مسٹر جسٹس الہٰی بخش خمیسانی کے نام

سخن بلند، نگہ دلنواز، جاں پرسوز،

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے!

JAF & CO.
Plot # 43/4. Q-2, Block-6,
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.

شکستِ بال و پر

کہیں موسمِ بہاراں کہیں زندگی غزل خواں
ترے حُسن کی بدولت مرے شعر کے اثر سے

غمِ زندگی گوارا تری مستیٔ نظر سے
مری رفعتِ تخیل ہے شکستِ بال و پر سے
یہ نشاطِ تیز گامی ہے کمالِ شادکامی
مجھے منزلوں سے مطلب نہ غبارِ رہگزر سے
وہ مقام میکدہ ہیں وہ جہاں جہاں رُکے ہیں
ہیں قدم قدم پہ گلشن وہ گزر گئے جدھر سے

(۱)

مَرَض چلا!

تم مجھے عزیز ہو، میرے لختِ جگر ہو۔ تم میں اور انجم میں کوئی فرق نہیں۔ بے شک وہ میرا لڑکا ہے لیکن میری نظر میں تم اس سے بڑھ کر محبوب ہو تمھاری تعلیمی ترقیاں دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوتا ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکو۔ اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کر سکو، اپنی نوجوان بہن کی شادی کر سکو، میرا جہاں تک تعلق ہے میں نے کب تمھاری مدد نہیں کرنا چاہی لیکن نہ تم نے اس عار کو گوارا کیا نہ تمھاری ماں اس ننگ کو برداشت کر سکیں تم وظیفہ لے کر پڑھ سکتے ہو لیکن اپنے چچا سے مالی مدد نہیں لے سکتے، خیر تم جانو تمھاری ماں جانیں ہم تو خیر طلب اور دعا گو ہیں لیکن کل سے میں بہت پریشان ہوں بلکہ سچ تو یہ ہے رات بھر سو نہ سکا۔

سنتے ہو بیٹے اسلم! تمھاری بیوقوف ماں نائلہ نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ مسرت سے تمھاری شادی کر دوں۔ بے شک وہ تمھاری چچازاد بہن ہے۔ جو وہی تم، خون ایک، خاندان ایک، ذات ایک، شرعاً یہ پیام ناجائز نہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے ہوا ہے، ہوتا رہتا ہے لیکن مسرت کو نائلہ کے گھر دلہن بنا کر کس طرح بھیج دوں؟ تمھارا اگر چچا ہوں تو مسرت کا باپ ہوں۔ یہ شادی بہت انمل بے جوڑ ہوگی۔

وہ ایک خاص ماحول میں پلی ہے، اس نے غربت کا منہ نہیں دیکھا، اس نے عیش و عشرت کی زندگی بسر کی ہے۔ وہ موٹر نشین ہے جس گھر میں رہتی ہے وہ محل سے کم نہیں اس کے نام پر بنک میں ایک لاکھ روپیہ جمع ہے۔ اس کے پاس زرنگار ملبوسات اور گراں بہا زیورات کا انبار ہے۔ اس کی شادی کسی ایسے ہی شخص سے ہو سکتی ہے جو برابر کا ہو وہ یہیں خوش رہ سکتی ہے، محض رشتہ داری کے جرم میں اس کی زندگی برباد کر دوں، یہ نہیں ہو سکتا!

ٹھیک ہے، بچپن میں ہی اس کی منگنی تمھارے ساتھ ہو چکی ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، ارے میاں نکاح ٹوٹ جاتے ہیں، پھر منگنی کیوں نہیں ٹوٹ سکتی۔ نائلہ کی سمجھ میں تو کچھ آئے گا نہیں ہیں تے سوچا تم ہی سے صاف صاف بات کر لوں، کیا تم میری طرف سے اتنا نہیں سمجھا سکتے کہ وہ اس خیالِ خام سے باز آجائیں! —

شاید اقبال کی تقریر ابھی اور جاری رہتی، لیکن اسلم نے موقع نہ دیا اور قطع کلام کرتے ہوئے بولا:

چچا جان! آپ کی صاف گوئی قابلِ قدر ہے، واقعی غریب اور امیر کا کیا جوڑ! کہاں ذرّہ، کہاں آفتاب!

اقبال نے خوش ہو کر دل ہی دل میں اس کی سعادت مندی پر دعائے ترقیٔ عمر دیتے ہوئے کہا:

بیٹے! خوش کر دیا تم نے، لیکن کیا کہا تم نے غریب اور امیر! نہیں ایسا نہ کہو، یہ بات نہیں۔ عزت اور امارت تو عارضی کیفیتیں ہیں تمھارا اور مسرت کا دل نہیں مل سکتا، مزاج نہیں مل سکتا۔ اس کے ماحول سے تم ناآشنا ہو، تمھارے ماحول سے وہ ہم آہنگ نہیں ہو سکتی، بس یہ بات ہے، کتنی معمولی سی بات لیکن کتنی اہم!

— تو کیا میں سمجھ لوں کہ میرے اس فیصلے کو تم نے دل سے قبول کر لیا۔ اسلم نے جواب دیا،

کیا آپ نے مسرت کا بھی عندیہ لے لیا ہے — کیا وہ بھی آپ کی رائے سے متفق ہے؟ اسلم نے جواب دیا۔

یہ الفاظ سن کر اقبال چونک پڑا — اس نے گھور کر اسلم کو دیکھا — اور پھر پوچھا:

کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

اسلم نے بڑی سنجیدگی اور سعادت مندی کے ساتھ ادب سے عرض کیا:

اگر مسرت کی رائے بھی یہی ہے، تو —

اقبال میاں کا غصہ ضبط سے باہر ہو گیا۔

خاموش — تم اس کا نام نہیں لے سکتے — وہ لڑکی ہے — وہ ماں باپ کے فیصلے سے سرتابی نہیں کر سکتی!

اسلم نے خود اعتمادی اور سخت درشت لہجے میں کہا:

آپ کا یہ خیال غلط ہے، وہ لڑکی ضرور ہے، لیکن عاقل ہے، بالغ ہے

اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا، جور نہیں کیا جا سکتا ـــــ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کر سکتی ہے۔

اس کی مرضی بھی یہی ہے۔

کب سے ہے ـــ کب سے اس کی مرضی بھی یہی ہے ـــ ؟

ہمیشہ سے ـــ اس کی مرضی بھی وہی ہے جو میری ہے!

غلط ـــ آپ اس کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں۔

(حد درجہ مشتعل ہو کر) نالائق، لچّے، بدمعاش ـــ تو کیا کہنا چاہتا ہے؟

اپنی بزرگی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے ـــ نہ میں نالائق ہوں نہ لُچّا نہ بدمعاش ـــ اور کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مسرّت مجھ سے شادی کا وعدہ کر چکی ہے

(اچھل کر) جھوٹا!

بلائیے مسرّت کو ـــ ابھی اور یہیں بات صاف ہوئی جاتی ہے۔

مسرّت نے تجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے؟

جی ہاں ـــ جی ـــ شادی کا وعدہ کیا ہے ـ محبّت کا دعویٰ کیا ہے رسمِ وفا باندھنے کا عہد کیا ہے ـــ پیمانِ وفا زندگی بھر کے لئے باندھا ہے۔ اور اس وعدے اور عہد کا خدا کو گواہ بنایا ہے۔

(نڈھال ہو کر) یہ کیا کہہ رہا ہے تو او ننگِ خاندان؟

ایک حقیقت ـــ ایک سچّی بات ـــ اور آج میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ سچ واقعی کڑوا ہوتا ہے!

تو نے اس کی نادانی، معصومیت اور بھولے پن سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ تو نے اظہارِ محبت کر کے اسیرِ دام کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھولی بھالی لڑکی اسیرِ دام ہو گئی، لیکن یہ صرف باتیں ہیں، یہ اَن ہونی باتیں ہیں۔ وہ عہدِ وفا جو اس نے کیا ہے مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہے۔ وہ پیمانِ وفا جو زندگی بھر کے لئے باندھا گیا ہے ٹوٹے گا اور ٹوٹ کر رہے گا۔

ایسا نہیں ہو سکتا۔

ہو گا اور ضرور ہو گا۔ ہرگز اس کی شادی تیرے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

پھر کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

ہو گی ــــ اور نواب زادہ سلیم اللہ خاں سے ہو گی ــــ تو ہاتھی سے گنے کھانے چلا ہے۔

ہاتھی کبھی چیونٹی سے گنے نہیں کھا سکتا۔

بہر حال میں نے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

میں نے بھی اپنے فیصلے سے آپ کو مطلع کر دیا۔

کیا کرے گا؟ ناخلف، ناشدنی تو کیا کرے گا!

میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، حکمِ امتناعی حاصل کروں گا آپ پر اور آپ کے نواب زادے صاحب پر سمن تعمیل کراؤں گا مسرت کا بیان عدالت میں لیا جائے گا پھر فیصلہ ہو گا۔

(حواس باختہ ہو کر) کیا کہا؟ عدالت جائے گا، حکمِ امتناعی حاصل کرے گا مجھ پر سمن کی تعمیل کرائے گا، مجھے یہ کرنا پڑے گا؟

تو مجھے ذلیل کرے گا، رسوا کرے گا؟

میں اپنا حق حاصل کروں گا، وہ حق آپ دے دیں تو سبحان اللہ، نہ دیں تو پھر رسوائی اور ذلّت برداشت کرنے کے لئے تیار رہئے!

تیرے پاس کیا ثبوت ہے ان جھوٹی باتوں کا؟

سب سے بڑا ثبوت تو خود مسرّت کا وجود ہے اس سے پوچھ لیجئے۔ دوسرا ثبوت اس کے وہ خطوط ہیں جو وقتاً فوقتاً اس نے مجھے لکھے ہیں۔

(ماتھے پر ہاتھ مار کر) خط کتابت بھی ہوتی رہی ہے تم دونوں میں؟

جی ہاں ___ ایک فائل تیار ہو گیا ہے۔

آہ کاش آج میرا مرحوم بھائی زندہ ہوتا!

وہ مرحوم بھائی جو آخری وقت بھی آپ کے دیدار حاصل کرنے کی عزّت نہ حاصل کر سکا۔ جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا، جسے دوا نہ مل سکی۔ جس نے بیماری میں دوا کی صورت نہ دیکھی اور نقاہت کے عالم میں فاقے کئے، اور آپ نے اس کی خبر نہ لی جو پروانہ دار آپ پر فدا ہوتا رہا ___ مگر آپ نے جسے منہ نہ لگایا ___ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو آپ کو خوشی ہوتی؟

کیا اس کے سامنے بھی تو اس طرح کی باتیں کر سکتا تھا؟

اگر آپ کے سامنے کر سکتا ہوں تو ان کے سامنے بھی کر سکتا تھا۔ وہ آپ سے کچھ زیادہ تو نہ تھے، چھوٹے ہی بھائی تھے آپ کے!

تم مسرّت سے اس لئے شادی کرنا چاہتے ہو کہ اس کی دولت ہتھیالو، مزے کرو، گلچھرّے اڑاؤ!

میری طرف سے اجازت ہے۔ آپ نے جو کچھ اسے دیا ہے سب واپس لے لیں، حتیٰ کہ وراثت تک سے محروم کر دیں، مجھے دولت نہیں چاہیئے۔ میں دولت سے محبّت نہیں کر سکتا، مسرّت سے کرتا ہوں۔

(بے خود ہو کر) ناخلف، میرے سامنے اظہارِ محبّت کرتا ہے ــــ؟

لیکن آپ سے نہیں۔

دُور ہو جا میرے سامنے سے، میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نفرت کرتا ہوں تجھ سے!

ابھی چلا جاتا ہوں، آپ نے بلایا تھا آ گیا ورنہ خود سے آنے کا نہ حوصلہ تھا نہ ضرورت!

یہ ہیں تم ماں بیٹوں کی حرکتیں جن سے میں نفرت کرتا ہوں۔

آپ نفرت کرتے ہیں یہ معلوم ہے، کیوں کرتے ہیں، یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اقبال میاں برہمی کے عالم میں اندر جانے کے لئے مڑے لیکن چند قدم جانے کے بعد پھر واپس آ گئے، انھوں نے ایک مرتبہ پھر ٹیڑھی نظروں سے اسلم کو دیکھا اور پھر زہرخند کرتے ہوئے طنز اور تعریض سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا:

تم ماں بیٹے کا مقصد رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آ رہا ہے، ایک طرف تم مسرّت سے شادی کرنا چاہتے ہو، اس مقصد میں بہ فرضِ محال کامیاب ہو گئے تو دوسرا وار انجم پر ہوگا۔

جی خوب سمجھتا ہوں سب کچھ!

"لیکن چچا جان میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

"پھر کوشش ہو گی کہ انجمن انجم کے سر منڈھ دی جائے!"

"یہ تو آپ کا بالکل ہی غلط خیال ہے اس لئے کہ انجمن کی نسبت شکیل سے طے پا چکی ہے۔"

"یہ کون چمار ہے؟"

"چمار نہیں، ایک شریف انسان، فی الحال ایک کمپنی میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ملازم ہے۔"

"اور اس کے بعد جب کبھی اور جیسے ہی انگلستان کا تخت خالی ہوا بادشاہ بنا لیا جائے گا۔ میں نے تو ان ذات شریف کا کبھی نام بھی نہیں سنا!"

"دُور کے رشتے سے عزیزداری بھی ہے۔ ویسے میں اس رشتے کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتا تھا لیکن جب حالات کا فیصلہ یہی تھا تو مجھے بھی ماننا پڑا۔"

"کیا ان دونوں میں بھی محبت تھی!"

"جی نہیں کاش ہوتی۔ لیکن غریب خاندان کی لڑکیاں محبت نہیں کرپاتیں۔"

"استغفراللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے ساری دُنیا محبت کے بحران میں مبتلا ہے جسے دیکھو محبت کا وظیفہ پڑھ رہا ہے محبت نہ ہوئی کھیل ہو گئی۔ پھر نائلہ اور افضال میں بھی محبت ہو گی، ضرور ہو گی۔"

"جی ہاں یقیناً تھی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیوں اس چیز سے چڑتے ہیں۔ کیا دُنیا میں محبت سے بھی بڑھ کر کوئی مقدس چیز ہو سکتی ہے۔"

"مقدس چیز! (زہرخند کرتے ہوئے) مقدس ـــــ میں تو لعنت بھیجتا ہوں

اس نقطہ پر۔

اقبال میاں لعنت بھیجتے، پیکرِ آتش فشاں بنے گھر کے اندر چلے گئے۔ انداز بتا رہے تھے کہ دُنیا میں اسلم سے زیادہ کسی سے نفرت نہیں کرتے!

اسلم بھی خاموشی سے اپنے غریب خانہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

اقبال صاحب مشکل سے زنان خانہ میں پہنچے ہوں گے کہ ایک شخص آیا اور اس نے آواز دی۔ آواز سنتے ہی اقبال میاں باہر تشریف لے آئے اور اس شخص پر ایک نظر ڈال کر گویا ہوئے۔ تم کون ہو؟

اس نے کہا: میں رعنا اسٹوڈیو سے بل لے کر آیا ہوں۔

اقبال صاحب نے مُنہ بگاڑ کر کہا: رعنا اسٹوڈیو؟ یہ کون بلا ہے؟ بل کیسا؟ کتنے کا ہے؟

وہ بولا: بل تو چوبیس روپے کا ہے۔ ہمارے اسٹوڈیو میں ایک فوٹو انلارج کرنے کو مس مسرت نے دیا تھا۔

فوٹو کا نام سن کر اقبال صاحب کے کان کھڑے ہوئے، پوچھا فوٹو بھی لائے ہو؟

اس نے بیگ کھولا، بل اور فوٹو دونوں ایک ساتھ پیشِ خدمت کر دیے، فوٹو اسلم کا تھا۔ فوٹو کو دیکھ کر اقبال صاحب کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ آنکھوں سے بجلیاں برسنے لگیں۔ اسٹوڈیو کا آدمی سخت حیران تھا، آخر یہ ماجرا کیا ہے اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا: کسی اور وقت حاضر ہو جاؤں اگر حکم ہو تو؟

اقبال صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چوبیس روپے نکالے اور اسے دیتے

ہوئے کہا : جاؤ چلے جاؤ ۔

اس نے روپے سنبھالے اور چلا گیا ۔ اس کے جانے کے بعد اقبال میاں نے اسلم کی تصویروں کے ـــ جو تعداد میں تین تھیں ـــ کئی ٹکڑے کیے اور ان ٹکڑوں کو زمین پر پھینک دیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ پُرزے اٹھائے ، جیب میں رکھے اور اندر چلے گئے ؟

---

(۲)
باغی

کالج کی بڑی تعطیل کے زمانہ میں وہ گھر آیا ہوا تھا۔ گھر، جہاں کی رعنائیوں کو ہوسٹل کی گہما گہمی، کالج کی رونق اور بزم احباب کی شور انگیزیوں میں بھی کبھی فراموش نہ کرسکا۔ ایک چھوٹے سے قصبے میں یہ چھوٹا سا گھر اس کی بنیادی تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہیں اس نے اپنے باپ کی گود میں ہمیشہ سچ بولنے کا سبق لیا تھا۔ سچ، خواہ اس کی قیمت کتنی ہی گراں کیوں نہ پڑے، یہیں اس نے اپنی محبت کرنے والی ماں کے دامن میں دوسروں سے محبت کرنا، دوسروں کے لئے اپنے آپ کو فنا کردینا، دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا۔ پریشان حالوں اور بدنصیبوں پر کڑھنا سیکھا تھا، یہیں مولانا مظہر الحق کے حلقۂ فیض میں بیٹھ کر اس نے اور بھی بہت سی اچھی اچھی باتیں سیکھی تھیں۔ خدا اور رسولؐ کی عظمت و محبت یہیں ملی تھی۔ مولانا بہت بڑے مجاہد بھی تھے، کئی دفعہ جیل جاچکے تھے، انگریزی سامراج کا سینہ تان کر مقابلہ

گر چکے تھے۔ جیل جب گئے تو اس حالت میں کہ گھر میں فاقہ تھا، واپس آئے تو یوں کہ برتن تک بک چکے تھے۔ لیکن نہ ماتھے پر شکن آئی نہ کسی کے سامنے دستِ طلب دراز کیا۔ فقر و فاقہ کا دور اس ٹھاٹھ اور اس شان سے بسر کیا جا سکتا ہے یہ بات اس نے مولانا ہی سے سیکھی تھی۔ بے خوفی کا جوہر بھی اسے یہیں اسی واقعے سے ملا تھا، اس بوریے پر بیٹھنے والے، پیوند لگے کپڑے پہننے والے، ہر مہینے بال بچوں سمیت کئی کئی فاقے کرنے والے شخص کے نطق و کلام اور سیرت و کردار میں کچھ اس بلا کا وقار اور دبدبہ تھا کہ بڑے بڑے فرعون اس کے سامنے سٹی بھول جاتے تھے۔ خودداری، خودنگری اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنے کا جوہر غیر محسوس طور پر اس کے دل و دماغ کیا روح تک میں یہی منظر دیکھ کر پیوست ہو گیا تھا۔ یہ ایسا شاندار، اتنا دل آویز اور اس طرح کا کشش انگیز اور سحر طراز نمونہ تھا جو دل کی آنکھوں میں کھب گیا تھا، بغیر ارادہ کے زندگی کا کاروان اس منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

بہت دن ہوئے وہ بساط الٹ چکی تھی۔

مولانا اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ باپ کو غریقِ رحمت ہوئے بھی ایک مدت گزر چکی تھی۔ ماں بوڑھی ہو چکی تھی، اس کی دنیا صرف مصلے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

لیکن اب بھی، جب وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد یونیورسٹی سے گھر آتا تو یہ نقوش پھر تازہ ہو جاتے تھے، یہ مٹے ہوئے اور کہنہ نقوش اُسے ایک نیا حوصلہ بخش دیتے ایک نئی اُمنگ عطا کر دیتے، دوسرے طلبا گھر جاتے ہوئے گھبراتے تھے کہ وہاں کالج اور ہوسٹل کی رنگینیاں اور دلچسپیاں اور زندگی کی رعنائیاں کہاں، لیکن وہ دن

گنا کرتا تھا، گھر جانے کے لئے اس نے اپنے گھر میں اور مولانا مرحوم کے حلقۂ فیض میں جو کچھ پالیا تھا جو کچھ سیکھ لیا تھا، جو کچھ اپنا لیا تھا وہ ایسی قیمتی پونجی تھی جو کبھی اور کہیں فراموش نہیں ہو سکتی تھی۔

آج کئی ماہ بعد وہ آیا تھا اور اس طرح آیا تھا جیسے تھکا ہوا مسافر منزل پر پہنچ جائے۔

یہاں مسرت بھی تو تھی!

مسرت! بچپن کی ساتھی، بچپن کی دوست، بچپن کی رفیق!

دونوں چچازاد بھائی بہن تھے، دونوں کے باپ سگے بھائی تھے۔ اقبال اور افضال ایک فارغ البال اور دوسرا زبوں حال۔ ایک اقبال مند اور دوسرا مفلوک الحال۔

دونوں ایک دوسرے سے اتنے الگ، اتنے الگ جیسے دن اور رات!

اقبال موٹروں اڑا پھرتا تھا، افضال کی قسمت میں دفتر کی کلرکی لکھی تھی۔ اقبال ہر روز سینکڑوں روپے کما لیتا تھا، افضال جس دن کسی مجبوری کے باعث دفتر نہ جا سکتا تھا اس دن کی تنخواہ کٹ جاتی تھی۔

اقبال اور افضال میں عسرت کی خلیج حائل تھی اور اس خلیج نے ایک کو دوسرے سے بے نیاز اور بے پروا بھی کر دیا تھا۔ اقبال نے کبھی نہیں سوچا کہ اس زبوں حال بھائی کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ افضال کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ آسودہ حال بھائی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ایک اپنی دولت میں مست تھا، دوسرا اپنی غربت میں، ایک مغرور تھا دوسرا خوددار!

افضال نے اسلم اور انجمن کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ کی، اسلم کو اچھے استاد ملے، اچھی

صحبت ملی، اچھا ماحول ملا اور غربت کے باوجود وہ بگڑ نہ سکا۔ پھر غربت کی تاب نہ لا کر باپ جب مر گیا تو اسلم نے ٹیوشن کر کے اور وظیفہ لے کر گھر بھی چلایا اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اور انجمن کے تعلیمی مصارف بھی برداشت کرتا رہا۔

اب وہ بی اے میں پہنچ چکا تھا، یہ آخری سال تھا۔ اور امید تھی کہ ضرور کامیاب ہوگا۔

مسرت اگرچہ دولت مند باپ کی بیٹی تھی اور اس میں وہ کمزوریاں بھی تھیں، جو دولت مندوں میں ہوتی ہیں۔ یعنی احساسِ برتری، نخوت، پندار، لیکن دل کی اچھی تھی۔ اور اسلم سے تو اس کا برتاؤ بہت ہی اچھا تھا۔ اقبال نے نائلہ کو، افضال کو، اسلم کو، انجمن کو کبھی جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔ لیکن وہ کبھی کبھی چچا کے ہاں بن بلائے چلی جاتی، انجمن سے گھنٹوں اور پہروں محبت بھری باتیں کرتی، نائلہ کا بھی کبھی ہاتھ بھی بٹا دیتی، وہ آتی تو گھر میں عید ہو جاتی، اسلم اور نائلہ بچھ بچھ جاتے، انجمن واری صدقے ہونے لگتی۔ اور اسلم پر تو نشاط و انبساط کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ معلوم ہوتا دُنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہے۔

کبھی مسرت انجمن اور اسلم کو اپنے ہاں مدعو کر لیتی اور وہاں بھی بزم و محفل کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

اس ارتباط و تعلّق نے رفتہ رفتہ غیر محسوس اور نامعلوم طور پر دونوں کو محبّت کے راستے پر ڈال دیا۔ پھر یہ جانتے ہوئے کہ یہ راستہ محبّت کا ہے دونوں نے اس جادہ پر چلنا شروع کر دیا۔

اس محبّت کا رنگ یوں اور زیادہ چوکھا ہو گیا کہ بچپن میں شاید دودھ کے دانت

نکلنے سے پہلے دونوں کی منگنی ہو چکی تھی۔

یہ واقعہ جب کا ہے جب دونوں کی مالی کیفیت تقریباً یکساں تھی۔ بلکہ مفضال کچھ بہتر حالت میں تھا۔ اُسے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ایک بندھی ہوئی رقم تنخواہ کی صورت میں مل جاتی۔ اور افضال ہر روز کساد بازاری کا شکوہ سنج رہتا۔ افضال کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ کسی کی مدد کر سکتا۔ لیکن جس طرح بھی بنتا کرتا تھا۔ کبھی انجم کے لئے ٹوپی لے آیا کبھی مسرت کے لئے گڑیا خرید لایا، کبھی بھائی کے لئے ٹوپی مول لے آیا، کبھی ناہید (افضال کی بیوی) کے لئے دوپٹہ لے آیا۔

لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلنے لگے۔

افضال کی ترقی پانچ روپے سالانہ سے نہ بڑھ سکی اور اقبال دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ پہلے دونوں بھائی ساتھ ساتھ رہتے تھے اب الگ ہو گئے۔ قریب ہی ایک وسیع اور کشادہ مکان تھا۔ وہ کرایہ پر لے لیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ یہ مکان بھی خرید لیا، پہلے بڑی ہمت کی تو سائیکل خرید لی، پھر وہ دن بھی آیا کہ موٹر خرید لی گئی۔

مکان کیا بدلا سب کچھ بدل گیا۔ نہ وہ چاہت رہی نہ پیار، کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تو علیک سلیک سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی ناہید گھڑی دو گھڑی کو آتی تو گھڑی دو گھڑی بیٹھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ جیسے کسی پنچھی کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ آئی اور گئی۔ اقبال بھی کبھی کبھی جھانک لیتا، کھڑے کھڑے حال پوچھا، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور رخصت۔ یہ رنگ دیکھ کر نائلہ اور افضال دونوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

لیکن بچپن کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ کم از کم مسرت نے تو اس رشتے کو اس طرح نباہا کہ اسے محبت کا رشتہ بنا لیا۔ اس محبت میں کوئی حرج بھی نہ تھا، دونوں کی

کے لئے ماں کی کسی خواہش کا رد کرنا مشکل تھا۔ لیکن یہ خواہش تو خود اس کی بھی تھی، دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے!

نائلہ نے خط لکھا اور انجمن کو پیامبر بنا کر بھیج دیا۔ اقبال میاں نے تیوری چڑھا کر خط پڑھا۔ پھر اسے توڑ مروڑ کر جیب میں رکھ لیا اور اس کے بعد نہایت خشک لہجے میں کہا:

جواب بھیج دیا جائے گا۔ نائلہ کو جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔

اس جواب پر اور اس طرزِ عمل پر انجمن کو بڑی حیرت ہوئی۔ گو اس نے چچا اور چچی کی دولت میں کبھی ساجھا نہیں لگایا تھا۔ لیکن حسنِ اخلاق کی دولت ہمیشہ جھولی بھر ملی تھی۔ آج وہ میٹھے بول بھی نہیں تھے۔ آج وہ مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ آج وہ کھانے وغیرہ کے لئے اصرار بھی نہیں تھا۔ اور ایک عجیب تر بات یہ تھی کہ اس کے آتے ہی کار دروازہ پر آکر لگ گئی۔ اور بیگم کسی بہت ضروری کام سے کہیں باہر چلی گئی یا بھیج دی گئی!

یہ ساری باتیں اس کے لئے ناقابلِ فہم تھیں۔ یہاں آکر وہ اپنے آپ کو کچھ شرمندہ شرمندہ سا، نادم نادم سا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن کیوں؟ کس لئے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

جب واپس جانے لگی تو اقبال میاں نے خلافِ عادت اخلاقاً بھی رک جانے کے لئے نہیں کہا۔ کہا تو صرف اتنا کہ اسلم کو کل صبح ذرا بھیج دینا۔ اور ناہید نے تو اس سارے عرصے میں جھوٹے منہ بھی بات تک نہیں پوچھی۔

دوسرے روز اسلم اقبال کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور منہ کی کھا کر واپس آیا۔ نائلہ نے پوچھا:

ہو ہی چکی تھی۔ اگرچہ اب اس کا ذکر اقبال اور ناہید کی زبان پر کبھی نہیں آتا تھا اور نائلہ بھی نہ جانے کیوں اس ذکر سے کترانے لگی تھی۔

اسلم نے جب قصبہ چھوڑا، شہر گیا اور کالج میں داخلہ لیا تو دونوں میں خط و کتابت بھی شروع ہو گئی۔ اور یہ رسمی خط و کتابت بہت جلد ہی محبّت کی صورت میں بدل گئی۔ عورت یا تو پیش قدمی کرتی نہیں، کرتی ہے تو بہت زیادہ آگے بڑھ جاتی ہے، اتنا زیادہ کہ پھر پیچھے لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے اگرچہ ناممکن نہیں۔

محبّت اسلم بھی کرتا تھا لیکن بقول مسرّت کے اس سے کم۔ اور بقول اسلم کے مجنوں سے بھی زیادہ۔

ملاقاتیں ہوتی رہیں، باتیں ہوتی رہیں، محبّت کی کہانیاں کہی اور سنی جاتی رہیں۔ محبّت کی حکایت لکھی جاتی اور قلم بند کی جاتی رہی، نباہ کے وعدے، وفا کا قول و قرار، جدائی کے شکوے، روز دید و ملاقات کی حسرت!

اب دونوں مکمل طور پر جوان ہو چکے تھے، باشعور ہو چکے تھے، فہم و تمیز کے مالک ہو چکے تھے۔ دونوں میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ زندگی بسر کرنے اور بسر کرلے جانے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے تھے۔

اس غور و فکر کا نتیجہ کچھ عجیب سا نکلا تھا۔

اسلم کی محبّت چٹان کی طرح محکم اور مستحکم ہو گئی تھی۔ اور مسرّت تو اسلم سے بھی دو قدم آگے تھی۔

اب وہ بی اے کے آخری سال میں پہنچ چکا تھا۔

نائلہ کی خواہش تھی کہ نکاح ہو جائے رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ ویسے بھی اسلم

کیا بات ہوئی؟ کیوں بلایا تھا؟

اس نے جواب دیا خیریت دریافت کرنے۔ کہہ رہے تھے، دُبلے بہت ہو گئے

ہو!

نائلہ اُلجھ پڑی۔ میرے خط کا جواب بھی کچھ دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے اور اس مسکراہٹ میں کتنا زہر تھا، کہا:

دیں گے تو آپ دیں گے — لیکن ابھی یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجئے۔

نائلہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اجنبن پر سناٹا طاری ہو گیا۔

کیوں میرے بیٹے یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جس آرزو کو اتنے عرصے سے دل میں لئے بیٹھی ہوں اُسے نکال پھینکوں۔

پھر یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ مر جاؤ۔ میں زہر کھا کر سو رہوں گی اگر ایسی باتیں ہوں گی مجھ سے، کچھ دماغ چل گیا ہے تیرا لڑکے۔؟

نائلہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسلم کا رنگ رُخ اڑا ہوا تھا۔ ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں چہرے پر، ایک رنگ آ تا تھا ایک جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انتہائی صدمے کو ضبط کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہو۔ اب رو دیا اور اب رو دیا!

یہ رنگ دیکھ کر نائلہ کے حواس جاتے رہے۔ اس نے بڑھ کر اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ اور بولی!

میرے بچے یہ تجھے کیا ہو رہا ہے؟ خدا کے لئے بتا تو دے بات کیا ہے۔ کیا کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی بھائی صاحب سے؟

اسلم نے ایک آہ سرد کے ساتھ جواب دیا:

ہاں امی ۔۔۔ وہ مسرت کی شادی ایک نواب زادہ سے کرنا چاہتے ہیں!

گویا اس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ نائلہ نے اپنی دلیل پیش کر دی۔

واہ کیا منگنی نہیں ہو چکی ہے۔؟

اسلم بڑی مشکل سے اپنے تاثرات پر غالب آیا، پھر گویا ہوا:

وہ کہتے ہیں جب نکاح ٹوٹ سکتا ہے تو منگنی کیوں نہیں ٹوٹ سکتی!

نائلہ چکر کھا کر ایک دم کھڑے سے بیٹھ گئی اور بڑے درد بھرے انداز میں بولی:

یہ میں کیا سن رہی ہوں، کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

اسلم بھی وہیں ماں کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا:

سب کچھ ہو سکتا ہے اس دنیا میں امی!

ایک اور توڑ نائلہ کی سمجھ میں آیا:

میں کبھی نہیں مان سکتی کہ مسرت خوشی سے کسی اور کی بیوی بن سکتی ہے۔ وہ بڑی باعزت اور باحیا لڑکی ہے۔ جان دے دے گی اپنی ۔۔۔ یہ کیسا باپ ہے جو لڑکی کو جان سے مارنے کے درپے ہے۔ اسلم میری مسرت کو لاؤ، میری مسرت کو بچاؤ۔ خدا جانے اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ حکم نادری سن کر،

کیوں اسلم! کچھ نہیں ہو سکتا اب؟

اسلم نے جواب دیا بڑے سرد لہجے میں:

سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر مسرت چاہے۔ ہاں وہ خود نہ چاہے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔

انجمن نے مسرت کی وکالت کا حق ادا کرتے ہوئے کہا:

بھائی جان آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مسرت کی رازدار میں ہوں۔ آپ بھی نہیں۔ وہ کبھی اور کسی قیمت پر رضامند نہیں ہو سکتی۔ چچا جان تو روپے کے لوبھی ہیں۔ کسی نواب زادہ کا پیام آیا، الجھ گئے۔ یہی حالت چچی کی بھی ہے۔ انھیں تو روپیہ چاہیئے نہ ذات نہ خاندان۔ نہ برادری۔ لیکن مسرت بڑی عالی خیال، اور عالی ظرف لڑکی ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں وہ بغاوت کر دے گی، ناکوں چنے چبوا دے گی!

مایوسی کی تاریکی میں نائلہ اور اسلم کو امید کی کرن نظر آئی۔ نائلہ بولی۔ ٹھیک کہتی ہے میری بچی۔ کوئی بہانہ کر کے وہاں جا اور اُسے ٹٹول، پھر ہم سوچیں گے کہ کیا کر سکتے ہیں؟

اسلم نے ماں کی تائید میں، بہن کو ابھارتے ہوئے کہا:

دیکھنا ہے کیا کر کے آتی ہو!

انجمن نے سینہ ٹھونک کر کہا۔:

دیکھ لیجیے گا۔ مسرت کو اپنے ساتھ نہ لاؤں جب کی بات۔ یہ ہمارے چچا جان سمجھتے کیا ہیں، وہ زمانہ لد گیا جب لڑکیاں مالِ تجارت کی طرح ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل کر دی جاتی تھیں۔ یہ آزادی، روشن خیالی اور خود مختاری کا زمانہ ہے۔ سچ بھائی جان بڑا مزا آئے گا دیکھیے گا کیا تماشا ہوتا ہے کیسا گل کھلتا ہے!

(۳)

دلِ بے قرار

اسلم نے اگرچہ اقبال کے سامنے کسی طرح کی کمزوری نہیں دکھائی تھی لیکن درحقیقت زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل چکی تھی۔ تائلہ کے پاس سے اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آیا تو سوچ رہا تھا یہ کیا ہو گیا!

کتنی امیدیں اور آرزوئیں لے کر وہ یہاں آیا تھا۔ لیکن وہ امیدیں اقبال چچا نے پاؤں تلے روند ڈالیں۔ ان آرزوؤں کا خون کر دیا گیا۔

پھر اب کیا ہو گا؟

دل نے جواب دیا کچھ نہیں ہو گا، کچھ نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے جو کچھ کہہ دیا وہ حرفِ آخر ہے۔ وہ نوشتۂ قسمت ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ وہ ہو کر رہے گا۔

دل نے پھر ایک سوال کیا، مسرت؟ کیا وہ بھی ہتھیار ڈال دے گی؟

جواب ملا، ہاں اسے بھی سر جھکانا پڑے گا! کسی لڑکی کے لئے والدین سے بغاوت

کرنا آسان نہیں ہوتا۔

کیا وہ میری محبّت کو ٹھکرا دے گی؟ اس عہدِ وفا کو فراموش کر دے گی جو بارہا کر چکی ہے!

اور پھر اس کے کانوں میں مسرت کے الفاظ گونجنے لگے، محبت بھرے الفاظ، نشہ آور الفاظ، زندگی آفریں الفاظ، یہ الفاظ بارہا اس نے سنے تھے!:

اسلم! تم میرے ہو، میں تمھاری ہوں۔ دُنیا کی کوئی طاقت ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی، ہمیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتی!

اور ان الفاظ کے جواب میں اسلم اپنی بے مائگی کا ذکر کرتا، اپنے افلاس اور غربت کی داستان لے کر بیٹھ جاتا اور یہ باتیں سن کر وہ کہہ اٹھتی:

بس کرو اسلم یہ باتیں میں نہیں سن سکتی۔ غربت اور امارت کا رونا کیوں روتے ہو؟ امارت کوئی قابلِ فخر چیز نہیں، غربت کوئی قابلِ شرم چیز نہیں۔ آج کا امیر کل فقیر ہو سکتا ہے۔ آج کا فقیر کل امیر ہو سکتا ہے، انسان گھوڑا نہیں بن سکتا، مرد عورت نہیں بن سکتا۔ پھول کانٹا نہیں بن سکتا، پانی آگ نہیں بن سکتا، اس لئے کہ یہ قدرت کا بنایا ہوا قانون ہے۔ اسے کوئی نہیں توڑ سکتا، لیکن غربت اور امارت کی خلیج خود انسان نے پیدا کی ہے۔ جب چاہے اسے پاٹ سکتا ہے۔

اور پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اور اسلم کو ذرا سا بھی بولنے کا موقع نہ دیتے ہوئے اس نے کہا تھا:

دل کا چین اور روح کا سکھ نہ دولت کا تابع ہوتا ہے نہ غربت کا، یقین پا کر مجھے وہ دولت مل جائے گی جو ہفت اقلیم کے خزانوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ اور اگر

اور اگر خدا نخواستہ میں تمھیں کھو دوں تو پھر سنگ مرمر کا محل میرے لئے قید خانہ ہوگا سونے اور چاندی کے زیورات زنجیر پا ہوں گے ۔ ریشم اور دیبا کے ملبوسات کانٹے کی طرح چبھیں گے میرے بدن میں ـــ کیوں اسلم ! سچ کہنا اگر چچی (نائلہ) تمھاری شادی کسی اونچے گھرانے کی مالدار لڑکی سے کرنا چاہیں تو کر لو گے ؟

"ہرگز نہیں ، قیامت تک نہیں" یہ جواب سن کر وہ کتنی خوش ہوئی تھی ، واقعی جیسے ہفت اقلیم کے خزانے مل گئے ہوں اسے ، پھر اس نے قیامت کی نظر ڈالتے ہوئے کتنے دل میں کھب جانے والے انداز کے ساتھ سوال کیا تھا :

کیوں ہرگز نہیں ـــ کیوں قیامت تک نہیں ؟

اور اس سوال کا جواب اُسے ملا تھا :

اس لئے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ہسرت ! میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں ـــ دنیا میں کسی سے اتنی والہانہ اور مجنونانہ محبت نہیں کرتا ۔

مسرت مسکرا مسکرا کر یہ باتیں سنتی رہی تھی ، پھر اس نے سوال کیا تھا :

اور میں ؟

"اور تم !؟"

"جی ـــ میرے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا ؟"

"تم بھی محبت کرتی ہو ـــ ہم دونوں محبت کرتے ہیں ۔"

"اور ہم دونوں میں کوئی بھی ایک دوسرے سے بڑھ کر محبت کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ میرے دعوے کو آپ اگر چیلنج کر سکتے ہیں تو آپ کے دعوے کا جواب میں ہوں ۔"

"سچ ہے؟ ــــ سچ کہتی ہو؟"

"تو پھر وعدہ کیجیے اب کبھی اس طرح کی باتیں نہیں ہوں گی۔ اب کبھی اس طرح کے سوال نہیں اٹھیں گے۔ سوچ کیا رہے ہیں کیجیے وعدہ!"

"اچھا بھئی کرلیتا ہوں، لیکن مجھے چچا جان سے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں، کیا وہ کوئی بھوت ہیں؟ کیوں ڈرتے ہیں آپ ان سے؟"

"معاف کرنا وہ زرپرست ہیں، ان کی نظر میں آدمی کی نہیں دولت کی قدر ہے صرف دولت کی!"

"ہاں یہ کمزوری ہے ان میں، لیکن دولت سے بھی زیادہ جس سے انھیں محبت ہے وہ میں ہوں، اگر میرا اور دولت کا سوال ہو تو وہ دولت کو چھوڑ دیں گے اور مجھے اختیار کرلیں گے۔"

"بہت حسن ظن ہے تمھیں اپنے بارے میں ـــ ضرورت سے زیادہ تو نہیں؟"

"نہیں ـــ اور ہو بھی تو کیا؟ مجھ میں خود اعتمادی بھی ہے۔ اگر وہ اپنے فیصلے میں اٹل ہیں تو میں بھی انہی کی بیٹی ہوں۔ میرا فیصلہ بھی کوئی بدل نہیں سکتا۔"

"خوب، بہت خوب!"

"اور آپ کو تو خواہ مخواہ مینیا ہوگیا ہے غربت کا۔ آپ کے پاس شرافت کی دولت ہے، انسانیت کی دولت ہے، علم کی دولت ہے۔ آج آپ کچھ نہیں ہیں کل سب کچھ ہوسکتے ہیں، آپ امتحان مقابلہ میں بیٹھ سکتے ہیں، آپ ترقی کرسکتے ہیں آپ دولت مند بن سکتے ہیں، کیا یہ نوشتۂ تقدیر ہے کہ ہمیشہ غریب ہی رہیں گے آپ؟ میرا حسن ظن تو اپنے بارے میں یہی ہے۔"؟

(ہنستے ہوئے) غلط ہے، اس خیالِ خام کو دل سے نکال دیجئے۔ بتائیے بی اے کر لینے کے بعد کیا ارادہ ہے؟

ملازمت ــــ یہی آبائی پیشہ ہے ہمارا۔

نہیں ــ آپ کو تجارت کرنا پڑے گی ــــ ملازمت نہیں۔

دلچسپی تو مجھے بھی ہے تجارت سے ــ لیکن تجارت کے لئے سرمایہ چاہیئے وہ کہاں سے آئے گا!

میرے زیورات ــــ

خبردار مسرّت اب یہ لفظ کبھی زبان پر نہ لانا۔

(تیوری چڑھاکر) شاید آپ کی عزت کو ٹھیس لگتی ہے اس پیش کش سے!

ہاں، مجھے اپنے دست و بازو پر بھروسہ ہے۔ پہلے ملازمت کروں گا پھر تجارت۔ میرا فرض یہ ہے کہ تمھیں سکھ سے رکھوں یہ نہیں کہ مصیبت میں ڈال دوں۔ تمھیں اگر زیورات دے نہیں سکتا تو اتنا بے حیا بھی نہیں ہوں کہ انہی پر اپنی معیشت کی بنیاد رکھوں۔ نہیں مسرّت یہ نہیں ہو سکتا، اس مسئلے پر گفتگو بھی نہیں ہو سکتی۔

اور پھر بڑی دیر تک دونوں میں پیار اور محبّت کی باتیں ہوتی رہیں۔

آج یہ ساری باتیں اسلم کو یاد آرہی تھیں، یہی باتیں تھیں جن کے بتے پر وہ اقبال سے لڑ گیا تھا۔ اس نے اقبال کی آمریت اور حکومت کو چیلنج کیا تھا۔ اُسے اپنے اوپر اور اپنے سے کہیں زیادہ مسرّت پر اعتماد تھا، اسے یقین تھا، ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر ہمارا پیمانِ وفا نہیں ٹوٹ سکتا اسے کوئی نہیں توڑ سکتا!

یہ باتیں یاد آرہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔

کیا آج بھی مسرت اپنے اس عہد پر قائم ہے؟

کیا اب بھی مسرت کا فیصلہ اٹل اور وعدۂ وفا لازوال ہے؟

طرح طرح کے اندیشے آنے لگے، لیکن وہ ان اندیشوں کو دور کرتا، ان سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا۔

اور پھر یک بیک ایک تیر سا لگا آکر دل میں ۔۔ دل کے اندر سے آواز اٹھی یہاں آئے ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔ مگر مسرت آج تک نہیں آئی۔

کیوں؟ کیا یہ خلافِ معمول بات نہیں ہے؟

پہلے تو وہ میری خبر سنتے ہی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آموجود ہوا کرتی تھی۔ اب کے کیوں نہیں آئی؟ انجمن سے بار بار تقاضے ہوتے تھے، ہماری دعوت کرو، ہمیں بلاؤ، ہمیں مہمان رکھو اپنے ہاں، لیکن اس مرتبہ کوئی فرمائش نہیں، کوئی تقاضا نہیں کوئی تحریک نہیں۔

یہ سکوت کیوں؟ یہ بے مہری کس لئے، اس نئے طرزِ عمل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

اور پھر اسے وہ کہانی یاد آئی جو انجمن نے اسے سنائی تھی۔ انجمن نے کہا تھا اسے دیکھتے ہی کار دروازہ پر رک گئی آکر اور مسرت "ایک بہت ضروری کام"، کا عذر کر کے چلی گئی

کیا وہ انجمن کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ کیوں نہیں لے گئی؟

کیا چلتے چلتے وہ انجمن سے فرمائش نہیں کر سکتی تھی۔ ہماری دعوت کرو ہم آج نہ آئیں گے، پھر یہ فرمائش کیوں نہیں کی گئی؟

انجمن کا خیال ہے۔ وہ گئی نہیں بھیجی گئی، اُسے جانا پڑا، وہ جانے پر مجبور تھی۔

اتنے میں انجمن آ گئی :

بھائی جان کیا کر رہے ہیں آپ ؟ چلیئے کھانا تیار ہے ۔ امی نے بلایا ہے "

اس نے کہا بیٹھ جاؤ انجمن ابھی چلتا ہوں ، ذرا کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے !

وہ بیٹھ گئی ۔۔ اسلم نے پوچھا :

کیا واقعی مسرت وہاں تمھارے پہنچنے کے بعد مجبور تھی باہر جانے پر ؟

انجمن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا :

اور میرا خیال تو ایسا ہی ہے ۔

لیکن اس خیال کی بنیاد ؟

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر افسردگی سی طاری ہے ، وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے ۔ ایک عجب طرح کی بیقراری ، ایک عجب طرح کی پریشانی عیاں تھی اس کے رنگ رخ سے ۔ اس حالت میں تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔

(کچھ سوچتے ہوئے) تمھارا خیال صحیح ہو سکتا ہے ، لیکن یہ تو بتاؤ اس نے میرا ذکر تو نہیں کیا ، میرے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا ۔ ؟

نہیں بھائی جان ! اور اس کا موقع بھی کب تھا ؟ اس بیچاری کو مجھ سے ملنے اور اور باتیں کرنے کی مہلت ہی کب ملی ؟

لیکن وہ تم سے اپنی دعوت کا مطالبہ تو کر سکتی تھی ۔

نہیں کر سکتی تھی بھائی جان ! بالکل نہیں کر سکتی تھی ۔

یعنی وہ لفظ بھی نہیں ۔۔ ایک ذرا سی بات نہیں ؟

جی ہاں نہیں ۔۔۔ چچی جان سر پر مسلط تھیں ، چچا میاں سامنے کھڑے تھے ، کا

دروازہ پر کھڑی تھی۔ اور انجن چل رہا تھا۔

کہیں کسی دوسری جگہ لے جا کر اسے قید تو نہیں کر دیا گیا۔ (اضطراب کے ساتھ) انجمن یہی بات ہے۔ میں جاتا ہوں، میں اس کا مطالبہ کروں گا، میں اس سے ملوں گا میں چچا جان سے پوچھوں گا، میں انجم سے دریافت کروں گا، اور اگر اس کا پتہ نہ ملا مجھے اس سے ملنے نہ دیا گیا تو پولیس کو جا کر اطلاع دے دوں گا، انجمن وہ مصیبت میں ہے سرت پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں، میں جان دے کر بھی اسے بچاؤں گا۔ یہ ظلم، یہ دھاندلی، یہ زیادتی برداشت نہیں ہو سکتی مجھ سے۔

وہ پیکر اضطراب بن کر اٹھ کھڑا ہوا اقبال کے ہاں جانے کے لئے، لیکن انجمن نے ایسا نہیں کرنے دیا، وہ بولی:

بھائی جان ہوش کی باتیں کیجئے، اس طرح معاملہ بگڑ جائے گا، آپ کا وہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ میرا کام ہے، میں جاؤں گی، میں خبر لاؤں گی، پھر آپ جو چاہیں کریں لیکن ابھی نہیں۔

بات اسلم کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے کمزور اور مدھم آواز میں کہا:

اچھا ــــ لیکن تم کب جاؤ گی؟ اب تک تو چلا جانا چاہئے تھا۔ کھانا ایسا کون ضروری تھا کہ پکانے بیٹھ گئیں، کیا فاقہ نہیں کر سکتی تھیں ایک دن؟ کیا میں بے کھائے ہوئے ایک دن بھی نہیں گزار سکتا تھا؟ کتنا قیمتی وقت ضائع کر دیا تم نے اپنی حماقت سے۔ اب کیا ہوگا؟

انجمن نے سمجھاتے اور دلاسا دیتے ہوئے کہا:

بھائی جان آپ تو جانے کیسی باتیں کرنے لگے، بالکل وقت ضائع نہیں ہوا۔ آج

جب کہ چچا جان سے آپ اتنی سخت گفتگو کر آئے ہیں میرا وہاں جانا قطعاً خلافِ مصلحت تھا، اطمینان رکھیے صبح اٹھتے ہی وہاں کی راہ لوں گی ۔ امّی نے بھی یہی حکم دیا ہے۔ کیا آپ مجھ پر بھی بھروسہ نہیں کرتے ؟!

اسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انجمن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی :

چلیے کھانا کھائیے چل کر امّی انتظار کر رہی ہیں، ان کا دل ویسے ہی دُکھا ہوا ہے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر وہ اور پریشان ہو جائیں گی، کہیں اختلاج کا دورہ نہ پڑ جائے آدمی بن کر چلیے وہ ہرگز یہ محسوس نہ کر سکیں کہ آپ پریشان ہیں، کوئی صدمہ ہے آپ کو، کیا اب تک نہیں جان سکے کتنی اتھاہ محبت کرتی ہیں وہ آپ سے !

اسلم چپ چاپ گردن جھکا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ پھر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا : کیوں انجمن تم نے مسرت کو کچھ بدلا ہوا تو نہیں پایا ؟

انجمن ہنسنے لگی اور کہنے لگی : بھائی جان کیوں وہم کر رہے ہیں آپ خواہ مخواہ، مسرت بڑی اچھی لڑکی ہے، زمین و آسمان بدل سکتے ہیں، وہ نہیں بدل سکتی۔

اسلم کو جیسے ان باتوں پر یقین نہیں آیا، اس نے کہا : تمھاری بات میں وزن ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہے، دل سے صدا اٹھتی ہے کہ مسرت بے وفائی نہیں کر سکتی، لیکن فوراً ہی ایک اور صدا سنتا ہوں کہ اس دنیا میں وفا ہے کہاں ؟ انجمن ! یہ کس کی آواز ہے ؟ یہ صدا کس کی ہے ؟ کیا میرے قلبِ ناشکیب کی ؟ کیا یہ آواز بھی میرے ہی دل کی گہرائیوں سے بلند ہوتی ہے ۔ بتاؤ انجمن، بولو مجھے سہارا دو، مجھے روشنی دو، مجھے سکون دو، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ۔

میں اندھیرے میں چل رہا ہوں ، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے سکون کی دولت کوئی غارت گر لوٹ لے گیا ، کیا ہوگا ، کیا ہونے والا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ باتیں سن کر انجمن گھبرا گئی ۔ اس نے مضطرب انداز میں کہا : بھائی جان حوصلہ قائم رکھئے ۔

اسلم پھر گردن جھکا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ۔

---

(۴)

بیتے دنوں کی یاد

انجمن کے اصرار اور نائلہ کے خیال سے اسلم دسترخوان پر بیٹھ تو گیا لیکن بھوک غائب تھی، چند لقمے کھا کر اٹھ کھڑا ہوا، پھر اپنے کمرے میں آکر پڑ رہا۔ وہ مسرت کے بارے میں حد درجہ فکرمند تھا۔ اسے یقین تھا وہ بدرجۂ تسلیم ہی ہوئی ہے، یہ دولت کا پجاری اسے اپنی ہوس زر پر بھینٹ چڑھا دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یہ فیصلہ بڑی آسانی سے بدل سکتا ہے اگر مسرت کا تعاون حاصل ہو۔ اور مسرت کا تعاون ایک طے شدہ چیز تھی ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا!

بڑی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، نیند نہ آنا تھا نہ آئی۔ بار بار مسرت کا تصوّر جلوہ نمائی کرنے لگتا۔

آخر جب کسی طرح رین نہ کٹی تو اٹھا، اور وہ فائل نکال لایا جس میں مسرت کے خوشبو میں بسے ہوئے اور محبت سے بھرے ہوئے خطوط تھے۔ ایک ڈھیر تھا خطوں کا۔

ان خطوں کی ورق گردانی شروع کر دی ــــ آخر رات کسی طرح تو کٹے ۔ وقت کسی ح گزرے ۔ ایک خط پر نظر پڑی :

کتنے دن ہو گئے ہیں تمھیں یہاں سے گئے ہوئے ۔ کہو گے کتنے دن ہوئے ، چار ہی پانچ دن تو ہوئے ہیں ، تمھارا کہنا بھی ٹھیک ہے ۔ لیکن میرے لئے تو یہ چار پانچ دن ایسا معلوم ہوتا ہے چار پانچ سال کی طرح طویل ہو گئے ہیں ۔ تم ہوتے ہو تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا ۔ کالج کی لمبی چھٹی بھی جو دو مہینوں پر مشتمل ہوتی ہے پلک جھپکاتے گزر جاتی ہے جیسے دو لمحے ۔ لیکن جب نہیں ہوتے تو یہ دن کاٹے کٹتا ہے نہ رات ۔ کیا واقعی ہجر کی شب بہت لمبی ہوتی ہے یا صرف محسوس ہوتی ہے ؟ ــــ خود تمھارا تجربہ کیا ہے ؟

ان الفاظ میں کتنی گھلاوٹ تھی ، کتنا رس تھا ، کتنا کیف تھا !

کئی بار خط کے اس ٹکڑے کو عقیدت کی نظروں سے پڑھا ، پھر ورق گردانی شروع کر دی یک اور خط پر نظر جا کر رک گئی :

انجمن کہہ رہی تھی : اس مرتبہ کرسمس کی چھٹیوں میں تم نہیں آؤ گے ۔ کیا واقعی نہیں آؤ گے ؟ ہاں ، کیوں آنے لگے ، وہاں دوستوں کا جمگھٹا ہے ، یاروں کی محفل ہے ، رنگینیاں ہیں ، دلچسپیاں ہیں ، دن عید رات شب برات ، اس کی کون پروا کرتا ہے ، کوئی کسی کی راہ تک رہا ہے ، کوئی کسی کے آنے کے دن نہیں گھڑیاں گن رہا ہے ۔ کوئی کسی کی یاد میں جان سے گزرا جا رہا ہے ، کسی کو خوشی کی صرف وہی گھڑیاں میسر آتی ہیں جب کوئی موجود ہو ۔ اور کتنا ظالم اور سنگ دل ہے وہ " کوئی " ! اسے دوسروں کے جعبات

احساسات کی ذرا پرواہ نہیں، ذرا فکر نہیں۔ اسلم اگر تم نہ آئے تو یاد رکھو، اچھا نہ ہوگا ــــ جواب نہ دو ــــ آؤ"

یہ سطریں پڑھ کر خود بخود اس کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا!

دل سے آواز اٹھی:

یہ ہے تیری مسرت، کون چھین سکتا ہے اسے تجھ سے، ایک لاکھ اقبال بھی نہیں

چند ورق اور الٹے، پھر ایک خط پر نظریں جم گئیں۔ لکھا تھا:

کئی دن سے بخار آ رہا ہے مجھے، دل کہہ رہا ہے اب میں نہیں بچنے کی، کیا آخری وقت بھی صورت نہ دکھاؤ گے؟

یہ سطریں پڑھ کر تو وہ ہنس پڑا۔ اسے یاد آگیا کہ یہ خط پڑھ کر دیوانہ وار بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ سب سے پہلے انجمن سے مڈبھیڑ ہوئی، سوال کیا:

مسرت کا کیا حال ہے، کیسی ہے اب وہ؟

انجمن لاعلم بن گئی۔ بالکل انجان سوکھا سا منہ بنا کر بولی: میں تو جانے بکی لیکن سنا ہے، حالت بہت خراب ہے۔ آج جانے والی تھی کہ آپ آگئے۔ میں اب نہیں جاتی، آپ ہی ہو آئیے۔

کتنا غصہ آیا تھا اُسے انجمن کی بے پروائی پر۔ سامان وہیں پٹکا، ماں سے بھی ملاقات نہیں کی اور سیدھا مسرت کے حضور میں پہنچ گیا۔ عیادت کے لئے، دلِ رنجور کو تسکین دینے جان سے زیادہ عزیز ہستی کا حال دیکھنے، اور ضرورت ہو تو اس پر قربان ہونے۔

لیکن وہ بھلی چنگی تھی۔

بخار کیا حرارت کی شکایت بھی نہ تھی۔ نہایت اطمینان سے اپنے کمرے میں بیٹھی

ریڈیوسن رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

آپ ؟ !۔۔۔ آ گئے آپ ! میرا دل کہتا تھا ضرور آئیں گے !

لیکن تم کیسی ہو اب ؟

بالکل اچھی ۔۔۔ جیسے کبھی بیمار ہی نہیں ہوئی تھی ۔

لیکن بیمار کیا تھیں ؟

کچھ بھی تو نہیں ۔۔۔ کتنی حسرت ہے بیمار پڑنے کی ۔ لیکن نہ جانے کمبخت بیماری کو کیا ضد ہے کہ بھولے سے بھی پاس نہیں پھٹکتی ۔

تو تم بیمار نہیں تھیں ۔ ؟

خدا نہ کرے میں کیوں بیمار ہوتی ۔۔

لیکن خط میں تو تم نے لکھا تھا ؟

خط !۔۔۔ ہاں یاد آیا ، لکھا تھا ۔

جھوٹ ۔۔۔ جھوٹ تھا وہ سارا افسانہ !۔۔۔ تم تو واقعی بالکل اچھی ہو !

تو آپ نظر کیوں لگائے دے رہے ہیں ۔ کیا آپ کی مرضی ہے میں بیمار پڑ جاؤں !

یہ کیوں ہوتی میری مرضی ، لیکن اتنا بھیانک ، اتنا ڈراونا ، اتنا لرزہ خیز خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی !

تھی ہی نا ۔۔۔ ایک تو آپ کا امتحان لینا تھا ، دیکھنا تھا میری بیماری کی خبر آپ پر کیا اثر ڈالتی ہے ۔ اور دوسرے ۔۔۔

وہ بھی کہہ ڈالو ، دوسرے کیا ۔۔۔ ؟

دوسرے یہ کہ آپ کو گئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے ، جی چاہتا تھا کہ آپ آئیں ۔

(ہنستے ہوئے) کیا کہنا ہے آپ کے جی کا
کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری!

جان جائے دشمنوں کی ــــ آپ تو اچھے بھلے موجود ہیں یہاں!
تم کیا جانو، وہ خط پڑھ کر کیا حالت ہو گئی میری ــــ کل سے اب تک حرام ہے جو ایک لقمہ بھی منہ میں گیا ہو۔

مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے، اور ضرور فاقہ سے ہوں گے، چنانچہ کھانا تیار ہے، دیکھئے جو میں نے سوچا تھا وہی ہوا۔

پھر کھانا آیا، دونوں نے ساتھ بیٹھ کر ہنسی کے شور اور قہقہوں کے ہجوم میں کھایا۔ وہ مجلس، وہ ملاقات، وہ نہ بھولنے والی ملاقات پوری تفصیل کے ساتھ یاد آ گئی نہ بھولنے کے لئے۔

پھر کئی ورق الٹ ڈالے، ایک اور خط سامنے تھا!

آپ کا خط مل گیا۔ جی تو چاہا جواب نہ دوں، لیکن رحم آ گیا۔
پوچھیے جواب دینے کو جی کیوں چاہا تھا اور رحم کیوں آ گیا؟
جواب دینے کو اس لئے جی نہیں چاہا تھا کہ خفا تھی آپ سے، تازہ تصویر بھیجنے کا کتنے دن سے وعدہ ہو رہا تھا۔ لیکن آپ تو شاید وفا نہ کرنے ہی کے لئے وعدہ کرتے ہیں۔ اس خط میں سب کچھ تھا، غمِ ہجراں کی شکایت، دردِ فراق کی اذیت، نالۂ دل، بوئے گل، دودِ چراغِ محفل، سب کچھ، لیکن تصویر ندارد، اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا پھاڑ کر پھینک دوں آپ کا یہ نامۂ الفت، خاموش رہوں، کسی خط کا جواب نہ دوں، آپ آئیں تو ملنے سے انکار کر دوں۔ پھر سوچا اگر واقعی یہ سب کچھ کر گزری تو آپ جان پر بنا لیں گے۔

وہاں پردیس میں کون تسلی دے گا۔ کون زخمِ دل پر مرہم رکھے گا۔ رحم آ گیا، خط لکھنے بیٹھ گئی۔ لیکن خفا اب تک ہوں، جب تک تصویر نہ آ جائے گی خفا رہوں گی۔ اور یہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ پوز کیسا ہو گا۔

فوراً ہی دوسرا خط نظر کے سامنے آ گیا۔

کل سہ پہر کی ڈاک سے آپ کا خط ملا۔ شکریہ قبول کیجئے تصویر کا!

لیکن یہ تصویر بولتی کیوں نہیں، بڑی دیر تک تنہائی میں اس سے باتیں کرتی رہی۔

لیکن کیا مجال ہے جو اس نے کسی بات کا جواب دیا ہو۔

میں نے بھی انتقام لے لیا۔

فوراً کار میں بیٹھ کر نذر اینڈ سنز فوٹوگرافر کے ہاں پہنچی۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے ایک سیمیں فریم میں قید کر دیا اس تصویر کو، پھر لا کر اپنے بیڈروم کی دیوار پر آویزاں کر دیا اپنے سر کے اوپر۔ اپنے آپ سے قریب، اپنی آنکھوں کے سامنے ــــ اپنے دل سے متصل!

اب بھاگ کر کہاں جائیں گے آپ؟ آپ تو بھاگتے ہی رہتے ہیں مگر یہ تصویر بھاگ کر کہاں جائے گی؟

تصویر بڑی اچھی کھنچی ہے۔ مصور سامنے ہوتا تو کہتی۔ اے مصور تیرے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں۔ جو دیکھتا ہے عش عش کر اٹھتا ہے۔ آج رقیہ، سلمیٰ، خانم، فاخرہ وغیرہ آئی تھیں، ٹکٹکی لگائے اس تصویر کو تکے جا رہی تھیں۔ جی چاہا آنکھیں پھوڑ دوں کمبختوں کی۔

مجھے تو وہم ہونے لگا کہیں نظر نہ لگ جائے۔ خیریت فوراً۔ فوراً سے پیشتر

لکھئے۔ شروع کر دیجئے لکھنا اسی وقت۔

جی منہ دھو رکھئے ۔ میں نہیں بھیجتی تصویر۔ آپ کا دعویٰ تو یہ تھا کہ دل میں میری تصویر بسی ہوئی ہے ۔ جب دل میں بسی ہے پھر اس تقاضے کا مطلب ؟

آخر آپ اتنے مظلوم کیوں نظر آنے لگتے ہیں ۔۔؟

پھر ترس آ گیا، آپ بھی کیا یاد کریں گے ، بھیجے دیتی ہوں ۔ لیکن آپ اسے کمرہ کی زینت نہ بنا لیجئے گا کہ لوگ پوچھتے پھریں یہ کون ہے ؟ اسے بھی دل ہی میں رکھ لیجئے گا۔

خط پڑھ کر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ وہ پھر بڑی دیر تک دریائے فکر میں غرق رہا ۔ بہت سی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں ۔۔ بھولی ہوئی باتیں، بھولی ہوئی کہانیاں بھولے ہوئے افسانے ۔۔ فائل سامنے کھلا رکھا تھا اور وہ دینا کے تصور کی سیر کر رہا تھا بڑی دیر تک اس طرح بیٹھے رہنے کے بعد یک بیک چونک سا پڑا ۔ جلدی جلدی سرسری نظر ڈالتا ہوا آخری خط پر پہنچا اور رک گیا۔

کل خط لکھ چکی ہوں، آج پھر لکھنے بیٹھ گئی ، بتائیے کیوں ؟

ریڈیو پر غزلیں سنائی جا رہی تھیں ، مغنیہ لہک لہک کر غالب کی غزل گا رہی تھی

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میں نے ریڈیو بند کر دیا ، لیکن یہ الفاظ برابر یہ دہ گوش سے ٹکراتے رہے ۔ یہ کس

کی آواز تھی — کیا مغنیہ کی ؟ !

ایک دفعہ یہی غزل اپنے مخصوص انداز میں آپ نے گا کر سنائی تھی مجھے !
آپ کے منہ سے نکلے ہوئے جو بول میرے کانوں میں پڑ چکے ہیں وہ اب کسی اور کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے نہیں لگ سکتے ! خواہ اس کی گلوکاری کتنی ہی مسلّم کیوں نہ ہو گلوکاری کے ساتھ اگر خلوص نہ ہو، سچائی نہ ہو تو وہ صرف فن ہے — اور صرف فن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

آج انجمن آ رہی ہے۔ کم سے کم دو تین دن رکھوں گی اسے اپنے پاس، وہ بھی میرے دل کی مکین بن چکی ہے۔ لیکن اس سے گھبرائی بہت ہوں، آپ کا نام لے کر بہت چھیڑتی ہے۔ ناک میں دم کر دیتی ہے چھیڑ چھیڑ کے۔ کیوں نہ ہو آخر آپ کی بہن ہے !

اقبال کی گفتگو سے، انجمن کی باتوں سے جو اندیشے اُسے دور دراز پیدا ہو گئے تھے وہ دور ہو گئے۔ ان خطوں نے ایک نیا ولولہ، ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ ایک نیا اعتماد پیدا کر دیا۔

وہ سوچنے لگا ان خطوں میں خلوص ہے، سچائی ہے، اس خلوص کو شکست دینا آسان نہیں، اس سچائی کو فتح کرنا ممکن نہیں۔ چچا جان ہوں یا نواب زادے صاحب ! اپنی سی ہر کوشش کر ڈالیں لیکن مسرت کو مجھ سے نہیں چھین سکتے۔

گھڑی پر نظر گئی تو پانچ بج رہے تھے، صبح ہو چکی تھی۔

ارے صبح ہو گئی، رات بیت گئی ! کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیدھا انجمن کے کمرے میں پہنچا، وہ اب تک سو رہی تھی، جل ہی تو گیا اسے سوتا دیکھ کر، فوراً چادر اٹھا کر

ایک طرف پھینک دی ۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی :

کیا بات ہے بھائی جان ، کیا ہوا ؟

اس نے جھلّائے ہوئے لہجے میں جواب دیا :

ہوا ہے تمہارا سر ۔ کب تک سوتی رہو گی ، کچھ خبر ہے صبح ہو چکی ۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور آپ نے مجھے جگایا کیوں ؟

" تو کیا سوتی ہی رہو گی ۔ کچھ یاد ہے کیا وعدہ کیا تھا تم نے ۔ کہیں جانے کا وعدہ کیا تھا ۔ یاد ہے کچھ یا سب بھول بھال گئیں ؟ "

وہ مسکرانے لگی : ہٹئے بھی ، آپ نے ہمیں جگا دیا اتنے سویرے ۔ جاؤں گی کیوں نہیں ۔ مگر کیا ابھی چلی جاؤں ؟

وہ بگڑتا ہوا بولا تو کیا شام کو جانے کا ارادہ ہے ؟

وہ ہنس پڑی ۔ بھائی جان کیا ہو گیا ہے آپ کو ! یہ کون سا جانے کا وقت ہے اس وقت جاؤں بھی تو وہ لوگ کیا سمجھیں گے ، کیا خیال کریں گے ؟ بات وہ کرنی چاہئے جو قرینے کی ہو !

اسلم نے اسی لب و لہجہ میں کہا :

میں تمہارا ادھر نہیں سننا چاہتا ۔ خیریت چاہتی ہو تو سیدھی روانہ ہو جاؤ ، ابھی اسی وقت !

وہ بولی : دس بجے سے پہلے تو میں جانے کی نہیں بھائی جان ۔ اور اگر زیادہ اصرار کریں گے تو پکارتی ہوں امی کو ۔۔۔ امی . . . .

کی آواز تھی ۔ کیا مغنّیہ کی ؟ !

ایک دفعہ یہی غزل اپنے مخصوص انداز میں آپ نے گاکر سنائی تھی مجھے ! آپ کے منہ سے نکلے ہوئے جو بول میرے کانوں میں پڑ چکے ہیں وہ اب کسی اور کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے نہیں لگ سکتے ! خواہ اس کی گلوکاری کتنی ہی مسلّم کیوں نہ ہو گلوکاری کے ساتھ اگر خلوص نہ ہو، سچائی نہ ہو تو وہ صرف فن ہے ـــــ اور صرف فن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ۔

آج انجمن آرہی ہے ۔ کم سے کم دو تین دن رکھوں گی اپنے پاس ، وہ بھی میرے دل کی مکین بن چکی ہے ۔ لیکن اس سے گھبرائی تہبت ہوں ، آپ کا نام لے کر بہت چھیڑتی ہے ۔ ناک میں دم کر دیتی ہے چھیڑ چھیڑ کے ۔ کیوں نہ ہو آخر آپ کی بہن ہے !

اقبال کی گفتگو سے ، انجمن کی باتوں سے جو اندیشہ ہائے دور دراز پیدا ہو گئے تھے وہ دور ہو گئے ۔ ان خطوں نے ایک نیا ولولہ ، ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا ۔ ایک نیا اعتماد پیدا کر دیا ۔

وہ سوچنے لگا ان خطوں میں خلوص ہے ، سچائی ہے ، اس خلوص کو شکست دینا آسان نہیں ، اس سچائی کو فتح کرنا ممکن نہیں ۔ چچا جان ہوں یا نواب زادے صاحب ! اپنی سی ہر کوشش کر ڈالیں لیکن مسرّت کو مجھ سے نہیں چھین سکتے ۔

گھڑی پر نظر گئی تو پانچ بج رہے تھے ، صبح ہو چکی تھی ۔

ارے صبح ہو گئی ، رات بیت گئی ! کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اور سیدھا انجمن کے کمرے میں پہنچا ، وہ اب تک سو رہی تھی ، چل ہی تو گیا اسے سوتا دیکھ کر ، فوراً چادر اٹھا کر

ایک طرف پھینک دی ۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی :

کیا بات ہے بھائی جان ، کیا ہوا ؟

اس نے جھلاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا :

ہوا ہے تمھارا سر ۔ کب تک سوتی رہو گی ، کچھ خبر ہے صبح ہو چکی ۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "اور آپ نے مجھے جگایا کیوں ؟"

"تو کیا سوتی ہی رہو گی ۔ کچھ یاد ہے کیا وعدہ کیا تھا تم نے ۔ کہیں جانے کا وعدہ کیا تھا ۔ یاد ہے کچھ یا سب بھول بھال گئیں ؟"

وہ مسکرانے لگی : ہٹئے بھی ، آپ نے ہمیں جگا دیا اتنے سویرے ۔ جاؤں گی کیوں نہیں ۔ مگر کیا ابھی چلی جاؤں ؟

وہ بگڑتا ہوا بولا تو کیا شام کو جانے کا ارادہ ہے ؟

وہ ہنس پڑی ۔ بھائی جان کیا ہو گیا ہے آپ کو ! یہ کون سا جانے کا وقت ہے اس وقت جاؤں بھی تو وہ لوگ کیا سمجھیں گے ، کیا خیال کریں گے ؟ بات وہ کرنی چاہیئے جو قرینے کی ہو !

اسلم نے اسی لب و لہجہ میں کہا :

میں تمھارا وعظ نہیں سننا چاہتا ۔ خیریت چاہتی ہو تو سیدھی روانہ ہو جاؤ ، ابھی اسی وقت !

وہ بولی : دس بجے سے پہلے تو میں جانے کی نہیں بھائی جان ۔ اور اگر زیادہ اصرار کریں گے تو پکارتی ہوں امی کو ۔۔۔ امی . . . .

انجن کی آواز سنتے ہی نائلہ نے جواب دیا :

بڑا مبارک دن ہے ۔ آج اتنے سویرے اٹھ گئیں، کیا ہے؟

وہ بولی : بھائی جان . . . .

اسلم نے ہلکے سے اس کے ایک چپت لگائی ـــ اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ گیا ۔

(۵)

منصوبے

اقبال منزل میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

اسلم نے جو گفتگو اقبال میاں سے کی تھی وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ سیدھے بیوی کے کمرے میں پہنچے۔ ناہید بیگم، ان کی بیوی بھی تھیں ہمشیر بھی، وزیر بھی اور حاکمِ بالا بھی۔ ساری گفتگو نمک مرچ لگا کر سنا دی۔ اور پھر بڑے تیکھے لہجے میں فرمایا:

اگر یہ سب کچھ ہوا تو کیا ہو گا؟ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اندر ہی اندر معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ میں کہتا ہوں اس مسرت کی بچی کو آخر عشق کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی!

ناہید نے تیکھی نظروں سے میاں کو دیکھا اور بولیں — واہ —!

اقبال میاں نے جلال کے عالم میں فرمایا، اس وقت تمھاری ان اداؤں سے

کام نہیں چلے گا، گلا گھونٹ دوں گا لڑکی کا!

وہ اور زیادہ تیکھے لہجے میں بولیں: ذرا گھونٹ کر تو دیکھو، مجھے بھی تو معلوم ہو کتنا دم ہے تمھارے ہاتھوں میں — !

اقبال میاں یہ تیور دیکھ کر اپنی جگہ قائم نہ رہ سکے، کمزور پڑ گئے، بے بسی کے ساتھ فرمایا:

آخر تمھارا مطلب کیا ہے؟ کیا مسرت نے بیہودگی کی حد نہیں کر دی!

وہ بے پروائی کے ساتھ بولیں: بیہودگی کیسی، بھولی بھالی لڑکی ہے، آ گئی اس چالاک کے دم میں۔ ورنہ خدا انخواستہ کچھ راہ سے بے راہ تو ہے نہیں میری بچی۔ اور یہ جو اس نمک حرام نے کہا ہے کہ عدالت میں بلاؤں گا اور مسرت کا بیان دلواؤں گا تو یہ حسرت بھی پوری کر لے!

"اور اگر وہاں کچھ کا کچھ تمھاری بھولی بھالی لڑکی کے منہ سے نکل گیا تو ان سفید بالوں میں جو آج تک خضاب سے ناآشنا رہے ہیں مفت کی کالک لگ جائے گی!

ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں مسرت کی ماں ہوں، جتنا میں جانتی ہوں اسے تم نہیں جانتے، میری بچی کلنک کا ٹیکہ نہیں ہے، رتن ہے خاندان کا!

"وہ تو ہے، لیکن وہ مبخت خدا غارت کرے اسے، خطوں کا بھی تو ذکر کر رہا تھا وہ — !

"خط! — کیسے خط — !"

"کہہ رہا تھا، مسرت نے مجھے خط لکھے ہیں، بہت سے خط لکھے ہیں، اور ان خطوں میں اظہارِ محبت کیا ہے ——— یہ خط اگر عدالت میں پیش ہوئے تو کیا ہوگا؟

"کیا ہوگا بتاؤ !"

"بدنامی ہوگی، رسوائی ہوگی، ذلّت ہوگی، جگ ہنسائی ہوگی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نواب زادہ سلیم اللہ خاں جو ایک ہی نازک مزاج اور شوریدہ سر واقع ہوئے ہیں اور جو اس وقت شادی کے شوق میں گھر کی دھول لیے جا رہے ہیں، ہتّے سے اکھڑ جائیں گے۔ بدظن ہو جائیں گے، شادی سے انکار کر دیں گے۔"

"میں ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتی۔"

"کیا کہا بیگم! تم ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتیں!"

"ہاں نہیں کرتی۔ کیوں کرلوں؟ میری جوتی کی نوک کرتی ہے پروا۔ یہ لو، اور سنو، غم نہ داری بز بخر!"

"بیگم کیا ہو گیا ہے تمھیں؟"

"ہوا تمھیں ہے، وہ نواب زادہ ہے تو ہم کون سے فقیر ہیں، وہ دولت مند ہے تو ہم کون سے بھک منگے ہیں، سو دفعہ غرض تھی تو آیا، پیام لایا، ناک رگڑی، تب ہم نے منظوری دی، لاکھ دفعہ غرض ہوگی تو سر کے بل آئے گا۔ اور دلہن کو بیاہ لے جائے گا۔ کیا ہم اس کے پاؤں پڑے تھے۔ کیا مسرت کو تم نے اجمن سمجھا ہے کہ بر جڑتا ہی نہیں کسی طرح، بوڑھی ہوئی جا رہی ہیں صاحب زادی، دس ہزار نواب زادے اس گھر پہ سر جھکا کر آئیں گے۔"

"وہ تو آئیں گے، لیکن کیا ایک بدنام لڑکی کے لئے بھی!"

"پھر تم نے مجھے غصّہ دلایا۔"

"ہاں غصّہ تو ہے تمھیں، لیکن بات تو طے کرنی ہے۔"

"بدنام کون لڑکی ہے؟ کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو؟"

"مسرّت کا ــ اگر اس کے خطوط زیرِ بحث آئے، اور اس بدبخت نے کیا نام ہے اس کا، اسلم نے عدالت میں پیش کرائے تو کیا ہوگا؟ کیا تم عدالت کا مُنہ نوچ لوگی؟ کیا تم اسلم کو ختم کر دوگی؟ اور یہ سب کچھ کر بھی لو، تو بھی حلق سے نکلی خلق میں پہنچی۔"

"کیوں ایک ہی بات رٹے جاتے ہو، اوّل تو مسرّت نے کوئی خط نہیں لکھا۔ یعنی کوئی ایسا خط نہیں لکھا جو قابلِ اعتراض ہو۔ بہرحال دونوں میں ایسا رشتہ ہے کہ خط و کتابت جرم نہیں ہو سکتی۔ اور بہ فرضِ محال اس نے محبت بھرے خط لکھے تو بھی وہ عدالت میں نہیں پیش ہو سکتے۔"

"کیسے نہیں پیش ہو سکتے ــ وہ کہہ جو گیا ہے۔"

"اس کی بات تمھارے نزدیک قرآن و حدیث ہوگی۔"

"یعنی اس نے گپ اڑائی، جھوٹ بولا ـــ یا مطلب یہ ہے کہ اس میں اتنی جرأت نہیں کہ برسرِ عام خطوں کا راز فاش کر سکے۔ آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"بھئی میرا سر نہ کھاؤ، ویسے ہی بڑی دیر سے درد ہو رہا ہے۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اسلم جو دھمکی دے گیا ہے اسے سن کر ہمیں چپ نہیں ہو جانا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔"

"لیکن اس کی تصدیق تو ہو کہ مسرّت نے اس نالائق کو خط لکھے ہیں یا نہیں۔ اگر لکھے ہیں تو کس طرح کے؟"

"تو کیا ان خطوں کی نقل لے آؤں مسرّت سے۔ تم کچھ نہ کرو، چپ چاپ بیٹھے رہو۔ بھگت لوں گی سب کچھ!"

(بے یقینی کے لہجے میں) اچھا بھئی یہی سہی، لیکن بات کچھ دل میں بیٹھی نہیں۔ اور ہاں ایک اہم بات تو کہنا بھول ہی گیا۔ نواب علیم اللہ خاں کا اصرار ہے کہ شادی اسی مہینے کی ۲۶ تاریخ کو ہو جائے۔ کیا جواب دوں انھیں؟

"خود تمھاری کیا رائے ہے؟"

"وہی جو تمھاری ہے۔"

"لیکن اتنی جلدی کیوں کر رہے ہیں وہ لوگ؟"

"نواب صاحب کہتے ہیں کہ سلیم اللہ سال بھر کے لئے لندن جا رہا ہے۔ یہ آخری سال ہے اس کی تعلیم کا، اور سال بھر پر شادی کا ملتوی کرنا انھیں منظور نہیں، میرے خیال میں کچھ شکوک ہیں لڑکے کی طرف سے۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ پاؤں میں بیڑی ڈال دیں۔"

"جب یہ طے ہو چکا کہ شادی بہرحال میں کرنی ہے لڑکی کی تو آج ہو یا کل یا سال بھر بعد بات ایک ہی ہے، لیکن ۲۶ تاریخ تو سر پر کھڑی ہے، دن ہی کتنے باقی ہیں ـــــ آج کون تاریخ ہے؟"

"(کیلنڈر پر ایک نظر ڈال کر) آج دس ہے۔"

"گویا صرف پندرہ دن باقی ہیں۔"

"یہی تو کہتا ہوں وقت بہت کم ہے!"

"تو ہمیں کون سی تیاریاں کرنی ہیں۔ خدا کے فضل سے سارا سامان تیار ہے۔ زیور کپڑے، برتن، فرنیچر، کوئی چیز مول لینے نہیں جانا ہے۔ سب کچھ پہلے ہی سے مہیا ہے، جب چاہے کر سکتے ہو!"

"تو پھر ہاں کرلوں ؟"

"کرلو — دعوت نامے جاری کردو — میں تو کہتی ہوں شادی کا جلدی ہو جانا اس لئے بھی مفید ہے کہ پھر یہ طوفان خود بخود سرد پڑ جائے گا! اسلم نے جو بکواس لگا رکھی ہے جب دیکھے گا کہ شادی ہوگئی تو ہار جھک مار کر خاموش ہونا پڑے گا اُسے!"

"ہاں — دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاموش ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ چیخ چیخ کر ساری دُنیا سر پر اٹھالے۔ بہرحال اب تو یہ معاملہ قسمت کے حوالہ ہے، جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا، اللہ خیریت رکھے۔ میں کسی چیز سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا بدنامی سے ڈرتا ہوں۔ اور بدنامی بھی کیسی، لڑکی کے معاملے میں — بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے یہ بھی!"

"بھئی وہم کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں، جب میں مطمئن ہوں تو تم کیوں اتنے ہراساں ہوئے جا رہے ہو؟"

"اس کی وجہ تو یہ ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں نکلتیں اور میں سارا دن گھر سے باہر رہتا ہوں، تم تک دوسروں کی چیخ بھی نہیں پہنچ سکتی، میرے کانوں تک دوسروں کی سرگوشی بھی پہنچ جاتی ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی کام سے مسرت آگئی، ناہید نے ہلکے سے ٹہوکا لگایا اور آہستہ سے کہا: لڑکی آ رہی ہے چپ رہو بلکہ باہر چلے جاؤ۔

نہایت سعادت مندی کے ساتھ اقبال میاں نے اس فرمائش کی تعمیل کی، چپ چاپ باہر چلے گئے!

بکت پور

(۶)

رُوبرو

انجمن واپس آئی۔ اس کے ساتھ مسرّت بھی تھی۔ مسرّت کو دیکھ کر نائلہ کی باچھیں کھل گئیں، وہ اپنی بچّی پر صدقے اور قربان ہونے لگیں۔ انجمن اسے وہیں چھوڑ کر بھاگم بھاگ ہانپتی کانپتی اوپر پہنچی، اسلم سے کہا:

مسرّت آئی ہے!

اسلم چونک پڑا، مسرت آئی ہے؟ کہاں؟ کہاں ہے وہ؟!

انجمن نے جواب دیا: امّی کے پاس بیٹھی ہے، ابھی آپ کے پاس آئے گی، وہ خود بھی آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔

اسلم کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ جوش کے عالم میں کہنے لگا:

مسرّت آ گئی۔ اب میری ہر مشکل رفع ہو جائے گی۔ سارے معاملات طے پا جائیں گے۔ لیکن انجمن وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے، اُسے یہاں بھیجو، یہاں لے کر آؤ، میں

اس سے بات کرنا چاہتا ہوں، اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے ۔۔۔ تم کھڑی میرا منہ کیوں تک رہی ہو؟

انجمن واقعی رحم اور ترس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں اور واپس جانے کے لئے مڑی۔ جاتے جاتے اس نے کہا:

ابھی بھیجتی ہوں مسرت کو، آپ یہیں بیٹھے رہیئے۔

انجمن جب سیڑھیاں اتر رہی تھی تو اس کے کانوں میں آواز آئی ۔۔۔:

انجمن جلدی جاؤ، بہت جلد مسرت کو لے کر آؤ، فوراً ۔۔۔ فوراً سے بھی پیشتر!

نیچے پہنچی تو مسرت کو نائلہ کی خاطر داری میں مصروف پایا، وہ چاۓ تیار کر رہی تھیں۔ انجمن ان کے پاس جا کر ہاتھ بٹانے کے لئے بیٹھ گئی۔ اور اشارہ سے مسرت کو اوپر کا راستہ دکھا دیا، جہاں آلم سراپا انتظار اور اشتیاق بنا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

مسرت خود ہی اس تکلف اور تپاک سے پریشان نظر آ رہی تھی لیکن گلو خلاصی کی کوئی صورت نہ تھی۔ انجمن کا اشارہ پا کر چپکے سے اٹھی، اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چاۓ تیار کر کے نائلہ نے نظر اٹھائی تو مسرت ندارد، حیران ہو کر بیٹی سے سوال کیا:

ارے مسرت کہاں چلی گئی!

انجمن نے بے پروائی کے ساتھ اپنی مصروفیت برقرار رکھتے ہوئے کہا:

شاید اوپر گئی ہوگی میرے کمرے میں۔ میں چاۓ وہیں جا کر دے آتی ہوں۔

بات نائلہ کی سمجھ میں آ گئی، پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ انجمن نے چاۓ اور اس کے لوازمات ایک ٹرے میں رکھے اور یہ سب چیزیں لے کر اوپر پہنچ گئی۔ لیکن وہاں بیٹھی نہیں اور فوراً نیچے چلی آئی۔ شاید یہ دونوں بھی اس کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔

اُسے نہ اسلم نے ہی روکا نہ مسرّت نے ٹوکا۔ حالانکہ اس سے پہلے ایسا ممکن نہ تھا کہ انجمن شریکِ محفل نہ کی جائے۔

مسرت نے چائے بنائی اور پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: لیجئے۔

اسلم نے پیالی اور اپنی طرف سرکائی، پھر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا:

مسرت! تم آگئیں؟

وہ دوپٹے کا آنچل انگلیوں سے مروڑتی ہوئی بولی:

میں آپ کے پاس ایک التجا لے کر آئی ہوں۔

اسلم نے حیرت سے اُسے دیکھا اور گویا ہوا:

التجا! ـــ یہ کیا کہہ رہی ہو تم بھلا کوئی بات تمھارے منہ سے نکلے اور پوری نہ ہو! تم کوئی بات کہو اور میں نہ مانوں؟ تمھاری کوئی مرضی ہو اور میں پوری نہ کروں کہہ کر تو دیکھا ہوتا، بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

جواب میں مسرّت نے کچھ نہیں کہا، اس نے دیوار پر نظریں گاڑ رکھی تھیں۔ جہاں اس کی ایک شاندار، دیدہ زیب اور سحر طراز تصویر آویزاں تھی۔ لیکن اس کی نظریں صرف دیوار کو دیکھ رہی تھیں تصویر کو نہیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اسلم پریشان ہوگیا، اس نے کہا:

تمھیں کیا ہوگیا ہے مسرّت! جو کچھ کہنا ہے کہتیں کیوں نہیں۔

وہ کچھ توقف کے بعد بولی:

کل ابّا جان سے آپ کی بات چیت ہوئی تھی کچھ؟

اسلم نے جوش و خروش کے ساتھ کہا:

ہاں ہوئی تھی، وہ تمھیں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں، وہ کسی دوسرے کو تمھاری قسمت کا، تمھاری زندگی کا مالک بنا دینا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ سے روپے کے لوبھی ہیں۔ وہ نواب علیم کے صاحبزادے سلیم اللہ خاں کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ نواب زادہ ہے، اس لئے کہ وہ دولت مند ہے، اس لئے کہ اس کے پاس موٹر ہے، وہ اسلم کو پسند نہیں کرتے اس لیئے کہ وہ فقیر زادہ ہے، اس لیئے کہ وہ مفلوک الحال ہے، اس لئے کہ پیدل چلتے چلتے اس کے پاؤں تھک جاتے ہیں مگر وہ بائیسکل تک کا بندوبست نہیں کرسکتا۔

مسرت سنتی ہو، مسرت میں تمھاری یہ توہین برداشت نہ کرسکا، میں محبت کی توہین نہ برداشت کرسکا۔

میں نے خوردی اور بزرگی کو بالائے طاق رکھ کر صاف صاف کہہ دیا مسرت میری ہے، میری رہے گی اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

وہ خفا ہوئے، بگڑے، گالیاں دیں، برا بھلا کہا، لیکن میں نے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ بہتر یہی ہے ہمارے راستے میں پتھر بن کر حائل نہ ہوں، اور اگر اپنی ضد پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

مسرت تم بولتیں کیوں نہیں، خاموش کیوں ہو؟ بتاؤ میں نے ٹھیک کہا نا؟ کیا اس کے سوا کچھ اور بھی میرے منہ سے نکل سکتا تھا۔؟

چچا جان کے پاس سے واپس آکر میری عجیب حالت ہوگئی۔ کن الفاظ میں بتاؤں کیا حالت تھی۔

محبّت کرنے والے کا دل بہت کمزور ہوتا ہے۔ میرا کمزور دل طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں سے لرزنے لگا۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم عہدِ وفا بھول گئی ہو، تم نے پیمانِ محبّت فراموش کر دیا ہو، تمھاری نظر میں میری کوئی حیثیت نہ رہ گئی ہو۔ خود تم نے سوچا ہو کہ ایک غریب شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنا شیوۂ دانش نہیں ہے۔

یہ خیالات پریشان کرتے رہے، میں کروٹیں بدلتا رہا۔ بیقراری، اضطراب اور بے چینی کا عجیب عالم تھا۔

یکایک مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آئی،

میں اٹھ بیٹھا، وہ فائل اٹھا لایا جس میں تمھارے نامہائے محبّت محفوظ تھے۔ میں نے ان خطوں کو پڑھنا شروع کیا، ایک ایک خط پڑھ ڈالا، کچھ ایسے خط بھی تھے جنھیں بار بار پڑھا، نیا لطف پایا۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد اپنی بدگمانی پر شرم آنے لگی۔ جن ہاتھوں سے یہ خط لکھے گئے تھے انھیں چوم لینے کا جی چاہا۔ میرے ہر اندیشہ کا ہر وسوسہ کا ہر خطرہ کا جواب ان خطوں میں موجود ہے۔ محبّت سے بھرے ہوئے یہ خط کیا کہوں کتنی بڑی نعمت ثابت ہوئے۔ اگر یہ فائل نہ مل جاتا اور ان خطوں کو میں نے نہ پڑھا ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا، دیوانہ ہو جاتا گریبان پھاڑ کر کہیں نکل جاتا۔

مسرت نہایت خاموشی سے بیٹھی اسلم کی یہ والہانہ اور پرجوش تقریر سن رہی تھی۔ اب وہ بولی :

کیا میرے تمام خطوط موجود اور محفوظ ہیں آپ کے پاس ؟

اسلم نے فخر اور نشاط کے عالم میں کہا :

ہاں ایک ایک، کیا دیکھو گی ــــ دکھاؤں؟

وہ بولی : دکھائیے، دیکھوں گی تو سہی !

اسلم لپک کر اٹھا لایا اور وہ فائل مسرت کے سامنے ڈال دیا مسرت نے ایک سرسری نظر ان خطوں پر ڈالی اور پھر فائل اپنے پہلو میں رکھتے ہوئے بولی :

میری التجا یہی تو تھی۔ کیا یہ خطوط آپ مجھے دے دیں گے؟

اسلم نے خوش ہو کر جواب دیا : لے لو تمھاری چیز ہے، اگر جواب میں اپنے خطوط میں مانگ بیٹھوں تو کیا کرو گی؟

مسرت نے ایک بنڈل پرس سے نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ :

میں خود لیتی آئی تھی، یہ ہیں آپ کے سارے خط !

اسلم پر بجلی گر پڑی، یہ تو کچھ اور ہی بات نکلی، چند سکنڈ تک تو اس سے بولا بھی نہ گیا پھر اس نے حواس مجتمع کئے اور اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا :

لیکن کیوں؟ ــــ کیوں اپنے خط واپس لے رہی ہو اور کیوں میرے خط واپس دے رہی ہو؟

آنکھیں چار کئے بغیر وہ بولی :

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں بھلا دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ ان خطوں کے تبادلے کے بعد بہت سی باتیں آسانی سے بھلائی جا سکتی ہیں، جن کا یاد رکھنا نہ ضروری ہے نہ مناسب!

اسلم نے بے تابی اور بے بسی کے ساتھ کہا : آج تم کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہو کیا یہ

سچ ہے؟

وہ بولی: زندگی نام ہی ہے تغیر اور تبدیلی کا ۔۔ ہم جو کچھ کل تھے وہ آج نہیں ہیں، جو آج ہیں وہ کل نہیں ہوں گے!

اسلم نے اپیل، فریاد اور التجا کے لہجے میں کہا:

لیکن مسرت اس دُنیا میں ایک چیز ہے جو کبھی نہیں بدلتی وہ ہے محبت ہم بچہ تھیں جوان ہوئیں، بوڑھی ہوگی، یہ ساری تبدیلیاں تمھارا جسم قبول کرے گا لیکن کیا محبت بھی ___

قطع کلام کرتی ہوئی وہ گویا ہوئی:

ایک چیز محبت سے بھی اونچی ہے ___ فرض ___ محبت فرض پر قربان کی جا سکتی ہے!

صورتِ احوال اب اسلم کی سمجھ میں آتی جارہی تھی ۔ اس نے کہا تو تم ___ تو تم نے محبت قربان کردی فرض پر، لیکن وہ کیسا فرض ہے جو محبت کی قربانی مانگ رہا ہے ______ ؟!

اس نے جواب دیا: والدین کی اطاعت ___ میں اپنے باپ سے سرتابی نہیں کرسکتی، میں اپنی ماں کی نافرمانی نہیں کرسکتی۔ والدین کی اطاعت فرض ہے اور اس فرض کو انجام دینے کے لئے میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کرسکتی ___ اپنی ہر خواہش ہر آرزو ہر تمنا قربان کرسکتی ہوں ان کی خوشی پر، انھیں خوش رکھنے اور خوش دیکھنے کے لیئے۔

اسلم نے یاد دلایا: لیکن ان خطوں میں تم نے کئی مرتبہ لکھا تھا کہ ___

بے پروائی سے بولی: لکھا ہوگا۔ لیکن غلط لکھا تھا۔

اسلم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، اس نے کہا:

میں سمجھ گیا — مسرّت میں سمجھ گیا۔

اتنی دیر میں پہلی مرتبہ تیوری چڑھاکر مسرت نے ایک نگاہِ غلط انداز اسلم پر ڈالی پھر کہنے لگی: کیا سمجھ لیا آپ نے — کوئی نیا انکشاف! ؟

اسلم نے سنبھلتے ہوئے کہا: شاید تم مجھ سے محبّت نہیں کرتی تھیں، شاید تم اب تک ایک کھیل کھیل رہی تھیں، اور اب اس سے جی اکتا گیا۔ جس کھلونے کو اتنے دن تک سر چڑھایا تھا وہ جی سے اتر گیا۔ اب وہ اس قابل ہے کہ توڑ دیا جائے، توڑ دیا جائے ٹھکرا دیا جائے — کیوں مسرّت یہی بات ہے نا؟

مسرّت نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ اسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

بہرحال اگر ایسا ہے تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، تم پہلے بھی اچھی تھیں اب بھی اچھی ہو ہمیشہ اچھی رہوگی، میں پہلے بھی بُرا تھا، اب بھی بُرا ہوں اور ہمیشہ ایسا ہی رہوں گا۔ تم تم ہو!

مسرّت اپنے آنچل سے کھیلتی ہوئی بولی:

باتیں بنانا تو آپ کو ہمیشہ سے بہت آتی ہیں، اس فن میں کون آپ کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

اسلم نے ہار مانتے ہوئے کہا: تم سے مقابلہ کرنے کی ہمّت کہاں سے لا سکتا ہوں بات صرف اتنی سی ہے!

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے

میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

بہرحال شکر گزار ہوں کہ آج حقیقت معلوم ہوگئی۔ یہ معلوم ہوگیا کہ غلط فہمی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے!

پھر تیوری چڑھا کر اس نے سوال کیا: غلط فہمی کیسی؟

جواب میں اس نے کہا:

یہ غلط فہمی ہی تو تھی کہ اب تک اس خیالِ خام میں مبتلا رہا کہ تم بھی محبّت کرتی ہو مجھ سے! کیا یہ غلط فہمی نہیں تھی کہ تمہاری محبت پر مجھے اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا ایک مردِ مومن کو خدا پر ہوتا ہے۔ لیکن ایک ملاقات میں چند لمحوں کے اندر وہ غلط فہمی تم نے رفع کردی، کتنی آسانی سے۔ محبّت جبر کا سودا نہیں، یہ خط شوق سے لے جا سکتی ہو۔ اور جو کچھ ان میں ہے وہ دل ہی میں رہے گا زبان تک کبھی نہیں آئے گا!

مسرّت بدستور خاموش بیٹھی رہی۔ جیسے جانا چاہ رہی ہو لیکن اذنِ رخصت طلب کرنے کا یارا نہ ہو۔ اسلم نے یہ کیفیت بھانپ لی، اس نے کہا:

یہاں بیٹھنا تم پر بار ہو رہا ہے، اگر چاہو تو جا سکتی ہو۔

لیکن مسرّت بدستور بیٹھی رہی۔ اس نے کہا:

کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں، اگر آپ اجازت دیں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔

اسلم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

اسلم اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ایک سوالی کسی امیر و الاتبار کی طرف دیکھتا ہو جس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہو، حالات کا رُخ بدل سکتا ہو۔

واقعات کے دھارے میں تبدیلی پیدا کرسکتا ہو۔

وہ خاموش تھا۔ لیکن سوچ رہا تھا جن آنکھوں سے مہر و محبت کی لہریں اٹھا کرتی تھیں آج اُن سے قہر و جلال کی بجلیاں کیوں برس رہی ہیں ؟ جس منہ سے پھول جھڑا کرتے تھے آج اس سے شرارے اور انگارے کیوں برس رہے ہیں اور اب اس ستمگر کے دل میں کیا ہے ؟ کیا کچھ کہنا چاہتی ہے یہ ؟ کیا ابھی کچھ اور باقی ہے ؟ ابھی کچھ اور بھی سننا ہے ؟ یہی بات تھی تو :

دل بھی یارب کئی دیے ہوتے !

---

(۷)

داستان رواں ہوا

کئی منٹ مسرت خاموش بیٹھی رہی ۔ اسلم نے بھی گفتگو میں پیش قدمی نہیں کی ۔ دونوں کے سامنے چائے رکھی تھی ۔ اور ٹھنڈی ہو چکی تھی ۔ اسلم کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی ۔ آخر مسرت نے مہر سکوت توڑی ۔ اس نے پوچھا :

کیا آپ مجھے بھول نہیں سکے ؟

اسلم نے بڑی مشکل سے تاب گویائی پیدا کی ۔ اس نے کہا :

نہیں مسرت ! میں تمہیں نہیں بھول سکتا ۔ زندگی کے آخری سانس تک نہیں ۔

"لیکن ـــــ میں جو کہتی ہوں بھول جائیے ۔ مجھے بھول جائیے اور ساتھ ہی تمام پچھلی باتیں بھی بھول جائیے ۔"

"ایسی باتیں کیوں کہتی ہو جو ہو نہیں سکتیں ۔ تم نے مجھ سے خطوط واپس لے لئے ، میں نے کوئی عذر نہیں کیا ، وہ پونجی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی بے چون و چرا حوالے

کردی ۔ تمھاری گفتگو سے اندازہ ہوا کہ تم مجھ سے محبّت نہیں کرتی تھیں یا اگر کرتی تھیں تو اب نہیں کرتی ہو۔ میں نے کوئی شکایت نہیں کی، شکوہ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلو۔ اس لئے کہ جانتا ہوں محبت کا سودا نہ مروّت سے ہوتا ہے نہ دباؤ سے۔ اگر تم محبّت نہیں کرتیں تو کس طرح تمھارے دل میں محبت پیدا کرسکتا ہوں، لیکن اب ایسی بات کہہ رہی ہو جو میرے بس سے باہر ہے۔ چاہتی ہو میں تمھیں بھول جاؤں لیکن جب تک دماغ کام کر رہا ہے یہ ناممکن ہے۔ ہاں ایک بات ہوسکتی ہے :

اشتیاق کے ساتھ مسرّت نے سوال کیا : کونسی بات ہوسکتی ہے ؟

اسلم نے جواب دیا : یہ کہ تم بھول جاؤ مجھے۔ لیکن یہ میں کیوں کہہ رہا ہوں۔ تم تو بھول بھی چکیں۔

مسرّت بولی : اور اگر آپ واقعی محبّت کرتے ہیں تو کیا محبّت منتقم بھی ہوتی ہے۔

اسلم نے کہا : ہرگز نہیں۔ محبّت اور انتقام ! دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ محبّت نام ہے سپردگی کا۔ انتقام نام ہے طلب اور تقاضے میں ناکامی کے بعد بدلہ لینے کا۔ کیا یہ دونوں چیزیں ایک ہوسکتی ہیں ؟

نہیں ہوسکتیں۔ مسرّت نے کہا : لیکن آپ تو انتقام لینے پر تلے ہوئے ہیں۔

ہیں ؟ ! اسلم نے سوال کیا۔ یہ تم سے کس نے کہا۔

ابّا کہہ رہے تھے۔ مسرّت نے بتایا کہ آپ عدالت میں جانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ حکم امتناعی حاصل کرنے کا اعلان کر رہے ہیں، میرے خطوں کا راز فاش کرنے کا تہیّہ کئے ہوئے ہیں۔ میری زندگی، میرے مستقبل، میری راحت ہر چیز کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ؟

"ہاں میں نے اس طرح کی باتیں کہی تھیں" اسلم نے اقرار کیا لیکن اس اعتماد پر کہ تم میرے ساتھ ہو، تمھارا التعاون مجھے حاصل ہے، تم مجھ سے محبّت کرتی ہو، لیکن اب، کہ یہ باتیں حرفِ غلط ثابت ہو چکی ہیں میری غلط فہمی رفع ہو چکی ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کسی طرح کا ۔۔ یوں سمجھ لو تمھارا فیصلہ سننے کے بعد میں نے اپنے تمام الفاظ واپس لے لئے ۔۔ !

"آپ کی ان باتوں کی سن گن ان لوگوں (نئی سسرال) کو بھی لگ چکی ہے" مسرّت نے بتایا، "اور وہ لوگ ٹوہ میں لگے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ میرا خیال تو ایسا ہے کہ کوئی نہ کوئی آپ سے مل کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرے گا، نہ جانے آپ کیا جواب دیں گے، جو کچھ بھی آپ کا جواب ہوگا وہ میری عزّت، ناموس اور آبرو کا فیصلہ کردے گا۔ کیا آپ مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہیں؟"

یہ کہتے کہتے مسرّت کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں اور پھر وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اسلم بیتابی اور بیقراری کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس نے کہا:

"خدا کے لئے مجھے جھوٹا نہ سمجھو، مجھ پر اعتماد کرو۔ میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرسکتا جو تمھاری زندگی پر اثر انداز ہو، میں یہاں دو مہینے قیام کے ارادہ سے آیا تھا لیکن اب کل ہی چلا جاؤں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، تم اطمینان سے اپنی زندگی کا نیا دَور شروع کرو۔ میری دلی دعائیں تمھارے ساتھ ہیں"

⁂

ان دونوں کو باتیں کرتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اب انجمن سے ضبط نہ ہوسکا، وہ آگئی

اسے یقین تھا اس طویل ملاقات اور مفصّل گفت گو نے تمام معاملات خوبی اور خوش اسلوبی سے طے کر دئیے ہوں گے، وہ آئی اور پیکر نشاط و انبساط بن کر آئی، اس نے دونوں کو ایک ساتھ چھیڑتے ہوئے کہا:

کون سی داستانِ طلسم ہوشربا بیان ہو رہی ہے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ آخر کب تک الگ تھلگ بیٹھی رہوں؟

اسلم نے شفقت بھرے لہجے میں کہا: تو تمھیں کس نے منع کیا تھا آنے سے۔ اس سے پہلے تو اجازت لے کر تم ہماری مجلس میں کبھی نہیں بیٹھیں۔ آج ہی اس تکلّف کی کیا ضرورت تھی؟

وہ ہنسنے لگی ― تھی ― نہ ہوتی تو!

یکایک اس کی نظر چائے کی پیالیوں پر پڑی، جن میں چائے اب تک رکھی ہوئی تھی۔ اور کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا:

ارے ― آپ لوگوں نے چائے بھی نہیں پی۔

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: اتنی محویت، اتنا استغراق۔ اچھا ٹھہرئیے، میں ابھی دوسری بنا کر لاتی ہوں چٹکی بجاتے ہیں!

مسرّت نے روکا: نہیں انجمن اب چائے کا وقت نہیں ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہے امّی منتظر ہوں گی، میں ایک گھنٹہ کو کہہ کر آئی تھی۔ (کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے) اور دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔

انجمن چلی گئی: واہ تو چائے کے تیار ہونے میں کتنی دیر لگ جائے گی، اپنی غرض سے دو گھنٹے گزار دو تو کوئی بات نہیں۔ اور ہمارے کہنے سے دس منٹ بھی گزارنا دوبھر ہے

یہ کہہ کر پھر اس نے جانا چاہا۔ لیکن اس مرتبہ اسلم نے روک دیا۔
واقعی بہت دیر ہو چکی ہے اب انھیں جانا ہی چاہیئے، خود تمھارا جی چاہ رہا ہو تو ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہاں پی لینا خوب جی بھر کے!
مسرّت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاں آؤ چلیں۔
انجمن اٹھ گئی ــ جی معاف کیجئے۔ اس وقت تو میں جانے سے رہی پھر آجاؤں گی کسی دن!
مسرت نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ پرس اٹھایا اور چل پڑی۔ انجمن ساتھ ساتھ نیچے اتری اور اسے موٹر میں سوار کرانے دروازہ تک چلی گئی۔ جب وہ کار میں بیٹھ گئی تو اس نے ایک لفافہ انجمن کی طرف بڑھایا اور کہنے لگی:
ارے یہ تو میں بھول ہی گئی، آپاجان نے دیا ہے۔ لو، دے دیا!
انجمن نے لفافہ لے لیا۔ پتہ کی جگہ اسلم کا نام لکھا تھا۔ نام پڑھ کر دریافت کیا:
خوش ہو گئے چچا میاں ہیّا کی جانب سے!
وہ بولی: بڑے کہیں چھوٹوں سے مستقل طور پر خفا ہوتے ہیں!
انجمن نے سوال کیا: اس لفافہ میں کوئی خوش خبری تو بند نہیں ہے!
وہ کہنے لگی: مجھے تو جیسا ملا ویسا تمھارے حوالے کر دیا، اس میں کیا ہے اور کیا نہیں، یہ تو پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوگا!
مسرت کو رخصت کر کے انجمن پھر اوپر دھم دھم کرتی جلدی سے پہنچی۔ اسلم دونوں ہاتھوں پر سر ٹیکے عالمِ تفکر میں بیٹھا تھا، لیکن اس نے اس کیفیت کو محسوس کیا نہ دیکھا۔ لفافہ اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی:

بھائی جان ــ بھائی جان ! منہ میٹھا کرائیے تو ایک بڑی اچھی سی خبر ہم بھی دیں آپ کو !

اسلم نے چونک کر انجمن کی طرف، پھر لفافے کی طرف دیکھا، اور پوچھا : کیا ہے یہ، کس کا خط ہے ؟

وہ مسکراتی ہوئی بولی : چچا میاں کا ــ پڑھنا ہے تو،

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اسلم نے لفافہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی : بڑے بہادر !

پھر نائلہ کی آواز سن کر نیچے چلی گئی۔ اسلم نے خط پڑھنا شروع کیا :

"اسلم بیٹے !

تمھارا خیال ہوگا میں تم سے خفا ہوں۔ لیکن کوئی کٹھور شخص بھی اپنے لختِ جگر سے خفا نہیں ہو سکتا۔ بے شک تم نے تند اور تلخ لہجے میں باتیں کی تھیں، لیکن چھوٹوں سے اس طرح کی گستاخی ہو ہی جاتی ہے۔ اور بڑے درگزر سے کام لیتے ہی ہیں۔ یہ نہ ہو تو نظامِ عالم قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک عرصے سے میں سوچ رہا ہوں کہ آخر تم لندن تکمیلِ تعلیم کے لئے کیوں نہیں جاتے ؟ بہت سے نالائق جاتے ہیں اور لائق بن کر آتے ہیں۔ تم سا لائق نوجوان اگر جائے گا تو لائق تر بن کر آئے گا۔

میرا فیصلہ، بلکہ اگر مانو تو حکم یہ ہے کہ اپنی صلاحیّت کو اجاگر کرنے کے لئے ضرور دو تین سال کے لئے لندن ہو آؤ۔ سوال اخراجات کا ہے۔ اور

بظاہر تم موجودہ حالات میں اتنی رقم کا اہتمام نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا میں مر گیا ہوں۔ افضال آج زندہ ہوتا اور اس کے پاس روپیہ ہوتا تو کیا تم اس سے نہ لیتے، کیا افضال میرا بھائی نہیں تھا۔ کیا تم افضال کے بیٹے نہیں ہو؟ کیا مجھ میں اور افضال میں کچھ فرق ہے؟ میں نے اس مد میں چھ ہزار روپے الگ کر دئے ہیں۔ جب چاہو لے سکتے ہو اور اپنے کام میں لا سکتے ہو۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتا۔

اس مہینے کی ۲۶ تاریخ کو تمھاری بہن مسرت کی شادی نواب زادہ سلیم اللہ خاں سے ہو رہی ہے، یہ خط دعوت نامہ بھی ہے۔ امید ہے تم، انجمن، نائلہ سب ہی کئی دن پہلے سے آجاؤ گے۔ انجم میں احساس ذمہ داری آج تک نہیں ہوا، تمھاری چچی اکثر بیمار رہتی ہیں اور اختلاج کی پرانی مریض ہیں، کتنا اچھا ہو اگر باہر کا انتظام تم اور اندر کا انجمن اور نائلہ سنبھال لیں!"

خط پڑھ کر اسلم کا خون کھولنے لگا۔ اس نے خط چاک کیا اور اس کے ٹکڑے فضا میں اڑا دیئے۔ اور عین اسی وقت انجمن واپس آگئی۔ اس نے جو چچا میاں کے خط کی یہ گت دیکھی تو تلے کا سانس تلے اور اوپر کا اوپر، کانپتی ہوئی آواز میں اس کے منہ سے صرف "بھائی جان" کا لفظ نکل سکا، لیکن اسلم اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا، اس نے کوٹ پہنا اور باہر جانے لگا، انجمن سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

بھائی جان ـــــ بھائی جان! یہ آپ کا کیا حال ہو رہا ہے اس وقت!

وہ اسے راستے سے ہٹاتا ہوا بولا:

پاگل ہوگیا ہوں ! ـــــــــ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے !

انجمن سہم کر پیچھے ہٹ گئی !

انجمن حیران و مضطر کھڑی تھی ۔ اس کی نظر کے سامنے اسلم پیکرِ قہر و جلال بنا باہر نکلا چلا گیا، وہ روک نہ سکی ۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ پُرزے ، وہ خط کے ٹکڑے جنھیں پاؤں تلے روندتا ہوا اسلم چلا گیا تھا ۔ وہ چننے لگی کہ شاید کچھ سُراغ مل سکے ۔ لیکن پُرزے جمع تو ہو گئے مرتّب نہ ہو سکے !

---

(۸)

کاغذ کی دھجیاں

اسلم تیزی سے باہر نکلا اور سیدھا اقبال منزل پہنچا ۔ اقبال میاں باہر ہی بیٹھے تھے ۔ اسے دیکھ کر سرو قد تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے ۔

آؤ بیٹے آؤ ـــ میرا خط مل گیا تھا تمھیں ؟

اسلم نے اپنی کیفیتِ نہاں کا ذرا بھی اظہار کئے بغیر سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

جی ہاں مل گیا تھا !

اقبال میاں خوش ہو گئے لیکن ردّ عمل معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے اُنھوں نے اپنی دانست میں بہت بڑی رشوت پیش کی تھی۔ ان کا خیال تھا یہ دار کامیاب ہو کر رہے گا ، اسلم نے جو کچھ کہا اس سے اس کے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی ، وہ بولا :

جی ہاں مل گیا تھا۔ اور میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں ۔

اقبال میاں خوردی اور بزرگی کا رشتہ ذرا دیر کے لئے بھول کر بے تکلفی پر آ گئے

کہنے لگے ۔ ہمارے ساتھ شاعری کرو گے ؟ ہمارا شکریہ ادا کرنے آئے ہو۔ لگاؤں ایک چپت !

اسلم نے اسی لب و لہجے میں کہا : آپ نے اتنی بڑی رقم کا میرے لئے انتظام کر کے کیا میرے شاندار مستقبل کی تعمیر نہیں کر دی ؟

اقبال میاں نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا :

تو کیا ہوا ! تمھارا مستقبل بنے گا تو اس میں ہمارا حصہ نہیں ہو گا ___ اچھا یہ رسمی باتیں چھوڑو ، کب جا رہے ہو ؟

اسلم بھی اس وقت انھیں زچ کرنے پر تُلا ہوا تھا ، کہنے لگا :

ارادہ تو یہ تھا کہ کل ہی روانہ ہو جاؤں ، لیکن آپ نے انتظام کی رَٹ لگا دی ہے ۔ اب تو ۲۶ کے بعد ہی جا سکوں گا ۔

اقبال میاں ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلم شادی کی تقریب میں شریک ہو ، انھوں نے تو صرف ٹٹولنے کے لئے کہہ دیا تھا کہ اس کے تاثرات معلوم کریں ، یہ دیکھ کر کہ کمبخت شادی تک رُکا جاتا ہے ، گھبرا گئے ، فرمایا :

وہ تو ٹھیک ہے ، لیکن شادی کی شرکت یہ تو رسمی چیز ہے ۔ رہا انتظام ! تو بیشک تم کرو تو خوب ہو گا ۔ لیکن بہرحال بسم اللہ پشم تمھارے بغیر بھی ہو جائے گا ۔ اگر پروگرام چلے جانے کا ہے تو جب چاہو چلے جاؤ ۔ جس قدر جلد ممکن ہو چلے جاؤ ۔

اسلم نے کہا : پھر تو کل ہی چلا جاؤں گا ! وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ ! جس قدر جلد جاؤں گا اسی قدر جلد واپسی ہو گی ۔

خوش ہو گئے ۔ باچھیں کھل گئیں اقبال میاں کی ، بزرگانہ لہجے میں شدید اصرار

کرتے ہوئے فرمایا :

میں تو کہتا ہوں کل کے جاتے آج چلے جاؤ، بلکہ ابھی چلے جاؤ۔

آج اور ابھی چلا جانا کس طرح ممکن ہے ؟ اب تو بینک کا وقت بھی نہیں رہا۔ کل کا چیک دیں گے آپ، اسے کیش کرا کے ہی جاؤں گا!

اقبال میاں نے ایک نہایت صحت مند اور توانا قہقہہ لگایا، کیسی باتیں کرتے ہو بینک کس کا اور چیک کیسا؟ کیا نقد روپیہ نہیں ہے میرے پاس ؟ ابھی چاہو تو ابھی لے لو، نقدا نقد!

اسلم نے آمادگی اور اطمینان کے ساتھ کہا : ایسا ہو سکے تو کیا کہنا!

اقبال میاں فوراً اٹھے اور تجوری کھول کر چھ ہزار کے سو سو والے نوٹ سامنے لاکر ڈھیر کر دیے ۔ لو یہ لو!

اسلم ایک بھکاری کی طرح ان نوٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ اقبال میاں اس کی یہ کیفیت دیکھ اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس نے سارے نوٹ لے لئے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا :

یہ نوٹ، چھ ہزار کے نوٹ، اتنی بڑی رقم!

پھر وہ نوٹ لئے لئے اس نے اقبال کی طرف دیکھا، اقبال نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا :

ہاں بیٹا، یہ صرف تمھارے ہیں، تمھارے! انھیں خرچ کرو، اپنے کام میں لاؤ۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت ہوگی تو میں باہر نہیں ہوں۔

یکایک اسلم نے اس خط کی طرح جو اس نے ابھی چاک کیا تھا۔ ان نوٹوں کو پھاڑ ڈالا

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور ان کی دھجیاں مٹھی بھر کر فضا میں اڑا دیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی کے ساتھ ہوا، اقبال کی سمجھ ہی میں نہ آ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسلم نے بلند آواز سے کہا:

آپ نے مجھے خریدنا چاہا تھا، آپ مجھے رشوت دے رہے تھے، آپ میری محبت کا سودا کرنا چاہتے تھے ــــ نہیں چچاجان آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اسلم نہیں خریدا جا سکتا۔ وہ رشوت نہیں قبول کر سکتا۔ محبت کا سودا نہیں ہو سکتا۔

اقبال میاں ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا:

میرا باپ، جو آپ کا بھائی بھی تھا، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا مگر آپ کی تجوری نہیں کھلی۔ میری ماں بیماری کی حالت میں فاقے کرتی رہی مگر آپ کی تجوری کا مضبوط قفل بند رہا۔ میری بہن ہر ہر چیز کو ترستی رہی لیکن آپ کو کوئی رحم نہ آیا، آپ نے اس کو دو روپے بھی نہیں دیے، میں آپ کا لختِ جگر، نورِ نظر، آپ کے مرحوم بھائی کا اکلوتا لڑکا۔ زمانہ کی ٹھوکریں کھاتا رہا مصیبتیں جھیلتا رہا۔ ٹیوشن کر کر کے اور وظیفے لے لے کر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ہر روز میلوں پیدل چلتا رہا مگر آپ ایک سکنڈ ہینڈ سائیکل بھی اس کے لئے نہ خرید سکے۔ اور آج ــــــــــــ اور آج آپ یک بیک اتنے سخی داتا ہو گئے کہ یکمشت چھ ہزار روپیہ عطا فرما دیا۔ چھ ہزار!

شاید آپ کا خیال تھا اس طرح آپ میری زبان بند کر سکیں گے، اس طرح آپ مجھے خاموش رکھ سکیں گے۔ اور اپنے آپ کو رسوائی سے بچا لیں گے!

اگر میں سودا کرتا تو چھ لاکھ مانگتا۔ آپ دیتے۔ اس سے بھی زیادہ طلب کرتا تو آپ کلیجہ پہ پتھر کی سل رکھ کر عطا فرما دیتے، لیکن ــــ

لیکن میں اپنی محبت کی توہین نہیں گوارا کر سکتا۔ مجھے معلوم ہو گیا مسرت بھی

آپ کی ہمنوا ہے، وہ مجھ سے محبّت نہیں کرتی۔ اس نے مجھے دھوکے میں رکھا تھا۔
اس نے مجھے فریب دیا تھا۔ اور آپ کی لڑکی یہی کچھ کر بھی سکتی تھی۔ لیکن اس محبت کے
واسطے جو میں نے کی تھی، جو مجھے ہے، جو مجھے رہے گی میں نے خاموش رہنے کا عہد کر لیا
ہے، میری طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو آپ کے لئے ـــــ آپ کی تو مجھے کوئی
پرواہ نہیں، جو مسرّت کے لئے تکلیف دہ ہو، آپ کے روپے میں نے واپس کر دئے۔
آپ کی دولت آپ کو مبارک، میں واقعی کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ شوق سے
نواب زادہ صاحب کو دولھا بنا کر لائیے۔

میں نہیں خریدا جا سکتا، اگرچہ غریب ہوں، آپ سرِ بازار نیلام ہو سکتے ہیں
اگرچہ دولت مند ہیں مجھے دولت کی ہوس نہیں، حالانکہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند
کوئی نہیں، آپ فکرِ دولت میں جان دیے دے رہے ہیں، حالانکہ شاید خود آپ کو
اپنی دولت کا صحیح اندازہ نہ ہو۔

میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے اس کاروبار پر!
جی تو چاہتا ہے نواب زادہ سلیم اللہ خاں کی خدمت میں بھی ہدیۂ سپاس پیش
کردں!

نواب زادہ صاحب کے خوش بخت ہونے میں شبہ نہیں، انھوں نے روپے
کے بل پر وہ چیز خریدلی جس کی قیمت، قیمتِ دو عالم نہیں۔ میری وہ پونجی دھری رہ گئی
جو آب و تاب میں اور گراں مائگی میں انمول ہے!
بہت اچھا چچا جان اجازت دیجئے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ آپ ابھی
بہت دن جئیں گے، میرا ابھی فی الحال مرنے کا ارادہ نہیں، لیکن اب اس دنیا میں

ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوگی !

اسلم کی یہ تقریر جاری تھی کہ انجم آگیا۔ اس نے گرم لہجے میں اسلم کو باتیں کرتے سنا اور مجرم کی طرح باپ کو خاموش دیکھا، پھر اس کی نظر فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کے ٹکڑوں پر پڑی، سمجھ نہ سکا یہ کیا ماجرا ہے۔ کبھی اسلم کو دیکھتا کبھی اقبال کو ——

آخر پوچھا:

ابا جان، یہ نوٹ ——!

اقبال نے کہا:

نہیں بیٹے یہ نوٹ نہیں ہیں، کاغذ کے ٹکڑے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں!

یہ عالمانہ فقرہ وہ بالکل نہ سمجھ سکا، کہنے لگا:

لیکن یہ تو نوٹ ہیں ابا جان!

اقبال نے للکارا:

نہیں ہیں —— جاؤ اپنا کام کرو۔

انجم چلا گیا!

---

(۹)

جوشِ جنوں

اسلم گھر واپس آیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ انجمن کھانے کے وقت بلانے آئی مگر اس نے دردِ سر کا بہانہ کر دیا۔ نائلہ نے خیریت پوچھنے کے لئے خود اوپر چڑھنے کی زحمت گوارا کی۔ وہ آئیں اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ اور پوچھا:

کیا بات ہے اسلم! تم وہاں سے آئے مگر کچھ بتایا نہیں۔ انجمن کھانے کو بلانے آئی، اسے جھڑک دیا۔ دردِ سر کا عذر کر کے، کیا کوئی خاص بات ہے؟

اسلم نے ویسے ہی لیٹے لیٹے کہا: نہیں امّی کوئی خاص بات تو نہیں، ہاں بلاوا آیا ہے آپ کے اور انجمن کے لئے۔ ۲۶ کو اس کی شادی ہو رہی ہے۔

نائلہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، ایک انجانے سے خطرہ نے ان کے قلبِ مضطر پر تسلط جما لیا۔ اکھڑی اکھڑی آواز میں بولیں:

مسرت کی شادی ! ؟

اسلم نے کہا : جی ہاں امی ، حیرت کیوں ہورہی ہے آپ کو ؟ آخر اس کی شادی ہونا ہی تھی ، ۲۶ کو نہ ہوتی تو اس کے بعد ہوتی ۔

جس بات کو ان کا دل سمجھ گیا تھا اسے زبان پر لاتے ڈر رہی تھیں ڈرتے ڈرتے سوال کیا : وہ تو خیر ہوتی ہی چاہیئے مگر اس قدر جلد ، چٹ منگنی پٹ بیاہ! لیکن ہمارے پیام کا تو انھوں نے جواب تک نہیں دیا ۔

اسلم کے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ ابھری ، اس نے کہا ، جواب دے تو دیا ۔ مسرت کی شادی نواب زادہ سلیم اللہ خاں سے ہورہی ہے ، کیا یہ جواب نہیں ہے آپ کے پیام کا !

اسی اثنا میں انجمن دبے پاؤں آکر بیٹھ گئی ۔ اور بولی :

تو یہ بات تھی ــــــ یہ راز اب سمجھ میں آیا ۔

نائلہ نے انجمن کے اس انکشاف کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا :

لیکن مسرت کی تو منگنی ہو چکی تھی تیرے ساتھ !

اسلم نے زہرخند کرتے ہوئے جواب دیا : ہاں ہو تو گئی تھی ۔ لیکن اس وقت مسرت کا باپ بھی ہماری طرح ایک غریب ہی تھا ۔ اب ہم غریب ہیں اور وہ امیر ہے ، کیا اس کا دماغ خراب ہے کہ اپنی نازوں کی پلی ہوئی بیٹی ایک بھک منگے سے بیاہ دے !

نائلہ نے دلیل بازی شروع کر دی : لیکن شرافت بھی تو کوئی چیز ہے ، انسانیت بھی تو کسی چیز کا نام ہے ۔ زبان سے نکلی ہوئی بات پر لوگ جان دے

دیتے تھے۔ مثل مشہور ہے : قولِ مرداں جان دارد : تمھارے چچا نے یہ سب باتیں فراموش کر دیں۔

اسلم ہنسنے لگے : امی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! یہ نہ بھولئے چچا میاں پہلے سوداگر ہیں پھر کچھ اور! سوداگر صرف وہی کام کرتا ہے جس میں نفع ہو، نقصان کے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا!

نائلہ نے ٹوکا : کیسی باتیں کرتا ہے لڑکے! کیا شادی بیاہ کا معاملہ بھی کاروبار ہے؟

"کاروبار نہیں تو اور کیا ہے"! اسلم نے کہا : "خالص کاروبار ہے۔ چچا میاں کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ مسرت عیش کی زندگی بسر کرے۔ اگر میں نوابِ اسلم ہوتا تو وہ نواب زادہ صاحب کو فراموش کر دیتے لیکن میں مفلوک الحال ہوں، خوبیٔ قسمت سے نواب زادہ صاحب دستیاب ہو گئے، ان کا دامن پکڑ لیا۔ کل اگر کوئی اور صاحب ایسے دستیاب ہو جائیں جو نواب زادہ صاحب کو خرید سکتے ہوں تو چچا میاں مسرت کو اس کے ہاتھ فروخت کر دیں گے!

انجمن منہ بناتی ہوئی بولی : فروخت کر دیں گے، اور مسرت بک جائے گی!

نائلہ نے بیٹی کی تائید کی : صرف روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ لڑکی کی خواہش بھی ہے یا نہیں، وہ رضامند بھی ہے یا نہیں، کوئی کروڑ پتی بھی اگر انجمن کا رشتہ بھیجے اور وہ پسند نہ کرتی ہو تو میں اس طرح دھتکار دوں جیسے کتے کو دھتکارا جاتا ہے!

اسلم نے جواب دیا : ہاں ایسا ہی کرو گی، اس لئے کہ تمھیں کاروبار نہیں آتا،

لیکن کوئی سوداگر ایسا نہیں کرسکتا، کسی طرح نہیں!

انجمن نے پھر مداخلت کی: ہاں ہاں نہیں کرسکتا، لیکن میں پوچھتی ہوں آخر مسرت سے کیوں نہیں پوچھا جاتا!

اسلم نے سوال کیا:

تمھارا خیال ہے اس سے نہیں پوچھا گیا ہوگا! کیا وہ اس رشتہ کو نامنظور کرسکتی ہے!

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا: ہاں، اس لئے کہ وہ نواب زادہ سے نہیں کسی اور سے محبت کرتی ہے! انسان ہر چیز کی قربانی دے سکتا ہے لیکن محبت کی نہیں دے سکتا۔۔ کیا وہ آپ سے محبت نہیں کرتی؟

اسلم نے بڑے ٹھنڈے لب و لہجہ میں کہا: اور اگر میں کہوں نہیں، تو؟!

انجمن اور نائلہ دونوں چونک پڑیں۔

انجمن نے کہا: بھیا ایسا نہ کہئے۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔ وہ ۔۔ وہ تو بہت محبت کرتی ہے آپ سے، اس کے کمرے میں آپ کی کئی تصویریں آویزاں ہیں۔ اس کی میز پر ایک چھوٹے سے نقرئی فریم میں آپ کی وہ تصویر جس میں ٹینس کا بلا لئے کھڑے ہیں ہر وقت رکھی رہتی ہے۔ اس کے پاس آپ کے درجنوں خطوط ہیں۔ فرصت کے اوقات یہی خط پڑھ پڑھ کر گزارتی ہے، آپ کا ذکر آتا ہے تو پھول کی طرح کھل جاتی ہے، اس ذوق و شوق سے آپ کی باتیں سنتی ہے کہ کیا کہوں، جب بھی میرا جانا ہوتا ہے تو کرید کرید کر آپ کی باتیں پوچھتی رہتی ہے، کبھی آپ کا خط نہیں آتا تو پریشان ہوجاتی ہے۔ میرے پاس قاصد پہ قاصد دوڑنے لگتے ہیں، کوئی خط آیا اسلم کا! اسے

آپ کہہ رہے ہیں کہ محبت نہیں کرتی! اتنا بڑا ظلم نہ کیجئے، غریب بچاری پر!

اسلم یہ باتیں سنتا جاتا تھا اور اس کا رنگ رخ بدلتا جاتا تھا، دفعتہً وہ شیر کی طرح گرجا:

چُپ رہو، خاموش ہوجاؤ!

انجمن چُپ ہوگئی، خاموش ہوگئی! نائلہ نے سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھنا شروع کر دیا، اسلم اٹھ کھڑا ہوا، اس نے کہا:

مسرت نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اس نے اپنی محبت واپس لے لی، اس نے کبھی بھی مجھ سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ محبت سے واقف بھی نہیں کہ وہ کیا چیز ہے، وہ مجھ سے کھیلتی رہی میرے جذبات سے کھیلتی رہی، میری محبت سے کھیلتی رہی، جب تک جی چاہا کھیل جاری رکھا، جب جی اُکتا گیا کھیل ختم کر دیا۔

پھر وہ میز کی طرف بڑھا، وہاں وہ بلندہ رکھا تھا جس میں اس کے خطوط تھے۔ اس نے ایک ایک خط نکال کر پھاڑتے ہوئے کہنا شروع کیا:

یہ ہیں وہ خط جنھیں وہ پڑھا کرتی تھی۔ لیکن اب ان میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کوئی پیام نہیں ہے۔ یہ سارے خط وہ واپس کر گئی، نہیں میرے مُنہ پر مار گئی!

بلندہ میں کچھ فریم سے نکلی ہوئی چھوٹی بڑی تصویریں بھی تھیں۔ اسلم نے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی اور انجمن کو دکھلاتے ہوئے کہا:

یہ ہے وہ تصویر جو اس کی میز پر ایک نقرئی چوکھٹے میں ہر وقت رکھی رہتی تھی۔ لیکن اب یہاں ہے، اب وہاں اس کی جگہ نہیں ہے!

یہ کہہ کر اس نے تصویر پھاڑ دی، اس کی دھجیاں فضا میں اڑنے لگیں۔

پھر اس نے ایک اور بڑی سی تصویر نکالی اور فضا میں لہراتے ہوئے انجمن سے کہا:
یہ تصویر اس کی فرمائش پر میں نے بھیجی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر وہ خود اپنے بقول تصویر حیرت بن گئی تھی۔ اسے خود بازار جا کر ایک قیمتی فریم میں اس نے جکڑا تھا، اور لاکر دیوار پر نصب کر دیا تھا تاکہ ہر وقت نظر پڑتی رہے۔ بجز کا خیال، خیال خام ثابت ہو تا رہے۔ اس تصویر پر اور جس کی یہ تصویر ہے اس پر فخر تھا اس کو، ناز تھا اس کو لیکن اب یہ ایک بے حقیقت کاغذ کا ٹکڑا ہے ــــ یہ لو!

اور یہ تصویر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں اڑ گئی۔

پھر اور کئی تصویریں اس نے نکالیں اور ان سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

پھر اس کمرے میں اس کی جتنی تصویریں تھیں اور جنھیں بڑے چاؤ سے انجمن نے آویزاں کیا تھا اکھاڑیں، زمین پر پٹکیں، فریم ٹوٹ گیا، شیشے کے ٹکڑے ہو گئے اور پھر یہ تصویریں بھی ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں اڑنے لگیں۔

پھر اس نے وہ تصویریں اتاریں جو مسرت کی تھیں اور الگ الگ پوز میں تھیں کسی میں وہ ساری میں ملبوس باغیچہ میں پھول توڑ رہی تھی، کسی میں شلوار پہنے دوپٹہ اوڑھے بلی کا بچہ گود میں لئے کھڑی تھی۔ کسی میں چوڑی دار پاجامہ پہنے مورپنکھی ہاتھ میں لئے اس طرح کھڑی تھی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو، کسی میں موٹر میں بیٹھی اسے ڈرائیو کرتی نظر آ رہی تھی۔

یہ ساری تصویریں وقتاً فوقتاً خود مسرت نے اسے بھیجی تھیں اور ہر تصویر میں اپنی طرف سے کچھ لکھا بھی تھا، کسی تصویر کے نیچے درج تھا "ہمیشہ آپ کی . . . . "

کسی پر لکھا تھا "صرف آپ کی . . ." کسی پر مرقوم تھا "جسے آپ بھول گئے" یہ سارے الفاظ اس نے زور زور سے پڑھے اور پھر ایک ایک کر کے ان تصویروں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا!

نائلہ بیٹھی ٹکٹکی ٹک یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ سب خاموش تھے، آنکھیں آب گوں، یہی حالت انجمن کی بھی تھی۔ اور پھر وہ رونے لگی، سسکیاں لے لے کر، اس نے گلوگیر آواز میں کہا:

بھائی جان — بھیا —!

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسلم نے اپنی کیفیت پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: کیوں روتی ہو انجمن؟!

وہ اسی طرح گریہ کناں بولی: اب کیا ہوگا؟

اسلم نے زہر خند کرتے ہوئے جواب دیا: اور اب کیا ہوگا! اتنا کچھ سن چکنے اور معلوم کر چکنے کے بعد جو پوچھ رہی ہو اب کیا ہوگا! — اب کیا ہوگا! اگر واقعی یہ معلوم کرنا چاہتی ہو تو پھر ۲۲ تاریخ میں دن ہی کتنے ہیں خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ آنا۔ ویسے تمہیں بلایا بھی ہے چچا میاں نے، بلکہ فرمائش کی ہے کہ تم اور امی آ کر شادی کا سارا انتظام سنبھال لو،

نائلہ کے منہ سے نکلا بھاڑ میں جائیں ایسے چچا میاں، جھاڑو پھرے ایسے چچا میاں

انجمن بولی: میری جانی تبسے بیزار — میں کیوں جانے لگی!

نائلہ کہنے لگی: اسے کہتے ہیں زخموں پہ نمک چھڑکنا!

انجمن بولی: اور کیا، شرم بھی نہیں آئی چچا میاں کو ہمیں بلاتے ہوئے ۔ لیکن کچھ بھی ہو ایک دفعہ مسرت سے ملوں گی ضرور!

اسلم نے تیوری چڑھا کر پوچھا: کیوں ملو گی؟

وہ کہنے لگی: ذرا خیریت پوچھوں گی ۔ بھیا اس نے آپ سے بھی اتنی صفائی سے اظہار محبت نہیں کیا ہوگا جتنا میرے سامنے کیا تھا!

اسلم کرسی پر بیٹھ گیا اور گویا ہوا: تم سے تو شاید وہ اب بھی محبت کرتی ہوگی!

وہ چراغ پا ہوتی ہوئی بولی: نہیں مجھ سے نہیں آپ سے! ۔ میرے سامنے آپ سے اپنی محبت کی کہانی بیان کیا کرتی تھی، وہ کہا کرتی تھی:

اسلم نے ٹوکا: نہیں، میں نہیں سننا چاہتا ۔ وہ جو کچھ کہتی تھی جھوٹ کہتی تھی! اور جھوٹی باتیں سننا میں پسند نہیں کرتا! میں بھی پچھلی باتیں بھول چکا ہوں تم بھی بھول جاؤ!

وہ بولی: آپ بھول جائیے لیکن میں نہیں بھول سکتی بھیا! ــــ

اسلم نے اسے گھور کر دیکھا اور سوال کیا:

کیوں نہیں بھول سکتیں؟

وہ کہنے لگی: میرے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی ہے، لاکھ بھلاتی ہوں، مگر اس کی باتیں یاد آ رہی ہیں ۔

اسلم زہر خند کرتا ہوا گویا ہوا:

تم پاگل ہو!

وہ بولی : ہاں بھیّا آپ سچ کہتے ہیں ۔ اگر نہیں ہوں تو ہو جاؤں گی ــــ ضرور پاگل ہو جاؤں گی !

نائلہ نے مداخلت کی ، پاگل ہوں تیرے دشمن ، کیوں ایسی باتیں کرتی ہے ؟ !

لیکن وہ کہے جا رہی تھی : اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مسرّت جھوٹی ہے ، میں اسے سو سچّوں کا ایک سچّا سمجھتی تھی ۔ بھیّا کیا آنسو بھی جھوٹے ہو سکتے ہیں ۔ بار ہا میرے سامنے وہ آپ کو یاد کر کے روئی ہے ۔ میرا اب تک یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ دھوکا دے سکتی ہے ۔

پیار بھرے لہجے میں اسلم نے کہا : حقیقت بڑی سنگین ہوتی ہے ، وہ خوش گوار ہو یا ناخوش گوار اسے ماننا ہی پڑتا ہے ۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا اسے ماننے کا ۔ تمھارا بھی جی نہیں چاہتا ۔ شاید امّی کا جی بھی نہیں چاہتا ۔ آؤ ہم سب مل کر انکار کر دیں ۔ ہم سب اعلان کر دیں کہ مسرّت سچی ہے ، وہ اپنے عہدِ وفا پر قائم ہے ــــ لیکن اس طرح کیا وہ واپس آ جائے گی ؟ کیا جو باتیں یہاں اس کمرہ میں مجھے مخاطب کر کے کہہ گئی ہے ان کی تردید کر دے گی ؟ کیا نواب زادہ صاحب بہادر کی رفیقۂ حیات بننے سے انکار کر دے گی ، کیا اس گھر میں امّی کی بہو ، تمھاری بھابی اور میری بیوی بن کر وہ آ جائے گی ــــ نہیں انجمن یہ کچھ نہیں ہوگا ۔ ہم لاکھ انکار کریں ۔ ہم دس لاکھ مرتبہ اس ٹھوس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیں لیکن وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم رہے گی ، اسے کوئی نہیں بدل سکتا ۔ ۲۶ تاریخ آئے گی ۔ اور اس تاریخ کو وہ بات جسے تم انہونی سمجھ رہی ہو ضرور واقع ہو جائے ــــ چھوڑو ان باتوں کو جاؤ اپنا کام کرو !

انجمن کی آنکھوں سے بدستور آنسو جاری تھے ، نائلہ کی حالت بھی غیر تھی ۔ اسلم نے

۹ -

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھول جانا چاہیے کہ مسرت بھی کوئی ہستی تھی جو ہماری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اسے فراموش ہی کر کے ہم اپنے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح رو رو کر تم اماں کو پریشان کر دگی مجھے پریشان کرو گی، خود پریشان ہو گی لیکن خدارا بتاؤ اس سے تمھیں حاصل کیا ہوگا؟

نہیں انجمن باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا!

---

(۱۰)

اندازِ جنوں

اسلم کا پختہ ارادہ تھا کہ تعطیل کی باقی مدّت کہیں اور گزارے گا، کئی دوستوں کے تقاضے اور مطالبے پیشِ نظر تھے، جہاں چاہتا جا سکتا تھا، صفدر کا بہت دنوں سے اصرار تھا اور اب اس نے خط بھی لکھا تھا کہ خدارا چلے آؤ۔ چند ہفتے رہو، شکار کا پروگرام رہے گا۔ جنگلات کی سیر رہے گی، بخدا جنگل کی زندگی، اتنی پُرسکون، اتنی رومانی، اتنی کیف آور ہوتی ہے کہ شہر کی زندگی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ پرند ہوں یا چرند یا درندیہ سب ایک جیسی بے تکلّف، پُرلطف اور باغ و بہار زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے!

اہاہا! جنگل کا بادشاہ، شیرِ غرّاں جب اپنی کچھار سے نکلتا ہے تو اس کا دبدبہ اور وقار دیکھ کر واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ہے۔ ہاتھیوں کے غول جس اتحاد یقینِ محکم اور تنظیم کے ساتھ گشت کو نکلتے ہیں وہ سماں بھی بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہرنوں کے جھنڈ، دیکھے چشمِ غزال دامنِ دل اپنی طرف نہ کھینچے تو میرا ذمّہ! طرح طرح کے مشہور و معروف

گم نام اور بے نام پرندے ، ان کے نغمے ان کا جذبۂ پرواز ایسا منظر ہے کہ دیکھتے آنکھیں نہیں تھکتیں !

پھر درختوں کی لمبی لمبی قطاریں ، بے ترتیب ، بے نظم ، لیکن اتنے گھنے کہ دن کو دھوپ نظر نہیں آتی ! گرمی کے موسم میں سردی کی شدّت سے دانت بجنے لگتے ہیں ، کہیں میدان کی کیفیت ، کہیں تالاب ، کہیں جھیل ، کہیں نہ جانے کب کے کھنڈرات کے نشانات جو لے پوچھے اپنی تاریخ بتانے پر آمادہ ، کہیں بندروں کی ٹولیاں ، اتنی شوخ و شریر مخلوق کہ خدا کی پناہ ! جنگل کی دُنیا اپنی ایک الگ دُنیا ہے ! نرالی ، نشاط انگیز ، روح پرور ــــ آؤ ، رہو اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو !

والد کی پنشن بہت جلد ہونے والی ہے ، سال دو سال سے زیادہ نہیں رہ سکیں گے ۔ اس اثنا میں آجاؤ تو جنگل ہمارا ، ہمارے باپ کا ، اس کے بعد آؤ تو بھئی شکریہ لیکن خدمت سے معذور ہوں !

یہ خط پڑھ کر اسلم کا جی تو لہرایا کہ چلا جائے ۔ اور اس مرتبہ تعطیل کلاں کا بڑا حصّہ وہیں گزارے ــــ لیکن مسرّت کے شہر میں آنے کے بعد جانا ممکن کب تھا ! معذرت لکھ دی اور آئندہ سال کا پختہ ارادہ کرلیا ۔ کئی سال سے ایسا ہی ہو رہا تھا ، لیکن اقبال کے ہاں سے واپس آتے ہی اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اب اس قصبہ میں جہاں کاروانِ دل لٹا ہے رہنا مناسب نہیں ۔ بہتر یہ ہے کہ صفدر کی دعوت قبول کرلی جائے ۔

یہ بات وہ گوارا ہی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے مسرّت کسی اور کی رفیقۂ حیات بن کر رخصت ہو !

شاید وہ سامانِ سفر باندھ کر رخصت بھی ہوچکا ہوتا اب تک ، اگر انجمن اور نائلہ نہ آگئی

ہوتیں وہ آئیں اور ایسی باتیں چھیڑیں کہ کافی وقت گزر گیا۔ اور ٹرین جس پر وہ جاتا نکل گئی۔

طے کر لیا کہ کل ضرور چلا جائے گا لیکن رات کو لیٹا تو بخار تھا، صبح تک کافی شدید ہو گیا۔ انجمن اور نائلہ گھبرا گئیں۔ حکیم صاحب طلب کئے گئے، ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دی گئی اور وہ بستر پر دراز ہو گیا، اگرچہ وہ بستر پر دراز تھا اور بخار اسے بُری طرح جھنجھوڑ رہا تھا لیکن اپنے عزم پر قائم تھا۔ جلد از جلد تندرست ہو کر روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد وہ بستر سے اٹھا، اب وہ جا سکتا تھا، لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

اس نے سوچا: مسرت کی شادی میں اب چند دن باقی ہیں۔ کیوں نہ شادی میں شرکت کے بعد رختِ سفر باندھوں!

وہ سوچنے لگا: میں اس لئے بھاگا جا رہا تھا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے مسرت کو ایک دوسرے شخص کی بیوی بن کر جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا ـــــ لیکن کیوں؟

جب اس نے میری محبت ٹھکرا دی، اس کے بارے میں زیادہ حساس بننے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔؟

وہ جب میری نہیں بن سکتی تو جس کی چاہے بن جائے، مجھے اعتراض کرنے یا بُرا ماننے یا غم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں کیوں بھاگوں؟ بے حوصلگی اور کم ظرفی کا مظاہرہ کیوں کروں؟ کیا مردانہ وار غم اور صدمہ کا مقابلہ میں نہیں کر سکتا؟ کیا خلافِ طبع بات اگر ہو تو مجھے بھاگ جانا چاہیئے؟ مسرت کو کھو چکنے کے بعد بھی میں اتنا جذباتی ہوں کہ اس شہر میں بھی رہنا نہیں چاہتا جہاں وہ رہتی ہے۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

میں یہیں رہوں گا!

اور ـــ میں اس کی شادی میں شریک بھی ہوں گا ۔ دیکھوں گا کیا ہوجاتا ہے مجھے ؟ میں نہ چاہوں تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا مجھے !

میں چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ نہ ہو ۔

میں چاہتا ہوں کہ مسرت کی رسمِ عقد میں شرکت کروں ! اور وہاں جاکر بیکرِ الم نہ نظر آؤں ـــ قہقہے لگاؤں ، ہنسوں !

چچا میاں کو ، انجم کو اور ہوسکے تو مسرت کو باور کراؤں ، اگر تمھیں میری پروا نہیں ہے تو مجھے بھی نہیں ہے ، تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں بھی تمھیں ٹھکرا سکتا ہوں ، تم نے مجھے بھلا دیا تو میں نے بھی تمھیں فراموش کر دیا ہے ۔

یہ کیا لغویت ہے کہ آدمی غم نہ جھیل سکے ، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں اور حسرتوں کے جنازہ کو خود کاندھا نہ دے سکے ۔ اپنے ولولوں کی خود تجہیز و تکفین نہ کرسکے ؟ ـــ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا ! ؟

ہوسکتا ہے !

اور کم از کم میں کر کے دکھادوں گا ۔ میں وہاں جاؤں گا اور اپنی حسرتوں کے جنازہ کو کاندھا دوں گا ۔ اپنی آرزوؤں کی تجہیز و تکفین کروں گا اور ان کو محسوس نہ ہونے دوں گا کہ دل پر کیا گزر رہی ہے !

دل پر کیا گزر رہی ہے ! کیا اس دم خم ، اس عزمِ محکم کے بعد بھی دل پر کچھ گزرے گی !

ہاں گزرے گی !

اس لئے کہ میں اب تک مسرت سے محبت کرتا ہوں ، میں اُسے بھول نہیں سکتا ۔ میں سر کبھی نہیں بھول سکوں گا ۔ کبھی نہیں ، زندگی بھر نہیں ، زندگی کی آخری سانس تک نہیں !

لیکن اس کے باوجود کہ میری محبت ٹھکرا دی گئی ہے، بھیک نہیں مانگوں گا۔ کاسۂ گدائی لے کر!

اگر میں ٹھکرا دیا گیا ہوں تو اتنا احساسِ خودی تو رکھتا ہوں کہ کسی کمزوری کا احساس نہ ہونے دوں!

مسرت کی بزمِ شادی سے بھاگنا کمزوری ہے اور میں ہرگز کسی قیمت پر اس کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دوں گا!

●

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے ایک طرح کا سکون سا محسوس کیا، عزمِ سفر ملتوی کر دیا اور بظاہر مطالعے میں وقت گزارنے لگا۔

لیکن نائلہ کا دل ماں کا دل تھا!

وہ سمجھ رہی تھی، لڑکا خاموش ہے! لیکن اس کے دلِ ناتواں پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ یہاں رہا تو یہ قیامت نہ جانے کیا بن جائے گی، نہ جانے کیا گل کھلائے گی؟!

چنانچہ وہ آئیں، انھوں نے پوچھا، کیا کر رہے ہو بیٹا!

اسلم ماں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا، کہنے لگا: کتاب پڑھ رہا تھا ــــ کیوں کوئی کام ہے؟

وہ شفقت اور محبت کے جذبہ سے بے خود ہو کر بولیں: نہیں بیٹے کام تو کوئی نہیں ہے

اسلم ان کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا: کام نہیں ہے تو آئی کیوں ہیں؟

ادھر نائلہ نے سوچا کہ اگر اسلم کو کہیں باہر جانے کا مشورہ دیا تو بہت ممکن ہے قبول نہ کرے، ضد پر آجائے، لیکن یکایک ایک نیا خیال آیا: وہ خوش ہو گئیں کہ ساری مشکل حل ہو گئی

انھوں نے سوچا: خود مجھے اور انجمن کو بھی اسلم کے ساتھ چند روز کے لئے کہیں چلا جانا چاہیئے۔

پھر وہ عذر نہ کر سکے گا ۔ چنانچہ کہنے لگیں :

بہت دن سے تمھارے ماموں بلا رہے ہیں ۔ میں ٹالتی رہی کہ تم آؤ گے تو جاؤں گی ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانا کچھ آسان بھی تو نہیں !

اس نے کچھ سوچتے ہوئے ماں سے پوچھا :

کیا فیض آباد کا ارادہ ہے ؟ ماموں سے ملنے کو جی تو میرا بھی بہت چاہتا ہے ۔

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا خوش ہو گئیں ۔ ہاں بیٹا وہیں چلو جب تک تمھاری چھٹی ہے وہیں رہیں گے ، پھر میں یہاں چلی آؤں گی تم اپنے کالج چلے جانا ۔

اسلم نے کہا : بڑی اچھی تجویز ہے ، ضرور چلیئے !

نائلہ نے خوش اور مطمئن ہو کر دریافت کیا : تو پھر سامان باندھوں ؟

کہنے لگا : تو کب ارادہ ہے آپ کا ؟ کیا آج ہی کل میں ؟

نائلہ نے کہا : ہاں بیٹا جب ارادہ کر لیا تو پھر دیر کیوں ؟ میری رائے تو یہ ہے کہ کل ہم لوگوں کو روانہ ہو جانا چاہیئے ۔

اسلم نے سنجیدہ بن کر کہا : امّی یہ کیسے ہو سکتا ہے ، چند روز کے بعد تو مسرّت کی شادی ہے

نائلہ پر نئے سرے سے بجلی گر پڑی ۔ کہنے لگی ، ہاں ہے تو نہیں کیا ؟

اسلم نے سوال کیا : کیا وہ ہمارے چچا کی لڑکی نہیں ہے ؟ کیا ہمارے باپ کی بھتیجی نہیں ہے ؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کی شادی ہو اور ہم نہ شریک ہوں ! دنیا کیا کہے گی ؟ لوگ کیا کہیں گے ؟ اور نہ کہے دنیا کچھ تو بھی یہ بات قطعاً غیر مناسب ہے !

نائلہ کو ایک بہت بڑا طوفان آتا ہوا نظر آیا ۔ تو کیا تم شرکت کرو گے ؟ آخر ارادہ کیا ہے تمھارا ؟ ـــ

وہ ہنسنے لگا: ارادہ صرف شرکت کا ہے۔ آپ کو اور انجمن کو بھی بلایا ہے۔

ماں نے بگڑے ہوئے تیور سے بیٹے کو دیکھا اور کہا: ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں نہیں جاؤں گی۔ انجمن خود جانے کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ رہی ہے۔ اور سن لو کان کھول کر، تم بھی نہیں جا سکتے۔ یہ میرا حکم ہے!

بڑے ٹھنڈے لہجے میں اسلم نے کہا: آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن آپ نے ضدیں پوری کر کر کے میری عادت بگاڑ دی ہے۔ اب بھگتئے۔ میں تو قطعاً جاؤں گا اور اگر آپ نہ گئیں تو لڑائی کھٹوائی لے کر پڑ جاؤں گا، پھر آپ کو منانا ہی پڑے گا!

اتنے میں انجمن آ گئی۔ نائلہ نے اس سے کہا: لو اور سنو، اپنے بھائی کی باتیں۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسلم کی طرف دیکھنے لگی۔

اسلم نے شفقت اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

یہ میرے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی۔ سنتی ہو انجمن مسرت کی شادی میں ہم سب شریک ہوں گے۔ دیکھو، خبردار! کوئی ایسی بات تمھارے منہ سے نہ نکلے جو میرے لئے تکلیف دہ ہو۔ سمجھ گئیں میرا مطلب!؟

وہ اسلم کا مطلب سمجھی یا نہیں لیکن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تکنے لگی، جیسے وہ سوچ رہی تھی۔ شدتِ غم نے اسے حواس باختہ اور دیوانہ تو نہیں کر دیا ہے؟

نائلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا: ہمارے گھر سے کوئی نہیں جا سکتا وہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے!

پھر وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد انجمن نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کئے اور بولی:

بھیّا کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ ؟ کہیں ایسا بھی ممکن ہے کہ ہم وہاں جائیں جہاں سے دھتکارے جا چکے ہیں، جہاں ہماری تذلیل ہو چکی ہے !

اسلم نے پھر ایک بھیانک سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگا: تم عورتوں کی ذہنیت بڑی عجیب ہوتی ہے !

انجمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے وہ بھی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گئی !

کارزارِ حیات

احساس کی حد سے جو گزرے اس درد کا درماں کون کرے
نس نس میں وہ اب شعلے بھی نہیں رگ رگ میں وہ اب نشتر بھی نہیں

سرمایۂ راحتِ دل تو کجا سامان عیش نظر بھی نہیں
اب خلوتِ حُسن کا ذکر ہی کیا اب جلوۂ راہگزر بھی نہیں

یہ شام و سحر کی یکرنگی، بےکیف ہوئے یوں شام و سحر،
جس طرح نظامِ فطرت میں پابندئ شام و سحر بھی نہیں

تدبیر بھی غم کی نادانی تقدیر ہے غم کی ویرانی
ممنونِ دلِ سوزاں بھی نہیں شرمندۂ چشمِ تر بھی نہیں

اب ہم کو وہ دولت حاصل ہے کہتے ہیں سکونِ غم جس کو،
اب دل کا یہ عالم ہے پیارے مضطر بھی ہے اور مضطر بھی نہیں

آغاز تھی انجام تھی، ہم پر ہی رہی ہر وقت نظر
آغازِ محبت پر بھی نہ تھی، انجامِ محبت پر بھی نہیں

(۱)

بزمِ شادی

اقبال میاں بہت مطمئن تھے کہ اسلم سے پیچھا چھٹا!

مسرت بھی نئی زندگی کے استقبال میں اس درجہ مصروف تھی کہ پیچھے مڑکر دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ حاجت۔ اسلم سے نفرت اسے اب بھی نہیں تھی۔ اور جب محبت کا دعویٰ تھا تو محبت بھی نہیں تھی۔ اسلم منگیتر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ صورت شکل وضع قطع، رکھ رکھاؤ، سبھاؤ ہر اعتبار سے بہتر، پھر بچپن کا ساتھی، اُنس ہو جانا قدرتی تھا، شادی آغازِ محبت ہی میں ہو جاتی تو شاید دونوں بہت اچھے میاں بیوی ثابت ہوتے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا، اس لئے کہ اقبال میاں کی یہ خواہش نہ تھی، ناہید کی یہ مرضی نہ تھی انھوں نے یہ تو نہیں کیا کہ مسرت کو اسلم سے ملنے جلنے سے منع کر دیا ہو، لیکن طریقہ ایسا رکھا، باتیں ایسی کیں کہ پہلے تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم رُکے، پھر وہ پیچھے مڑ گئی!

بعض دفعہ تو معمولی سی باتیں بڑے نتائج پیدا کرتی ہیں، یہی مسرت کے ساتھ ہوا،

رقیہ کی شادی میں وہ بھی شریک ہوئی۔ رقیہ اس کی سہیلی تھی۔ رقیہ کے باپ سے اس
کے باپ کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ اگر نواب علیم اللہ خاں تھے تو یہ بھی ملک التجار تھے
وہیں پہلی مرتبہ نواب زادہ سلیم اللہ خاں سے نظریں چار ہوئیں۔ تعلیم کے نام سے انھوں
نے اپنے ملک کی بھی خوب سیاحت کر لی تھی، اور غیر ممالک میں بھی اچھی طرح گھومے پھرے
تھے۔ شاید ابھی ان کا سفر جاری رہتا لیکن رقیہ کی شادی کھینچ لائی اور مسرت سے مل کر
انھوں نے محسوس کیا نہ آتے تو غلطی کرتے!

یہ پہلی ملاقات مستقل اور نہ ختم ہونے والی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ کبھی رقیہ
مسرت کو اپنے یہاں بلا لیتی اور وہاں سلیم سے ملاقات ضرور ہوتی۔ کبھی رقیہ کو مسرت
مدعو کر لیتی۔ اور اُسے پہنچانے اور لینے کے لئے سلیم ضرور آتا، دونوں مرتبہ تپاک اور جوش
کے ساتھ اس کی پذیرائی کی جاتی۔ خاطریں ہوتیں، مدارات کی جاتی، شروع میں ان
ملاقاتوں کی حیثیت رسمی تھی، سلیم تو پہلے ہی دن سے مسرت میں دلچسپی لینے لگا تھا لیکن
دو چار ملاقاتوں کے بعد مسرت بھی اس سے مل کر خوش ہونے لگی۔

وہ تھا بھی بڑا باغ و بہار آدمی، نہ جانے کتنے لطیفے یاد تھے۔ داستان طرازی میں
اپنا جواب آپ تھا، تہذیب، وضعداری اور رکھ رکھاؤ میں کوئی اس کا حریف نہ تھا۔
رقیہ سے اور رقیہ کے پردے میں سلیم سے مسرت کی دوستی بڑھتی گئی۔

شروع میں وہ خود محسوس نہ کر سکی کہ کدھر جا رہی ہے، کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے
والا ہے؟ —

لیکن ایک روز جب اقبال اور ناہید کی باتیں کان میں پڑیں جو اس کے بارے
میں ہو رہی تھیں، اور جن میں اس تمنا کا اظہار کیا گیا تھا کہ اگر سلیم اور مسرت کی شادی

ہو جائے تو کتنا اچھا ہو، تو یہ بات بُری تھی۔ البتہ سلیم سے دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔ پہلے اس سے ملنے میں جو جھجک سی تھی وہ بالکل جاتی رہی۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ ایسا محسوس کرنے لگی کہ اس کا منگیتر اسلم کیوں ہے سلیم کیوں نہیں ؟!

اب تک اسلم کی غربت اور فلاکت کو وہ بری نظر سے نہیں دیکھتی تھی، اب خود بخود دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اسلم سے زندگی کا نباہ ہو کس طرح سکتا ہے! بی اے کرنے کے بعد کونسی بڑی ملازمت مل جائے گی۔ بہت سے بہت ملی تو دو ڈھائی سو کی، اس میں وہ کیا کیا کرے گا! انجمن کا بوجھ، ماں کا بوجھ، اپنا بوجھ اور میرا بوجھ —— اس کے برعکس سلیم ٹھہرا امیر ابن امیر —— نوکر چاکر، موٹر، حویلی، روپیہ پیسہ کس چیز کی کمی ہے اس کے پاس!

اسلم مجھے سیر کراتے ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھی نہیں لے جا سکتا سلیم ساری دُنیا گھما سکتا ہے، بیمار پڑ دل تو اسلم صرف آنسو بہا سکتا ہے، سلیم بڑے سے بڑے حکیم اور ڈاکٹر کر آن کی آن میں جمع کر سکتا ہے کسی زیور کو جی چاہے تو اسلم کے پاس وعدۂ فردا کے سوا کیا ہے اور سلیم کی تجوری اشرفی اور نوٹوں سے بھری ہے، میں ایک کہوں وہ دو چیزیں لے کر دے سکتا ہے۔ بڑے لوگوں کے ہاں جانا ہو تو اسلم کی جگہ کہاں ہو گی! کوئی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرے گا اور سلیم ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اسلم کی بیوی کی حیثیت سے میں صرف مسرت جہاں رہوں گی اور سلیم کی بیوی بن کر ہم چشموں میں، بلکہ بڑے بڑے لوگوں میں وہ آؤبھگت ہو گی کہ دوسرے رشک کریں گے۔ کتنا فرق ہے اسلم اور سلیم میں۔ اور پھر جب اسے اقبال اور ناہید کی باتیں اپنے اور سلیم کے بارے میں یاد آئیں تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اور ایک روز جب واقعی سلیم کا پیام آیا اور ماں نے پیار بھرے لہجے میں اس کا عندیہ لیتے ہوئے پوچھا:

راضی ہے تو لڑکی!

تو وہ انکار نہ کرسکی مسکرائی اور شرما کر گردن جھکالی۔

نا امید کو بڑا دھڑکا تھا کہیں مسرت مچل نہ جائے، انکار نہ کر دے، وہ جانتی تھیں اسلم میں اور اس میں ایک طرح کا ربط و ضبط ہے، لیکن بیٹی کی سعادت مندی نے یہ دھڑکا دور کر دیا۔ ان کا دل مسرت سے زیادہ جوش مسرت میں اچھلنے لگا۔ جس مرحلے کو طے کرنے میں ہفت خواں سر کرنے کا اندیشہ تھا وہ چٹکی بجاتے میں طے ہو گیا۔

اور اس کامیابی میں رقیہ کا بھی بڑا حصہ تھا۔

رقیہ باتوں باتوں میں برابر سلیم کے حسن مردانہ شیوۂ ترکانہ، قابلیت، ذہانت، فراخ دلی اور سخاوت کے گن گایا کرتی تھی۔ مزے لے لے کر یہ باتیں سنایا کرتی تھی اور خود اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کر دیا کرتی تھی۔

رقیہ نے سلیم کی رہنمائی میں بڑی حکمت اور روانائی کے ساتھ یہ منزل طے کی تھی، رفتہ رفتہ وہ لگاؤ جو مسرت کو اسلم سے تھا، بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے سلیم کی طرف منتقل کر دیا تھا۔

پہلے وہ اسلم کی تصویر دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی، اس کے خط پڑھ کر لطف لیا کرتی تھی۔ انجمن سے اس کی باتیں سن کر نہ جانے کس دنیا میں پہنچ جاتی تھی۔ اور اب تصویر کی طرف نظر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ خطوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ انجمن کا آنا اور باتیں کرنا بے حد ناگوار تھا، گو اس نے اپنی یہ کیفیت انجمن پر ظاہر نہیں ہونے دی۔

سلیم کا پیام آنے کے بعد حالات جلد جلد بدلنے لگے، اُدھر اتفاق سے نائلہ کا پیام بھی آگیا۔ اس سے بہتر موقع اس معاملے کو ختم کرنے کا کوئی نہ تھا، خوبیٔ تقدیر سے اسلم بھی تعطیلات

گزارنے آگیا تھا۔ چنانچہ اقبال میاں نے اور ناہید نے اپنا اپنا رول خوش اسلوبی سے ادا کرکے اس معاملہ کو بخیر و خوبی ختم کر دیا۔

لیکن اب ایک اور ٹیڑھا سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اسلم نے دوران گفتگو میں کہا تھا۔ وہ اس شہر سے چلا جائے گا تعطیل کا زمانہ بھی یہاں نہیں گزارے گا۔ اس اعلان نے اپنی اپنی جگہ اقبال اور مسرت دونوں کو مطمئن کر دیا تھا۔

لیکن اسلم اب تک موجود تھا۔

شادی میں صرف چند دن باقی تھے مگر وہ ڈٹا ہوا تھا۔ یوں تو اس کو رہنے یا نہ رہنے کا سوال نہیں تھا۔ ایک جگہ بات ختم ہو چکی تھی۔ دوسری جگہ پختہ ہو چکی تھی۔ لیکن اگر وہ سرپھرا شخص شادی کے دن کوئی نیا گل کھلانے پر آمادہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ یہ اندیشہ اقبال کو تھا! مسرت کو نہیں، اس لئے کہ وہ اپنی کمزوری یعنی اپنے خطوط ایک ایک کرکے اس سے واپس لے آئی تھی۔ اب اسلم زبانی جو چاہے بکے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اس کی غداری اور بے وفائی کا، پھر بھی دل ہی دل میں وہ بھی کڑھ رہی تھی کہ جب کہا تھا تو گیا کیوں نہیں؟ تقریباً ہر روز انجم اسٹیشن جاتا تھا۔ اور یہ دیکھ کر واپس آجاتا تھا کہ ٹرین آئی اور چھوٹ گئی، جن مسافروں کو چڑھنا تھا وہ چڑھ لئے جنھیں اترنا تھا وہ اتر لئے۔ لیکن اسلم! اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہیں موجود ہے۔

یہاں تک کہ شادی کا مبارک دن آگیا۔

سلیم اور مسرت کی شاندار حویلی میں شادیانے بجنے لگے۔ شہنائیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جشنِ نشاط کی ہما ہمی شروع ہو گئی۔

اور عین اس وقت جب تمام مہمان آچکے تھے، قاضی صاحب بھی رونق افروز ہو ہو چکے تھے۔ سلیم سہرا باندھے پیکر انبساط و نشاط بنا بیٹھا تھا۔ اقبال میاں مہمانوں کی پذیرائی کر رہے تھے۔ اور انجم ادھر سے ادھر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اسلم آگیا!

اسلم کو دیکھ کر اقبال اور انجم کی یہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ دونوں کو اپنی عزّت، وقار اور ناموس کی ناؤ ڈوبتی نظر آئی۔ دونوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ عقل حیران تھی کہ اب کیا کیا جائے ــــ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہونے والا ہے؟

بڑی مشکل سے ہوش و حواس مجتمع کر کے اقبال میاں آگے بڑھے، انتہائی نفرت، لیکن انتہائی تپاک کے ساتھ بڑھ کر ملے اور فرمایا:

تم آگئے بیٹا؟!

اسلم نے جواب دیا: جی ہاں حاضر ہوگیا، اس تقریب سعید میں شریک ہونا کیا میرا فرض نہ تھا؟

ہکلاتے ہوئے بولے: ہاں ہاں بہت اچھا کیا۔ آؤ بیٹھو، کیوں بیٹا تمھاری ماں، تمھاری بہن ــ!

اسلم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: اپنی طرف سے تو میں نے بے حد کوشش کی لیکن وہ نہیں آئیں، دونوں نے طبیعت کی ناسازی کا عذر کیا ہے۔

دل میں تو بہت خوش ہوئے لیکن بہ ظاہر اس طرح جیسے نائلہ اور انجمن کے نہ آنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ فرمایا:

طبیعت ناساز ہے تو مجبوری ہے، ورنہ ان کے آنے سے رونق بڑھ جاتی۔ اچھا،

بیٹے آؤ۔ آؤ یہاں بیٹھو اس صوفے پر!

یہ صوفہ پہلی صف میں تھا۔ وہ خاموش بیٹھ گیا۔ سلیم بھی پاس ہی بیٹھا تھا اقبال نے اسلم کا سلیم سے تعارف کرایا۔ سلیم کو اسلم جیسے ناقابلِ التفات لوگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ یہ مسرت کا منگیتر رہ چکا ہے اور اس نے مسرت کو اس سے چھین لیا ہے۔ اس کی آمد پر اُسے حیرت بھی ہوئی اور ایک عجیب طرح کا احساسِ عظمت بھی! یہ کتنے دل گردے کا ہے کہ جس لڑکی سے نسبت چھوٹ گئی ہے اس کی شادی میں شرکت کے لئے آیا ہے۔ اس خیال نے اسے ملتفت ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ گو کچھ کھینچا کھینچا سا تھا لیکن تپاک اور گرم جوشی سے ملا۔ اسلم کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ نہ نفرت کا نہ رقابت کا نہ خوشی کا۔ اس نے سنجیدگی سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

اقبال میاں نے آگ اور پانی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہی لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ اسلم کو اور سلیم کو کس طرح اب ایک دوسرے سے الگ بٹھائیں!

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے پھر رسمی سی باتیں شروع ہوئیں۔ بہت جلد سلیم نے محسوس کر لیا کہ جس شخص سے وہ مخاطب ہے مالی اعتبار سے گو وہ اس کی ٹکر کا نہ ہو، لیکن علم، ذہانت، فراست اور اخلاق میں اس سے کہیں زیادہ اونچا کہیں زیادہ بڑا ہے، بہت جلد وہ مرعوب ہو گیا۔ اور رسمِ نکاح کے بعد جب اسلم رخصت ہونے لگا تو سلیم نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور امید ظاہر کی کہ پھر ملاقات ہو گی، لیکن اسلم نے یہ کہہ کر امید منقطع کر دی کہ میں تو اس تقریب میں شرکت کی وجہ سے رک گیا تھا، کل یہاں سے ایک دوست کے ہاں رانی گنج جاؤں گا اور کالج کھلتے

ہے ، سوال یہ نہیں صرف یہ ہے کہ آپ سے بڑھ کر احمق ، بر خود غلط اور پاگل آدمی بھی دنیا میں کوئی موجود ہے ؟

اسلم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا : خاکساری اچھی چیز ہے لیکن اتنی اچھی بھی نہیں کہ آدمی حقیقت کا اعتراف نہ کرے ، گردن اونچی کر کے فخر کے ساتھ اپنا نام پیش کر سکتے ہو !

خاور جو خاموشی سے بیٹھا ایک باتصویر رسالہ کی ورق گردانی کر رہا تھا ہنسی ضبط نہ کر سکا کھلکھلا کر ہنس پڑا اور صفدر سے گویا ہوا :۔

بڑے بے غیرت ہو ، ہمیشہ منہ کی کھاتے ہو لیکن چپ نہیں رہا جاتا ۔!

صفدر شیو ختم کر چکا تھا ، وہ خاور سے مخاطب ہوا :

سچ کہتے ہو یار ، بار ہا دل میں عہد کیا کہ اس شخص کی لن ترانیوں کے جواب میں خاموش رہا کروں گا ۔ لیکن جانے کیا بات ہے چپ نہیں رہا جاتا ۔ اور جب چپ نہیں رہ پاتا تو شرمندہ ہونا پڑتا ہے ۔

اسلم اور خاور دونوں ہنس پڑے ۔

اتنے میں بہت سے لڑکوں کا ریلا بورڈنگ کے کمپاؤنڈ سے باہر نکلا ۔ یہ سب زرق برق لباس میں ملبوس تھے ۔ ہشاش بشاش ، نعرہ زن ، خوب رد ، خوب تن ۔ یہ ریلا گزرا چلا گیا ۔ صفدر نے جو بہترین سوٹ میں ملبوس ہو چکا تھا ، خاور سے کہا :

تم تو چلو ، یا یوں ہی بیٹھے رہو گے ؟

خاور اٹھ کھڑا ہوا : چلو ، ورنہ ساری نشستیں پُر ہو جائیں گی ۔۔۔۔ تو اسلم تم نہیں چلنے کے ؟

اسلم نے سنجیدگی سے جواب دیا : نہیں !

خاور نے صفدر کا ہاتھ پکڑا - چلو یار، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ! یہ ضدی آدمی ایک مرتبہ نہیں کہنے کے بعد پھر کبھی ہاں نہیں کہے گا !

صفدر اور خاور چلے گئے - اسلم نے سگریٹ سلگایا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر ہٹی کی تاریخ عرب کا مطالعہ کرنے لگا !

صفدر اور خاور ہوسٹل سے نکل کر ہال کی طرف بڑھے، ہر ہر ہوسٹل سے طلبا کی قطاریں نشاط و مسرت کا پیکر بنی اس طرف بڑھ رہی تھیں - ڈے اسکالر کی جماعت بھی آج وقت سے پہلے آگئی تھی - طالبات کے گروہ بھی بہار اندر بہار رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ رواں دواں تھے - ان سب کی منزلِ مقصود ایک ہی تھی، — ہال !

آج عزت مآب گورنر صاحب کالج میں نزولِ اجلال فرما رہے تھے، پرنسپل، پروفیسر، ریڈر، لیکچرار سب اپنے اپنے مقام پر ایک مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے، پرنسپل صاحب اپنے مخصوص لباس میں آراستہ پیراستہ اشتیاق و انتظار اور اضطراب و اضطرار کی مورت بنے، اس بل کھاتی سڑک پر نظریں جمائے کھڑے تھے جدھر سے اعلیٰحضرت کی سواری بادِ بہاری رونق افروز ہوا چاہتی تھی -

تھوڑی دیر کے بعد مجمع میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی :

گورنر صاحب تشریف لے آئے،

بڑا پُرتپاک استقبال ہوا، جب وہ اساتذہ، ممبران کورٹ اور پرنسپل کے حلقے میں ہال کے اندر داخل ہوئے تو سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا - ہز ایکسی لینسی کی قوم بہت جلد

اس دیس سے رخصت ہونے والی تھی، اس کا سامراجی عہد موت کی ہچکیاں لے رہا تھا! اس کی شہنشاہیت دم توڑ رہی تھی! دوسری جنگ عظیم کے اختتام نے اس کے دم خم کی کمر توڑ دی تھی، اپنے ایشیائی مقبوضات اور مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ دینے کا اس نے آخری اور قطعی فیصلہ کر لیا تھا،

لیکن گورنر صاحب کے تیور میں رعونت اور نخوت کی وہی شان تھی جیسے مرکز بھی اسی ٹھاٹھ اور شان سے حکومت کرتے رہیں گے،

پرنسپل صاحب نے ایک نیازمندانہ سپاس نامہ پیش کیا، گورنر صاحب نے مشفقانہ انداز میں جواب دیا۔ طلبہ کی طرف سے یونین کے صدر (اسلم) کو خیر مقدمی تقریر کرنی تھی وائس چانسلر صاحب کی نگاہوں نے دور دور ڈھونڈا مگر وہ گوہر نایاب نظر نہ آیا۔ آخر یہ فریضہ خاور نے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اور کم از کم تھوڑی دیر کے لئے اسلم کی اس بدتمیزی اور بیہودگی کی یاد پرنسپل صاحب کے برہم دل و دماغ سے محو ہوگئی۔

گورنر صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد طلبہ اور طالبات کی ٹولیاں پھر اپنے اپنے ہوسٹل یا گھر کی طرف روانہ ہوگئیں۔

اسلم اب تک کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔

سب سے پہلے خاور اور صفدر پہنچے اور ان سب کے ساتھ اور بھی کئی دوست دندانہ داخل ہوگئے۔

ارشد نے سوال کیا:

یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟

اسلم نے جواب دیا: کتاب پڑھ رہا ہوں۔

جلسے میں کیوں نہیں شریک ہوئے؟

کیوں شریک ہوتا! کیا اس لئے کہ گورنر صاحب بہادر خطاب کرنے والے تھے؟

ہاں — کیا یہ کوئی وجہ نہیں ہے؟

ہے کیوں نہیں! نہ ہوتی تو تم، خاور، صفدر، اور دوسرے تمام طلبہ کیوں دل و جان سے شریک ہوتے؟ لیکن میرے دوست! جو کچھ تم نے سنا وہ میں اخبار میں پڑھ لوں گا۔

یہ گستاخی اور بدتمیزی ہے، جسے پرنسپل صاحب ہرگز معاف نہیں کریں گے!

معافی نہ مانگوں تو بھی معاف نہیں کریں گے؟

اس برجستہ اور بےساختہ جواب پر سب لوگ ہنس پڑے۔

صفدر نے کہا یار اسلم کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کو کیا ہو گیا؟

ارشد گویا ہوا: یہی سوال اکثر مجھے بھی پریشان رکھتا ہے۔ یہ شخص نہ پورا کافر ہے نہ پورا مسلمان، اسے کفر سے بھی نسبت ہے اور اسلام کا بھی دعویٰ ہے؟ یہ آزاد خیال بھی ہے اور قدامت پرست بھی، یہ جوان بھی ہے اور بوڑھا بھی — اور شاید بچہ بھی!

خاور نے مداخلت کرتے ہوئے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا:

ایک ہی شخص، ایک ہی وقت میں جوان بھی ہے، بوڑھا بھی اور بچہ بھی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ارشد اپنے قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگا:

کیوں نہیں ہو سکتا، اسے ہم جوان اس لئے کہتے ہیں کہ بدقسمتی سے جوان ہے، بوڑھا یوں ہے کہ دنیا سے، زندگی سے، خلقِ خدا سے اور شاید خود اپنے آپ سے بھی مایوس ہے

اور آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے۔ بڑھاپے کی علامت سفید بال نہیں، مایوسی ہے انسان جب تک جوان ہے مایوسی اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی، وہ یاس میں بھی آس کے پہلو پیدا کر لیتا ہے اور جہاں بوڑھا ہوا آس بھی یاس سے بدل گئی، اُسے بچہ ہم اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ جب مچل جاتا ہے تو پھر قابو میں نہیں آتا!

صفدر نے کہا: کچھ یہ خاکسار بھی عرض کرنا چاہتا ہے!

خاور نے ٹوکا: پھر بولے؟

صفدر نے جواب دیا: ہاں بھئی! نہیں رہا جاتا ۔۔۔ اس شخص کو ہم کمیونسٹ کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ یہ سرمایہ داروں اور دولت مندوں کا دشمن ہے لیکن ہم اسے کمیونسٹ نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ پابند صوم وصلوٰۃ بھی ہے اسے ہم نیشنلسٹ کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ وطن کا پجاری ہے لیکن اسے ہم نیشنلسٹ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ملت اور وطن کا جب تصادم ہو تو ملت کو ترجیح دیتا ہے، اسے ہم شاعر کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ بڑے اچھے شعر کہتا ہے لیکن ہم اسے شاعر نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ جمالِ رہگزر اور حسنِ بے پروا کو دیکھ کر یہ آنکھیں نیچی کر لیتا ہے، یہ ظالم ہے، اس لئے کہ ہم جیسے دوستوں کے دل توڑتا رہتا ہے لیکن یہ ظالم نہیں ہے کیونکہ دوسروں کا دُکھ دیکھ کر اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے، یہ پاگل ہے اس لئے کہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، لیکن یہ پاگل نہیں ہے کیونکہ اس کی باتوں میں گہرائی ہوتی ہے، بلندی ہوتی ہے حقیقت کی جلوہ سامانی ہوتی ہے، یہ جو کچھ ہے وہ نہیں ہے جو کچھ نہیں ہے وہ ہے، یہ کیا ہے؟ یہ کیا نہیں ہے؟ اسے کوئی نہیں بتا سکتا اور اگر بتا سکتا ہے تو جیبِ خاص سے دس ہزار روپے کا انعام اس کی خدمت میں پیش کروں گا!

قہقہوں کے شور میں اسلم نے سوال کیا :

کیا اگر یہ معمہ میں حل کر دوں تو انعام کے وعدے سے پھر تو نہ جاؤ گے ! اچھا چلو دس ہزار نہ سہی ہوٹل ڈی پکس میں جملہ حاضرین کی دعوت سہی !

صفدر نے یہ شرط منظور کر لی ، سب لوگ اشتیاق کے ساتھ اسلم کی طرف تکنے لگے ۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا :

میں ہوں "شوقِ بلند" اور

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں ؟

مرے حوصلے کی پستی مرے شوق کی بلندی !

خدا نے یہ دنیا اس لئے بنائی تھی کہ انسان فردوسِ بریں کا جویا نہ رہے ، خود اپنی جنت تعمیر کر سکے ، لیکن انسان نے اس دنیا کو جہنم بنا لیا اور فردوس بریں کے حق سے بھی محروم ہو گیا !

تم نے سچ کہا میں کمیونسٹ ہوں ۔ اس لئے کہ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ غریب زیادہ غریب اور امیر زیادہ سے زیادہ امیر ہوتے رہیں ۔ غریبوں کے آنسو بھی نہ پونچھے جائیں اور امیروں کی خون آشامی پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے ! لیکن میں کمیونسٹ کس طرح ہو سکتا ہوں جب کہ میرا مذہب غریب کی ہر حاجت کا کفیل ہے اور کوئی امیر اس کے احتساب کی زد سے باہر نہیں ، خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا جاگیردار !

تم نے یہ بھی سچ کہا میں نیشنلسٹ ہوں اس لئے کہ اپنے وطن سے یہ نہا محبت کرتا ہوں ،

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے ،

یہاں کے باغ اور کھیت، یہاں کے دریا اور سمندر، یہاں کے پہاڑ اور ٹیلے یہ سب میرا دامن دل اپنی طرف کھینچتے ہیں، لیکن میں ہرگز نیشنلسٹ بننے پر قناعت نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مجھے صرف گنگا اور جمنا ہی سے محبت نہیں، دجلہ وفرات اور دریائے نیل سے بھی ہے، اس لئے کہ جس طرح انسان کی فطرت ایک ہے اسی طرح خدا کی ہر مخلوق کی جبلت میں یکسانیت ہے۔ ہر دریا اس لئے ہے کہ خشک زمین کو سیراب کرے، ہر درخت اس لئے ہے کہ اپنی چھاؤں سے تھکے ہوؤں کو آرام پہنچائے، ہر باغ اس لئے ہے کہ پھل دے اور لوگ انھیں کھائیں۔ لہٰذا اگر میں جمنا اور گنگا سے محبت کرتا ہوں تو دجلہ وفرات سے بھی محبت کرنے پر مجبور ہوں اور یہ تم نے غلط کہا کہ ملت اور وطن میں تصادم ہوسکتا ہے وطن کے حدود اور ملت کے حدود الگ الگ ہیں، ان میں تصادم ہو ہی نہیں سکتا کسی طرح!

اور میرے دوست، تم نے یہ بھی سچ کہا کہ میں پاگل ہوں اور اگر میں پاگل نہیں ہوں تو تم سب پاگل ہو، یہ ساری دنیا پاگل ہے!

یہ زندگی جو ہم بسر کر رہے ہیں انسانوں کی نہیں صرف پاگلوں ہی کی ہوسکتی ہے! میں کہتا ہوں اگر یہ دنیا جنت نہیں بن سکتی تو اسے مٹ جانا چاہئے ختم ہو جانا چاہئے تباہ ہو جانا چاہئے!

ارشد نے فقرہ چست کیا: کاش امریکہ کے صدر بن جاؤ۔

صفدر نے سوال کیا: پھر کیا ہوگا؟

سلیم نے جواب دیا: پھر سارے ایٹم بموں کا ذخیرہ ان کے ہاتھ آجائے گا اور یہ

آن کی آن میں ساری دنیا کو بہر شیما بنا کر رکھ دیں گے۔

خاور نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں مسٹر حزر شیف کے پاس ناکو بھیجا جائے، اور وہ کسی اسپتنک میں بٹھا کر زہرہ یا مریخ کی زیارت کرا دیں! اور وہاں کی مخلوق ایسی ہی ہو جیسی یہ چاہتے ہیں۔ کیوں اسلم؟!

صفدر نے تقاضا کیا: چپ کیوں ہو گئے، جواب دو؟

اسلم نے جواب دیتے ہوئے کہا:

ایک ہی بات بار بار دہرانے سے کیا حاصل؟ ابھی ذرا دیر پہلے کہہ چکا ہوں، یا میں پاگل ہوں یا تم سب اور اپنے متعلق وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں ہوں۔ پھر پاگلوں کے منہ لگنا، یا ان کی دیوانگی کی باتوں کا جواب دینا کون سی عقل مندی ہے!

خاور نے کہا:

اچھا بھئی مذاق ختم، یہ بتاؤ آخر تم دنیا سے اور ہم دنیا والوں سے خفا کیوں ہو اس قدر؟

اسلم نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا:

محض اس لئے کہ:

ریاضِ دہر میں ہیں یوں تو رنگ رنگ کے پھول
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی!

ہر طرف خود غرضی مسلط ہے ــــــ ہر شخص صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے!

اور ہونا کیا چاہئے؟ ارشد نے سوال کیا۔

اسلم نے پڑھنے کے لئے پھر سے کتاب کھول لی اور کہا:

"یہ دوسروں کا حق ہے کہ ہمارے بارے میں سوچیں اور فیصلہ کریں۔ ہمیں صرف اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔"

ارشد نے خاور کا ہاتھ کھینچ کر ساتھ لے جاتے ہوئے کہا:

پاگل ہو گیا ہے یہ تو ــــ آؤ چلیں، ریگل میں بڑی عمدہ فلم دکھائی جا رہی ہے!

---

(۳)
ایک اور شاک!

جیسے قسمت نے منہ پھیر لیا تھا اسلم   مسرت کو کھو چکنے کے بعد، بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ یوں تو ہنستا تھا بولتا تھا، کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا، یونین کے جلسوں کی صدارت کرتا تھا، بزمِ احباب میں شریک رہتا تھا، لیکن اس کی دُنیا ویران ہو چکی تھی۔ مسرت نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ مسرت، جسے وہ جان و ایمان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہ ظاہر اس غم کو اس نے دلیری اور بہادری سے سہہ لیا تھا۔ لیکن صرف ظاہر میں ورنہ اندر ہی اندر کام تمام ہوا جا رہا تھا، وہ ہنستے ہنستے دفعۃً سنجیدہ بن جاتا تھا۔ مسرت یاد آجاتی تھی۔ کالج روم میں لیکچر سنتے سنتے عالمِ خیال میں پہنچ جاتا تھا، چشمِ تصور میں مسرت آ بستی تھی، بزمِ احباب کی بحث و گفتگو میں حصہ لیتے لیتے یک بیک سکوت اختیار کر لیتا تھا مسرت کی یاد چٹکیاں لینے لگتی تھی۔ پڑھنے بیٹھتا تھا تو مسرت اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی تھی، اور پھر ایک حرف نہ پڑھ سکتا تھا، سونے لیٹتا تو بڑی دیر تک، رات گئے

تک کبھی کبھی مرغ کی بانگ سحر تک کروٹیں لیتا رہتا، آنسو بہاتا رہتا اور مسرت کی یاد کو دل سے دھکے دے دے کر نکالنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا۔

پھر صبح ہوتی اور پھر وہی تلخیاں اور ناکامیاں اپنے جال میں اسے جکڑ لیتیں، لاکھ لاکھ کوشش کرتا کہ اس قید بے زنجیر سے رہائی حاصل کرے لیکن کامیابی نہ ہوتی۔ اسی طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ بی اے کے امتحان میں وہ شاندار نمبروں سے کامیاب ہوا۔ اور ایم اے میں داخلہ لے لیا۔

ایم اے میں داخلہ لئے ہوئے ابھی چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ سیٹھ قاسم بھائی نور علی نے کالج کی ایک تقریب میں اعلان کیا کہ وہ ایک طالب علم کو اپنے خرچ پر پانچ سال کا وظیفہ دے کر لندن، برلن یا پیرس کی کسی یونیورسٹی میں بھیجنے کو تیار ہیں، وہ پانچ سال کی یکمشت رقم کالج کو دے دیں گے۔ کالج ہونہار، ذہین اور قابل طالب علموں میں سے کسی ایک کو منتخب کرلے اس اعلان کا پرنسپل اور منتظمین کی طرف سے شکر و سپاس کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔

پرنسپل نے ایک سلیکشن کمیٹی قائم کردی جو چند پروفیسروں پر مشتمل تھی۔ پرنسپل صاحب خود اس کمیٹی کے صدر تھے۔

کمیٹی نے درخواستیں طلب کیں، اسلم نے بھی درخواست ٹائپ کی اور بھیج دی۔ دوستوں نے درخواست بھیجنے سے پہلے ہی پیشگی مبارکباد کا تار باندھ دیا۔ صفدر اور رضا ومبارکباد دینے والوں میں پیش پیش تھے۔ صفدر نے تو پیشن گوئی کی کہ کامیابی صرف اسلم کو ہوگی۔ اور وہ لوگ سراسر احمق ہیں جو درخواستیں بھیج کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

انٹرویو ہوا۔ بعض ممبروں نے کچھ سوالات کئے، اسلم نے تسلی بخش جواب دیا۔ ایک ممبر نے اصل مضمون سے ہٹ کر سوال کیا:

تمھیں یقین ہے کہ تم ضرور لندن سے ڈگری لے کر آؤ گے؟

اسلم نے جواب دیا: جی ہاں مجھے یقین کامل ہے۔

سوال کیا گیا: لیکن اس یقین کی بنیاد بھی تو ہوگی کچھ؟

اس نے جواب دیا: یقین اس لئے ہے کہ میں آج تک فیل نہیں ہوا۔

اس لئے بھی یقین ہے کہ جس موضوع پر ریسرچ کے لئے امیدوار کا بھیجا جانا طے پایا ہے میرا خاص موضوع ہے۔ اور اس میں نہایت نمایاں کامیابی کے ساتھ میں نے بی اے کی سند لی ہے۔ اور سب سے زیادہ یقین اس لئے ہے کہ جو لوگ لندن سے ڈگری لے کر آتے ہیں وہ بھی آدمی ہوتے ہیں اور میں بھی آدمی ہوں۔

پرنسپل صاحب نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا:

ہاں بھئی تم آدمی ہو! — اور بڑے اچھے آدمی ہو، تمھاری ذہانت اور فراست بھی شک و شبہ سے ماورا ہے، ہم سے زیادہ تمھیں کون جانے گا، تم رتن ہو ہمارے کالج کے! — اب تم جا سکتے ہو!

اسلم خوش خوش چلا آیا۔ صفدر اس کا روم فیلو بھی تھا اسے دیکھتے ہی لپکا اور بیقراری سے پوچھا:

کہو کیسی گزری؟

اسلم نے فخر اور مسرت کے ساتھ سر اونچا کر کے کہا: بہت اچھی گزری — یار، تمھاری پیش گوئی تو حرف بحرف پوری ہوتی نظر آ رہی ہے!

صفدر نے خوش ہوتے ہوئے سوال کیا: یعنی تم کامیاب ہو گئے؟

اسلم نے جواب دیا: ہاں اور کیا! کامیاب ہی سمجھو۔

اور پھر اس نے ساری کارروائی از اوّل تا آخر سنا دی، صفدر نے اسے گلے سے لگایا اور بولا: بھئی مبارک، اب دعوت کب کرتے ہو، وہ تو کرنا ہی پڑے گی!

دعوت کا لفظ سنتا ہوا خاور داخل ہوا۔:

اکیلے اکیلے دعوت کے پروگرام بن رہے ہیں، بڑے غدار ہو تم لوگ، ہمارے بغیر بھی کوئی دعوت مکمل ہو سکتی ہے؟

صفدر نے گرم جوشی کے ساتھ، جیسے وہ خود دعوت کر رہا ہے کہا:

تم تو ضرور چلو گے؟ کیوں بھئی اسلم تو پھر آج کا ڈنر ہے؟

اسلم نے پھر مسکراتے ہوئے کہا:

ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش نہ کرو! کھالینا دعوت۔ پہلے پرنسپل صاحب کی طرف سے باقاعدہ اعلان تو ہونے دو!

صفدر نے اس عذر کو عذر لنگ قرار دیتے ہوئے کہا:

کیا اعلان میں اب بھی کسر ہے کچھ؟ اور اگر اعلان اتنا ہی ضروری ہے تو اس کے بعد پھر ایک مرتبہ کر دینا دعوت۔

خاور نے ہاں میں ہاں ملائی: بھائی اس کارِ خیر میں حیل حجّت سے کام نہ لو، غریبوں کا پیٹ بھروگے تو اجر پاؤگے بارگاہِ الٰہی سے!

اسلم ہنسنے لگا:

لیکن دعوت کھاؤ گے کسی اچھے ہوٹل میں۔ اور میرے پاس وہی رقم ہے جو ٹیوشن کی ملی ہے۔ کل ساٹھ روپے، اس میں بہت سے کام کرنے ہیں۔ تم تو کھاتے پیتے لوگ ہو ایک دن میں ساٹھ کیا سو روپے خرچ کر سکتے ہو، میری تو کل پونجی یہی ہے!

صفدر نے گفتگو کو بحث کا رنگ دیتے ہوئے کہا:

لیکن آج ساٹھ کے مالک ہو کل ساٹھ ہزار کے مالک ہو جاؤ گے۔ لندن سے واپس آنے کے بعد اسی کالج میں پہلے پروفیسر اور پھر پرنسپل نہ بن گئے تو ہمارا ذمہ!

خاور نے پھر ہانک لگائی۔ آمین یارب العالمین!

اسلم نے کہا: اچھا فقیرو کھا لینا، پیچھا تو چھوڑو کسی طرح!

شام ہوتے ہی صفدر اور خاور نے آ کر گھیر لیا اُسے اور ایک اچھے ہوٹل میں لے جا کر خوب ہاتھ صاف کئے۔ بل بائیس روپے کا بنا۔ اسلم نے بل ادا کر دیا۔ باہر نکلا تو خاور نے سینما کا پروگرام پیش کر دیا۔ یہ فرمائش بھی پوری کرنی پڑی۔ بعد میں آئس کریم بغیر پوچھے دونوں نے منگائی۔ خوب کھائی، بل اسلم کو ادا کرنا پڑا۔ ہوسٹل پہنچتے پہنچتے چالیس روپے خرچ ہو چکے تھے۔ رات کو بڑی دیر تک گپیں ہوتی رہیں۔ کوئی ایک بجے کے قریب یہ لوگ سونے کے لئے لیٹے!

دوسرے روز سلیکشن کمیٹی کا اعلان سنا دیا گیا!

کمیٹی نے اتفاق رائے سے صفدر کو منتخب کیا تھا!

اس اعلان نے اسلم کو حواس باختہ کر دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ واقعات کا رُخ اس طرح پلٹ سکتا ہے۔ خاور بھی اس وقت موجود تھا، اس نے اسلم کی حالت سے متاثر ہو کر کہا:

یار یہ صفدر بڑا چالباز ہے، اس نے تمہیں دھوکے میں رکھا، اندر ہی اندر باپ کے ذریعہ ممبران کمیٹی کو توڑتا رہا۔ اور تم سے دعوتیں کھاتا رہا، مجھے یہ واقعہ خود اس نے آج ہی بتایا ہے۔ میں نے بہت ملامت کی اُسے۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو دعوت میں ہرگز نہ شریک ہوتا!

اعلان پڑھ کر صفدر کمرہ میں آیا تو اسلم موجود تھا۔ اس نے کہا:

دو حریف اکھاڑہ میں اترتے ہیں، ایک کامیاب ہوتا ہے دوسرا ناکام۔ جو ناکام ہوتا ہے وہ کامیاب حریف کو مبارکباد دیتا ہے۔ اسلم مجھے مبارکباد دو، ہم دونوں نے کوشش کی، تم کامیاب نہ ہو سکے، میں ہو گیا!

اسلم نے ایک نظر صفدر پر ڈالی اور گویا ہوا: بے شک مبارکباد کے تم مستحق ہو ایک نہیں کئی مبارکبادوں کے، حیران ہوں کس کس کامیابی پر مبارکباد دوں!

صفدر نے جبین شکن آلود کے ساتھ کہا: میں سمجھا نہیں، کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

وہ بولا: تمھارا ایک کارنامہ یہ ہے کہ تم نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا، اگر تم اپنے ارادہ کا اظہار کر دیتے تو از خود تمھارے حق میں دستبردار ہو جاتا، دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اپنی درپردہ کوششوں کو بڑی کامیابی سے چھپانے میں تم کامیاب ہو گئے۔ تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ بہت اچھے ایکٹر ہو تم۔ ایک طرف میری کامیابی کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری طرف پرنسپل صاحب کو اور ممبران کمیٹی کو اپنے والد کے معزز، متمول اور با اثر دوستوں سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور چوتھا کارنامہ یہ ہے کہ جس مضمون سے تمھیں کوئی لگاؤ نہیں، جس کے بارے میں تم ایک لفظ بھی نہیں جانتے، جسے نہ تم نے کبھی پڑھا نہ سنا اس میں پی ایچ ڈی کرنے جا رہے ہو، آخری مبارکباد اس وقت دوں گا جب ڈگری لے کر خیر سے واپس آجاؤ گے!

صفدر ان باتوں سے چڑ گیا۔ لیکن اس خیال سے کہ بات بڑھانا مناسب نہیں ہے خاموش ہو گیا۔

اب اسلم کمرہ میں تنہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں ایک مرتبہ پھر خاور کی باتیں گونجنے لگیں

آخر ضبط نہ کرسکا، سیدھا پرنسپل صاحب کے کمرہ میں پہنچا۔ اسے دیکھ کر پرنسپل صاحب کھڑے ہوگئے۔ کہنے لگے:

آؤ اسلم، بیٹھو، کوئی خاص بات ہے؟

اسلم جلا بھنا تو تھا ہی کہنے لگا، آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دینے آیا ہوں!

پرنسپل صاحب کو اپنے ایک شاگرد اور طالب علم سے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ انھوں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

کیا کہنا چاہتے ہو؟ حسنِ انتخاب کیسا؟

اسلم نے چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ برہم انداز میں کہا:

امتحان مقابلہ میں صفدر کی کامیابی کیا آپ کے حسنِ انتخاب کی دلیل نہیں ہے؟

پرنسپل صاحب نے نہایت اطمینان سے جیب میں ہاتھ ڈالا، سگریٹ کیس نکالا سگریٹ نکال کر پہلے اُسے میز پر ٹھوک کا بجایا، پھر سلگایا اور ایک لمبا سا کش لیتے ہوئے فرمایا:

اوہ، تمھارا یہ مطلب ہے، لیکن تمھیں اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ آج تک کوئی طالب علم مجھ سے لڑنے نہیں آیا۔ یہ نئی بات تم نے شروع کی ہے، کیا تمھیں یہ نہیں معلوم یہ انتخاب میں نے نہیں کیا، کمیٹی نے کیا ہے، کیا تم کمیٹی پر بدگمانی کرتے ہو؟ یا اپنے استادوں سے بدظن ہو!؟

اسلم پر اب تک آشفتہ سری کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے کہا: اگر یہ انتخاب اہلیت استعداد اور قابلیت کی بنا پر کیا گیا ہوتا تو نہ مجھے شکایت ہوتی نہ اعتراض کی جسارت! لیکن یہ انتخاب یکسر جانبدارانہ ہے۔ اب بلا لیجیے صفدر کو اور ہم دونوں کا امتحان لیجیے۔ اور دیکھیے کون کامیاب ہوتا ہے، پھر آپ سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا کون ہوسکتا ہے کہ جس

موضوع پر ریسرچ کے لئے آپ صفدر کو بھیج رہے ہیں اس کا ایک لفظ بھی وہ نہیں جانتا۔ وہ بی اے کے امتحان میں نہایت حقیر نمبروں سے کامیاب ہوا ہے اور میں؟ ۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بالکل صفر ہے اور میرا؟ وہ صحیح انگریزی نہ بول سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے لیکن پروفیسر آرنلڈ میری انگریزی کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں وہ آپ ہی کے ذریعے مجھے معلوم ہوئی تھی ۔ آج تک اس نے کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا۔ میرے متعدد تحقیقی مقالات بلند پایہ رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

مجھے بتائیے میں کیوں ناکام ہوا اور وہ کیسے کامیاب ہو گیا۔؟

میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کیا خالص علمی معاملات کا تصفیہ بھی سفارش، مداخلت اور دباؤ کے تحت ہوتا ہے۔؟

آپ اور کمیٹی کے دوسرے ممبران ہمیشہ مجھ پر فخر کرتے رہے، میری قابلیت کو سراہتے رہے، شاندار الفاظ میں میری تحسین وستائش کرتے رہے، لیکن جب وقت آیا، تو معلوم ہوا ـــــ میں کچھ نہ تھا اور وہ سب کچھ تھا جو کچھ نہ تھا!

میں آپ کے پاس سفارش نہیں لا سکا، رہ گیا، لیکن خان بہادروں، سروں اور رئیسوں کی بات آپ نہ ٹال سکے! کیا ایسا ہونا چاہئے؟

پرنسپل صاحب خاموشی سے اسلم کی باتیں سنتے رہے، پھر انھوں نے بالکل بدلے ہوئے لب ولہجہ میں فرمایا:

سچ پوچھئے تو تم واقعی تم بہترین امیدوار تھے اور اگر تم منتخب ہو جاتے تو سب سے زیادہ خوشی مجھی کو ہوتی، لیکن ایسے مواقع پر صرف قابلیت ہی نہیں دیکھی جاتی۔ کچھ اور چیزیں بھی پیش نظر رکھنا پڑتی ہیں۔

"مثلاً کیا ؟" اسلم نے پوچھا : کیا ازراہ کرم آپ میری معلومات میں اضافے کے لئے بتائیں گے کہ وہ کیا موثرات تھے جنھوں نے مجھے ناکام اور صفدر کو کامیاب کر دیا ؟

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ پرنسپل صاحب نے فرمایا ۔ بہرحال سیاسی مصلحتیں پیش نظر رکھنا پڑتی ہیں ۔ ورنہ تم سے عداوت نہیں اور صفدر سے محبت نہیں بہرحال میں کوشش کروں گا کہ تلافی کر سکوں ! اب نہ سہی کسی اور موقع پر سہی !

آپ ضرور کسی آئندہ موقع پر تلافی کی کوشش کریں گے ، اسلم نے جھنجلاتے ہوئے کہا : بشرطیکہ اس وقت تک کوئی نیا صفدر نہ پیدا ہو گیا ۔ بہرحال میں نے کالج سے رخصت ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے !

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا !

پرنسپل صاحب تصویر حیرت بنے اسے دیکھتے رہے ، کچھ نہ کہہ سکے !

اسلم چلا گیا ۔ لیکن پرنسپل صاحب دوگونہ عذاب میں مبتلا ہو گئے ۔ وہ بظاہر دھواں اڑا رہے تھے لیکن حقیقتاً سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے ۔ ایک طرف ضمیر کی خلش تھی ، دوسری طرف ایک معمولی سے طالب علم کی سرکشی ! ضمیر کہتا کہ انھوں نے اسلم کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور نخوت اکساتی کہ گستاخ اور سرکش طالب علم تعزیر کا مستحق ہے ۔ ضمیر کہتا جس طرح بھی ہو اس کا ٹوٹا ہوا دل جوڑ دینا چاہیئے ، پندار کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اس طرح کچل دیا جائے کہ پھر سر نہ اٹھا سکے ۔ رہ رہ کر انھیں صفدر پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نالائق لڑکے نے نااہلیت کے باوجود خواہ مخواہ کیوں ٹانگ اڑا دی کس لئے میدان میں اتر آیا ؟ اگر اس نے مداخلت بیجا نہ کی ہوتی ، سفارشیں نہ لایا ہوتا ۔ اور دباؤ نہ ڈلوایا ہوتا تو یقیناً حقدار کو اس کا حق مل جاتا ۔ لیکن جو کچھ ہونا تھا ہو چکا

اب یہ مسئلہ از سر نو نہ اٹھایا جا سکتا ہے، نہ اس فیصلے میں کسی طرح کی ترمیم یا تبدیلی کی جا سکتی ہے!

اتنے میں پروفیسر مرز آگئے اور ان سے بعض دوسرے مسائل پر گفتگو چھڑ گئی!

(۶)

دلِ مایوس

پرنسپل صاحب کے ہاں سے واپس آکر اسلم اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا اب کیا کرنا چاہیئے؟

گھر کے حالات ویسے ہی درست نہیں تھے۔ سوچا، ملازمت کر لینی چاہیئے لیکن ملازمت کا ملنا کچھ آسان تو نہیں۔ وہ زمانہ مدّت ہوئی گزر گیا جب بی اے کی سند حاصل کرتے ہی اچھّی سی ملازمت مل جاتی تھی، اب بڑی بڑی ڈگریاں لے کر گھومتے ہیں اور دھتکار دیئے جاتے ہیں۔

پھر ــ پھر کیا ہوگا؟

اسی فکر میں بیٹھا تھا کہ خاور آگیا۔ اس نے ندامت آمیز لہجے میں کہا:

اسلم! میں بہت شرمندہ ہوں، کیا تم مجھے معاف نہیں کر دو گے؟

اسلم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اور گویا ہوا: تم نے تو میری کوئی خطا نہیں کی ہے

معافی کیسی ؟ !

وہ بولا : میں اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا ہوں ، مجھے صفدر کی گھناؤنی سازش میں شریک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بخدا مجھے علم نہ تھا کہ وہ ایسا ناپاک کھیل کھیل رہا ہے ایک طرف تمھاری تعریف ، تمھاری قابلیت کا اعتراف ، اپنی نااہلیت کا بجا طور پر اقرار اور دوسری طرف اندر ہی اندر سازش ! مجھ سے کہہ رہا تھا اور بڑے فخر سے کہہ رہا تھا دیکھ لیا خاور تم نے صرف قابلیت ہی سب کچھ نہیں ہوتی ، ہنر بھی کسی چیز کا نام ہے ۔ اسلم کی قابلیت دھری رہ گئی میرا ہنر کام آگیا ! سر اعجاز حسین اور خان بہادر مقصود علی اور نواب شجاعت جنگ ، یہ سب میرے والد کے نیاز مند ہیں۔ سرکاری خرچ پر ہمیشہ ابّا جان انھیں شکار کھلاتے ہیں ۔ ان کی دعوتیں کرتے ہیں ، خاطر مدارات کرتے ہیں ۔ میں ان چیزوں کو غلامانہ ذہنیت سے تعبیر کیا کرتا تھا ۔ لیکن یار وہی غلامانہ ذہنیت بامراد کر گئی ۔ سر اعجاز حسین پرنسپل صاحب کے پرانے مربی ہیں ، انھوں نے پرنسپل صاحب کو دبوچا ، خان بہادر صاحب پروفیسر اشرف کے برادر نسبتی ہیں اور جانتے ہی ہو ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف ، نواب شجاعت جنگ نے بارہا نازک مواقع پر پروفیسر الطاف کا ساتھ دیا ۔ اور انھیں بھنور سے نکالا ، لیجئے یہ بھی گئے ۔ یہی دو لوگ کمیٹی کے ممبر تھے ، ہاری ہوئی بازی جیت لی خاکسار نے ، ورنہ صرف قابلیت پر دارو مدار ہوتا تو بندہ کی پوچھ کہاں ہوتی ! ؟

اسلم نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ خاموشی سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا خاور نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

ابھی حضرت نئے نئے سوٹوں کا آرڈر دے گئے ہیں ، مجھے بھی ساتھ لئے جا رہے

تھے، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ طبیعت ہٹ گئی اس شخص سے۔ دولتوں سے یہ فریب!
لیکن کیا ہوا؟ وہ دو ہزار ڈگریاں لے کر آجائے تمہارا مقابلہ تو نہیں کر سکتا! مجھے امید
ہے تم ایم اے میں اوّل آؤ گے اور حکومت تمہیں وظیفہ دے کر بھیجے گی۔

اسلم نے کہا: لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایم اے نہیں کروں گا۔

خاور نے حیران ہو کر پوچھا: یہ کیا بک رہے ہو؟ دماغ چل گیا ہے کچھ؟

یہی سمجھ لو! ——— یہ میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے!

لیکن کیوں؟ آخر کیوں؟

اس لئے کہ ہر چیز اب بکنے لگی ہے، اور میری جیب میں اتنے دام نہیں ہیں کہ خرید سکوں، میری جس قابلیت کے تم سب، پرنسپل صاحب اور پروفیسر صاحبان معترف تھے وہ بازار میں دو کوڑی کی بھی نہ نکلی، میں شاندار نمبروں سے بی اے میں کامیاب ہوا۔ تم سب نے، پرنسپل صاحب نے، پروفیسر صاحبان نے مبارکبادوں کا ڈھیر لگا دیا میرے قدموں میں، لیکن نتیجہ؟ یہی نا کہ ایک ایسا شخص مجھ سے بازی لے گیا جو ہر اعتبار سے فروتر تھا! میرے مقابلے میں۔ پھر آگے پڑھ کر کیا کروں؟ بی اے کر کے کیا ملا ہے جو ایم اے کر کے مل جائے گا۔ آج بھی میری جیب خالی ہے کل بھی خالی رہے گی! نہ آج پرنسپل صاحب کو اور ممبرانِ سلیکشن کمیٹی کو خرید سکا، نہ کل خرید سکوں گا!

کہتے تو ٹھیک ہو، لیکن ارادہ کیا ہے آخر؟

ملازمت ——— کوئی سی بھی ملازمت! ورنہ فاقے، دریوزہ گری ——— زیادہ سے زیادہ خودکشی! بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے!

خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو! اتنے مایوس کیوں ہوئے جاتے ہو؟ دُنیا میں

جتنے بڑے بڑے آدمی ہوئے ہیں سب تمہاری طرح غریب ہی تھے !

بڑا آدمی تو نہیں اب بھی ہوں، لیکن بڑائی اور دنیاوی ترقی دو الگ الگ چیزیں ہیں میرے دوست !

غلط ــ ترقی یافتہ ممالک پر ایک نظر ڈالو، جمہوریتوں کے صدر، حکومتوں کے وزرا، اعظم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ کیا تھے ؟ کوئی اخبار بیچتا تھا، کوئی پریس میں نوکر تھا، کوئی ہوٹل میں خدمت گاری کرتا تھا، لیکن ــ

لیکن یہ واقعات ترقی یافتہ ممالک کے ہیں ہمارے دیس میں ایسا نہیں ہوتا، اور شاید ابھی بہت دنوں تک نہیں ہوسکے گا۔ دیکھ لو ــ محمد علی کتنا قابل تھا، فاقے کرکے مرا، حسرت موہانی کو دنیا سر پر بٹھاتی ہے لیکن پھٹے کپڑے پہنتا ہے، لیکن یہ لیڈر دولت مند ہیں، وہ سب کچھ ہیں، ان دولت مند لیڈروں میں کئی حقیقی لیڈر ہیں، ان کی قابلیت، ان کا خلوص، ان کا جذبۂ خدمت ہر طرح کے شک و شبہہ سے بالا ہے، لیکن زیادہ تر ایسے ہیں کہ اگر غریب ہو جائیں تو کوئی بات بھی نہ پوچھے، سارا بھرم صرف دولت سے قائم ہے۔

یار! تم تو تقریر کرنے لگے !

لیکن چھیڑا تو تم ہی نے تھا۔ تو چپ ہوا جاتا ہوں، تم کہو کچھ !

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ! ــ کہوں کیا، صرف یہی کہتا ہوں کہ ایم اے کرلو۔

ہرگز نہیں میرے دوست !

کیا نہیں ــ یقین ہے، ملازمت مل جائے گی ، ؟

ملازمت نہ ملے گی تو مزدوری ملے گی، ــ کیا وہ بھی نہیں ملے گی ؟ لیکن اب میں

ایم اے کر کے اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا!

عجیب ضدی آدمی ہو ۔ بھئی دوسروں کی بھی مان لیا کرو!

تم کیوں نہیں مان لیتے؟ کیوں ضد کئے جا رہے ہو؟

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ارشد آ گیا:

ہلو اسلم! ــــ ہاں سنا ہے تم نے کالج سے رخت سفر باندھنے کا تہیّہ کر لیا ہے؟ ــ کیا واقعی؟

اسلم نے خاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

میرے پرائیویٹ سکریٹری سے پوچھو!

خاور نے افسردہ اور مغموم لہجے میں کہا:

ہاں ـــ یعنی جنون سوار ہے حضرت پر ـــ ملازمت کریں گے!

اسلم نے خاور کو نظر انداز کر کے اسلم سے سوال کیا:

کہیں مل بھی رہی ہے نوکری!

وہ متبسّم ہو کر بولا:

ہاں بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے ۔ روزنامہ "قوم" کے مالک صاحب عرصے سے اصرار کر رہے تھے کہ اخبار کی ایڈیٹری قبول کر لو، مگر میں ٹال جاتا تھا اب اِدھر میرا کالج سے جی اُکتایا، اُدھر اُن کا اصرار بڑھا، تو میں نے سوچا کر لینی چاہئے ملازمت ـــــــ فی الحال پانچسو روپے ماہوار دیں گے، بعد میں ترقّی کا وعدہ ہے!

اس گپ پر خاور کا زور سے ہنسنے کا جی چاہا ـــ لیکن اس جھوٹ میں سچ

کا امکان بھی تھا ۔۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا :

آدمی واقعی قابل اور ہونہار ہے ، ہو سکتا ہے کہ سٹہ لگ گیا ہو اور ارشد نے بھی سوچا کہ اسلم جیسا قابل آدمی واقعی اس منصب کا اہل ہے اور اس میدان میں ضرور ترقی کرے گا ۔

اس نے کچھ فخر، کچھ مسرت کے جذبات کے ساتھ کہا :

تو پھر تم میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کرو ۔

اسلم نے خاور سے کہا :

جمع کر لو اس مبارکباد کو بھی میرے کھاتہ میں ۔ شکریہ !

(۷)

بگڑی بن گئی

بعض دفعہ بات بنتی ہے تو بے سان و گمان بن جاتی ہے۔ اسلم نے جو بات دوستوں سے مذاق میں کہی تھی وہ چند گھنٹے کے اندر امرِ واقعہ بن گئی۔ وہ سیدھا "قوم" کے دفتر میں پہنچا، اس سے پہلے اس کے کئی مقالات اس اخبار نے نمایاں طور پر شائع کئے تھے۔ امید تھی اچھی پذیرائی ہوگی۔ وہ سیدھا پروپرائٹر کے دفتر میں پہنچا۔ منشی سجاد حسین ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم آدمی تھے، دبیز شیشے کی عینک ناک پر رکھے، صرف بنیان پہنے اور تہمد باندھے، بڑا سا حقہ سامنے رکھے محویت اور استغراق کے عالم میں بڑی تیزی سے کچھ لکھ رہے تھے، چاپ سن کر لکھتے لکھتے گردن اٹھائی اور پوچھا:

"کون؟"

اور بدستور لکھتے رہے، اسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد منشی صاحب نے محسوس کیا آنے والا کھڑا ہے۔ ویسے ہی لکھتے لکھتے فرمایا:

کون ؟

اور بدستور لکھتے رہے۔ اسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا رہا کچھ دیر کے بعد منشی صاحب نے محسوس کیا، آنے والا کھڑا ہے، ویسے ہی لکھتے لکھتے فرمایا:

کون ہے ـ کیا ہے ؟

لیکن گردن اسی طرح جھکی ہوئی تھی۔ اور قلم ایسے چل رہا تھا جیسے آب رواں پہ کشتی چلتی ہے! اسلم نے اس مرتبہ ہمت کر کے کہا:

جی میں ہوں ــ اسلم!

منشی صاحب نے اسی طرح گردن جھکائے جھکائے کہا:

اسلم! ـــ ابے بھاگ، دیکھتا نہیں ہے ہم کام کر رہے ہیں!

اس انداز تخاطب نے اسلم کا حوصلہ پست کر دیا، اسے بالکل نہیں معلوم تھا منشی صاحب کے نواسے کا نام بھی اسلم ہے۔ اور وہ وقت بے وقت انھیں بہت پریشان کرتا رہتا ہے وہ الٹے پاؤں واپس جانے والا ہی تھا کہ منشی صاحب نے یہ دیکھنے کے لئے کہ تعمیل حکم ہوئی یا نہیں، نگاہ غلط انداز سے اپنے نواسے کو دیکھنا چاہا۔ مگر ایک اور اسلم کو دیکھ کر وہ شرمندہ سے ہو گئے، عینک میز پر پٹک، قلم پھینک بولے

معاف کیجئے گا ـــ آئیے آئیے تشریف لائیے!

وہ واپس چلا آیا۔ منشی صاحب نے بڑے تپاک اور گرم جوشی سے اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا: یاد نہیں پڑتا، آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی!

اس نے جواب دیا: میرا نام اسلم ہے، اس سال میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ ایم اے کرنے کا ارادہ تھا مگر اب ملازمت کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کے اخبار میں میرے

مقالات بھی کبھی کبھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

اتنا تعارف کافی تھا، منشی صاحب نے اور زیادہ تپاک اور اس سے زیادہ اپنائیت کے ساتھ فرمایا:

بھئی بہت اچھا کیا جو چلے آئے تم جیسے نوجوانوں کی ہم جیسے از کار رفتہ لوگوں کو ضرورت بھی بہت ہے۔!

پھر ایک انگریزی اخبار اٹھایا، پہلے صفحہ کی ایک بڑی سی خبر پر سرخ پنسل سے نشان لگایا۔ اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے رطب اللساں ہوئے۔:

بی اے ہونا دوسری بات ہے اور ایک اچھا مترجم ہونا بالکل دوسری بات، ذرا اس خبر کا ترجمہ تو کر دو، دیکھیں کتنی روانی سے اور کتنی جلدی کرتے ہو؟!

اسلم نے خبر کا ترجمہ چند منٹ میں کر کے پیش کر دیا۔ منشی صاحب پڑھ کر خوش ہو گئے، بھئی خوب، بہت خوب! ماشاء اللہ تم تو منجھے ہوئے مترجم معلوم ہوتے ہو لیکن بُرا نہ ماننا ابھی ایک امتحان اور باقی ہے۔ ذرا ایک نوٹ تو لکھو تازہ بجٹ پر!

اسلم نے پھر تعمیلِ ارشاد شروع کر دی اور پندرہ منٹ میں ایک کالم کا نوٹ لکھ کر پیش کر دیا۔

منشی صاحب نے ایک ایک حرف پڑھنے کے بعد جوشِ مسرت سے بے قابو ہو کر فرمایا: کیسے مانِ لوں میدانِ صحافت میں نوزارد ہو! بڑا اچھا نوٹ لکھا ہے، جو نکتہ چینی کی ہے برمحل، جو تجویز پیش کی ہے مناسب، الفاظ جچے تلے ––– انداز بیان میں شوخی بھی اور سنجیدگی بھی!

پھر گھنٹی بجائی ––– ایک ملازم حاضر ہوا۔ اُسے وہ نوٹ دیتے ہوئے فرمایا: جاؤ

کاتب کو دے آؤ! کہنا یہ ایڈیٹوریل ہے!

اسلم کا دل بلیّوں اچھلنے لگا۔ بی اے میں پاس ہونے کی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی جتنی اس انٹرویو میں کامیاب ہونے کی ہوئی۔ دفعتہً پھر منشی صاحب کی آواز پردۂ گوش سے ٹکرائی:

میاں صاحب زادے ایک آخری اور چھوٹا امتحان اور دینا ہوگا! ذرا ایک چٹپٹی سی خبر تو بنا کر دکھاؤ،

اسلم چونک پڑا: ترجمہ کرنے کا ڈھنگ آتا تھا کر دیا۔ مضمون کے سلیقے سے واقف تھا لکھ دیا، لیکن خبر کس طرح بنائی جاتی ہے، یہ انکشاف تو بجائے خود ایک خبر تھا۔ دلچسپ بھی اور سنسنی خیز بھی!

وہ حیرت سے منشی صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ منشی صاحب نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔ مسکرائے، پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر حقّے کا ایک زوردار کش لگاتے ہوئے فرمایا:

بھئی سوچ کیا رہے ہو! بناؤ کوئی سی بھی خبر!

اسلم نے کہا: معاف کیجئے، خبر بنائی کس طرح جاتی ہے یہ تو میں بالکل نہیں جانتا! خبر تو کسی واقعے کی ہوتی ہے، اور واقعہ ہی نہ ہو اور خبر بن جائے، یہ تو عجیب سی صنعت ہے۔ شاید اس امتحان میں ایک نمبر بھی نہیں لے سکوں گا!

منشی صاحب اعتماد آفریں لہجے میں گویا ہوئے: نہیں نہیں نہیں، ہو سکتے تم "مواد" میں دیتا ہوں خبر تم بناؤ۔ بلکہ رہنے دو، نمونہ کے طور پر ایک خبر میں خود بنا کر دکھاتا ہوں۔

اسلم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ یہ تجویز قبول کر لی، جی ہاں ضرور!

منشی صاحب سر جھکا کر لکھنے لگے: چند منٹ میں ایک سلپ اس کی طرف پھینک

دی، گھسیٹ کر۔ اس نے بیتابی کے ساتھ وہ سلپ اٹھائی اور پڑھنی شروع کردی!
اگرچہ اب تک تصدیق نہیں ہوسکی، لیکن ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے میونسپل بورڈ کو توڑ دینے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسٹر صدیقی کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کا فیصلہ بھی ہوچکا ہے۔ موجودہ چیئرمین صاحب کی بے ضابطگیوں پر قانونی کارروائی کرنے پر بھی غور کیا جارہا ہے۔ یہ خبر باشندگانِ شہر کے لئے انتہائی مسرت بخش ثابت ہوگی۔ کیونکہ وہ میونسپلٹی کی بدانتظامیوں، چیئرمین کی خویش پروری اور اقربا نوازی سے بہت تنگ آچکے ہیں۔

اسلم نے سلپ واپس کی تو مدیرانہ شان اور پندار کے ساتھ منشی صاحب نے پوچھا:
پڑھ لیا؟! — اسے کہتے ہیں خبر سازی!
اسلم نے کچھ دیر تامل کے بعد کہا:— واقعی کمال ہے!
حوصلہ افزائی کرتے ہوئے منشی صاحب نے فرمایا:
یہ کمال تم بھی حاصل کرسکتے ہو!

وہ بولا: لیکن آپ کی بنائی ہوئی یہ خبر واقعے کے بالکل خلاف ہے۔ میونسپلٹی سے اہلِ شہر کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہے، چیرمین صاحب بھی بڑے شریف اور معقول آدمی ہیں۔ آپ کے مجوزہ ایڈمنسٹریٹر مسٹر صدیقی مانے ہوئے راشی ہیں۔ اور اگر حکومت نے یہ اقدام کیا تو یہ انتہائی احمقانہ اقدام ہوگا!

شفقت آمیز نظروں سے منشی صاحب اسلم کو دیکھتے رہے اور اس کی باتیں مزے لے لے کر سنتے رہے۔ پھر محبت بھرے انداز میں اس کے شانے تھپتھپائے اور فرمایا:
بچے ہو، یہ فن کی باتیں ہیں، میرے عزیز یہ خبر مجموعہ ہے بہت سے کمالات کا جنہیں

تم نہیں سمجھ سکتے! میں سمجھاتا ہوں، لو سنو!

اسے غیر مصدقہ کہہ کر ہم ذمہ داری سے بچ گئے۔ "قابل اعتبار ذرائع" سے حاصل کر کے اپنا بھرم قائم کر لیا۔ پھر لطف کی بات یہ دیکھو کہ خبر کی خبر اور تجویز کی تجویز۔ خبر عوام کے لئے، تجویز حکومت کے لئے، صدیقی صاحب بڑے با اثر شخص ہیں قتل بھی کر دیں تو کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ رشوت سے کیا بگڑ جائے گا ان کا، البتہ یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو یا صحیح! وہ ممنون ہوں گے۔ ہمیشہ ہمارے کام آئیں گے۔ چیئرمین صاحب شریف تو بے شک ہیں لیکن یہی شرافت لے ڈوبے گی انھیں، اچھی شرافت ہے "قوم" کو اشتہار تک نہیں دیتے، کہتے ہیں اشاعت کم ہے۔ ہاں صاحب کم ہے تو یہ قصور ہمارا ہے یا پڑھنے والوں کا! — دیکھا تم نے چند سطریں ہیں لیکن حکومت کے ایوان سے لے کر چیئرمین صاحب کے دولت خانہ تک تہلکہ مچ جائے گا۔ تو میاں یہ کام بھی کرنا ہوگا تمھیں!

پھر گھنٹی بجی — ملازم آیا۔ سلپ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کاتب کو دے دو، کہنا پہلے صفحے پر چوکھٹے میں آئے گی!

ملازم گیا تو پھر اسلم سے مخاطب ہوئے: آ گیا سمجھ میں!!

اسلم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: جی نہیں — نہ آیا ہے نہ آئے گا!

منشی صاحب نے سراپا حیرت بن کر سوال کیا: کیوں؟

وہ بولا: بحث کرنے سے کیا فائدہ! میں اپنی درخواست واپس لیتا ہوں۔ یہ کام میں کسی طرح بھی نہیں کر سکوں گا، یہ میرے اصول اور ضمیر کے خلاف ہے۔

منشی صاحب کو ہنسی آ گئی۔ کیا کہا اصول! ضمیر؟ پھر کھاؤ گے کیا؟

فاقے کر لوں گا۔ اسلم نے جواب دیا

فاقے سے پیٹ نہیں بھرتا!

بھوکا رہوں گا!

جب بھوک زیادہ ستائے گی تو اصول اور ضمیر کو لقمہ بنا کر کھانے پر مجبور ہو جاؤں گا میرے عزیز!

اگر ایسی صورت ہوئی تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔

لیکن کیا معلوم اس وقت جگہ خالی ہو یا نہ ہو!

تو واپس چلا جاؤں گا!

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا!

کیا تم اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی نہیں کر سکتے عزیزِ من!

یہی استدعا میری آپ سے ہے!

منشی صاحب کا اخبار اگرچہ روزانہ تھا لیکن جیسا کہ وہ خود باتوں باتوں میں اعتراف کر چکے تھے چلتا بہت کم تھا، چھوٹے سے شہر میں ویسے بھی ایک روزنامہ مشکل ہی سے کامیاب ہوتا ہے اور جب کہ وسائل ناپید ہوں تو کامیابی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ وسائل کا یہ عالم تھا کہ نہ سرمایہ، نہ خبر رساں ایجنسیوں اور کمپنیوں سے معاملہ، سارا دارومدار یا انگریزی اخبارات کی خبروں پر تھا یا خانہ ساز اور ایجاد کردہ خبروں پر، ان چیزوں کی سرپرستی ایک محدود تر حلقہ ہی کر سکتا ہے، پڑھے لکھے لوگ بدکتے ہیں۔ اسلم کی صورت میں نیا خون منشی صاحب کو نظر آیا۔ انھوں نے سوچا اگر اس کا جوان قلم بھی اخبار کا مددگار بن جائے تو شاید مُردہ زندہ ہو جائے۔ لیکن یہ نوجوان نہ ہم پسند نکلا نہ من چلا! خبر سازی کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگا! شکار کو واپس بھی کرنا نہیں چاہتے

تھے، آخر ہتھیار ڈال دیئے!

اچھا بھئی تم ادارتی نوٹ لکھ دیا کرنا، خبریں ترجمہ کر دیا کرنا، دوسرے اخبارات کے اقتباسات دے دیا کرنا، باقی سب کچھ ہم بھگت لیں گے!

اسلم بھی سخت کشمکش و پیچ میں تھا۔ ایک طرف کالج سے علیحدہ ہو چکا تھا، ہوسٹل امروز و فردا میں چھوڑ دینا تھا، قیام کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اور روزگار کا بھی۔ لہٰذا اس سمجھوتہ پر اُسے رضامند ہو جانا پڑا۔

ہاں یوں میں ہر خدمت کے لئے کمربستہ ہوں!

منشی صاحب نے کچھ خوش دلی سے کچھ برہمی سے کہا: "شکریہ!" تو پھر کب سے کام شروع کر رہے ہو؟

وہ بولا: جب سے کہئے — لیکن . . . .

منشی جی سمجھ گئے، جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے: کچھ پیشگی چاہیئے؟ — اصول تو نہیں ہے لیکن اس وقت پندرہ روپے لے لو۔ پھر روز کے روز لیتے رہنا۔ لیکن تنخواہ کیا لو گے؟ یہ طے ہو جانا چاہیئے!

اسلم بھی معاملہ کا کھرا تھا بولا: ضرور طے کر لیجئے۔

منشی صاحب نے سوال کیا:

تو بتاؤ پھر کم سے کم کیا لے سکتے ہو؟ بھئی موجودہ حالات کے پیش نظر میں ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں دے سکتا! البتہ حالات سُدھر جائیں تو اضافہ کر دوں گا!

اسلم نے جواب دیا:

ڈیڑھ سو کم ہیں۔ لیکن مجھے منظور ہے۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ رہوں

گا کہاں؟

منشی صاحب کچھ سوچنے لگے ۔ ہاں یہ سوال بے شک اہم ہے ۔ اب تک کہاں رہتے تھے؟

ہوسٹل میں ۔۔ لیکن یہاں ملازمت کرنے کے بعد وہاں نہیں رہ سکتا ۔

منشی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا :

اچھا آجاؤ ! دفتر میں ایک کمرہ خالی کرا دوں گا تمھارے لئے !

اسلم خوش خوش چلا گیا ۔ منشی صاحب بھی خوش تھے ، ایک ہونہار ملازم کے مل جانے پر بھی اور پندرہ روپے بچ جانے پر بھی !

منشی سجاد حسین ہمہ صفت موصوف آدمی تھے ۔ قسمت نے انھیں ایڈیٹر بنا دیا تھا وہ ایک اخبار کے ٹورنگ ایجنٹ کی حیثیت سے اس شہر میں آئے تھے ، رہنے والے نہ جانے کہاں کے تھے ۔ لیکن یہاں ان کا دل کچھ اس طــــرح لگا اور یہاں کے لوگوں سے کچھ ایسے مانوس ہوئے کہ رہ پڑے ۔

معمولی سرمائے سے اخبار نکالا ، نہ چلا تو بلیک میلنگ پر اتر آئے ۔ حکام سے یارانہ گانٹھ لیا ۔ شریفوں کی پگڑیاں اچھالیں ، نا اہلوں اور سماج دشمن عناصــــر کی سرپرستی حاصل کی اور حلوے مانڈے کا کام چل نکلا ۔ اور رفتہ رفتہ ایسا چلا کہ گو اخبار نہ چل سکا لیکن وہ چل پڑے ۔ بینک بیلنس دن بدن بڑھنے لگا ، اشتہارات آنے لگے ۔ جس کی تعریف کی اس سے بھی اینٹھا جس کو گالیاں دیں اس کی جیب بھی خالی کرالی ۔

لیکن اب حالات بدل رہے تھے ۔

پبلک کے مذاق میں تبدیلی ہو رہی تھی، آدمی زیرک اور دانش مند تھے، چاہتے تھے اخبار کو ایسے ڈھنگ سے چلائیں کہ اس انقلابی دور میں بھی نہ صرف زندہ رہے بلکہ حالات سے فائدہ اٹھا کر ترقی بھی کرے!

اسلم کو دیکھ کر یہ جذبہ پھر تازہ ہو گیا۔ اور وہ اسے ملازم رکھ کر گویا جوا کھیلنے پر تیار ہو گئے۔ محض مستقبل کی توقع میں ڈیڑھ سو روپے مہینہ صرف کرنا جوا ہی تو تھا!

(۸)

نیا تجربہ نئی زندگی

اسلم نے ہوسٹل کو الوداع کہا اور "قوم" کے دفتر میں منتقل ہوگیا!

صحافت کی زندگی سے وہ بالکل ناآشنا تھا، لیکن شب و روز محنت کرکے بہت جلد حالات پر اس نے قابو پالیا۔ منشی صاحب اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ کالج سے نکلے ہوئے اس نوجوان سے ایسی مستعدی اور محنت کی انھیں ہرگز توقع نہیں تھی!

اخبار کے دفتر میں اسے کئی سہولتیں حاصل تھیں، کرایہ دینا نہیں پڑتا تھا، ہوٹل دس قدم پر تھا۔ کھانے اور ناشتے کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ آنے جانے کی زحمت سے بچا ہوا تھا۔

لیکن ایک بہت بڑی مصیبت بھی تھی،

کام پورا کرنے کے بعد وہ چاہتا تھا گھومے پھرے، تفریح کرے، دوست احباب سے ملے لیکن منشی صاحب تسمہ پا کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ اخبار کا کام ہی کیا کم تھا کہ وہ اس سے دوسرے کام بھی لینے لگا، کاغذ والے کے ہاں جاکر کاغذ کے ریٹ طے کرآؤ

اس دلیل نے منشی صاحب کو لاجواب کر دیا، کہنے لگے :

خیر بھائی نصیحت فضیحت بعد میں ہوتی رہے گی اس مصیبت سے تو نجات دلاؤ کسی طرح !

وہ بولا : نجات کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ جا کر آپ کی طرف سے وعدہ کر آؤں کہ اب اس طرح کی خبریں نہیں چھپیں گی ! ـــ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں ؟

چار و ناچار جواب دینا پڑا : ہاں بھئی تیار ہیں ۔

بڑی مشکل سے معاملہ اس نے رفت گزشت کر دیا، اور کچھ عرصے کے لئے واقعی منشی صاحب نے ایک حرف بھی لکھنے سے توبہ کر لی ۔ اس سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ اخبار کی ساکھ پھر بڑھنے لگی وہاں یہ نقصان بھی ہوا کہ اس کے اوقات کارگزاری میں خود بخود مزید اضافہ ہو گیا ۔ اضافۂ تنخواہ یا الاؤنس یا اوور ٹائم کا سوال ہی نہیں تھا !

دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک روز انجمن کا خط آیا ۔

امّی بہت بیمار ہیں، آپ کو دیکھنے کے لئے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہیں یہ خط پڑھتے ہی آجائیے خواہ ملازمت سے استعفا ہی کیوں نہ دینا پڑے ۔ خدانخواستہ وہ نہ رہیں تو سب کچھ بیکار ہے !

اس سے قبل اشاروں اشاروں میں انجمن نے کئی مرتبہ امّی کی علالت کا ذکر کیا تھا لیکن اب اتنا کھل کر لکھنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ صرف بیمار ہی نہیں ہیں حالت بہت نازک ہے ـــ مجھے فوراً چلا جانا چاہیئے !

لیکن جانے کے لئے کرایہ بھی تو نہیں تھا !

منشی صاحب کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ کئی کئی مہینے کی تنخواہ چڑھا لیتے تھے ۔ اور یہ

فیض عام تھا، کاتب بھی رہا کرتے تھے اور دوسرے افراد بھی، چنانچہ دو مہینے کی تنخواہ منشی صاحب پر واجب تھی! اور اب یہ تیسرا مہینہ بھی ختم ہو رہا تھا!

اسلم سیدھا اٹھا اور منشی صاحب کے کمرے میں پہنچا، وہ حقہ پی رہے تھے اور باہر کے آئے ہوئے اخبارات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اسلم کو دیکھ کر ذرا چونکے، وہ آ کر کھڑا ہو گیا، یہ حسب معمول اخبار پڑھتے رہے، ذرا دیر کے بعد سر اٹھایا اور پوچھا:

کوئی کام ہے، کچھ کہنا چاہتے ہو؟

وہ بولا: بہت ضروری کام ہے، پندرہ دن کی رخصت چاہیئے مجھے!

منشی صاحب اچھل پڑے اور کہا: پندرہ دن کی رخصت! گویا پندرہ دن کے لئے اخبار بند کر دوں؟

اسلم نے انجمن کا خط ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: اسے پڑھ لیجئے!

خطوں کے پڑھنے کا، خاص طور پر دوسروں کے خط بغیر ان کی اجازت پڑھنے کا منشی صاحب کو بہت شوق تھا۔ دفتر کے کئی لوگوں نے پتے تبدیل کرا دئے تھے اس لئے کہ ان کے خانگی اور نجی معاملات میں منشی صاحب کے معلومات حیرت انگیز حد تک ترقی کرتے جاتے تھے لیکن ا[illegible] یہاں کوئی ٹھکانہ نہ تھا، وہ پتہ نہ تبدیل کرا سکا، یہ خط جو اُن کے سامنے تھا اُسے وہ [illegible]یت فن کاری کے ساتھ کھول کر پڑھ چکے تھے، کھولا ہوا لفافہ اس فن کاری سے بند کر دیتے تھے کہ پتہ لگانا ممکن ہی نہیں تھا۔ بہرحال پھر پڑھا اور واپس کرتے ہوئے کہا:

یہ بات ہے تو روک بھی نہیں سکتا، چلے جاؤ، لیکن کتنا اچھا ہوتا جانے کے بجائے روپے بھیج دیتے، تاکہ علاج اچھی طرح ہو سکتا، تم جا کر کیا کر لوگے، نہ حکیم ہو نہ ڈاکٹر،

نہ نرس !

اسلم نے ضد کرتے ہوئے کہا: میں ضرور جاؤں گا !

منشی صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں لبریز اشک تھیں !

اچھا چلے جاؤ، لیکن کب تک آجاؤ گے ؟

وہ ذرا آہستہ انداز میں بولا :

کہہ تو رہا ہوں پندرہ دن کی رخصت چاہیئے مجھے !

منشی صاحب اس کی سعادت مندی سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے سمجھ لیا یہ جائے بغیر نہیں مانے گا کسی طرح۔ فرمایا :

اچھا بھئی جاؤ ــــ لیکن خدا کے لئے کوشش تو کرنا کہ جلد آجاؤ۔ تمھارے بغیر اخبار کیسے چلے گا ؟ تم نے تو اپاہج بنا دیا ہے مجھے !

اس نے بجھے ہوئے اور افسردہ لہجے میں کہا :

میں آج شام کی گاڑی سے جا رہا ہوں، میری تقریباً تین ماہ کی تنخواہ واجب الادا ہے، ساری دیجئے !

منشی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر میز کی دراز کو ٹٹولا، پھر بٹوہ نکالا اور اس کا جائزہ لیا اور ان تینوں جگہ کی مجموعی رقم اس کے سامنے ڈھیر کر دی۔ ۳۵ روپے پھر فرمایا :

اس وقت تو یہی ہے، پتہ لکھاتے جاؤ، بعد میں بھیج دوں گا !

اسلم جل کر کوئلہ ہو گیا، اس نے کڑے تیور سے کہا :

آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں، میری ماں مر رہی ہے اور میں یہاں اپنے

ساڑھے چار سو میں سے ۳۲۵ روپے لے کر جاؤں؟ دس روپے تو ٹکٹ ہی پر صرف ہو جائیں گے! پانچ راستے میں! گویا بیس روپے لے کر گھر پہنچوں! مجھے پوری رقم چاہئے میں تو آپ سے کچھ زیادہ کی توقع لے کر آیا تھا!

منشی صاحب نے ان کڑوی کسیلی باتوں کا ذرا بھی برا نہیں مانا، کہنے لگے:

خفا کیوں ہوتے ہو؟ اگر پوری رقم چاہتے ہو تو تین چار دن کے بعد جاؤ، ورنہ اس وقت جاؤ تو تین چار دن کے بعد ساری رقم منی آرڈر کر دوں گا تار سے!

مرتا کیا نہ کرتا، اسلم نے روپے لے لئے!

لیکن وہ ابھی دو قدم بھی نہیں گیا تھا کہ منی آرڈر آگئے بہت سے ــــــ جب تک منشی صاحب دستخط کرتے رہے وہ کھڑا رہا۔ پوسٹ مین کے جانے کے بعد وہ نوٹ گننے لگے۔ اسلم بھی ساتھ ساتھ شمار کرتا رہا، یہ چار سو بیالیس کی رقم تھی!

نوٹ گننے کے بعد سجاد صاحب نے سر اٹھایا تو دیکھا اسلم کھڑا ہے۔ تیوری چڑھ گئی۔ سوال کیا: اب کیوں کھڑے ہو؟ جاتے کیوں نہیں؟

اسلم نے کہا: اب تو رقم آگئی، کم از کم سو اور دے دیجئے، باقی دو تین دن میں منی آرڈر سے بھیج دیجئے گا!

سجاد صاحب کا خون کھولنے لگا، بگڑ گئے۔ سو روپے بھتیں دے دوں اور اخبار کے دفتر میں تالا لگا دوں، آج پورے پانچسو کاغذ والے کو دینے ہیں وہ کہاں سے دوں گا؟

اسلم جیسے بحث کرنے لگا: اسے تین چار دن کے بعد دے دیجئے گا!

منشی صاحب کھڑے ہو گئے۔ اس کے الفاظ دوہرائے "تین چار دن کے بعد

دے دیجیے گا،" جیسے وہ میرے باپ کا غلام ہے! — ہونہہ!
اور پھر کمنجیوں کا گچھا لے کر تیزی کے ساتھ زنان خانے میں چلے گئے!
اسلم کو مجبوراً ۳۵ روپیوں پر ہی قناعت کرنا پڑی!

(۹)

ویران گھر

رات کے بارہ بجے گاڑی سعادت گنج پہنچی ۔ سردی کا موسم تھا، سرد ہوائیں چل رہی تھیں، دانت سے دانت بج رہے تھے، پلیٹ فارم پر نہ کوئی قلی تھا نہ مزدور، اسلم نے خود ہی سامان اتارا ۔ سامان تھا ہی کیا، ایک بکس، ایک بستر ۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر صرف ایک منٹ گاڑی ٹھہرتی تھی ۔ سامان اتارتے اتارتے چھک چھک کرتی روانہ ہو گئی ۔ وہ اپنا سامان لئے گیٹ پر پہنچا، یہاں بھی الّو بول رہا تھا ۔ خود اسٹیشن ماسٹر صاحب ایک ٹمٹماتی ہوئی لالٹین لئے کھڑے تھے، نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں ۔ اس اندھیری روشنی میں اسلم کو پہچان بھی نہ سکے ۔ وہ بستر بغل میں دابے، ٹرنک ہاتھ میں لئے نکلا چلا گیا نہ کسی نے ٹکٹ مانگا نہ اس نے دیا ۔

گھر پہنچتے ساڑھے بارہ بج گئے!

اس کا دل دھڑک رہا تھا، دیکھا چاہتے امّی کی کیا حالت ہے؟ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں

انجمن بیچاری اکیلی کیا کیا کر رہی ہوگی؟ کئی منٹ تک دروازہ پر کھڑا یہی باتیں سوچتا رہا۔ پھر ڈرتے ڈرتے کنڈی کھٹکھٹائی،

کوئی جواب نہیں ملا!

دل اور زیادہ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یا اللہ اپنا فضل کرنا۔ اتنا سناٹا کیوں ہے گھر میں؟ کوئی بولتا کیوں نہیں؟ کوئی آتا کیوں نہیں؟ کوئی جواب کیوں نہیں دیتا؟ ماجرا کیا ہے؟

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پھر کنڈی کھٹکھٹائی!

اس مرتبہ ایسا معلوم ہوا جیسے جلدی جلدی چلتا کوئی دروازہ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ پھر ایک لرزتی سی آواز آئی:

کون ہے اس وقت؟

یہ آواز انجمن کی تھی!

اسلم نے کہا: انجمن میں ہوں دروازہ کھول دو،

فوراً دروازہ کھل گیا۔ انجمن، بھیا میرے بھیا کہہ کر اسلم سے لپٹ گئی اور اس کے سینے سے سر لگا کر سسکیاں لے لے کر رونے لگی!

اسلم کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، نبض کی رفتار بڑھ گئی، خود بخود آنکھوں میں آنسو آگئے! بڑی مشکل سے وہ صرف امی کہہ سکا، پھر اس کی آواز بھرا گئی، سب خاموش ہو گئے۔ انجمن نے آہستہ سے کہا: ہر وقت آپ ہی کی راہ تکتی رہتی ہیں وہ تو!

وہ خوش ہو گیا، محبت سے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا گویا ہوا۔ وہ زندہ ہیں، اچھی ہیں، اب کیسی ہیں؟

انجمن نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں بولی:

"ڈاکٹر کہتا ہے آج کی رات بھاری ہے، آئندہ ۲۴ گھنٹوں میں زندگی اور موت کا فیصلہ ہو جائے گا، حالت بہت نازک ہے، دوا پینی بالکل چھوڑ دی، غذا کا ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتیں، بس ایک دُھن ہے: اسلم! میرا بچہ اسلم!!

یہ کہتے کہتے پھر انجمن کی آواز بھرّا گئی، اسلم نے بیقراری کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا:

چلو انجمن مجھے لے چلو امی کے پاس!

وہ اسی طرح سامنے کھڑی تھی، کہنے لگی نہیں، ڈاکٹر نے انجکشن دیا ہے، بڑی مشکل سے نیند آئی ہے کئی دنوں بعد! میں خود بھی اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ رہتی ہوں، کبھی ان کے کمرہ کے سامنے ٹہلنے لگتی ہوں، اندر نہیں جاتی کہیں جاگ نہ جائیں، چلئے میرے کمرہ میں بیٹھئے، اللہ خیریت رکھے صبح مل لیجئے گا، دیکھ لیجئے گا اچھی طرح سے!

انجمن نے کنڈی بند کی، ٹرنک ہاتھ میں لیا، بستر اٹھانے جھکی تھی کہ اسلم نے دونوں چیزیں لے لیں، اور تحکمانہ لہجے میں بولا: چلو!

انجمن اسے اپنے کمرہ میں لائی۔ ایک دوسری چارپائی پر اس کا بستر بچھانے لگی، اسلم نے روکا: اب رات ہی کتنی باقی ہے نیند بھی نہیں آئے گی، تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں بستر رہنے دو!

لیکن وہ بستر بچھاتی ہوئی بولی: اس پر بیٹھ کر آرام سے باتیں کیجئے گا!

اتنے میں بستر ہو گیا، وہ کہنے لگی: آئیے بیٹھ جائیے۔ آپ بیٹھئے میں ابھی آئی۔

اسلم سر جھکا کر زمین پر پاؤں لٹکائے بستر پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا: کیا چیز ہے یہ زندگی بھی، کسی کو مالا مال کر دیتی ہے، کسی کو چین سے مرنے بھی نہیں دیتی۔ کسی کو ریشم اور کمخواب

بنائی تب ہے، کسی کو موٹا جھوٹا بھی میسّر نہیں آتا، کوئی بستر راحت پہ دم توڑتا ہے کوئی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتا ہے!

اور پھر دُنیا سے اس کے خیالات گھر کی طرف منتقل ہوئے وہ سوچنے لگا: قسمت کا کھیل بھی کیسا عجیب ہوتا ہے، میری یہ ماں جو قبل از وقت بوڑھی ہوگئی ہے ایک دن بھی سکھ سے زندگی بسر نہیں کر سکی، میرا باپ جو مر چکا ہے ایک دن بھی چین کی نیند نہ سو سکا۔ میں، جو اپنے باپ کا چہیتا اور ماں کا دُلارا ہوں نہ باپ کو سُکھ پہنچا سکا نہ ماں کے کام آ سکا:

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

اسی عالمِ فکر میں دو گھنٹے گزر گئے۔ یکایک انجمن کی آہٹ سُن کر اس نے سر اٹھایا تو سینی ہاتھ میں لئے انجمن کھڑی نظر آئی۔ اسلم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: یہ کیا؟

دہیں ایک اسٹول پر اس نے سینی رکھ دی اور بولی:

جائیے ہاتھ دھو آئیے۔

بے ساختہ اسلم کے منہ سے نکلا: مجھے بالکل بھوک نہیں ہے!

وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور کہنے لگی: کھا لیجئے بھیا!

وہ اس جملہ کی تاب نہ لا سکا، چپکے سے اٹھا اور ہاتھ دھو کر آ گیا۔ گرم گرم چپاتیاں، گرم تلے ہوئے آلو، یہ دونوں ابھی لپ جھپ انجمن نے تیار کر لی تھیں، دال البتہ پہلے کی پکی ہوئی تھی۔

اسلم نے واقعی کھانا نہیں کھایا تھا، اتنا ہوش کسے تھا کہ کھانے پینے کی فکر کرتا لیکن انجمن کی دل شکنی کے خیال سے کھانے بیٹھ گیا۔ اور ختم کر کے اٹھا۔

کھانا ختم کر کے اٹھا تو انجمن پھر ندارد۔ اس نے باہر برآمدہ میں جا کر ہاتھ دھوئے اور باورچی

خانہ میں روشنی دیکھ کر وہاں پہنچا، انجمن چارپائی تیار کر چکی تھی، اسے دیکھ کر بولی: آپ کیوں آ گئے چلئے ——— !

دونوں بھائی بہن آگے پیچھے پھر اس کمرہ میں پہنچ گئے۔ اسلم کو پیالی دینے کے لئے جب انجمن نے ہاتھ بڑھایا تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ مہندی میں رچے ہوئے ہیں۔ مزید غور کیا تو چوڑیاں بھی شہانہ نظر آئیں، اور غور کیا تو لباس بھی دلہنوں کا سا دکھائی دیا، حیرانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ جی چاہا پوچھے:

کیا تمھاری شادی ہو گئی ہے؟

لیکن جی چاہنے کے باوجود پوچھ نہ سکا، خود ہی دل میں سوال پیدا ہوا۔ اگر شادی ہو گئی ہے تو اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی! ہوئی تو روپیہ کہاں سے آیا؟ کس سے ہوئی؟ جہاں تھی وہاں سے تو کوئی نئی تحریک ہوئی نہیں تھی۔

یہ سب باتیں دل میں اٹھتی رہیں لیکن زبان تک نہ آ سکیں، چائے لیتے ہوئے اس نے کہا

ہاں بھئی ذرا تفصیل سے بتاؤ امی کی حالت کیا ہے؟

وہ افسردہ لہجے میں کہنے لگی: کئی دن سے سینے میں درد کی شکایت کر رہی تھیں۔ کبھی یہ درد خود بخود اچھا ہو جاتا کبھی پھر شروع ہو جاتا۔ آپ کو خط میں لکھا تو تھا میں نے، کیا نہیں ملا؟

ہاں ملا تھا ——— پھر؟

اس مرتبہ جو درد شروع ہوا تو حالت بہت نازک ہو گئی۔ میں نے حکیم صاحب کو بلایا۔ انھوں نے نسخہ لکھ دیا، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ اس نے انجکشن دیئے اور نسخہ لکھنے کے بعد کہا، زیادہ سے زیادہ چند دن کی مہمان ہیں! بھیا میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ تار دے نہیں سکتی تھی، فوراً خط لکھ دیا آپ کو!

لیکن تم نے یہ تو نہیں لکھا تھا کہ ڈاکٹر یہ کہہ رہا ہے ۔

یہ کہتی تو آپ بہت زیادہ پریشان ہو جاتے !

اب کیا کہتا ہے ڈاکٹر ؟

کہتا ہے آنے والا دن زندگی کا فیصلہ کر دے گا !

(بے بسی کے عالم میں) کہتا ہے ، امی اچھی ہو جائیں گی ، زندہ رہیں گی !

(بے ساختگی کے ساتھ) آمین ! اللہ آمین ! بھیّا خدا کرے ایسا ہو ! لیکن ۔۔

لیکن کیا ؟ مجھ سے کیوں چھپاتی ہو ، کہو ! کیا بات ہے ؟

واقعی ان کی حالت بہت خراب ہے ۔

بیماری میں سب ہی کی حالت نازک ہو جایا کرتی ہے !

ان کا تو سچ بہت بُرا حال ہے بھیّا ! ۔۔۔ ایک بات کرتی ہیں دو منٹ ہانپتی ہیں !

دو قدم چل نہیں سکتیں ، چہرہ بالکل زرد ، ہاتھوں میں اتنی سکت بھی نہیں کہ گلاس پکڑ سکیں !

بھیّا آپ دیکھیں گے تو رونے لگیں گے !

اور یہ کہتے کہتے وہ خود رونے لگی ۔

اسلم کی سمجھ میں اب حقیقت آنے لگی تھی ، اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں ہو گئیں ۔ اس نے کہا : تو یوں رو رہی ہے پگلی ! رونا تو مجھے چاہیے ، تیرے لئے تو میں زندہ ہوں ، لیکن امی کو کھو کر میں کس کا سہارا ڈھونڈوں گا ؟

"بھیّا !"

اتنا کہا اور پھر اس کے سینے سے سر لگا کر سسکیاں لینے لگی !

اسلم نے شفقت اور محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا ۔ اور دل جوئی کرتے ہوئے کہا :

انجمن تم تو بڑی اچھی لڑکی ہو، گھبراتے نہیں، یوں دل چھوٹا کرنے سے کیا فائدہ ؟

انجمن کے ہاتھ ایک مرتبہ پھر اسلم کو نظر آئے، وہی عروسی چوڑیاں، وہی مہندی میں رچی ہوئی اور سجی ہوئی انگلیاں!

یہ چوڑیاں اور انگلیاں دیکھ کر اسے خواہ مخواہ خلجان ہونے لگتا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا، آخر تغیر احوال کا راز کیا ہے ؟

یہ چیزیں شوقیہ تو ہو نہیں سکتیں۔ انجمن اس طبیعت کی لڑکی ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہوتی تو ماں بستر مرگ پر دراز ہے اور اسے مہندی رچانے، شہانہ چوڑیاں پہننے اور عروسی لباس زیب تن کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ بھلا انجمن جیسی لڑکی یہ کر سکتی ہے ؟

پھر ؟ ــــ پھر یہ کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟

ایک مرتبہ پھر جی چاہا کہ پوچھ ہی ڈالے، لیکن سسکیاں لیتی ہوئی بہن سے ایسا سوال کرنے کی ہمت نہیں پڑی، اگرچہ خلجان جوں کا توں باقی رہا۔ اضطراب اور خلش میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

انجمن نے جلدی جلدی برتن اٹھائے اور باورچی خانہ میں رکھنے چلی گئی۔ واپس آئی تو کہنے لگی:

میں امی کے کمرے میں گئی تھی وہ ابھی تک سو رہی ہیں۔ آج کئی دن کے بعد انھیں انجکشن کے زور سے نیند آئی ہے۔

اسلم نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اذانِ فجر کی آواز فضا میں گونجی۔

شاید اس نے کبھی فجر کی نماز نہیں پڑھی تھی، مسجد میں جماعت سے تو قطعاً نہیں پڑھی تھی، لیکن آج نہ جانے کیوں بے ساختہ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھنے لگے۔

ذرا نماز پڑھ آؤں جا کر ابھی آیا۔

اسلم نماز پڑھنے چلا گیا۔ انجمن گھر کے کام میں لگ گئی۔ وہ جھاڑو دے رہی تھی برتن مانجھ رہی تھی۔ بستر صاف کر رہی تھی، لیکن ماں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی، بار بار دل سے صدا اٹھتی تھی۔ اماں جی زندہ ہیں، رہیں گی کیا، وہ رخصت ہو جائیں گی بچھڑ جائیں گی۔ اور جیسے ہی —— یہ الفاظ کانوں میں گونجتے آنکھوں سے موتی کی لڑیاں گرنے لگتیں۔

دوپٹے کے دامن سے آنسو پونچھتی جاتی اور کام کرتی جاتی تھی!

(١٠)

اجل کا پیام

شاید ہی کوئی نماز اتنا ج[illegible]گر اس نے پڑھی ہو!
نماز کے بعد بڑی دیر تک اس[illegible] خدا سے گڑگڑا گڑگڑا کر ماں کے لئے دعائے صحت مانگتا رہا!

اس طرح دل کا بوجھ کچھ اترا گھر پہنچا تو دروازہ پہ انجمن منتظر کھڑی تھی۔ دروازے پر اسے کھڑا دیکھ کر گھبرا گیا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔

کیا بات ہے انجمن! کیسی طبیعت ہے امی کی؟

وہ خوش خوش بولی: اچھی ہیں بھیا، ابھی آنکھ کھلی ہے، مجھے دیکھتے ہی پوچھا: اسلم کا کوئی خط آیا؟ جب میں نے بتایا کہ وہ تو رات ایک بجے آ بھی گئے تو خفا ہونے لگیں کہ مجھے تو نے کیوں نہیں جگایا۔ اب بھیا انھیں کون بتائے تم تو انجکشن کے اثر سے بیہوش پڑی تھیں جگاتا کون؟ اور پھر ڈاکٹر نے بھی منع کر دیا ہے۔ جب سے ایک ہی رٹ

لگی ہے، دیکھ اب آ رہا ہوگا! دیکھ اب آیا؟ کتنی لمبی نماز پڑھ رہا ہے کہ اب تک نہیں آیا؟
آخر یں آ کر دروازہ پر کھڑی ہوگئی۔ چلیئے لے چلوں آپ کو، کہیں بھاگ نہ جائیے گا!

دونوں بھائی بہن جلدی جلدی ماں کے کمرے میں پہنچے۔

جیسے ہی اسلم پر نائلہ کی نظر پڑی اس نے بستر پر لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ اسے کلیجے سے لگانے کے لئے بڑھا دئے۔ اسلم لپک کر ماں کے پاس پہنچا۔ نائلہ نے اپنے کانپتے ہوئے اور کمزور ہاتھ اس کے سر پر رکھ دئے۔ اس نے اپنا سر ماں کے شانے پر رکھ دیا اور کہا:

امی تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔

نائلہ نے بے نور آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولی: زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے ــــــ تمھیں ایک مرتبہ دیکھ لینے کی حسرت تھی سو خدا نے پوری کر دی!

انجمن خوش ہو کر بولی: بھیا، ابھی امی اچھی ہو رہی ہیں۔ اتنی باتیں کیں مگر سانس نہیں پھولا!

نائلہ نے انجمن کی باتوں پر دھیان دئے بغیر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: بیٹے! اب میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ زندہ رہ کر کروں گی بھی کیا؟ اپنا حال خوب سمجھ رہی ہوں، گھڑی دو گھڑی سے زیادہ کی مہمان نہیں ہوں!

انجمن رونے لگی!

اسلم نے بھرائی ہوئی آواز میں تقریباً چیختے ہوئے کہا: امی آپ اچھی ہیں، اچھی ہو جائیں گی۔

لیکن وہ اپنی کہے جا رہی تھی۔ کیوں ضد کرتے ہو بیٹے ـــ میں نے انجمن کی شادی کر دی!

جو سوال اسلم کے دل میں کھٹک رہا تھا، اس کا جواب مل گیا!

نائلہ کہہ رہی تھی، میں نے انجمن کے ہاتھ پیلے کر دیئے ـــ جہاں نسبت تھی، جہاں بات طے تھی وہاں سکوت چھایا ہوا ہے۔ میں نے اپنا حال لکھا، مگر کوئی بات پوچھنے بھی نہ آیا۔ میں نے سوچا مجھے اپنی ذمہ داری پوری کر کے مرنا چاہیئے، اس سے بوجھ میں اضافہ کرتے جی کو اچھا نہیں لگا۔

اسلم نے سوال کیا: لیکن امّی کہاں کی ہے آپ نے انجمن کی شادی؟

نائلہ نے بتایا: اشفاق سے، غریب لڑکا ہے، نیک ہے، شریف ہے، ڈیڑھ سو مہینے کا نوکر بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنا خون ہے، خدا نے چاہا تو نبھ جائے گی دونوں کی میری بچّی ہیرا ہے! وہ ہر حالت پر [illegible] لے گی، اور ہم بھی کون سے امیر ہیں، ایک وقت کھانا دوسرے وقت فاقہ!

اشفاق ـــ اسلم کا ماموں زاد بھائی تھا، اس کے مرحوم ماموں کا لڑکا!

اسلم نے پوچھا: لیکن ـــ لیکن آپ نے انجمن سے بھی پوچھا تھا؟ اس کا بھی عندیہ لیا تھا؟ انجمن اٹھ کر چلی گئی،

نائلہ نے کہا: ہاں پوچھا تھا۔ اُسے اس رشتے سے کوئی اختلاف نہ تھا جہاں نسبت تھی۔ ان لوگوں کے طرزِ عمل سے اس کا دل بھی پھٹ گیا تھا۔

اسلم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: لیکن امّی آپ نے یہ بھی سوچا ممانی کا مزاج کتنا تیکھا ہے کیا انجمن برداشت کر سکے گی؟

نائلہ نے جواب دیا: ہاں تیکھا ہے لیکن انجمن ان کی بیٹی ہے، وہ ہمیشہ سے اُسے چاہتی ہیں۔ وہی آئی تھیں پیام لے کر کہتی کتنی خوشامدیں کی ہیں میری کہ بس اللہ جانتا ہے!

زبان گھس گئی ہو گی بیچاری کی، میں خود اس مسئلہ میں بھی راضی ہو گئی!

اسلم مطمئن ہو گیا۔ تو ٹھیک ہے پھر۔ ویسے فرزانہ (اشفاق کی بہن) بھی اس کا خیال رکھے گی۔ دونوں میں بڑی محبت ہے۔

نائلہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ہاں اور کیا ۔۔۔ فرزانہ بڑی اچھی لڑکی ہے اور انجمن پر جان دیتی ہے۔

پھر ایک خیال آ گیا اسلم کے دل میں، لیکن امی! یہاں تو نہ میں ممانی کو دیکھتا ہوں، نہ فرزانہ کو، نہ اشفاق کو!

نائلہ نے بتایا: سب یہیں تھے، دفعتہً اطلاع آئی فرزانہ کے شوہر موٹر کے حادثہ میں سخت زخمی ہو گئے ہیں اور اسپتال میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ میں نے خود اصرار کر کے بھیجا، اشفاق پہنچانے گیا ہے، رات اُسے آ جانا چاہیئے تھا، خدا خیر کرے! ۔۔۔ کہو بیٹے تمھاری نوکری کا کیا ہوتا؟

یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا: وہ سوچنے لگا، کیا کہے کیا نہ کہے۔ یہ بھی سوچنے لگا کہ نوکری کرنے کے باوجود ماں مرتی رہی اور میں اس کے علاج کے لئے بھی روپیہ نہ بھیج سکا۔ اس نے معذرت آمیز انداز میں کہا:

نوکر تو ہوں لیکن یوں ہی معمولی سی جگہ ہے، تین مہینے کی تنخواہ چڑھی ہوئی ہے اس لئے آپ کو بھی کچھ نہ بھیج سکا۔

نائلہ تڑپ گئی، میں گئی بھاڑ میں، تین مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تو تم کہاں سے کھاتے پیتے رہے؟ کتنا چہرہ اتر گیا ہے، کتنا دبلا ہو کر آیا ہے لڑکا! پھر ایسی جگہ نوکری کرنے سے کیا فائدہ؟ چھوڑ دو اسے، کہیں اور خدا روزگار لگا دے گا!

اسلم نے گویا یہ ساری باتیں نہیں سنیں، کہنے لگا:

امید ہے تین چار دن میں ساری بقایا رقم منی آرڈر سے آجائے گی!

انجمن پھر واپس آ گئی، وہ چوزے کی یخنی بنا کر لائی تھی۔ ماں کے پاس بیٹھ کر چمچہ سے پلانے لگی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن انجمن اور اسلم کے اصرار سے مجبور ہو کر لیٹے لیٹے ہی پینا پڑا:

یخنی پلانے کے بعد انجمن اور خوش ہو گئی، اس نے اسلم سے کہا: آج کئی دن کے بعد امی نے یہ دو گھونٹ پئے ہیں۔ یہ بھی آپ کے قدموں کی برکت ہے بھیا!

اسلم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی پونجی [illegible] ڑھے بائیس روپے تھے۔ وہ انجمن کی طرف بڑھاتا ہوا بولا:

یہ رکھ لو، امید ہے تین چار دن میں میری تنخواہ کا منی آرڈر آجائے گا پھر کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔

انجمن تکلّف کرنے لگی: یہ اپنے پاس رہنے دیجئے جب منی آرڈر آجائے گا لے لوں گی۔

اسلم نے ڈانٹا: کچھ ہوش میں ہے لڑکی!

وہ مسکرانے لگی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر روپے چھین لئے۔ اسلم کے افسردہ ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلنے لگا۔

دفعتہً انجمن چیخی، بھیّا!

اسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نائلہ کا سانس اکھڑ چکا تھا۔ وہ دوڑ کر ماں کے پاس گیا:۔۔۔ امّی! امّی!!۔۔۔

لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی ـــــ اس کی گردن ڈھلک چکی تھی ـــــ وہ مر چکی تھی!

انجمن بے ہوش ہو کر گر پڑی، اور خود اسلم بھی اس فوری صدمے سے اتنا نڈھال ہؤا کہ اس کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔ وہ ہکّا بکّا نائلہ کی لاش کو کھڑا دیکھ رہا تھا۔ نہ آنکھ میں آنسو تھے نہ لب پہ فریاد!

---

(۱۱)

پرسشِ غم

دو دن گزر گئے!

نائلہ کی موت نے انجمن اور اسلم کی آنکھوں میں دُنیا تاریک کر دی، اسے زمانے نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا، زندگی کی اُمنگ اور حوصلہ سے وہ محروم ہو چکی تھی۔ خوشی، سُکھ، چین اس کے لئے بے معنیٰ الفاظ تھے۔ ہنسی، دل لگی اور نشاط و انبساط کا نام اس نے کبھی سُنا تھا، پھر بھول گئی۔ ایک دن آرام سے نہ گزرا، آنکھیں کبھی نہیں روئیں لیکن دل ہمیشہ روتا رہا۔ لب کبھی فریاد سے آلودہ نہ ہوئے لیکن سینے سے ہوک اٹھتی رہی، زبان کبھی کسی کی شکوہ سنج نہیں ہوئی۔ لیکن بے مہری ایام نے اسے اس زندگی سے بیزار کر دیا لیکن ــــــــ!

لیکن یہ کچھ ہونے کے باوجود اس کے دم سے گھر میں رونق تھی، اس کا وجود ایک سہارا تھا۔ صرف اس کی موجودگی ہی ڈھارس اور آس کا سبب تھی!

اور اب وہ نہیں تھی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دُنیا اپنوں کی نہیں بیگانوں کی ہے۔ دشمنوں کی ہے، اس گھر کے در و دیوار اب کاٹنے کو دوڑ رہے تھے، اب اس میں رونق نہیں تھی ویرانی تھی!

دُنیا والوں نے زندگی میں بھی نائلہ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور مرنے کے بعد دو قدم ساتھ چلنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی جیسے وہ کوئی مجرم تھی، گنہ گار تھی، خطا کار تھی!

لیکن مجرم تو تھی کیا اس سے بڑا جرم بھی کوئی ہو سکتا تھا کہ اس نے کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی، وہ ضرور گنہ گار تھی اور اس کا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ دشمن کے لئے محبت اخلاق اور ہمدردی کا جذبہ رکھتی تھی۔ اس کے خطا کار ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی خطا ہو سکتی ہے کہ جب تک جیتی رہی خاموشی کے ساتھ اپنوں کے، عزیزوں کے رشتہ داروں کے ستم سہتی رہی، اس کی یہی غلط کاریاں تھیں کہ مرنے کے بعد بھی دُنیا والوں نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا، لیکن وہ بھی آن کی پکی تھی، جس طرح جیتے جی چپ رہی اور ہر طرح کے تلخ، ترش اور شیریں حوادث ایک چُپ میں ٹالتی رہی، اسی طرح قبر کی منزل کی طرف بھی منہ سے ایک لفظ کہے بغیر روانہ ہو گئی۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش

پاس پڑوس کے لوگوں نے پوری ہمدردی کی، اور یہ بیچارے ہمدردی سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن زخم دل پر یہی چیز مرہم کا کام کر گئی!

تدفین کے بعد بھی بعض پڑوس کے لوگ آئے، تعزیت کی، مرنے والی کے لئے کلمۂ خیر کہا۔ اور رخصت ہو گئے۔

انجمن کمرے میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی، خود ہی آنسو پونچھتی، کچھ سوچنے لگتی اور پھر رونے لگتی!

وہ سوچنے لگی: دُنیا ماؤں سے بھری ہوئی ہے لیکن ایسی ماں بھی کوئی ہوتی ہے جیسی میری ماں تھی! اس کی محبت، اس کی شفقت، اس کی خدمت، کون چیز تھی، جو سب سے اونچی سب سے زیادہ نہ تھی!

اسلم باہر بیٹھا تھا — انجمن کے پاس جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی، اُسے روتا دیکھ کر کس طرح چُپ کرے گا؟ کیونکر اس کے آنسو پونچھ سکے گا؟ کیسے ضبطِ گریہ کر سکے گا۔ وہ مرد تھا، باحوصلہ تھا، باہمت تھا۔ ہر دُکھ ہر مصیبت کا خندہ جبینی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس مصیبت کا بھی! کیا اس دُکھ کا بھی — بس اے ہمدم میری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں۔ اور واقعی اس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں!

اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ عمِّ نامدار اقبال میاں تشریف لا رہے ہیں۔ آتے ہی لپٹ گئے، ہچکوں ہچکوں رونے لگے۔ پھر شیروانی کی جیب سے ایک قیمتی رومال نکالا۔ اور اپنے قیمتی آنسو پونچھ ڈالے، اور فرمایا:

بیٹے! یہ کیا ہو گیا؟ — مجھے تو بیماری کی اطلاع بھی نہیں ملی۔ وہ دھان پان اور دائم المریض تو تھیں ہی۔ لیکن اس طرح چٹ پٹ ہو جائیں گی اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا — ہائے!!

اسلم خاموش بیٹھا چچا کی باتیں سُنتا رہا۔ جواب کیا دیتا۔ وہ جواب نہ دے سکا

اقبال میاں نے فرمایا:

جیسے ہی اطلاع ملی، حکمہ آ گیا۔ بیہوش ہوتے بچا۔ ناہید کی حالت تو کچھ نہ پوچھو برابر پچھاڑیں کھا رہی ہے جیسے کسی بچی کی ماں مر گئی ہو۔ اور وہ مرنے والی ماں سے تھی کب کم ناہید کے لئے۔ مسرت کے بھی آنسو نہیں تھمتے برابر روئے جا رہی ہے۔ آج دونوں آ۔۔۔

کے لئے مچل گئیں۔ لیکن یک بیک ناامید غش کھا کر گر پڑی، حسرت اُسے سنبھالنے میں لگ گئی میں نے دونوں کو خدا کے سپرد کیا اور یہاں چلا آیا۔ وہ آئیں تو فضا اور زیادہ غمناک ہو جاتی

ان باتوں کے جواب میں بھی اسلم نے کچھ نہیں کہا۔ چُپ بیٹھا رہا۔ اقبال میاں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

تم کب آئے بیٹا؟

اسلم نے جواب دیا: کل ہی حاضر ہوا تھا۔

شکر ہے تم نے نائلہ کو اور نائلہ نے تمھیں دیکھ لیا ورنہ تمھاری حسرت ہی لے جاتیں اس دُنیا سے۔ اور انجمن ــــ ؟

اسلم نے چچا سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا: اور انجمن؟ ــــ یہیں ہے۔۔ وہیں ہوگی اپنے کمرے میں، مجھے تو تاب نہیں اس کے پاس جانے اور اسے سمجھانے بجھانے کی؟!

آواز بھرا گئی، فرمایا سچ کہتے ہو، بیٹا ــــ لیکن میں جاؤں گا، میں اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھوں گا ــــ وہ میری بیٹی ہے، میری بچی ہے!

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اندر چلے گئے:

انجمن ــ انجمن! بیٹی تو کہاں ہے؟ کہاں ہے تو بیٹی؟

اس کمرے سے اس کمرے میں گشت کر رہے تھے کہ آواز سُن کر وہ خود اوپر سے نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، پلکیں بھیگی ہوئی تھیں، آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اس پر، وہ خاموشی سے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اقبال میاں نے اُسے دیکھا اور پھر اسے رلانے کے لئے خود رونے لگے۔ لیکن وہ نہیں روئی، بُت کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر تک سسکیاں اور ہچکیاں لینے کے بعد اپنے آنسو

پوچھے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا:

بہت بڑا غم ہے یہ، پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے غم کا تیرے قلبِ ناتواں پہ!

الفاظ انجمن کے منہ سے نہ نکل سکے، لیکن آنکھیں بولنے لگیں یعنی آنسو برسنے لگے!

بڑے بڑے موتی کے سے قطرے ٹپاٹپ!

اقبال نے ایک نظر اپنی بھتیجی پر ڈالی اور گلوگیر آواز میں کہا: صبر کر بیٹی، صبر ہی کرنا پڑے گا، ـــ صبر کرتے ہی بنے گی غالب!

ایک مرتبہ پھر اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا: لیکن میری بچی تو روتی کیوں ہے؟ کیا میں بھی مرگیا ہوں؟ کیا ناہید بھی مرگئی ہے؟ کیا وہ تیری ماں نہیں ہے؟ کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں؟

انجمن کے لب تک بہت سے حقیقت میں لپٹے ہوئے الفاظ آئے، اس نے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ اقبال میاں نے فرمایا:

مسرت کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی۔ آنسو ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے، ناہید کو تو عشق میں چھوڑ کر آیا ہوں، اور اچھا ہی ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ نہ لایا۔ ورنہ ان کی حالت دیکھ کر تیری حالت اور بگڑ جاتی۔

بجٹ میں اس سے زیادہ وقت نہ تھا۔ وہ صرف پندرہ منٹ کے لئے آئے تھے، لیکن بیس منٹ گزر چکے تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے فرمایا:

بیٹی اب میں چلتا ہوں، دیکھوں جا کر ناہید کا کیا حال ہے؟

انجمن نے نہ روکنا چاہا نہ روکا، وہ چلنے لگے، جاتے جاتے کچھ سوچ کر پلٹے اور بالکل پاس آکر سو روپے کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے بولے: بیٹی یہ رکھ لے، بہت سے خرچ

کرنا ہوں گے!

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے کہا: شکریہ چچا جان، اس کی ضرورت نہیں ہے!

چچا جان خفا ہو گئے۔ بزرگوں کی طرح ڈانٹتے ہوئے فرمایا: بڑوں سے ضد کرے گی!

اس نے اپنا پیچھا چھڑایا، تو پھر بھائی جان کو دے دیجئے، میں نہیں لے سکتی۔ خرچ ورچ انہی کے ہاتھ میں ہے۔

نوٹ پھر جیب میں پہنچ گیا۔ اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتے تھے کہ بھڑ کے چھتے کو چھیڑتے۔ یہ نوٹ اسلم کو دکھاتے، جو ایک مرتبہ پورے چھ ہزار کے نوٹ ردّی کر چکا تھا، ایک آہِ سرد کے ساتھ فرمایا:

اچھا بیٹی!

اور باہر چلے آئے، باہر پہنچے تو سلیم بیٹھا ہوا تھا اُسے دیکھ کر سٹپٹا گئے، کچھ گھبرا بھی گئے۔ اس "قران السعدین" نے ذرا کے ذرا پریشان کر دیا انھیں "سلیم تم — تم کب آئے — ؟"

وہ ادب کے ساتھ گویا ہوا: آ گیا ذرا اسلم صاحب کے پاس!

اسلم اور سلیم دونوں اقبال کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے — سلیم نے کہا: تشریف رکھئے — !

لیکن وہ تشریف رکھنے پر تیار نہ ہوئے۔ کہنے لگے: میں ذرا بڑی دیر کا آیا ہوا ہوں تم بیٹھو، مجھے اب جانا ہے۔ ذرا گھر کی خبر لوں جا کر!

وہ چلے گئے۔ اسلم اور سلیم پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ سلیم نے اقبال کے آنے سے پہلے تعزیت کا فرض ادا کر لیا تھا۔ اور اسلم نے محسوس کیا تھا کہ ان الفاظ میں صداقت ہے۔ سلیم ہی سے اسے اپنے اس اندیشے کی تصدیق ہو گئی کہ اقبال چچا جھوٹے ہیں۔ سلیم کی باتوں سے معلوم ہوا کہ تاہید اور مسرت دونوں بخیریت ہیں، نہ کسی کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہے نہ کسی پر غشی کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ باتیں کرتے کرتے سلیم نے کہا:

کہئے آجکل شغل کیا ہے؟

اسلم نے ایک افسردہ سے تبسّم کے ساتھ جواب دیا: بیک وقت بیکار بھی ہوں اور باکار بھی!

سلیم نے پوچھا، وہ کیسے؟ اگر باکار ہیں تو بیکار کیسے ہوئے؟ اور بیکار ہیں تو باکاری کا سوال کیا؟

وہ کہنے لگا: باکار تو یوں ہوں کہ ایک اخبار کے دفتر میں باقاعدہ ملازم ہوں، زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے کام دن میں بھی کرنا پڑتا ہے اور رات کو بھی، وقت کا کوئی تعیّن نہیں، جب کام نکل آئے اور بیکار یوں ہوں کہ چار مہینے نوکری کرتے ہوئے ہیں اور تین مہینے کی تنخواہ باقی ہے۔

سلیم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: خوب، ملازمت ہے یہ بھی! نہ اسے بیکاری کہہ سکتے ہیں نہ باکاری!

اسلم گویا ہوا: جی ہاں یہ ایسی ہی ملازمت ہوتی ہے۔

یکایک سلیم کے ذہن میں ایک خیال کوندا، پوچھا: لیکن جب آپ یہاں آ رہے تھے

تب تو تنخواہ مل گئی ہوگی ؟

اسلم نے بتایا : نہیں وعدہ کیا تھا کہ بھیج دیں گے ، تار دے چکا ہوں ــــ لیکن جواب ندارد !

سلیم کے چہرے پر اضطراب اور تشویش کے آثار پیدا ہوئے ، اس نے کہا : یہ تو بہت بُری بات ہے ، سوال یہ ہے پھر آپ کریں گے کیا ؟

اسلم نے جواب دیا : صبر کروں گا اور کیا کر سکتا ہوں ۔

سلیم بولا : میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آخر کام کس طرح چلے گا ؟

پُرخیال انداز میں فضا کو گھورتے ہوئے اسلم نے کہا : کام ! ـــــ جن لوگوں کی جیب خالی ہوتی ہے اُن کا کوئی کام بھی نہیں رکتا ۔

اس عجیب و غریب فلسفے کو سلیم سمجھ نہ سکا ، اسلم نے مزید کہا : اس لئے کہ پھر ہر کام اُن کے نزدیک اہم ہو جاتا ہے مثلاً میرے پاس روپے ہوتے تو بڑے دھوم دھام سے فاتحے کرتا ، اب نہیں کروں گا ، مُردوں کی مغفرت فاتحوں کی دعوتوں سے نہیں ہوتی ، ان کے عمل سے ، یا اُن کے دوستوں ، عزیزوں اور ہوا خواہوں کی دعاؤں سے ہوتی ہے ۔ میری امی نیک عمل خاتون تھیں ، اور جہاں تک دعا کا تعلق ہے اس سے نہ میں غافل ہوں نہ انجمن ـــ چلیئے کام بن گیا ـــ بنا یا نہیں ؟

سلیم حیران ہو کر اسلم کو دیکھنے لگا : اُسے حیرت تھی کہ دُنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس طرح سوچتے ہیں ، اتنی عجیب طرح !

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی ، پھر سلیم نے کہا ، لیکن فاتحوں کے علاوہ بھی تو بہت سے کام ہیں ، سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ اب زندگی کی گاڑی کس طرح چلے گی ؟

اسلم نے کھوکھلی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: زندگی کی گاڑی کس طرح چلے گی؟ کیا آپ کا خیال ہے وہ چلانے سے چلتی ہے؟ وہ خود ہی چلتی ہے، چلتی رہتی ہے جب رُکنا ہو گا رُک جائے گی!

یہ کس قسم کا آدمی ہے! سلیم سوچنے لگا اور پھر سوچے سمجھے بغیر اس کی زبان سے نکلا:

لیکن ــــ لیکن کھانا کھانا پڑتا ہے، اس کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے، کپڑے پہننا پڑتے ہیں، اس کے لئے بھی کچھ کرنا ہوتا ہے!

اسلم قطع کلام کرتا ہوا بولا: میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن یہ بھی تو کچھ کرنا ہی ہے کہ اگر نہ ہو تو نہ کھائے، نہ ہو تو نہ پہنے!

اس فلسفے نے اور زیادہ سلیم کو ہکّا بکّا کر دیا۔ جس جذبے کے ماتحت یہ ساری باتیں کر رہا تھا اب وہ پردۂ اخفا میں مستور نہ رہ سکا، اُبل پڑا، اس نے کہا:

میرا مطلب یہ ہے کہ کیوں نہ آپ حسبِ ضرورت رقم مجھ سے لے لیں اور جب آپ کو مل جائے ادا کر دیں!

اسلم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے کہا شکریہ! آپ کے ان الفاظ میں خلوص ہے اسی لئے میرا شکریہ بھی رسمی نہیں لیکن افسوس آپ کی پیشکش میرے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہ بتائیے آپ لندن کب جا رہے ہیں؟ میں نے تو سُنا تھا بہت جلد جانے والے ہیں۔

سلیم سمجھ گیا ــــ اسلم نے عمداً گفتگو کا موضوع بدلا ہے اور وہ اس کی مدد کسی طرح بھی قبول نہیں کرے گا۔ اس نے جواب دیا: جی ہاں ارادہ تو ہے لیکن کچھ ایسے

جھمیلے ہیں کہ شاید دیر لگ جائے بہرحال جاؤں گا ضرور!

تھوڑی دیر کے بعد سلیم نے اجازت چاہی اور رخصت ہو گیا!

سلیم کے جانے کے بعد اسلم نے ارادہ کیا کہ اندر جائے اور انجمن کی خبر لے نہ جانے اتنی دیر میں روتے روتے اس نے اپنا کیا حال کر لیا ہو گا؟ لیکن جاتے جاتے جیسے زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ سوچنے لگا سلیم کیوں آیا تھا؟ اس نے یہ پیش کش کیوں کی تھی؟ کیا یہ ایک معمولی سی بات تھی؟ یا اس کی تہ میں کوئی خاص مقصد پنہاں ہے! وہ خود آیا تھا یا کسی کا بھیجا ہوا آیا تھا؟ وہ میرا اتنا ہمدرد کیوں ہے؟ میری اس سے کوئی صاحب سلامت نہیں، تعلقات نہیں، مراسم نہیں، دوستداری نہیں، پھر یہ عنایت کیوں، یہ التفات کس لئے؟!

پھر انجمن کا خیال آیا اور وہ اس خیال کو جھٹک کر اندر چلا گیا!

(۱۲)
بیدرد

اسلم کے دو ماموں تھے، ایک فیض آباد میں رہتے تھے جو بقید حیات تھے، دوسرے کا انتقال ہو چکا تھا۔ اشفاق انہی کا لڑکا تھا اور اپنے عادات و اطوار کے لحاظ سے پسندیدہ خصائل کا مالک تھا۔

نائلہ جب بیوہ ہوئی تو جس طرح اس کی بہن نے ساتھ نہیں دیا بھیا نے بھی بات نہیں پوچھی۔ بھائی اگر امیر نہیں تھے تو غریب بھی نہیں تھے۔ چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن مولی اپنے پتوں سے بھاری، ان کے مصارف میں کار خیر کی کوئی مد نہ تھی، اور اگر تھی بھی تو اسے اپنے اوپر خرچ کر لیتے تھے۔

نائلہ نے جس طرح بہن کی آنکھیں بھری ہوئی دیکھ کر اس سے منہ موڑ لیا اسی طرح بھائیوں کو بے پروا دیکھ کر اُن سے کوئی آس نہیں لگائی۔ خدا پہ اس کا اتنا غیر متزلزل اعتقاد تھا کہ جتنی جتنی تکلیف اور مصیبت بڑھتی جاتی تھی یہ اعتقاد محکم اور مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ اور خدا پر

اتنا زیادہ اعتقاد رکھنے کے بعد بھر آدمی بندگانِ خدا کے سامنے نہ ہاتھ پھیلاتا ہے نہ سر جھکاتا ہے نائلہ نے غربت کے عالم میں ساری زندگی کاٹ دی، اسی حالت میں مری، بیٹی کو بیاہنے کے کیا کیا ارمان نہ تھے، کیا کیا حوصلے نہ تھے مگر دُھلے ہوئے سادہ کپڑوں میں نکاح کر دینے پر مجبور ہو گئیں اور کیا مجال ہے جو حرفِ شکوہ زبان تک آیا ہو، اس حالت میں بھی نماز پڑھ پڑھ کر خدا کا شکر ہی ادا کرتی رہی۔

چھوٹے ماموں یعنی اشفاق کے باپ اگر زندہ ہوتے تو ہرگز مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہ لگ سکتا تھا۔ یعنی انجمن اور اشفاق کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ حیثیت کو بہن اور بھانجی کے معاملے میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کلثوم نے اِدھر اُدھر بہت ہاتھ پاؤں مارے، اور "حیثیت" والی لڑکیاں تلاش کیں، لیکن اشفاق اتنا نالائق ثابت ہوا کہ اُسے رام نہ کر سکیں، جب کبھی موقع ملتا وہ پھوپھی یعنی نائلہ کے ہاں ضرور پہنچ جاتا۔ اور یہاں اس کی آؤ بھگت بھی ہوتی۔ لیکن جس لئے آتا وہ بات نہ کہہ سکتا۔ نہ انجمن سے نہ نائلہ سے۔ دل کی دل ہی میں رہ جاتی!

پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اس نے کلثوم کو الٹی میٹم دے دیا۔ شادی ہوگی تو انجمن سے ورنہ نوکری چھوڑ کر کہیں روپوش ہو جاؤں گا ــــ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لیتا مجھ سے ــــ!

اس نالائقی پر دل جل کر کباب ہو گیا!

لیکن اکلوتا لڑکا تھا، گھر بھی سنبھالے ہوئے تھا، سختی کر نہیں سکتی تھیں، اور جب روپوش ہونے کی خوش خبری سُنی، تو سب کچھ بھول کر پہنچ گئیں نائلہ کے پاس پیام لے کر ــــ اس لعنتی پا

کے سجیے نے کیا کیا کیا ذلیل!

جس گھر میں قدم رکھنا باعثِ ننگ و عار سمجھتی تھیں وہیں جھولی پھیلا کر بھکارن بن کر پہنچیں ـــ خدا ایسے خود سر لڑکے بھی نہ دے کسی کو!

بات بننے والی تھی بن گئی، جھٹ منگنی پٹ بیاہ بھی ہو گیا۔ لیکن جو خوشی ہونا چاہیے تھی وہ نہ ہوئی۔ انجمن کو سادہ لباس میں دیکھ کر ایک ہوک سی اٹھتی دل میں، لیکن بے بس تھیں کرتیں کیا، اسی اثنا میں نائلہ بیمار پڑی، چارپائی سے لگ گئی، گھڑیاں گنی جانے لگیں:

اشفاق سب کام چھوڑ چھاڑ پھوپھی کی تیمارداری، علاج اور دوا دوش میں لگ گیا۔ اس کی اس مصروفیت اور انہماک کو دیکھ کر دل اور کڑھا۔ ایک مرتبہ جب ڈاکٹر نے جواب دے دیا تو جی میں آیا کہ مرنے والی سے پوچھیں:

کیوں بہن! اسی کی منتظر تھیں کہ انجمن کو ہمارے سر تھوپو اور چل بسو!

لیکن دل کی بات زبان تک لانے کی جرأت نہ کر سکیں، کس سے کہتیں، کون رازدار تھا؟

اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، فرزانہ کے شوہر کار کے حادثہ میں زخمی ہوتے اور وہ بیٹی اور بیٹے کو لے کر سعادت گنج سدھاریں، دو موتیں سامنے تھیں۔ دو ہستیاں بستر مرگ پر دراز تھیں!

یہ امتحان کا وقت تھا ـــ اور خود اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئیں۔ نائلہ کو انجمن پر چھوڑ کر بیٹی کو ساتھ لے بیٹے کے ساتھ بشارت گنج روانہ ہو گئیں!

اشفاق نے لاکھ پہلو بچانا چاہا، لیکن بہن اور بہنوئی کا معاملہ تھا، انکار نہ کر سکا، بادلِ ناخواستہ جانا پڑا۔ ارادہ یہ تھا کہ دو دن میں واپس آ جائے گا لیکن بشارت گنج پہنچ کر

معلوم ہوا کہ نسیم صاحب کی پسلی کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں ۔ ڈاکٹر نے لاکھ اطمینان دلایا لیکن فرزانہ کے کہرام اور کلثوم کے بین نے اشفاق کے پاؤں پکڑ لئے ۔ ہر ٹرین سے وہ واپس جانے کا ارادہ کرتا لیکن ہر ٹرین چھوٹ جاتی ۔ اور پھر وہ دوسری گاڑی سے جانے کا پروگرام بنا لیتا ۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے ۔ اضطراب، تشویش اور فکر کے یہ دن اس نے بڑی مصیبت سے کاٹے ،

اور جس دن نسیم کی پٹیاں کھل گئیں اور ڈاکٹر نے بشارت دی کہ اب دو چار دن میں بوریہ بستر باندھ کر رخصت کی تیاری کیجئے، کلثوم نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور فرزانہ خوشی سے پھولی نہ سمائی ۔ اس دن اشفاق کو اجازت ملی کہ اب وہ جا سکتا ہے !

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ، فوراً جانے کی تیاریاں کرنے لگا ۔

کلثوم ، فرزانہ اور اشفاق نسیم کے پاس ہسپتال میں بیٹھے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے ۔ نسیم اس انوکھی شادی پر اُسے چھیڑ رہا تھا فرزانہ بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی ، کلثوم بڑی محتاط تھی ۔ اس لئے صرف خاموش رہ کر نسیم اور فرزانہ کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی ۔ مگر اشفاق بھی کب بند رہنے والا تھا ۔ ایک کے جواب میں دس سناتا ۔ نسیم نے کہا :

اماں ہٹو بھی ، ہم نے سوچا تھا کسی مالدار لڑکی سے شادی کریں گے تمھاری ، اور تم ایسی دُلہن بیاہ لائے جس کے پاس خدا کے نام کے سوا کچھ نہیں ، ساری خوشی کرکری کر دی تم نے کیا کیا حوصلے تھے سب خاک میں ملا دیے (کلثوم سے مخاطب ہو کر) آپ بھی اس کے کہنے میں آ گئیں ـــ !

کلثوم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا : قسمت کا لکھا ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے ۔

فرزانہ بولی : اتنی پیاری اور بھولی بھالی تو ہے ہماری انجمن !

نسیم نے کہا : ضرور ہوگی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔

فرزانہ نے اشفاق کا بدلا ہوا رنگ رُخ دیکھ کر کہا :

بس رہنے دیجیئے ، شادی پسند کی ہونی چاہیئے ۔ دولت سے کیا ہوتا ہے ، وہ تو ہاتھ کا میل ہے ، آج ہے کل نہیں !

اشفاق گویا ہوا : مجھے ان لوگوں سے ہمدردی ہے جو صرف دولت ہی کو پسند کرتے ہیں

نسیم تکیے کے سہارے ذرا اونچا ہوا :

یہ تم نے ہم پر چوٹ کی ہے ؟ !

وہ بولا : جی میں اتنا گستاخ نہیں ہوں کہ آپ پر چوٹ کروں ! لیکن اپنی چوٹ ضرور محسوس کی ہے ۔

نسیم ہنسنے لگا ۔ بڑے شریر ہو (کلثوم سے) یہ تو بتایئے واقعی انجمن ایسی ہی ہے جیسی فرزانہ اس کی تعریف کرتی ہیں ؟

کلثوم نے بے دلی سے کہا : دیکھ لینا ، اللہ تمھیں اچھا کر دے ، خود وہاں جا کر یا اسے یہاں بلا کر !

نسیم نے منہ بنا کر شوخ نظروں سے اشفاق کو دیکھتے ہوئے کہا : جی ہاں یہ تو بادلِ ناخواستہ کرنا ہی پڑے گا !

اشفاق بگڑ گیا : بادلِ ناخواستہ کیوں ؟ ۔۔۔ اور کیا آپ نے سمجھ لیا ہے کہ اگر آپ نے بلایا تو وہ آ ہی جائے گی !

نسیم نے مسکراتے ہوئے پوچھا : کیوں نہیں آئے گی ، ہم بلائیں اور وہ نہ آئے !

وہ کہنے لگا: اوپری دل سے ہم لوگ کہیں بلائے جائیں تو نہیں جاتے!

نسیم نے ایک قہقہہ لگایا: اوہو! "ہم لوگ!" اب آپ ہم لوگ ہیں! سبحان اللہ ماشاء اللہ! (کلثوم سے) سنا آپ نے؟

وہ تیوری چڑھا کر بولیں: ہاں سن لیا۔ جو کچھ سنواؤ گے وہ سننا پڑے گا!

نسیم نے بات بگڑتی دیکھ کر کہا: ہم لوگ تو مذاق کر رہے ہیں!

وہ بولیں: ہاں اور کیا، مذاق کے لئے میں ہی تو رہ گئی ہوں! — کر لو خوب جی بھر کے مذاق، مجھ سٹھیائی ہوئی بڑھیا سے!!

فرزانہ رونکھی ہو گئی: امی: امی واہ آپ تو خفا ہو گئیں!

وہ کہنے لگیں: میری خفگی کی پروا تم بھائی بہنوں میں سے کسے ہے۔ تم اپنے رنگ میں کامل، صاحبزادے اپنی دُھن کے پکے! جو تم چاہتی ہو وہ ہوتا ہے جو انھوں نے چاہا وہ ہوا۔ میں تو صرف اس لئے ہوں کہ تعمیل حکم کرتی رہوں!

فرزانہ جواب میں کچھ کہنے والی تھی کہ ملازم ڈاک لے کر آیا۔ نسیم نے نیم دراز ہو کر شفاق سے کہا:

پرائیویٹ سکریٹری صاحب ڈاک سنائیے! پھر اسٹینوبن کر جوابات لکھئے۔

اشفاق نے ڈاک ہاتھ میں لی۔ پہلا خط جو اس کے ہاتھ میں آیا وہ انجمن کا تھا۔

اس نے بقیہ ڈاک الگ رکھ دی، لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگا:

"امی اس دُنیا سے گزر گئیں۔ کاش آپ اس وقت ہوتے،

بھیا آ گئے ہیں، لیکن مجھ سے زیادہ ان کی حالت ابتر ہے!"

خط پڑھتے ہی اشفاق کا رنگ زرد ہو گیا، نسیم نے پوچھا:

خیریت ! ۔۔۔ کس کا خط ہے ؟

فرزانہ نے لفافہ اشفاق کے ہاتھ سے لے لیا ۔ بولی : انجمن کا ہے !

خط پڑھ کر لفافہ نسیم کی طرف بڑھا دیا ۔ خاموشی سے کلثوم نے پوچھا : خیریت تو ہے سب ۔۔۔ ؟ !

نسیم نے لفافہ ایک طرف رکھتے ہوئے غم انگیز لہجے میں کہا : وہی تو نہیں ہے !

فرزانہ بولی : امّی بھتیجی کا انتقال ہوگیا ۔

اگرچہ اس خبر کی توقع تھی ، لیکن سن کر گھبرا گئیں ۔ کیا کہا نائلہ مر گئی ؟ !

فرزانہ نے جواب دیا : بڑا افسوس ہوا کتنے دُکھ اٹھائے تھے انھوں نے زندگی میں افسوس آخر وقت میں بھی ہم ان کے پاس چند دن نہ رہ سکے !

نسیم نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا : واقعی بڑے افسوس کی بات ہے لیکن جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ، اب صبر کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے ؟ !

فرزانہ بولی : صبر تو کرنا ہی پڑے گا ۔ ہم انھیں ایسی حالت میں چھوڑ آئے تھے کہ زندگی کی امید بھی نہیں تھی ۔ لیکن سوچ رہی ہوں انجمن غریب پر کیا گزر رہی ہوگی ! کس طرح اس غم کو اس نے سہا ہوگا ! کس نے اس کے آنسو پونچھے ہوں گے ؟

کلثوم نے کہا تمھاری اس سعادت مندی سے دل خوش ہوتا ہے ، لیکن حیرت ہے کہ تم تو یہ سب کچھ سوچ رہی ہو ، لیکن صاحبزادے عیش کر رہے ہیں ۔ نہ ماں کی زندگی میں گئے نہ مرنے پر پہنچے ، کچھ اُن کا فرض بھی تو تھا !

اشفاق نے ذرا بلند آواز سے کہا : امّی اتنی بے درد نہ بنئے !

کلثوم نے کچھ حیرت ، کچھ برہمی کے ساتھ بیٹے پر ایک شعلہ بار نظر ڈالی اور پوچھا :

کیا کہا تونے ــــ میں بے درد ہوں!

اشفاق نے اسی لب ولہجہ میں کہا:

آپ اسلم کو نہیں جانتیں، میں جانتا ہوں!

وہ بولیں: ہاں میں اسے کیا جانوں ــــ وہ میرا کون لگتا ہے بھلا! تم جانتے ہو اُسے، تمھارا تو گودوں کا کھلایا ہوا ہے وہ!

فرزانہ نے رفع شر کے لیے بتایا: امّی اسلم آگیا ہے۔ اور واقعی وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ انجمن نے لکھا ہے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی!

کہنے لگیں لکھا ہوگا ــــ؟! اور سچ ہی لکھا ہوگا!

نسیم نے فرزانہ اور کلثوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: میں تو ابھی اس قابل نہیں ہوں لیکن تم لوگوں کو فوراً روانہ ہوجانا چاہیئے پہلی ٹرین سے!

فرزانہ آمادگی اور مستعدی کے ساتھ بولی: ہاں واقعی! ہمیں ضرور جانا چاہیئے اور فوراً۔ اشفاق تم سوچ کیا رہے ہو بیٹھے، کس کے ماں باپ ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ غم تو ایک نہ ایک دن دیکھنا ہی پڑتا ہے، سفر کی تیاری کرو۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جو ٹرین جاتی ہے اس سے چلیں گے۔

یہ سن کر اشفاق اٹھا اور کوٹھی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کلثوم برس پڑی فرزانہ پر: تم ہی نے بگاڑا ہے لڑکے کو، ورنہ وہ ایسا نہ تھا!

فرزانہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی:۔ امّی میں نے کیا کیا آپ تو خواہ مخواہ ــــ قطع کلام کرتی ہوئی بولیں: ہاں بھئی میرا تو دماغ چل گیا ہے خواہ مخواہ کی باتیں نکل ہی جاتی ہیں منہ سے! لیکن خود ہی ابھی کہہ چکی ہو، سب کے ماں باپ ہمیشہ تو نہیں بیٹھے رہتے!

فرزانہ نے متحیر ہو کر ماں کو دیکھا اور بولی : یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟

جواب ملا : میں کیوں کہتی ، تم ہی نے کہا تھا : سو بیٹی باپ تو اللہ کو پیارے ہو چکے میں بھی قیامت کے بورے نہیں سمیٹوں گی ۔ اطمینان رکھو ، آج مری کل دوسرا دن !

فرزانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ لسنیم نے سوچا یہ تو بہت بُرا ہوا ، بات بہت زیادہ بڑھ گئی ۔ اس نے مداخلت کرتے ہوئے کلثوم سے کہا :

آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں ۔ فرزانہ جیسی ماں کی پرستار سے یہ بد گمانی ! اس نے تو اشفاق کو تسلّی دینے کے لئے ـــــ

اشفاق کو تسلّی دینے کے لئے ـــ ہاں سچ تو ہے ۔ اس کی ماں بھی وہی تھی نا کہ میں تو اس کی اتا ہوں ۔ بے شک اُسے تسلّی دینی چاہیئے تھی ۔ اب وہ انھیں ساتھ لے جانے کے لئے آتا ہوگا ، میں بھی پُرسا دوں گی اُسے !

ماں کی ان باتوں پر فرزانہ کو غصّہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی ، کوئی اور وقت ہوتا تو شاید لڑ جاتی ۔ مگر ٹھنڈے لہجے میں بولی :

میں نے تو جو کچھ کہا وہ محض ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا ۔ لیکن کیا آپ نہیں چلیں گی ؟

وہ بگڑ کر بولیں : مجھے کیا ضرورت ہے جانے کی !

لسنیم نے اصرار کیا : ایسا نہ کیجئے ۔ اس وقت تو ضرور جانا چاہیئے آپ کو ، خواہ دو چار دن رہ کر واپس چلی آئیے ۔

فرزانہ نے ہاں میں ہاں ملائی ، اشفاق کو وہاں چھوڑ کر میں بھی آپ کے ساتھ واپس آجاؤں گی ، لیکن چند دن کے لئے ضرور چلنا چاہیئے !

کلثوم نے اعتراض کیا ، لیکن اشفاق کو وہاں چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے ۔ کیا انجمن

ہمیشہ وہاں رہے گی۔ کیا سسرال میں قدم رکھنے کا ننگ گوارا نہیں کرے گی؟

نسیم نے کلثوم کی تائید کرتے ہوئے کہا: یہ بھی ٹھیک ہے، جائیے کچھ دن وہاں رہیے اور انجمن کو ساتھ لے کر آجائیے!

ماں کو نیم رضامند دیکھ کر فرزانہ ماں سے لپٹ گئی۔ میری امی ہنیں، چلیے، آپ کو ضرور چلنا پڑے گا۔

بات کچھ سمجھ میں آگئی۔ ہولے سے اسے پرے ہٹاتے ہوئے بولیں: اچھا اچھا زیادہ چونچلے نہ کرو۔

اتنے میں اشفاق آگیا، اس نے آتے ہی کہا:

چلیے، گاڑی کے آنے میں اب صرف پندرہ منٹ باقی ہیں!

(۱۳)

آج ہی گھر میں ویرانہ ہوا

اسلم کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ انجمن ماں کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھی کہ سب سے پہلے اشفاق اندر داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی پکارا "انجمن!" اور لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ انجمن نے قرآن جزدان میں رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اشفاق کو دیکھ کر خود بخود اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تسلی دیتا ہوا بولا:

صبر کرو انجمن! سب کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔

اتنے میں فرزانہ آ گئی اور اس کے پیچھے کلثوم۔ فرزانہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ میری انجمن! ہائے کیا کہوں کتنا غم ہوا ہے خط پڑھ کر، لیکن خدا کی مرضی!

اب کلثوم بالکل قریب آ چکی تھی، انجمن نے جھک کر سلام کیا۔ اس نے مغموم آواز میں کہا "جیو!"

پھر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا: صبر کرو بیٹی!

یہ کہہ کر سامنے جو چارپائی پڑی تھی اس پہ پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی ۔ یہ گھٹنوں کا درد مار ڈالے گا مجھے !

انجمن نے آگے بڑھ کر کہا : لائیے دبادوں !

وہ پاؤں ہٹاتی ہوئی بولیں : نہیں نہیں !

فرزانہ نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : امی دیکھتی ہیں آپ ، چند روز میں انجمن کا کیا حال ہوگیا ہے ! کیا حال کر لیا ہے اس لڑکی نے اپنا !

وہ بولیں : ہاں دیکھ رہی ہوں ۔ لیکن ـــــ ماں کا غم بھی ایسی چیز ہے جو بھلایا جا سکے ! ویسے آجکل کے لڑکے اور لڑکیاں دعا مانگا کرتے ہیں کہ کب ماں مرے اور کب گھی کے چراغ جلائیں !

براہ راست یہ چوٹ فرزانہ اور اشفاق پر تھی ، لیکن یہ موقع بات بڑھانے کا نہ تھا ، وہ کہنے لگی : نہ جانے کیسے بدبخت لوگ ہوتے ہوں گے وہ بھی !

کلثوم بی نے لقمہ دیا : ہے ہے ایسا نہ کہو ،

اشفاق کو اس گفتگو سے وحشت ہونے لگی ۔ بجائے اس کے کہ انجمن کے قلب شکستہ کو جوڑنے کی کوشش کی جاتی نوک جھونک شروع ہوگئی ۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کلثوم کی سرد مہری انجمن کے ساتھ نہ صرف بدستور قائم ہے بلکہ کچھ اور بڑھ گئی ہے ، مناسب یہی معلوم ہوا کہ سامنے سے ہٹ جائے ۔ چنانچہ اوپر والے کمرہ میں چلا گیا ۔ اس کی موجودگی میں یہ اس کا اور انجمن کا مشترک کمرہ تھا ۔

فرزانہ اپنے ساتھ ایک ملازم بھی لائی تھی ، نیچے کے دونوں کمروں کی اس نے جلد جلد صفائی کی اور سامان سلیقے سے رکھنے لگا ۔ انجمن نے جلدی سے ایک کمرہ میں ساس کا بستر

لگادیا اور پھر آکر بولی :

چلئے ، بستر کر دیا ہے میں نے وہیں آرام کیجئے ، تھک گئی ہوں گی آپ ! میں ابھی چائے بنا کر لائی !

کلثوم نے ان باتوں کے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا ، اپنے کمرے میں چلی گئیں ، فرزانہ بولی :

بھئی ہم تو پہلے غسل کریں گے پھر چائے پئیں گے ۔

انجمن نے کہا : میں نے پانی پہلے ہی گرم کر دیا ہے ، جائیے نہا لیجئے ۔

فرزانہ خوش ہوگئی ، اس کے گال چھوتی ہوئی بولی : کتنی پیاری کتنی اچھی ہے ہماری انجمن !

کلثوم اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھی یہ جگر فگار اور اشتعال انگیز منظر دیکھ رہی تھی آخر ضبط نہ ہو سکا وہیں سے چیخیں : کیا نمونیہ سے مرنے کا جی چاہ رہا ہے ، دھوپ ڈھلتی جارہی ہے نہاؤ گی نہیں !

فرزانہ ہنستے ہنستے چپ ہو گئی اور وہیں سے بولی :

جا تو رہی ہوں ، آپ بھی وضو کر کے نماز پڑھ لیجئے جب تک ، وقت نکلا جا رہا ہے ، امی کے لئے وضو کو پانی رکھ دے جلدی سے اشرف ! اور مصلیٰ بھی بچھا دے !

پھر انجمن سے سرگوشی کے لہجے میں بولی : نہ جانے کیا ہو گیا ہے انھیں ، صبح سے جلی کٹی باتیں کئے جارہی ہیں

انجمن کے ہونٹوں پر افسردہ سا تبسم کھیلنے لگا ۔ فرزانہ نے کہا : "اچھا میں ابھی آئی "

کلثوم وضو کرنے چوکی پر بیٹھ گئیں ۔ فرزانہ نہانے چلی گئی ۔ اشرف سامان کی دھر پٹخ میں

مصروف ہوگیا۔ انجمن چائے بنانے کے لئے باورچی خانے پہنچی، لیکن ـــــــ
لیکن نہ جانے تھی نہ سکی ــــ دل دھک سے رہ گیا!

اسلم بھی نہیں تھا کہ اس سے کہتی، لیکن وہ ہوتا بھی تو کیا کرلیتا! "قوم" کے مالک کو تار دیے، خط لکھے مگر جواب ندارد! جو کچھ پاس تھا خرچ ہوچکا تھا۔ صبح اس نے کھچڑی پکائی تھی! اور دونوں بھائی بہن نے خوشی خوشی کھالی تھی۔ لیکن ان معزز مہمانوں کو تو کھچڑی نہیں کھلائی جاسکتی تھی۔ وہ تو اشرف بھی نہیں کھائے گا ــــ پھر؟!

اس ذلّت کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جو آج پیش آرہی تھی!

لاکھ اپنایت سہی، عزیز داری سہی لیکن ایسی بھی کیا غربت کہ ساس اور نند کو گت کا کھانا بھی نہ کھلایا جاسکے، کھانے کے وقت میں اب دیر ہی کیا تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں تیار ہوجانا چاہیے ــــ پھر؟

آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑی دوڑی اوپر گئی۔ اشفاق کے پاس، وہ اسے دیکھ کر محبت بھرے لہجے میں بولا: آؤ انجمن، اتنا غم نہ کرو کہ جان پر بن جائے۔ تمہاری آنکھیں اب تک سُرخ ہیں! چہرہ اترا ہوا ہے، مجھ سے یہ کیفیت نہیں دیکھی جاتی!

ان الفاظ نے اسے بہت تسلی دی۔ ذرا دیر کے لئے ساری پریشانی بھول گئی۔ بالکل قریب پہنچ کر بولی: اچھا ایک بات تو بتائیے:

اشفاق نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا: بھئی تم امی کی سرد مہری کو کہہ رہی ہوگی، ان پر اس طرح کے دورے پڑا کرتے ہیں، کبھی خوش، کبھی خفا۔ کبھی خود بخود خوش کبھی بے وجہ خفا! میں اور آپا تو اس کے عادی ہوچکے ہیں۔ تمہیں بھی ان باتوں کو محسوس نہ کرنا چاہیے آگیا سمجھ میں!؟

ان باتوں پر اپنی پریشانی میں اس نے غور بھی نہیں کیا تھا، نہ وہ انھیں زیر بحث لانا چاہتی تھی، کہنے لگی:

تو بھئی میں تو کچھ اور کہہ رہی تھی،

اشفاق نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا: تو اجازت کی ضرورت ہے، کہو

وہ اٹکتے ہوئے گویا ہوئی۔ بھائی جان کی تنخواہ تین مہینے کی باقی ہے، وہ بہت پریشان ہیں ——!

اشفاق نے بے پروائی کے ساتھ کہا: ہاں بھئی ذاتی اور نجی ملازمتوں میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن وہ بڑا قابل اور ہونہار شخص ہے ان مشکلوں پر غالب آجائے گا۔ اور نام پیدا کرے گا!

انجمن مسکراتی ہوئی بولی: نجومی صاحب پیشین گوئیاں رہنے دیجئے۔ میرے اور بھیا کے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے۔ صبح ہم دونوں نے کھچڑی کھائی تھی، کام چل گیا تھا مگر آپ کی اماں (کلثوم) کو اور باجی (فرزانہ) کو کیا کھلاؤں گی؟ اور کھانے سے بھی پہلے چائے کا سوال ہے!

اشفاق نے تیوری چڑھا کر کہا: ان تکلفات کی آخر ضرورت ہی کیا ہے ۔ ہم سب بھی کھچڑی کھالیں گے،

وہ کہنے لگی: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چائے کا تو میرے منہ سے خود ہی نکل گیا۔ ورنہ کسی نے فرمائش تو کی نہیں تھی! باورچی خانہ پہنچی تو چائے بھی ندارد اور شکر بھی ۔ بہر حال اب یہ مشکل حل کیجئے۔

اشفاق نے اپنی جیب سے دس دس روپے کے دس نوٹ نکالے اور انجمن کی طرف

بڑھا دئے۔ بغیر کسی تامل اور تکلّف کے جیسے یہ اسی کی رقم تھی! اس نے ہاتھ بڑھا کر نوٹوں پہ قبضہ کیا۔ پھر بولی:

لیکن سامان کون لائے گا؟

اشفاق نے کہا، اشرف کس مرض کی دوا ہے؟

وہ بولی: ویسے تو اس سے کام لینے میں کوئی بات نہیں۔ لیکن اس وقت اگر منگاؤں گی تو کیا کہے گا وہ اپنے دل میں!

اشفاق نے سوال کیا: کیا کہے گا؟

وہ گویا ہوئی: کہے گا یہ اتنے فقطے ہیں کہ چائے اور شکر تک موجود نہیں، پھر میں اس سے آنکھیں چار نہیں کر سکوں گی!

اشفاق نے عاجز آتے ہوئے کہا: تو پھر آخر چاہتی کیا ہو تم؟

وہ بولی: آپ کو تکلیف کرنا پڑے گی، (ایک کینوس کا تھیلا بڑھاتے ہوئے) بڑا اچھا موقع ہے اماں نماز پڑھ رہی ہیں، باجی غسل کر رہی ہیں، اشرف سامان ٹھیک کر رہا ہے کمرے میں، باہر صحن میں کوئی نہیں ہے۔ ضرورت کی تھوڑی تھوڑی چیزیں لے آیئے۔ باقی کل اشرف لے آئیگا

اشفاق نے تھیلا لے لیا اور بولا: بہت اچھا!

وہ تاکید کرتی ہوئی کہنے لگی: خبردار کسی کو پتہ نہ چلے، چور کی طرح جائیے، میں باورچی خانہ میں آگ جلاتی ہوں۔ جب تک وہیں چپکے سے تھیلا رکھ کر اوپر چلے جائیے گا! (دس کا نوٹ بڑھا کر) لیجئے!

اشفاق نے نوٹ نہیں لیا اور چلا گیا!

---

(۱۴۱)
جلی کٹی

شوہر اور محبت کرنے والا شوہر بھی کیا چیز ہوتا ہے، جتنا اعتماد اس پر کیا جا سکتا ہے کسی پر نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا سہارا وہ بن سکتا ہے کوئی نہیں بن سکتا۔ انجمن نے اپنی شکل کا حسن صفائی اور آسانی سے اشفاق کو رازدار بنا لیا شاید اسلم کو بھی نہیں بنا سکتی تھی!

دونوں دبے پاؤں اترے، صحن بالکل خالی تھا۔ اشفاق آہستہ سے باہر نکل گیا اور وہ باورچی خانہ میں بیٹھ کر آگ سلگانے لگی!

کوئی پندرہ منٹ میں اشفاق وہ تھیلا چپکے سے انجمن کے پاس رکھ کر شاید داد پانے کے لئے کھڑا ہو گیا لیکن انجمن نے تھیلا کھولنے سے پہلے آنکھوں سے رخصت ہو جانے کا اشارہ کیا، وہ خاموشی کے ساتھ اوپر چلا گیا۔ اب تھیلا کھولا تو وہ عمرو عیار کی زنبیل ثابت ہوا ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، شکر، چاے، گوشت، انڈے، گھی، بسکٹ کا پیکٹ،

مکھن، اچار کی بوتل، سبزی، ترکاری، پیاز، آلو، لہسن اور تھوڑے سے پھل!

یہ چیزیں دیکھ کر انجمن اپنی پریشانی بھول گئی، اس کے ہونٹوں پر سحر طراز تبسم رقص کرنے لگا۔ اس کے دل میں شوہر کی محبت اور عزت بڑھ گئی، اگر وہ محبت نہ کرتا ہوتا، اگر وہ محبت کرنے والا شوہر نہ ہوتا تو کس طرح اپنی غربت کا مداوا خود اس کی ماں اور بہن کے لئے وہ چاہ سکتی تھی ۔۔۔! اس کے دل میں اشفاق کی محبت اور عزت بڑھ گئی۔ اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا، اسے ہر مصیبت ہیچ معلوم ہونے لگی۔ ایسے رفیق زندگی کی موجودگی میں ہر دکھ سکھ بن سکتا ہے!

اس نے دوسری چیزیں تو ایک طرف رکھیں، پہلے جلدی جلدی چائے بنائی، کچھ پکوڑے تل لئے، اور یہ سامان لے کر کلثوم کے کمرے میں پہنچی۔ وہ تسبیح سے شغل کر رہی تھیں فرزانہ تولیہ سے بال سکھا رہی تھی! چائے دیکھ کر خوش ہو گئی، کہنے لگی، بھئی انجمن کیا کہنا ہے تمھارا! کتنے اچھے وقت چائے لائی ہو جب اس کے لئے دل تڑپ رہا تھا!

انجمن نے مسکراتے ہوئے چائے بنائی، ایک پیالی ادب سے کلثوم کے سامنے رکھی۔ ایک فرزانہ کے، اس کے بعد پھر باورچی خانے گئی! اور ایک اور ٹرے لے کر اوپر پہنچی۔ اشفاق نہ جانے کس خیال میں ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا!

ارے! یہ کیا ہے بھئی؟ اتنی جلد!

چائے رکھ کر وہ جانے لگی تو اشفاق نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، چلیں کہاں، تمھیں بھی پینا پڑے گی ہمارے ساتھ!

وہ ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی: جی نہیں معاف کیجئے، اس وقت، اگر کہیں اماں نے دیکھ لیا، یا باجی نے پکارا اور میں نہ ہوئی تو بُرا ہو گا!

اشفاق نے اسی طرح ہاتھ پکڑے پکڑے سوال کیا . . . کیا بُرا ہوگا ؟

وہ بولی : آاں کہیں گی کتنی بے غیرت لڑکی ہے ، باجی بھی مذاق اڑائیں گی !

اشفاق نے ٹرے ایک طرف کھسکا دی ، تو ہم بھی نہیں پیتے پھر !

مجبوراً اُسے بیٹھنا پڑا ۔ بڑی بے موقع ضد کرتے ہیں آپ ؟

دونوں نے مل کر چائے پی ۔ اشفاق اس کی ہنرمندی کی تعریف کرتا رہا ۔ اتنی اچھی چائے آج پہلی مرتبہ پی ہے زندگی میں ! اور یہ پکوڑے : ان کا سواد سب سے الگ ہے !

وہ ہنسنے لگی ۔ اب آپ نے بنانا شروع کر دیا ــــ اچھا آپ اطمینان سے پیتے رہئے میں پی چکی مجھے جانے دیجئے !

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر چلی گئی ۔

نیچے پہنچی تو تیر کی طرح سیدھی کلثوم کے کمرے میں آ گئی ، کہ پی چکی ہوں تو ٹرے اور پیالیاں اٹھا لاؤں ، اُسے دیکھتے ہی کلثوم نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں اوپر کے کمرے کی طرف تکتے ہوئے کہا :

پلا دی چائے لڑکے (اشفاق) کو ؟

وہ بولی : جی ہاں پلا دی ۔

کلثوم نے پھر اسی لب و لہجے میں کہا : اور پی بھی آئیں ؟

جی ــــــــ !

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی ۔ سٹپٹا گئی ۔ یہ عجیب قسم کا سوال تھا ، اس کا جواب دینا آسان نہ تھا ۔ فرزانہ کو یہ بات بُری لگی ۔ توبہ ہے امّی !

امّی بگڑ گئیں ، کیوں ڈانٹ رہی ہو بیٹی ماں کو ؟ کیا غلطی ہو گئی مجھ سے ؟!

انجمن کو کلثوم بی سے کبھی سابقہ نہیں رہا تھا۔ زندگی میں شاید چند ہی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ وہ بھی کسی تقریب کے موقع پر، البتہ جب وہ اشفاق کا پیام لے کر آئی تھیں اور کئی دن رہی تھیں تو انھیں دیکھنے اور پرکھنے کا اچھا خاصا موقع ملا تھا۔ اور یہ موقع بڑا خوشگوار تھا۔ ان کے اخلاق، ان کی محبت، ان کی اپنائیت سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ نائلہ کے ساتھ ان کا جو برتاؤ تھا وہ تو تھا ہی، لیکن خود اسے دیکھ کر وہ بچھ بچھ جاتی تھیں، زبان خشک ہوتی تھی اس کی تعریف کرتے کرتے۔

میری انجمن تو چاند ہے چاند!

سگھڑ کتنی ہے میری بچی!

اسے دیکھ کر بلیوں خون بڑھ جاتا ہے میرا!

صبح شام یہ باتیں سن سن کر کان پک گئے تھے، لیکن اس مرتبہ جب سے آئی تھیں ان کے طور طریقے ہی کچھ اور تھے! کچھ عجیب سے دبدبے، جلال اور طنطنے کا اظہار کر رہی تھیں کہاں وہ محبت جو معلوم ہوتا تھا عشق کے درجے تک پہنچ گئی ہے کہاں یہ سرد مہری کہ ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا!

وہ حیران ہو ہو کر سوچنے لگی اس انقلاب کا راز کیا ہے، سبب کیا ہے؟

پھر اس کے کانوں میں اشفاق کے الفاظ گونجنے لگے۔۔:

امی پر اس طرح کے دورے پڑا ہی کرتے ہیں، کبھی خوش کبھی خفا، کبھی خود بخود خوش کبھی بے وجہ خفا، میں اور آپا تو اس کے عادی ہو چکے ہیں، تمھیں بھی ان باتوں کو محسوس نہ کرنا چاہیئے!

اس نے فیصلہ کر لیا، اشفاق کی نصیحت پر عمل کرے گی اور اماں کی باتوں کو محسوس

نہیں کرے گی۔

اس فیصلے سے وہ تکدر دور ہوگیا جو نانا نوس سے الفاظ اور جملے سن کر پیدا ہوگیا تھا۔

انجمن نے ٹرے اٹھائی اور باورچی خانے چلی گئی کہ کھانا پکائے۔ شام کا اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔

انجمن کے جانے کے بعد فرزانہ نے ماں کی ٹانگ لی، امی کیا کہہ رہی ہوگی وہ اپنے دل میں؟

کلثوم نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا: کوس رہی ہوگی، خدا سے دعا مانگ رہی ہوگی کہ اس بلا سے نجات ملے!

الجھ کر فرزانہ نے کہا لیکن کیوں امی!

وہ بولیں: اس لئے کہ میں بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں برداشت نہیں کرسکتی، اور صاحبزادی خیر سے حیا کو گھول کر پی چکی ہیں۔

فرزانہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں: یہ تم انجمن کو کہہ رہی ہو ــــ اس نے حیا کو گھول کر پی لیا ہے؟ ــــ جو ہمیں دیکھتے ہی اپنا غم بھول گئی! جس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ میرے لئے پانی گرم کیا کہ نہالوں! تمھارے لئے پانی گرم کیا کہ وضو کرلو، پھر جھپ چاء بنائی۔ پکوڑے تلے، فخر کرنا چاہیئے تمھیں ایسی بہو پر!

وہ اور زیادہ خشک لہجے میں بولیں: کس کس پر فخر کروں؟ انجمن پر، تم پر، یا اشفاق پر ــــ؟

فرزانہ نے اور زیادہ متحیر ہوکر پوچھا: آخر اس سے خطا کیا سرزد ہوئی ہے؟ کیا وہ

اشفاق کو چائے نہ پلائی جاکر؟

کہنے لگیں: کیوں نہ پلاتی! اس سے اچھا موقع چائے پینے اور پلانے کا کون سا ہو سکتا تھا؟ ماں کو مرے ابھی چند دن ہوئے ہیں اور ساقی گری شروع ہو گئی ـــــ توبہ ہے میری یا اللہ! ـــــ

فرزانہ اتنی حیران ہوئی کہ چند لمحوں تک اس پر سکتہ ساطاری رہا، کچھ نہ بول سکی کلثوم نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا:

ایک ہمارا زمانہ تھا، ایک وہ زمانہ تھا جو ہم نے دیکھا ہے، شوہر اور بیوی لوگوں کے سامنے اس طرح بیگانہ بنے رہتے تھے جیسے یہ ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں، اور ایک یہ زمانہ ہے کہ چار بنائی، ٹرے سر پر رکھی اور کھٹ کھٹ قدم رکھتی میم صاحب اوپر پہنچ گئیں صاحب بہادر کے پاس! اور دونوں نے قہقہے اور چہچہے شروع کر دئیے، یوں غم منایا جاتا ہے آجکل ماں کا! واہ بھئی واہ، اچھی جگہ قسمت پھوڑی ہے تم نے میرے لڑکے کی!

اس الزام کو سن کر تو فرزانہ گھبرا گئی ـــــ میں نے؟!

کلثوم بی نے فرمایا: تم اگر اس کا ساتھ نہ دیتیں تو مجال تھی کہ لڑکا اس گھر کا رخ کر سکتا۔ لیکن تمھارا بھی کیا دوش جب قسمت بگڑتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے میری بچی، تم تو الگ ہو گئیں بھائی کا بیاہ کر کے، مجھے زندگی بھر کا رونا ہے!

فرزانہ جل کر بولی: تو حکم دیجیے اشفاق کو طلاق دے دے!!

---

(۱۵)

خُدا کی پناہ!

اسلم صبح کھچڑی کھا کر گیا گیا اب تک نہیں آیا تھا، انجمن نے تشویش کا اظہار تو نہیں کیا لیکن دل ہی دل میں سخت پریشان تھی، وہ اپنے بھائی کی ذہنی اور مالی کلفتوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی، اُسے ڈر لگتا تھا کہیں یہ پریشانیاں رنگ نہ لائیں!

گزشت بھونتی جارہی تھی اور یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ اسلم آگیا۔ بھائی کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہوگیا، بہن کو دیکھ کر بھائی کی باچھیں کھل گئیں۔ انجمن نے پوچھا: کہاں رہے بھیّا اب تک؟ میرا تو دل ہول رہا تھا!

وہ مسکراتا ہوا پیار بھرے لہجے میں بولا: دل کیوں ہول رہا تھا؟ کونسی ایسی بات تھی پریشانی کی ـــ ہاں بھئی آج منی آرڈر آگیا ہے۔ لیکن جانتی ہو کتنے کا؟

انجمن نے کچھ سوچا اور پھر بولی: آپ کا بقایا بھیج دیا ہوگا، سب! کیوں بھیّا؟

یہ کہتے کہتے ایک طرح کا سکون اور اطمینان محسوس کرنے لگی چلو پریشانیوں کے

بادل کچھ تو چھٹے!

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا: ہاں بقایا کے حساب میں، یعنی تین مہینے کی تنخواہ جو چڑھی ہوئی تھی، اس کے حساب میں حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے جناب پروپرائٹر صاحب "قوم" نے مبلغ پندرہ روپے ارسال فرمائے ہیں۔

انجمن اپنی حیرت ضبط نہ کر سکی ۔ پندرہ روپے!

اسلم نے زہر خند کرتے ہوئے کہا: یہ بھی ان کا بہت بڑا احسان ہے نہ بھیجتے تو میں کیا کر لیتا! ـــ شاید پھر کھچڑی بھی نہ ملتی! ہم دونوں فاقہ کرتے ۔ اپنی تو فکر نہ تھی لیکن تجھے فاقہ کرتے کس طرح دیکھتا!

ان الفاظ میں محبت کا اتھاہ سمندر لہریں لے رہا تھا، انجمن کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں! پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا: دیکھئے تو کیا کیا پکا رہی ہوں آپ کے لئے! انڈے کا خاگینہ، بھنا ہوا گوشت، دھوئی ماش کی دال، زردہ! ساری کسر نکل جائے گی صبح کی کھچڑی کی بھیا!

اسلم نے اب تک باورچی خانہ کے اس شاندار پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا؟ اب مسالہ کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کا مشامِ جاں معطر کرنے لگی ۔ خوش ہو کر، اور زیادہ قریب آ کر گویا ہوا:

ارے ہاں بھئی یہ کیا؟:

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا   کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

دو دن میں کہاں دو گھڑی میں! یہ مَن کہاں سے برسنے لگا؟ یہ من و سلویٰ کیسے پکنے لگا؟

انجمن نے خوش ہوتے مسکراتے اسے دس دس کے دس نوٹ دکھلائے اور بولی:

یہ بھی تو دیکھئے یہ دھن ہے دھن!

اسلم نے حیرت سے نوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہاں ہے تو، لیکن کیا واقعی چھپّر پھاڑ کر روپیہ دینے کی جو روایتیں اللہ میاں کی طرف منسوب ہیں صحیح ہیں؟

انجمن ہنسنے لگی۔ اس نے بتایا: آج سب لوگ آ گئے ہیں!

اسلم نے پوچھا: کون سب لوگ؟

انجمن نے کہا: اماں، باجی، وہ سب!

اسلم کو اور زیادہ حیرت ہو گئی۔ کہنے لگا: آج آئے ہیں، آج — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا — لیکن تم نے تو نہ جانے کہاں سے بوریا کیا قالین کا بندوبست کر لیا — چوری کی ہے کہیں؟

وہ اور زیادہ خوش ہو کر بولی — واہ بھیّا، چوری کیوں کرتی۔ کیا آپ کی بہن چوٹّی ہے؟

تو پھر ڈاکا ڈالا ہوگا؟ — میں تو کئی مرتبہ سوچ چکا ہوں، اگر حالات یہی ہیں تو کہیں ڈاکا ڈالنا چاہیے!

چپ بھی رہیے بھیّا! سنئے، میں بتاتی ہوں، ہوا یہ کہ یہ لوگ جب آئے تو چائے اور شکر تک نہ تھی گھر میں،

وہ تو ظاہر ہے نہیں تھی!

ادھر از راہ اخلاق میرے منہ سے نکل گیا کہ چائے لاتی ہوں باجی ابھی آپ کے لئے — باورچی خانہ آئی تو اللہ کا نام! پھر تو زمین نکل گئی پاؤں تلے سے! اور کیا — میں تو کھڑی کھڑی رونے لگی۔

شاباش، امید بھی تم سے یہی تھی۔ اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ عورت اپنا ہوا نہیں رکھتی۔ جب چاہو ساون بھادوں کی جھڑی، ذرا اسی بات پر دیکھ لو۔ خیر پھر!

آپ تھے نہیں!

ہوتا بھی تو کیا کر لیتا اس بے بسی پر آج شاید تمھارے ساتھ میں بھی رونے لگتا ___ اچھا آگے ___

کچھ اور نہ سوجھا تو اوپر چلی گئی، ان سے سارا ماجرا کہا، ہلنے لگے، پھر سو روپے نکال کر دیئے۔ میں نے کہا اب بازار جائیے اور ضرورت کی ساری چیزیں لا کر دیجئے۔ یہ رہا تھیلا، لیکن خبردار آپ کو آتے جاتے، سامان لاتے کوئی نہ دیکھے ورنہ بھرم کھل جائے گا! اور میری سخت ذلت ہوگی، آماں تو نماز پڑھ رہی تھیں کمرے میں، باجی غسل کر رہی تھیں، اشرف اندر سامان ٹھیک کر رہا تھا۔ بیچارے چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتے، ادھر اُدھر دیکھتے باہر گئے، جلدی جلدی یہ سارا سامان خریدا، چپکے سے مجھے لا کر دیا اور پھر مطمئن ہو کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، ایک ہی زقند میں ادھر۔

انجمن خوشی سے اور فخر سے اشفاق کا یہ کارنامہ سنا رہی تھی۔ اسلم پر بھی اشفاق کی اس شرافت اور اپنایت کا گہرا اثر ہوا۔ لیکن وہ کڑھا بھی بہت اپنی غربت پر۔ کتنی روحانی اذیت آج اس نے محسوس کی تھی ___ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

بڑا اچھا لڑکا ہے اشفاق، میرا ہمیشہ سے اس کے بارے میں یہی خیال ہے۔

پھر سوال کیا: تو چائے پلا دی پھر تم نے؟

وہ بولی: جی ہاں، سب کو پلا دی،

اسلم نے جرح کی ___ سب کو ___ یعنی اشفاق کو بھی؟

انجمن کچھ جھینپ سی گئی۔ خفا ہوتی ہوئی بولی: ہم نہیں جانتے ـــ آپ کا جی بھی تو چاہ رہا تھا!

سامنے پڑی ہوئی پیڑھی گھسیٹ کر اطمینان سے بیٹھتا ہوا بولا: نیکی اور پوچھ پوچھ!

انجمن نے چھیڑا: لیکن بھوک مر جائے گی! کھانا بھی تو اب تیار ہوا چاہتا ہے!

وہ بولا: چائے تو آبِ حیات ہے، وہ مُردوں کو زندہ کر دیتی ہے، بھوک کا کیا ذکر!

اس نے پہلے ہی بھائی کا حصّہ الگ کر رکھا تھا۔ کیتلی اس کی طرف بڑھادی اپنے ہاتھ سے انڈیل کر وہ چائے پینے لگا۔ انجمن نے پھر ٹوکا: کچھ اور نہیں چاہئے؟

حلق سے گھونٹ اتارتا ہوا وہ بولا: اور بھی کچھ ہے؟

انجمن نے ایک طشتری بڑھادی جس میں سموسے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اسلم نے پیالی الگ رکھ کر پہلے ان چیزوں پر ہاتھ صاف کیا پھر دو گھونٹ میں چائے حلق سے نیچے اتاری پھر کہنے لگا: جاؤں ذرا ممانی سے مل آؤں جاکر، کیا رائے ہے تمھاری؟

انجمن نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ تاب مفارقت نہ لاکر اشفاق صاحب اوپر سے نیچے اتر آئے۔ اور بے تکلف سیدھے باورچی خانہ میں چلے آئے۔ یہاں اسلم کو دیکھ کر ٹھٹکے پھر بغل گیر ہو گئے۔ اسلم نے کہا چلو ممانی اور باجی سے مل آئیں چل کر!

فرزانہ تو بڑے تپاک سے ملی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اشفاق اور اسلم میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ کرید کرید کر اس کے حالات دریافت کرتی رہی، اس کے مسائل سے دلچسپی کا اظہار کرتی رہی، بشارت گنج آنے کی دعوت دیتی رہی۔ کوشش کرتی رہی کہ رسمی طور پر تعزیت کرنے کے بجائے اس کے دل کا غم اپنی خوش گوار باتوں سے ہلکا کرنے کی کوشش

کرے ۔ ان باتوں سے اور اس طرز عمل سے اسلم متاثر بہت ہوتا لیکن کلثوم کے طرز عمل میں اس نے کچھ عجیب طرح کی بیگانگی ، روکھا پن اور سرد مہری محسوس کی لیکن کچھ زیادہ پرواہ بھی نہیں کی، فرزانہ نے کہا :

تو بھئی اسلم ! کب آرہے ہو لبشارت گنج ؟ وہاں آؤ اور کچھ دن رہو ! آؤ گے تا ؟ ——

اسلم نے جواب دیا : آپ بلائیں گی تو کیوں نہیں آؤں گا —— ممانی تو کچھ کہتی نہیں چپ بیٹھی ہیں ۔ گویا انھیں میرا آنا پسند نہیں ۔ ممانی آپ دعوت دیں گی تو آؤں گا ورنہ نہیں !

ممانی کو جیسے بولنے کا موقع مل گیا ، کہنے لگیں : میں کون ہوتی ہوں دعوت دینے والی ؟ اب تو گھر بھی تمھارا ہے اور گھر والے بھی !

" اب تو " کی بلاغت میں جو طنز تھا ، اسے اسلم محسوس کرتے کرتے رہ گیا شاید پورے طور پر محسوس کر لیا ہوتا اگر فرزانہ بیچ میں نہ بول پڑتی ، :

دیکھو اسلم تم میں اور اشفاق میں کوئی فرق نہیں ، میری نظر میں جو تم وہی وہ ۔ یہ رسمی باتیں ہوتی ہیں ، میں اپنی دعوت واپس لیتی ہوں تمھیں از خود آنا پڑے گا بن بلائے ، بتاؤ آنے ہو یا نہیں ؟

اسلم نے کہا : ضرور آؤں گا ، کسی دن آؤں گا ۔

اشفاق نے اندازہ کر لیا کہ بات بگڑ گئی ہوتی اگر کہیں فرزانہ نے فرزانگی سے کام نہ لیا ہوتا ! لیکن اگر یہ مجلس قائم رہی ، امی کو دو چار بار لب کشائی کا موقع ملا تو شاید بنی ہوئی بات پھر بگڑ جائے ۔ اس نے اسلم کا بازو پکڑ کر باہر جاتے ہوئے کہا :

ذرا گھوم آئیں چلو!

اسلم نے کوئی مزاحمت نہ کی، چپ چاپ، اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کے جانے کے بعد فرزانہ نے ماں سے کہا:

امّی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے، کل صبح چلی جاؤں گی!

امّی نے جواب دئیے بغیر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر بیٹی کو دیکھا اور پان بنانے لگیں اپنے لئے۔ فرزانہ بولی:

آپ تو جیسے کوئی گل کھلانے کا فیصلہ کر چکی ہیں، کم از کم میں یہ تماشا نہیں دیکھنا چاہتی، میری پیٹھ پیچھے آپ جو چاہیں کریں، چاہے انجمن کے جھونٹے پکڑ کر اسے ماریں، چاہے اسلم کا گریبان پکڑ کر اس کی خبر لیں، چاہے اشفاق کا گلا گھونٹ دیں، نہ جانے کیا ہو گیا ہے آپ کو! اگر یہی سب کرنا تھا تو کیوں شادی کی آپ نے اشفاق کی، انجمن سے! کیوں اس غریب، نیک، شریف اور پیاری سی لڑکی کا خون اپنے سر لینے کا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟ کس نے خوشامد کی تھی آپ کی؟ نہ اسلم نے کبھی اشارہ کیا نہ انکل جیجی نے! خود ہی اشفاق کے ڈر سے دوڑی دوڑی آئیں، محبت کا سوانگ رچایا، مرنے والی پر ڈورے ڈالے، اس بھولی بھالی لڑکی کو رچایا۔ اور جب کام ہو گیا نانا مر گئیں اور انجمن قبضے میں آگئی تو ـــــ

اس سے زیادہ سننا کلثوم کے لئے ناممکن ہو گیا، وہ ادھ بنا پان ویسا ہی چھوڑ کر بولیں:

واپس جانا چاہتی ہو تو کل نہیں ابھی چلی جاؤ ـــ میری جوتی سے، جوتی کی نوک سے ـــ!

ہاں چلی جاؤں گی!

اے تو جانی کیوں نہیں، خواہ مخواہ ٹرٹر اٹنے کیوں جا رہی ہے؟

آپ تو جیسے انجمن کی دشمن ہیں۔

ہاں، ہوں — پھر؟ — تو کون میرا محاسبہ کرنے والی؟

لیکن میں اس پر کوئی ظلم نہیں ہونے دوں گی!

گھونٹ دے پھر میرا گلا!

کیا آپ کی زندگی کا مقصد غریب انجمن کو تختۂ مشق بنانا ہے؟

کیوں بار بار انجمن، انجمن رٹے جا رہی ہے، میں کہتی ہوں آخر تجھے ہوا کیا ہے؟

مجھے کیا ہوا ہے؟ میں نے کیا کیا ہے؟!

ایک تو بھک منگی لڑکی سے شادی کر دی بھائی کی، نہ جہیز نہ دان نہ پُن، نہ سامان نہ زیور، نہ فرنیچر، نہ برتن نہ کپڑے لتے، حالانکہ اشفاق کو ایک سے ایک بہتر اور مالدار لڑکی مل سکتی تھی، پھر اس پر طرّہ یہ کہ دلہن کے بھائی کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ بھائی ہمارے ہاں روٹیاں توڑو آکر، خدا نے ہمیں بہت کچھ دے رکھا ہے یہ قربان ہے تم پہ اور تمھاری بہن پر! — میں یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتی کسی طرح بھی! اگر وہ آیا بشارت گنج تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا!

وہ اتنا بے غیرت نہیں ہے، رُخ بھی نہیں کرے گا، ہم جیسے کم ظرفوں اور تھُڑ دلوں کی طرف!

آخاہ! کیا کہنا ہے بڑے دل والے، بڑے باغیرت، مرئے فقتے! — میں زندگی بھر روؤں گی یہ رشتہ کر کے! — لیکن میرا نام بھی کلثوم نہیں اگر دوسری ہو

کاڑولانہ لاؤں اپنے گھر میں! — مجھے سمجھتی کیا ہو؟!

فرزانہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ تقریباً چیخی،:

امی — امی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم — کیا انجمن کے ساتھ اشفاق کی جان بھی لینا چاہتی ہو، وہ بہت چاہتا ہے اُسے!

پوری بے پروائی کے ساتھ بولیں: یہ سارا عشق کا زور چند دن کی چاندنی ہے آج ہے کل نہیں، یہ ندی جتنے زور سے چڑھتی ہے اتنی ہی تیزی سے اترتی ہے۔

فرزانہ نے کہا: شریفوں کے ہاں یہ نہیں ہوتا!

کلثوم بی نے پھر سے پان بناتے ہوئے کہا: ہمارے ہاں تو ہوتا ہے آخر ہم جیسے غیر شریف لوگوں کے ہاں تم بھائی بہن پیدا کیوں ہوئے تھے؟ — کہاں شمسہ — کہاں انجمن! ایک جوتی کی خاک ایک آسمان کا لوز!

وہ جل کر بولی: جوتی کی خاک تو وہی ہے شمسہ — نہ گن نہ سلیقہ۔ نہ بات کرنے کی تمیز نہ رکھ رکھاؤ۔ باپ کرخندار ماں گوالن، خالی خولی روپے سے کیا ہوتا ہے

کلثوم بی نے اسے اور زیادہ جلاتے ہوئے کہا: روپے سے کیا نہیں ہوتا! تم اگر غریب ہوتیں نسیم جڑھا تا تھیں، نسیم اگر غریب ہوتا تو بن جاتیں تم اس کی بیوی — بی بی میرے سامنے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ میں سب کچھ جانتی ہوں!

فرزانہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

خدا اور رسول کے لئے چُپ رہئے۔ اگر آپ کی باتیں انجمن کے کان میں پڑ گئیں یا اسلم کو سُن گُن مل گئی یا اشفاق کو پتا چل گیا تو طوفان آجائے گا۔ امی آپ تو آگ سے کھیل رہی ہیں۔ انجمن سے دشمنی سہی، کیا اشفاق کی محبت بھی جاتی رہی

آپ کے دل سے؟!

اتنے میں کسی کام سے انجمن ادھر آ گئی۔ اسے آتا دیکھ کر فرزانہ نے خاموشی اختیار کرلی!

---

(۱۶)

فرزانہ اور انجمن

زندگی میں فرزانہ کبھی بھی اتنی پریشان نہیں ہوئی تھی جتنی اس دو تین دن کی مدت میں ہو گئی۔

وہ حیران تھی کیا ہو گیا ہے امّی کو۔ چڑچڑی، بد دماغ اور نازک مزاج ہمیشہ سے ہیں لیکن اتنا زیادہ تو کبھی نہیں تھیں، ابّا سے، مجھ سے، اشفاق سے ہمیشہ الجھتی رہیں لیکن فوراً ہی خوش بھی ہو گئیں۔ لیکن اب تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں   لیکن اب کی سرگرانی اور ہے!

کبھی طلاق دلانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، دوسری بیوی کی تیاریاں کرنے لگتی ہیں اس یتیم اور نیک اور بے گناہ بچّی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ حد ہو گئی۔ اسلم تک سے ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں کرنے لگیں۔ کیا نتیجہ ہو گا ان باتوں کا؟ کس طرح کام چلے گا!

یوں تو اشفاق کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، دیوانہ ہو جائے گا غریب۔ اور انجمن

کی جان پر بن جائے گی ! بے زبان لڑکی ہے، کڑھ کڑھ کر مر جائے گی مگر اُف نہیں کرے گی !
کیا یہ شادی اس لئے ہوئی تھی کہ دو گھر بگڑ جائیں، مٹ جائیں، تباہ ہو جائیں !
کتنی محبت کرتا ہے اشفاق انجمن سے، اور خود انجمن بھی کتنی جان چھڑکتی ہے اس پر !
ہائے میرے اللہ ! کیا دونوں دل کھلونے کی طرح توڑ دیئے جائیں گے ؟ کیا ان کی یہ خوشی عارضی ہے ؟ کیا یہ دھوکے ہیں ہیں ؟ انھیں کیا خبر کیسے کیسے طوفان منڈلا رہے ہیں ان کے سروں پر ! ؟

ماں سے کچھ بیزار ہو کر کچھ رد عمل کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی، بظاہر کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں انہی باتوں پر پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ اشفاق نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر سہم گئی، کہیں کوئی اور فتنہ تو نہیں اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن نہیں یہ غلط فہمی تھی، وہ تو مسکرا رہا تھا ——— !

فرزانہ نے کتاب بند کر دی اور محبت بھرے لہجے میں بولی : آؤ اشفاق ——— آؤ بیٹھو ——— !

وہ پاس آ کر بیٹھ گیا، کہنے لگا : باجی ایمان سے کہنا انجمن کیسی ہے ؟

اس عجیب سوال پر فرزانہ چونک پڑی۔ کہنے لگی اچھی ہے، بہت اچھی ——— لیکن اس سوال کا مطلب ؟ !

وہ مسکرایا، پھر ہنسا، پھر کہنے لگا : امتحان لے رہا تھا تمھارے ذوق کا، داد چاہتا تھا اپنے حُسنِ انتخاب کی !

فرزانہ مسکراتی ہوئی بولی : چل ——— زیادہ باتیں نہ بنایا کر !

اشفاق نے کہا : سوچتا ہوں انجمن اگر مجھے نہ ملتی تو میں کیا کرتا، میری زندگی کس طرح

بسر ہوتی!؟

فرزانہ نے چھیڑا: جیسی اب ہو رہی ہے!

اشفاق نے انکار میں گردن ہلائی۔ کہنے لگا: نہیں باجی تمھارا خیال غلط ہے، وہ مجھے نہ ملتی تو میری زندگی بے کیف رہتی۔ اور اگر اب خدا نخواستہ قدرت اُسے مجھ سے چھین لے تو میں زندہ نہیں رہ سکتا، ایک منٹ بھی نہیں، فوراً دم توڑ دوں گا!

فرزانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ باتیں یہ خود کر رہا ہے یا قدرت کہلوا رہی ہے، اس سے! کیوں اس طرح کی باتیں چھیڑ دیں اس نے؟ اس پر گھبراہٹ اور وحشت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جھڑکتی ہوئی بولی: کیوں بک بک کئے جا رہا ہے، ابھی جا کر کہتی ہوں امی سے کہ یہ کرتوت ہیں صاحبزادے کے!

وہ سینہ تان کر بولا: کہہ دو گی تو کیا ہو جائے گا؟

بے بھاؤ کے پڑیں گے، چاند گنجی ہو جائے گی!

کبھی پڑے نہ ہوں!

دیکھ لینا ان کا غصہ بہت بُرا ہے!

اور مجھے نہیں جانتیں تم، کتنی اکڑی ہوئی تھیں کہ نہیں شادی ہو سکتی انجمن سے، انھوں نے تو تمسہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا! لیکن جب میں نے روپوش ہو جانے کی دھمکی دی تو اوسان خطا ہو گئے۔ بھاگی بھاگی خود ہی آئیں ـــــ پیام دیا ـــــ نسبت طے کی ـــــ اور شادی کر دی!

فرزانہ سوچنے لگی: سچ تو کہتا ہے لڑکا! امی لاکھ چڑچڑی اور بد دماغ ہوں ـــــ لیکن اشفاق کی جان نہیں لے سکتیں، اس کی زندگی سے نہیں کھیل سکتیں!

پھر وہ سوچنے لگی : اگر یہ بات ہے تو پھر امّی خفا کیوں ہیں ؟

دل نے جواب دیا : اس کی وجہ یہ ہے کہ ماما کے جوش میں شادی کردی ممّی کے ہاں سے چھکڑوں پر لد کر جہیز آتا ۔ یہاں خدا کا نام ہے ۔ مایوس ہوگئیں ۔ اس مایوسی نے چڑچڑے پن کی صورت اختیار کرلی ۔ لیکن یہ عارضی کیفیت ہے ، رفتہ رفتہ دُور ہوجائے گی !

لیکن اگر اس رفتہ رفتہ میں بات بڑھ گئی ، فتنہ سر اٹھاتا گیا ، اسلم کو کیفیتِ دل کا علم ہوگیا اور انجمن نے دل کی بات تاڑلی تو کیا ہوگا ؟

" نازک بہت ہے شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا !

ٹوٹ گیا دل یا شیشے میں بال پڑ گیا ـــ تو پڑا !

لیکن نہیں انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا !

امّی کی مخالفت کرنے کے بجائے ہاں میں ہاں ملانی چاہیئے ، تاکہ وہ خوش ہوں ، خوش رہیں ، یہ خوشامد انھیں راہ راست پر لے آئے گی ، ان کا جوش کم ہوجائے گا ۔ مایوسی ختم ہوجائے گی ، پھر یہ خوشی انجمن کو گوارا کرلیں گی !

فرزانہ یہ باتیں سوچ رہی تھی اور اشفاق بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا ۔ دھوئیں کے چھلّے بنا بنا کر پھینک رہا تھا ۔ وہ خود گم تھا کسی خیال ـــ انجمن کے خیال میں !

تھوڑی دیر کے بعد ایک نیا سگریٹ سلگاتا ہوا بولا : باجی یہ تو بتاؤ اب ہوگا کیا ؟

باجی نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا : پہیلیوں میں باتیں کرنے کی عادت کب سے پڑ گئی ہے ؟

اشفاق نے ایک زوردار کش لگایا اور کہنے لگا : میرا مطلب یہ ہے کہ انجمن کہاں رہے گی ؟

بے تابی فرزانہ نے کہا : اپنے گھر میں — بشارت گنج میں — اور کہاں؟

وہ تو ٹھیک ہے باجی — مگر —!

مگر کیا؟ — کیا تم نے اس سے کہا تھا اور اس نے جانے سے انکار کر دیا؟

ہاں ایسا ہی سمجھ لو!

(حیران ہو کر) ایسا نہیں ہو سکتا، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، نہ جانے تم نے کس طرح کہا اور اس نے کیا جواب دیا اور تم کیا سمجھ بیٹھے؟ میں خود اس سے بات کر لوں گی، سمجھا دوں گی!

نہیں باجی، میرے اس کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم دونوں اس پر متفق ہیں کہ بشارت گنج ہی میں رہنا ہے، لیکن وہ جو کچھ کہتی ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔

آخر کیا کہتی ہے وہ خدا کی بندی؟

وہ کہتی ہے جب تک نائلہ پھوپھی کا جہلم نہ ہو جائے اس وقت تک یہاں رہے گی، پھر بشارت گنج آ جائے گی اور وہیں رہے گی!

ٹھیک ہے۔ اس میں کونسی پریشانی کی بات ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ مدت میں کیسے گزاروں گا؟

فرزانہ ہنسنے لگی : تو خود بھی یہیں رہنا چاہتے ہو؟

اشفاق نے التجا اور اصرار کے ساتھ کہا : ہاں، امی سے اجازت دلا دو!

لیکن نوکری کا کیا ہوگا؟

میں چھٹی لے لوں گا۔

اتنے زن پرست ہو کہ بغیر اس کے نہیں رہ سکتے؟

(مسکراتے ہوئے) نہیں باجی میرا بھی جی گھبرائے گا اور اس کا بھی!

اوہو —! اس کا بھی جی گھبرائے گا، بڑی فکر ہے اس کی! — کتنا حرفوں کا بنا ہوا ہے! کیوں تہمت لگاتا ہے اس بیچاری پر!

تہمت کیسی باجی؟

یہ تو نے کیسے کہا کہ بغیر تیرے اس کا جی بھی گھبرائے گا؟

خود اسی نے کہا تھا!

پوچھوں —؟ مکر تو نہیں جاؤ گے؟

ہرگز نہیں، شوق سے پوچھو، بلکہ میرے سامنے دریافت کرو!

فرزانہ نے اشرف کو آواز دی، وہ آیا تو حکم دیا جاؤ ذرا انجمن کو بلا لاؤ، اشرف کے جانے کے بعد اس نے اشفاق سے کہا: مناسب یہی ہے کہ چالیسویں کے بعد آؤ اور انجمن کو آکر لے جاؤ!

لیکن اگر رہوں تو کیا حرج ہے؟ میری چھٹی باقی ہے، ایک نہیں دو مہینے کی لے سکتا ہوں!

وہ تو ٹھیک ہے — لیکن امی —!

انھیں راضی کرنا تمھارا کام ہے!

نا بابا اس جھمیلے میں مجھے نہ ڈالو!

دیکھو مان جاؤ باجی ورنہ مجھے رو پڑنا بھی آتا ہے!

فرزانہ نے اس شرارت کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ انجمن آگئی!

باجی، کیا مجھے بلایا تھا؟

فرزانہ نے جواب دیا: ہاں انجمن آؤ، بیٹھ جاؤ!

وہ آکر بیٹھ گئی۔ اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی!

فرزانہ نے اشفاق سے کہا: پوچھوں؟

وہ بولا: ضرور پوچھو۔ ایک دفعہ نہیں سو مرتبہ، بلکہ ہزار مرتبہ پوچھو گی تب بھی مجھے وہی لطف آئے گا جو پہلی مرتبہ وہ شیریں الفاظ سن کر آیا تھا۔

انجمن حیران تھی، کیا بات مجھ سے پوچھی جائے گی! وہ کون سا سوال ہے جس نے بھائی بہن کے درمیان اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے؟ اس سوال سے میرا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟ اور "شیریں الفاظ!" یہ کن شیریں الفاظ کا حوالہ دے رہے تھے؟

اتنے میں فرزانہ نے پوچھا: کیوں انجمن! کیا تم باقاعدہ محبت کرنے لگی ہو اس کم ظرف اشفاق سے؟ یہ پٹے کا ہلکا تمہارا اظہار محبت بھی نہیں چھپا سکتا! ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے ساری دنیا میں! کیا نکو بننے کو جی چاہتا ہے؟

انجمن کی حیرت اور بڑھ گئی۔ کہنے لگی: کیا ہوا باجی، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟

اشفاق نے مداخلت کی: اوہنہ ارے بھائی ۔ بات یہ ہے کہ تم نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ بشارت گنج چالیسویں کے بعد جاؤں گی!

انکار کی کوئی وجہ نہ تھی، انجمن نے اقرار کر لیا۔

ہاں کہا تو تھا ۔ پھر ۔؟

اشفاق نے سوال کیا: تم نے نہیں کہا تھا کہ جی گھبرائے گا تمہارا یہاں؟

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا: ہاں کہا تھا!

اشفاق نے فاتحانہ نظروں سے بہن کو دیکھا اور گویا ہوا: دیکھ لیا ۔ ہار گئیں نا!

انجمن نے پوچھا: لیکن اس میں بات کیا ہوئی جس پر اتنی بحث ہو رہی ہے؟

فرزانہ نے کہا: اشفاق کا خیال ہے ان الفاظ میں محبت کا عزانہ بھرا ہوا ہے بہرحال اس سے ذرا سوچ سمجھ کر باتیں کیا کرو، اس کا کچھ نہیں بگڑے گا تمھیں بدنام کر دے گا مرد کے لئے باعثِ فخر ہے محبت کرنا لیکن عورت کے لئے باعثِ ننگ اور مجھے امید ہے تم اس تھرڈ کلاس کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دو گی!

وہ مسکرانے لگی۔ اشفاق نے کہا لاکھ بھڑکائیے، لیکن اس پر اثر نہیں ہو سکتا ان باتوں کا! ـــ بس تو اب امی کو راضی کر دیجئے!

فرزانہ الجھتی ہوئی بولی: تو آخر تم خود کیوں نہیں کہہ لیتے ان سے۔ مجھ سے زیادہ تمھارا کہا مانتی ہیں۔

اسی اثنا میں کسی کام سے یا ان لوگوں کے قہقہے اور چہچے سن کر کلثوم بی آگئیں، انجمن دیکھتے ہی انجمن بھاگ جانے کے لئے اٹھی، مگر جیسے انہوں نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور ے! چلیں کہاں؟ تمھاری ہنسی ہول لگی کی باتیں سن کر مجھ افسردہ دل کی طبیعت بھی لہرا گئی۔ جب سے آئی ہوں تائلہ کی یاد تڑپا رہی ہے لیکن اس وقت ضبط نہ کر سکی چلی آئی۔ میں نے کہا اس خوشی کی محفل میں شاید میرا غم بھی ہلکا ہو جائے! بیٹھو ـــ بیٹھو! ـــ انجمن کا چہرہ زرد پڑ گیا انتہائی اطاعت مند ہونے کے باوجود نہ بیٹھ سکی! صاف معلوم ہو رہا تھا یہ باتیں تیر کی طرح چھد گئیں اس کے دل میں جا کر۔

انجمن کے جانے کے بعد نہایت برہمی کے عالم میں اشفاق بھی چلا گیا، فرزانہ نے پھر کتاب سنبھال لی، گویا کلثوم اس کمرہ میں موجود ہی نہیں تھی!

---

(۱۷)

لاوا اُبلنے لگا!

تین چار روز کے بعد نسیم بھی آگیا۔ اب وہ بالکل اچھا تھا۔ اس کے آتے ہی گھر میں نئے سرے سے رونق اور گہما گہمی کے آثار پیدا ہو گئے۔ انجمن کو دیکھ کر، اس سے مل کر، اس کی باتیں سُن کر، اس کے طور طریق کا اندازہ کر کے وہ بہت متاثر ہوا۔ ایک روز فرزانہ سے بیٹھا وہ باتیں کر رہا تھا کہ اشفاق آگیا۔ نسیم نے اسے دیکھتے ہی کہا:

ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا، خوب آگئے وقت پر!

اشفاق نے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا: میرا ذکر کیوں ہو رہا تھا، میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں کہ آپ حضرات کی محفل میں جگہ پاؤں!

نسیم نے کہا: یہ تو سچ کہتے ہو کہ بڑے آدمی نہیں ہو، لیکن بعض ایسے آدمی ہوتے ہیں جو دوسروں کی وجہ سے بڑے بن جاتے ہیں!

اشفاق نے پوچھا: یعنی میں دوسروں کی وجہ سے بڑا آدمی بن گیا ہوں، لیکن کس کی وجہ

سے ؟ —

نسیم نے بے تامل کہا: انجمن کی وجہ سے۔ اس نے تمہیں بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ تمہاری خوش قسمتی پر رشک آتا ہے، اتنی اچھی بیوی کے تم مستحق نہیں تھے!

فرزانہ بگڑ گئی: واہ نہیں کیوں تھا! یہ بھی اچھی رہی، ایک کی تعریف کرو گے تو دوسرے کی برائی ضرور کرو گے! کیا ہمارا اشفاق کم ہے کسی سے؟!

نسیم نے ہنستے ہوئے کہا: بہن ہو۔ تمہیں یہ کہنا ہی چاہئے، لیکن میاں اشفاق خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہنا! —

بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ کلثوم بی تشریف لے آئیں، ایک سرسری نظر حاضرین پر ڈالی پھر اس کرسی پر جو اشفاق نے ان کے لئے خالی کر دی تھی آرام سے بیٹھ گئیں۔ اشفاق نے سامنے سے ٹل جانا مناسب سمجھا، رہ جانے کے لئے بڑھا تھا کہ کلثوم بی نے ٹوکا:

کہاں چلے —؟ تھوڑی دیر کی فرقت بھی گوارا نہیں!

اشفاق بیچارہ جھینپ سا گیا، ویسے ہی پلٹ آیا۔ اور نسیم کے پاس بیٹھ گیا۔ نسیم نے بات مذاق میں اڑا دینی چاہی، کہنے لگا۔ بڑی دیر سے ہم لوگ اشفاق کو چھیڑ رہے ہیں۔ بڑے موقع سے آگئیں آپ، اب بیچارے نے اطمینان کا سانس لیا ہے!

کلثوم بی نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں کی، اشفاق سے کہنے لگیں: کب تک یہاں ڈیرے ڈالے پڑے رہو گے — نہ نوکری کی پرواہ ہے نہ گھر کا خیال!

نسیم نے جو اندرونی واقعات وحالات سے لاعلم تھا کہا: میں تو کل چلا جاؤں گا۔ فرزانہ بھی میرے ساتھ جائیں گی۔

کلثوم نے کہا: تو میرا یہاں کون بیٹھا ہے، کیا کروں گی رہ کر، میں بھی چلوں گی!

نسیم نے اشفاق کی طرف دیکھا اور کہا، کیوں بھئی ہے پروگرام، چلتے ہو؟
اشفاق کش مکش میں پڑ گیا۔ کیا جواب دے کیا نہ دے! یہاں تو طور ہی بگڑے ہوئے تھے، فرزانہ بھی پریشان ہو گئی۔ سوچا تھا اطمینان سے امّی کو راضی کرنے کی کوشش کروں گی۔ نسیم کو بالکل نہیں معلوم تھا کلثوم کی آمد کس طوفان کی تمہید ہے اب سب خاموش تھے، اس خاموشی سے اکتا کر کلثوم نے خونخوار نظروں سے اشفاق کو دیکھا اور کہنے لگیں۔ کیا کچھ اونچا سننے لگے ہو بیٹے طاہر سے! یا میری اتنی وقعت بھی نہیں رہ گئی ہے کہ جو پوچھوں اس کا جواب مل جائے!

صورتِ حال اور زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ اب تو نسیم کی خوش طبعی بھی رخصت ہو گئی۔ اور اسے بشارت گنج کے سول ہسپتال کی کلثوم بی یاد آ گئیں۔ آخر اشفاق کا قفلِ سکوت ٹوٹا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا صاف صاف بات کہہ دینی چاہیے۔ چنانچہ کچھ تامّل کے بعد کہنے لگا:

آپا کے ساتھ آپ بھی چلی جائیے کل!

بم کا گولہ پھٹ پڑا۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے کلثوم نے سر گھمایا۔ اور اشفاق کو گھورتے ہوئے بولیں: کیا کہا تو نے، میں چلی جاؤں؟ ــــ اور تو یہاں رنگ رلیاں کرتا رہے گا!

اب فرزانہ کو بھی بولنا پڑا، کہنے لگی: امّی یہ بات نہیں ہے، ــــ

بیزاری کے ساتھ امّی نے بیٹی کو دیکھا، پھر بولیں: تم کیوں وکالت کر رہی ہو؟ کیا اس کے منہ میں زبان نہیں ہے؟

لیکن فرزانہ نے وکالت کا حق ادا کر دیا۔ کہنے لگی: بات یہ ہے کہ جب تک نائلہ چوہدری کا

چالیسواں نہ ہو جائے اس وقت تک وہ نہیں جا سکتی یہاں سے اور اسلم کی ساری تنخواہ رکی ہوئی ہے۔ ایسے آدمی سے پالا پڑا ہے جو دینے کا نام ہی نہیں جانتا۔ پھر عزیر حاضری الگ لگ رہی ہے، وہ دو چار دن میں جانے والا ہے تو کیا بیچاری انجمن رہے گی اتنے بڑے گھر میں نہ آدمی نہ آدم زاد، کس طرح رہ سکے گی؟ اشفاق کو رہنا ہی چاہیئے اس کے پاس، پھر اس سے فارغ ہو کر دونوں آ جائیں گے اطمینان سے بشارت گنج!

اس لمبی تقریر سے کلثوم نے ذرا بھی اثر نہیں لیا، کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں: سچ کہا، بیٹی سچ کہا تم نے، پورس کے ہاتھی ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ جیسی تم ہو جیسا اشفاق ہے!

نسیم نے مداخلت کر کے بات ختم کر دینی چاہی، لیکن کلثوم نے موقع نہ دیا۔ میں کہتی ہوں یہ کیسا اندھیر ہے، اسلم اپنی ماں کے جہلم کے لئے نہیں ٹھہر سکتا ملازمت پر جانے کے لئے بے چین ہے بیقرار ہے، لیکن صاحبزادی بجلی ہوئی ہیں کہ ہم تو فاتحہ کر کے جائیں گے، اور صاحبزادے اڑے ہوئے ہیں کہ میں تو بیوی کے ساتھ آؤں گا۔ جیسے نہ یہ کہیں ملازم ہیں نہ ان کی کوئی ذمہ داری ہے!

اشفاق نے غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی: لیکن میری غیر حاضری تو نہیں لگ سکتی، میری تو دو مہینے سے زیادہ کی چھٹی باقی ہے۔

ہوا کرے کلثوم نے کہا: بہرحال کل چلنا پڑے گا تمہیں بھی اور انجمن کو بھی۔ یہ میرا فیصلہ ہے، یہ میرا حکم ہے!

شاید گالیاں کھانے اور جھڑکیاں سننے کے لئے فرزانہ پھر بول پڑی۔ لیکن امی یہ تو ظلم ہے، جب اشفاق کی چھٹی باقی ہے تو اس کے رہ جانے میں کیا حرج ہے؟ بات کا

جھگڑ بڑھانے سے کیا فائدہ؟

کوئی بڑی ہی تلخ بات جواب میں کلثوم کے منہ سے نکلنے والی تھی کہ قسمت کا مارا اسلم آ گیا۔ کلثوم کے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا مسئلے کو طے کر لینے کا۔ انھوں نے اس طرح جیسے ابھی نہ غصے میں تھیں نہ بگڑ رہی تھیں بہج سے کہا:

بیٹے اسلم کل ہم لوگ جا رہے ہیں!

جی ہاں! اسلم نے جواب دیا: نسیم بھائی کہہ تو رہے تھے۔ لیکن کیا آپ بھی جا رہی ہیں؟

وہ اور زیادہ پیکر اخلاق بن کر بولیں: ہاں بیٹا گھر کی بھی تو خبر لینا ہے۔ فرزانہ خیر سے اپنے گھر میں رہتی ہیں۔ کبھی تیسرے چوتھے منٹ دو منٹ کو جھانک گئیں۔ گھر کا سارا کام میرے ہی اوپر ہے۔ اکیلی ذات کیا کیا کروں؟!

اسلم نے کہا: یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اب آپ کو نہ اکیلے پن کی شکایت رہے گی نہ گھر کا سارا کام کرنے کی۔ انجمن آپ کا ہاتھ بٹائے گی، بلکہ مجھے تو امید ہے سارا بوجھ وہ خود اٹھا لے گی۔

کلثوم کو جیسے دل کی بات زبان پر لانے کا موقع مل گیا۔ کہنے لگیں ہاں امید تو یہی ہے ۔۔۔ سوچتی ہوں کل اسے بھی لیتی جاؤں اپنے ساتھ بشارت گنج!

اسلم نے جواب دیا جیسی آپ کی مرضی! ۔۔۔ لیکن اشفاق تو کہہ رہے تھے چالیسویں کے بعد لے جائیں گے ۔۔۔ (اشفاق سے مخاطب ہو کر) کیوں بھئی تم رہ گئے؟

اشفاق پر گو مگو کا عالم طاری ہو گیا، نہ ہاں کہہ سکتا تھا نہ نہیں، اس کی مشکل کلثوم نے آسان کر دی۔

وہ کیسے رہ سکتا ہے، وہ بھی تو ملازم ہے تمہاری طرح!

یہ الفاظ بڑے ٹھنڈے لب ولہجے میں کہے گئے تھے، "لیکن وہ بھی تو ملازم ہے تمہاری طرح" کے فصیح و بلیغ جملے میں جو طنز پنہاں تھا اُسے اسلم نے محسوس کر لیا۔ ذرا دیر کے لئے اس کے ماتھے پر شکنیں ابھریں، پھر یہ کیفیت دُور ہو گئی۔ وہ مسکرانے لگا، اور گویا ہوا:

واقعی بات تو آپ نے بڑے پتے کی کہی۔ میں بیٹا ہو کر اگر ماں کے چہلم کے لئے نہیں رُک سکتا تو اشفاق داماد ہو کر کیونکر رُکے؟ — انجمن کو آپ کے ساتھ جانا چاہئے وہ جائے گی — یہ اس کی جذباتیت تھی کہ چالیسواں یہاں کرنے پر مُصر تھی، اور اشفاق کا لڑکپن تھا کہ خود بھی اس وقت تک یہاں رہنے پر تیار ہو گیا۔ ورنہ میں ان باتوں کو رسمی سمجھتا ہوں۔ دسواں، بیسواں، چالیسواں، برسی یہ سب غیر مذہبی چیزیں ہیں۔ آدمی کے ساتھ اس کے اعمال جاتے ہیں یا پھر دل سے نکلی ہوئی دوسرے لوگوں کی دعائیں! دعا ہم جہاں چاہیں کر سکتے ہیں! قیدِ مقام کا کیا سوال!

یہ کہہ کر اسلم کمرے سے نکل گیا۔

اسلم کی باتوں نے سب پر سکتہ سا طاری کر دیا۔ اشفاق کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر جمع ہو گیا تھا! فرزانہ پر شرمندگی اور ندامت کی ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی! نسیم بھی کچھ جھینپا جھینپا سا نظر آ رہا تھا۔ لیکن کلثوم بالکل غیر متاثر تھی۔ جیسے اس نے اسلم کی بات سنی ہی نہیں! یا سنی تو ذرا بھی اہمیت نہیں دی!

کافی دیر تک سناٹا سا طاری رہا۔ کسی میں یارائے تکلم نہ تھا۔ اشفاق نے انتہائی جھلاہٹ کے عالم میں کہا:

امی میں نہیں جاؤں گا، ہرگز نہیں جاؤں گا!

کلثوم نے اسی لہجے میں جواب دیا: تیرے اچھے جائیں گے، تو ہے کس خیال میں ہیرا نام بھی کلثوم ہے ــ تو بھی جائے گا اور تیری بیگم صاحبہ بھی جائیں گی! جھونٹے پکڑ کر لے جاؤں گی اپنے ساتھ، کوئی ہنسی کھیل ہے میرے حکم کا مذاق اڑانا!

اشفاق نے زور سے زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے پھر اپنے وہی الفاظ دہرا دیئے نہیں جاؤں گا ہرگز نہیں جاؤں گا۔

کلثوم اٹھ کھڑی ہوئیں، بالکل سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔ ڈپٹ کر پوچھا: نہیں جائے گا؟

اشفاق نے تھرّائے ہوئے لہجے میں کہا: نہیں!

تڑسے اس کے منہ پر ایک چانٹا پڑا: اشفاق کانپ گیا۔ نسیم جلدی سے اٹھا، اس نے کلثوم سے کہا:

کیا کر رہی ہیں آپ؟

پھر اشفاق کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں جا کر اس سے کہا: بچے نہ بنو، ماں بہرحال ماں ہے۔ میں خود بھی محسوس کرتا ہوں وہ زیادتی کر رہی ہیں، ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا، لیکن بوڑھوں اور بچوں میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ وہ اڑ گئی ہیں۔ احترام واجب ہے۔ انجمن کو میں خود سمجھا دوں گا۔

ادھر فرزانہ ماں سے کہہ رہی تھی:

اشفاق کو ایک طمانچہ نہیں دس مارتیں مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ مجھے بھی مار لیتیں تو چپ چاپ کھا لیتی، لیکن اسلم کو جو طعنہ دیا ہے آپ نے اسے میں نہیں بھول

سکتی۔ میں سچے دل سے نادم ہوں کہ کیوں بیچ میں پڑی تھی، خیر جو ہونا تھا ہو گیا لیکن آج جو ذلت آپ نے میری کی ہے اُسے زندگی بھر نہیں بھولوں گی!

اتنے میں نسیم اشفاق کو سمجھا بجھا کر واپس آیا۔ اس نے کہا: اماں معاف کیجئے آج تو آپ نے حد کر دی، اتنا بھی کیا غصہ! میری، فرزانہ کی، اشفاق کی دوسری بات ہے لیکن اسلم کو بھی جلی کٹی سنا گئیں آپ! کیا اثر لے گیا ہو گا وہ ہم سب کے بارے میں! انجمن سنے گی تو، جس گھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لینے رہنے کو جا رہی ہے کیا سوچے گی اس کے بارے میں! خوشی خوشی جانے کے بجائے اس کے پاؤں کانپ رہے ہوں گے دل دھڑک رہا ہو گا!

---

(۱۸)

وہ رخصت کا وقت

اشفاق تو اتنا شرمندہ شرمندہ سا تھا کہ انجمن سے آنکھیں تک نہ چار کر سکا۔ یہی کیفیت فرزانہ کی بھی تھی، لیکن اسلم نے سمجھا بجھا کر اسے راضی کر لیا۔ بادلِ ناخواستہ بیچاری کو راضی ہونا پڑا۔

وہ بشارت گنج جانے پر تیار تو ہو گئی لیکن حیران تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ اتنی ذرا سی بات نے اتنی نازک اور پیچیدہ صورت کیوں اختیار کر لی ہے؟

یہ بات بھی رہ رہ کر اُسے پریشان کر رہی تھی کہ امّی (کلثوم) کے طرزِ عمل میں یک بیک اتنا فرق کیوں آ گیا ہے؟

یا تو یہ کیفیت تھی کہ جب پیام دینے آئی ہیں تو میری صورت دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں، ہر وقت پیار اور محبت کی باتیں، ہر بات پر تعریفیں، یا اب یہ کیفیت ہے کہ نہ سیدھے مُنہ بات کرتی ہیں نہ محبت اور شفقت کا اظہار کرتی ہیں، جب دیکھو تو ایسا معلوم

ہوتا ہے جیسے آنکھوں سے محبّت کی لہریں نہیں نفرت کی بجلیاں برس رہی ہیں! آخر کیوں؟ — کس جرم میں — کیا خطا کی ہے میں نے؟

کیا یہ ساس اور بہو کی وہی روایتی دشمنی ہے جس کا ذکر دوسروں سے سنتی اور کتابوں میں پڑھتی رہی ہوں؟

لیکن میں نے تو جب بھی یہ باتیں سنیں یا پڑھیں تو یہ سوچ کر حیران ہو جایا کرتی تھی کہ آخر ساس اور بہو میں بدمزگی اور تلخی پیدا کیوں ہوتی ہے! کیوں دونوں ایک دوسرے کے لاگو ہو جاتے ہیں؟

اگر بہو ساس کی خدمت کرے، اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے تو ساس بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو ماں کا بیٹی کے ساتھ ہوتا ہے! ہاں اگر بہو سرکشی اور خودسری کا اظہار کرے تو ساس ضرور خفا ہوگی — اور اُسے خفا ہونا بھی چاہیئے!

مگر کیا میں نے خودسری اور سرکشی کا اظہار بھی کیا؟

کیا میں نے خدمت اور اطاعت سے جی چرایا کبھی؟

جب سے وہ آئی ہیں میں تلے اوپر ہو رہی ہوں، وضو کے لئے پانی گرم کرنا، وقت پر چائے دینا، ناشتہ پہنچانا، کھانا تیار کرنا یہ میری ڈیوٹیاں ہیں اور انھیں پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیتی ہوں!

پرسوں مجھے بخار تھا، طبیعت بھاری ہو رہی تھی، نیند بھی بہت آ رہی تھی۔ لیکن گرم لحاف میں لیٹے لیٹے خیال آیا ارے وضو کے لئے پانی تو میں نے گرم ہی نہیں کیا؟ وہ (اشفاق) منع ہی کرتے رہ گئے۔ بھاگی بھاگ باورچی خانہ میں پہنچی، لکڑیاں بھی

کمبخت سیلی ہوئی تھیں، پھونک پھونک کر سالن چڑھائی، لیکن پانی گرم کر کے، لوٹے میں بھر کر ان کے پاس رکھ آئی۔

مگر اس خدمت اور کارگزاری کا انعام کیا ملا؟

پانی رکھ کر جب واپس آ رہی تھی تو کتنے تلخ اور توہین آمیز لہجے میں بولیں:

ساری رات پڑی ہے عین کی بینسری بجانے کے لئے، اتنی جلدی کیوں بھاگی جا رہی ہو؟

یہ کڑوا گھونٹ میں نے پی لیا، اور کھڑی ہو گئی کہ دیکھوں کیا فرماتی ہیں۔ کہنے لگیں، جب سے نسیم آیا ہے بہت زیادہ فرزانہ کے کمرے میں آنا جانا شروع ہو گیا ہے میں ان باتوں کو پسند نہیں کرتی!

کتنا حصہ آیا ہے اس بیہودگی پر مجھے! جی میں تو آیا کہ ایسا سخت اور منہ توڑ جواب دوں کہ یاد کرتی رہ جائیں لیکن چپ رہ گئی!

کتنی بیچی اور گھناؤنی بات کی تھی امی نے!

نسیم بھائی کتنے اچھے آدمی ہیں کتنے نیک، کتنے شریف، لیکن نہ انھیں چھوڑا نہ مجھے، گویا وہ اتنے برے ہیں کہ میرا وہاں جانا مناسب نہیں۔ اور میں اتنی بری ہوں کہ وہاں جاؤں گی تو پر چالوں گی انھیں، کئی مرتبہ ارادہ ہوا باجی سے کہہ دوں یہ ہیں امی کے خیالات، لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ فتنہ دبا ہا جا ہئے اٹھانا نہیں چاہئے!

واپس آئی تو وہ سو چکے تھے، لیکن مجھے کروٹیں بدلتے بدلتے آدھی رات ہو گئی۔ مگر نیند کا کہیں کالے کوسوں پتہ نہ تھا۔ ایسی ذلت، ایسی توہین میری کبھی نہیں ہوئی ہو گی!

بے بسی میں انسان کے آنسو نکل ہی آتے ہیں، کئی مرتبہ میری آنکھیں نمناک ہو گئیں ۔
اور اب یہ جو بات کا بتنگڑ بنایا گیا ہے اس کا مقصد اور مطلب ہی سمجھ میں نہیں آیا ۔
اگر امی (نائلہ) کا چالیسواں کر کے بشارت گنج جاتی تو کون سا غضب ہو جاتا !
مگر وہاں تو ضد ہے : "ہم جو کہیں بے چون و چرا مان لو !"

اچھا مان لیا، لیکن اتنی ہنگامہ آرائی کی کیا ضرورت تھی ! مجھ سے الگ خفا ہیں، اشفاق سے جدا روٹھی ہوئی ہیں، باجی سے بات نہیں کرتیں ۔ نسیم بھائی سے بھی کھنچی کھنچی سی ہیں کچھ !

سوچتی ہوں وہاں گئی تو کیا ہو گا؟

کیا وہاں بھی اسی طرح کے فتنے اٹھتے رہیں گے ؟ کیا وہاں بھی اسی طرح بے بات کی بات پر ہنگامے برپا ہوا کریں گے ؟ کیا وہاں بھی اسی طرح میری توہین اور تذلیل ہوتی رہے گی ؟

اور کیا ۔ میں یہ سب کچھ برداشت کر لوں گی ـــــ کر بھی لیا تو کب تک ؟ ہر بات کی، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، میں بھی آدمی ہوں آخر ! میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلک گیا کبھی تو پھر کیا ہو گا ؟

لیکن نہیں ـــــ میں اس کی نوبت نہیں آنے دوں گی !

زندگی بھر کا پیمانِ وفا میں نے اشفاق سے باندھا ہے ۔ اور جہاں تک ان کا تعلق ہے ان سے مجھے کوئی شکایت نہیں ۔ کوئی شکوہ نہیں، وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرا خیال کرتے ہیں، میرا مان رکھتے ہیں ۔ میری تکلیف پر کڑھتے ہیں، میری خوشی سے خوش ہوتے ہیں اصل واسطہ تو انھیں سے ہے، جب وہ اتنے اچھے ہیں تو ان کے خیال سے، انھیں خوش

رکھنے کے لئے مجھے امی کی کڑوی کسیلی باتیں بھی صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لینی چاہئیں۔ اور یہ بھی تو ہے کہ انسان کی نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔ آج نہ معلوم کیوں اور کس بات پر وہ مجھ سے خفا ہیں، لیکن اگر میں خدمت کرتی رہی تو میری خدمت انہیں جیت لے گی۔ خفگی خود بخود دور ہو جائے گی! بیچاری باجی بھی کتنا چاہتی ہیں مجھے! کتنا ساتھ دیتی ہیں میرا! اگر میری خدمت بھی کام نہ آئی تو باجی کا دامن پکڑوں گی، وہ میری سفارش کریں گی اور امی کا دل صاف کر دیں گی مجھ سے!

یہ باتیں بیٹھی وہ سوچ رہی تھی کہ اسلم آیا۔ اس نے کہا:

گاڑی کا وقت قریب آگیا ہے، سامان بندھ چکا ہے، سب لوگ باہر کھڑے ہیں۔ چلو، میری اچھی بہن چلو!

انجمن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ بھائی کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اسلم نے بہت ضبط کیا لیکن اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

گھبراؤ نہیں، سب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں بھی آتا اور تمہیں بلاتا رہوں گا!

انجمن نے آنسو پونچھے اور چل پڑی، اشفاق نیچے اس کا انتظار کر رہا تھا، اس کی ہمت نہیں پڑی کہ انجمن سے چلنے کے لئے کہتا۔

انجمن نیچے اتری اور چپ چاپ اس قافلے میں شریک ہو گئی جو رخت سفر باندھ کر بشارت گنج کی طرف کوچ کر رہا تھا۔

کلثوم بی سب سے پہلے چپ چاپ جا کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ اسلم نے نسیم سے ہاتھ ملا، فرزانہ کو سلام کیا، اشفاق سے مصافحہ کیا اور کلثوم سے ملے بغیر اپنے گھر

واپس آگیا ـــ اگر وہ اتنی کھنچی ہوئی ہیں تو مجھے بھی کیا پڑی ہے کہ ناک رگڑ دوں ان کے قدموں سے!

اسلم کو بے سلام کئے جاتا دیکھ کر کلثوم بی تلملا کر رہ گئیں۔ انھیں توقع تھی ان کی بہو کا بھائی اپنی تذلیل و توہین کے بعد بھی سر کے بل حاضر ہو کر رخصت کرے گا انھیں لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی!

تلخیاں

زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی

پرسشِ غم کو وہ آئے تو اک عالم ہوگا
دیدنی کیفیتِ قلب و جگر بھی ہوگی

منزلِ عشق پہ یاد آئیں گے کچھ راہ کے غم
مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گردِ سفر بھی ہوگی

ہوگا افسردہ ستاروں میں کوئی نالۂ صبح
غنچہ و گل میں کہیں بادِ سحر بھی ہوگی

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا
دردمندوں کی وہیں راہگزر بھی ہوگی!

(۱)

غمِ روزگار

انجمن کو رخصت کرنے کے بعد اسلم پہلی ٹرین سے روانہ ہو گیا، منشی صاحب نے صرف پندرہ روپے پر ٹرخا دیا تھا، ماں کی علالت کے زمانہ میں کافی قرضہ ہو گیا تھا، نہ جانے کس طرح کام چلایا، پھر جب اس کا انتقال ہو گیا تو بھی کچھ نہ کچھ خرچ ہوا۔ لگ بھگ تین سو روپے قرض کے ادا کرنے تھے۔ اور جلد از جلد ادا کرنے تھے۔ اُسے یقین تھا منشی صاحب اس کی صورت دیکھتے ہی میز کا خانہ کھولیں گے اور رقم گن دیں گے۔ لیکن بعض لوگوں کی امیدیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ یہی اسلم کے ساتھ ہوا۔ منشی صاحب اُسے دیکھتے ہی سرو قد کھڑے ہو گئے، دلی صدمے کا اظہار کیا۔ اس کے یتیم ہو جانے پر، پھر دفعتہً گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا: "قوم" کا صنعت و حرفت نمبر بہت جلد نکل رہا ہے۔ اعلان کر چکا ہوں کہ پہلی تاریخ کو قارئین کرام کے ہاتھ میں ہو گا، اب صرف سات دن باقی رہ گئے ہیں اور میاں سچ پوچھو تو ابھی تک نہ ایک صفحہ کی کتابت ہوئی ہے نہ کوئی مضمون لکھا گیا ہے، دو چار

اوٹ پٹانگ مضامین آئے ہیں وہ بھی نظرِ ثانی کے محتاج ہیں

اسلم ہیٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ اور گم صُم سن رہا تھا۔ انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

بس اب رات دن محنت کر کے یہ نمبر مرتب کر ڈالو، جسے دیکھ کر لوگ کہہ اٹھیں کہ واہ کیا نمبر مرتب کیا ہے! مخالفین دنگ رہ جائیں کہ نمبر کیا ہے انسائیکلوپیڈیا ہے حریف دانتوں تلے انگلیاں دبالیں کہ لیں نکالے جاتے ہیں نمبر!

یہ تقریر کر کے اسلم کے اترے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور گرج کر پوچھا:

کیوں میاں ہے ہمّت!؟

اسلم نے کہا: ہمّت کے سوا اور میرے پاس ہے کیا؟ اطمینان رکھئے نمبر وقت پر نکلے اور توقع سے اچھا نکلے گا! لیکن ـــــ

منشی صاحب نے لفظ پکڑ لیا: لیکن ـــــ میں سمجھ گیا ـــــ روپیہ مانگتے ہو۔ بھئی بہت شرمندہ ہوں آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ تم سے! اطمینان رکھو، نمبر نکلتے ہی رقمیں وصول ہونے لگیں گی، سب سے پہلے تمھارا حساب بیباق کر دوں گا!

یہ وعدہ اسلم کو مطمئن نہ کر سکا وہ گویا ہوا۔ لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، ایک روپیہ بھی نہیں۔

منشی صاحب نے سراپا شفقت اور ہمدردی بن کر اپنے خستہ درماندہ مفلوک الحال اور پریشان روزگار مزدور پر ایک نظر ڈالی اور بڑے درد بھرے لہجے میں کہا:

واقعی! کچھ بھی نہیں ہے تمھاری جیب میں؟

اسلم نے جیب الٹ دی، گیارہ آنہ پیسے تھے۔ اس نے کہا: اس رقم میں بھی یہ چونّی

کھوٹی ہے، آپ کچھ دیں گے نہیں تو کھاؤں گا کیا؟

منشی صاحب سوچنے لگے، گویا اتنا اہم مسئلہ تھا یہ، کہ سوچے بغیر اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بولا:

چلئے حساب نمبر نکلنے کے بعد بیباق کر دیجئے گا۔ لیکن روزمرّہ کے مصارف کے لئے تیس چالیس روپے تو دے دیجئے!

منشی صاحب نے بےبسی کی تصویر بن کر کہا: کاش دے سکتا، تم میری پریشانی کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ تمھارے جانے کے بعد سے تو اخبار اور زیادہ چوپٹ ہو گیا ہے!

اسلم نے مایوسی کے انداز میں کہا تو پھر میں کہیں اور مزدوری کرتا ہوں جا کر، آپ نمبر نکالئے اس کے بعد آؤں گا، حساب بیباق کر دیجئے گا!

یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ انھوں نے سوچا: اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نمبر نکل چکا۔ لیکن تیس چالیس روپے کا یکمشت رسک بھی برداشت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی آخر انھوں نے ایک اور درمیانی راستہ نکال لیا۔

تو ایسا کرو دس روپے تو اس وقت لے لو اور کل سے دو روپے روز لے لیا کرو نمبر نکلنے کے بعد جیسے ہی بل وصول ہوئے تمھاری ایک ایک پائی کا حساب بیباق کر دوں گا

مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے، اسلم کو یہ تجویز ماننی پڑی۔ اس نے جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا:

لائیے دس ہی روپے! دے دیجئے اس وقت!

لیکن جب تک مزدور کام شروع نہ کر دے منشی صاحب دس روپے بھی دینے

پر تیار نہ تھے، کہنے لگے :

شام کو دے دوں گا، لے لینا بھئی!

اسلم کو غصّہ آ گیا ــ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ دفتر میں کیا خالی بنیان پہن کر بیٹھوں۔ ۲۴ گھنٹے کوٹ تو نہیں پہن سکتا! ابھی بازار سے قمیص لانی ہے جاکر۔ کھانا بھی کھانا ہے۔ کل سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے، شام تک کیا ہوا کھاؤں گا؟

ہر طرف سے زچ ہو کر، منشی صاحب دس روپے دینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن بات کا بنا ہنا خوب جانتے تھے، نہ اپنی جیب کو تکلیف دی نہ تجوری کو!

خوش قسمتی یا بد قسمتی سے گھر کی ملازمہ جاتی ہوئی نظر آئی۔ فوراً آواز دی ــ اری سنتی ہے!

وہ پلٹ آئی جلتے جاتے۔ کہنے لگے، جا ذرا بیگم صاحبہ سے دس روپے مانگ لا کہنا میاں نے منگائے ہیں!

وہ گئی اور الٹے پاؤں واپس آئی، سو روپے کا ایک نوٹ بڑھاتی ہوئی بولی، کہے ہیں چھٹا نہیں ہے!

سو روپے کا نوٹ دیکھ کر خون کھول گیا منشی صاحب کا! غصّہ اور غصے سے زیادہ جھینپ جیسے یہ نوٹ، اُن کا نہیں اسلم کا تھا! جسے انھوں نے چرایا تھا! جیسے چیل بوٹی پر جھپٹتی ہے اس طرح اس سے نوٹ چھینا۔ اب اس چکّر میں پڑ گئے کہ خود جاکر تڑائیں یا یہ ذمّہ داری اسلم کو سونپ دیں!

ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ قدرت نے ان کی مشکل حل کر دی لیکن بہت بُری طرح!

نوٹ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اقدام وعمل کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ پوسٹ مین آگیا۔ اس نے چھ سات وی پی منی آرڈر فارم ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

دو سو بائیس روپے پندرہ آنہ!

پھر ہمیانی کھول کر دس دس اور پانچ پانچ کے نوٹ نکالنے لگا۔

پوسٹ مین کو دیکھ کر وہ ہمیشہ پھول کی طرح کھل جایا کرتے تھے، لیکن اس وقت اسے قاتل نظروں سے گھور رہے تھے۔ اسلم سر پر کھڑا تھا۔ اس کا سر پر کھڑا ہونا اور زیادہ ناگوار گزر رہا تھا، آخر ضبط نہ کر سکے، خشک لہجے میں فرمایا:

جائیے اپنے کمرے میں بیٹھ جائیے جاکر، ابھی روپے وہیں پہنچ جائیں گے۔

اسلم کو خود بھی یہاں کھڑا رہنا ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منشی صاحب کا یہ لب ولہجہ اور انداز گفتگو بہت بُرا معلوم ہوا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا!

ذرا دیر کے بعد منشی صاحب تشریف لائے، اب موڈ بدل چکا تھا، سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور مسکراتے ہوئے دس کا نوٹ جیب سے نکالا۔ اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

لو بھئی ـــــ لینا!

اسلم نے نوٹ لے لیا، منشی صاحب نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے فرمایا:

یہ خاص نمبر کم سے کم سو سوا سو صفحے کا ہوگا۔ سائز اس مرتبہ بدل دیں گے ـــ یعنی چھوٹا کر دیں گے!

اسلم نے بے دلی کے ساتھ جواب دیا ہو جائے گا! فکر نہ کیجئے۔

پھر وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگا تاکہ کسی ہوٹل میں کھانا کھائے، پھر بازار جاکر قمیض

خرید سے لیکن منشی صاحب ہدایات دینے پر تلے ہوئے تھے، کہنے لگے :

آرٹ پیپر پر ایک درجن تصویریں بھی ہوں گی ، بازار تو جا رہے ہو ذرا کاغذ والے سے بھاؤ بھی پوچھتے آنا ، بلاک بن چکے ہیں ، چھپنے کو دے دوں گا !

اسلم نے جل کر کہا : لیتا ہی کیوں نہ آؤں !

یہ تو اور اچھا ہے ، پانچ ریم لیتے آؤ ۔

لیکن نہیں اس سے قرض مانگوں گا اور نہ وہ دے گا !

یہ کاغذ والے بڑے بے مروّت ہوتے ہیں ، یہ کیا جانیں اُدھار دینا ! لیکن نرخ تو معلوم ہونا چاہیئے پہلے !

نرخ معلوم ہے ، سو روپے سے کم نہیں ہے !

منشی صاحب کچھ کہے بغیر پھر اپنے کمرے میں واپس گئے ، اور ذرا دیر میں واپس آ کر پانچ سو روپے اس کے سامنے رکھ دیے اور فرمایا :

کوشش کرنا کچھ رعایت کر دے ۔۔ پانچ روپے ریم سہی !

اسلم نے کوئی جواب نہیں دیا ، روپے جیب میں رکھے اور باہر نکل گیا ۔ باہر نکلا تو خود بخود اس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ منشی صاحب کا حافظہ اتنا کمزور کیوں ہے ؟ ابھی ابھی وہ میرے سامنے اپنی پریشانیوں کا عذر کر رہے تھے ۔ بے زری کی داستان بیان کر رہے تھے تیس چالیس روپے کی حقیر رقم بھی میرے کئی سو کے بقایا میں سے ادا کرنے پر قادر نہ تھے ، لیکن گھر سے ، دس ٹنگائے سو کا نوٹ آ گیا ، پوسٹ مین سوا دو سو روپے دے گیا اور سو سو کے یہ پانچ نوٹ بھی نکل آئے ، پوسٹ مین نے تو میرے سامنے دس دس اور پانچ پانچ کے نوٹ نکالے تھے ، گویا یہ سو سو والے نوٹ پہلے ہی سے الگ رکھے ہوئے تھے ،

گویا منشی صاحب جھوٹ بول رہے تھے، وہ میرا حساب بیباق کر سکتے ہیں مگر کرنا نہیں چاہتے!

کیا ایسے آدمی کے ساتھ کام کرنا چاہیئے، لطف آسکتا ہے کام کا! کیوں نہ استعفا دے دوں، کام کرنے سے انکار کر دوں؟

لیکن ایسا کروں تو، اب جو ذرا سی آس ہے بقایا کے مل جانے کی وہ بھی خاک میں مل جائے گی! استعفا تو قبول کرلیں گے لیکن ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے!

ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے! پھر قرض کس طرح ادا ہوگا! کھاؤں گا کیا؟ زندگی کس طرح بسر کروں گا؟

یہی سوچتے سوچتے ہوٹل آگیا، اندر داخل ہوا۔ کھانے کا آرڈر دیا اور ڈٹ کر کھایا۔ ڈیڑھ روپے کا بل آیا۔ بل ادا کر کے باہر نکلا! پھر ایک نئی تشویش پیدا ہو گئی! منشی صاحب صرف دو روپے روز دیں گے،

ایک جھرجھری سی لے کر اس نے فیصلہ کیا، کچھ بھی ہو، مجھے دو روپے روز میں گزر کرنا ہی پڑے گا، قرض کے بارے سے سبکدوش ہونا ہے۔ انجمن دُلہن بن کر سسرال گئی ہے کچھ اسے بھیجنا ہے! میرا کیا ہے تکلیف اٹھالوں گا! دونوں وقت نہ سہی ایک ہی وقت کھا کر گزارہ کرلوں گا! زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی!

بازار پہنچا، سب سے پہلے قمیص خریدی، بہت سی رنگ رنگ کی قمیصیں دکان میں رکھی تھیں۔ چار روپے سے لے کر بیس روپے تک کی، کئی قمیصیں پسند آئیں لیکن خریدی وہ جو سب سے زیادہ ناپسند تھی، سستی جو تھی، صرف چار روپے کی!

قمیص خرید کر کاغذی بازار میں پہنچا۔ ہر دکان پر الگ نرخ، کھلے بازار میں یہ چیز

ناپید تھی، بلیک مارکیٹ میں رقم کے رقم بک رہے تھے۔ آخر بڑی مشکل سے ایک جگہ ۹۵ روپے فی رقم پر سودا ہوا۔ رسید لی، کاغذ گاڑی میں رکھا اور دفتر آ گیا، گاڑی والے کو دو روپے دیے۔

منشی صاحب اس وقت اندرون خانہ تشریف رکھتے تھے، اتنے میں اُن کا لختِ جگر اور اسلم کا ہم نام خوش خوش آتا دکھائی دیا، اس نے کہا:

اسلم صاحب! ہماری سائیکل دیکھی آپ نے!؟

سائیکل کیسی بھائی ؟ اسلم نے سوال کیا۔

فلپ — چار سو پچاس روپے میں لی ہے۔ بڑی مشکل سے — یہ دیکھیے!

یہ کہہ کر رسید بڑھا دی اس کی طرف۔ اسلم نے رسید پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور کہا: ہاں ٹھیک کہتے ہو بھئی — مزے کرو — لیکن مہنگی ہے!

وہ ہنسنے لگا: مہنگی ہو یا سستی، ہم نے تو خرید لی۔ آپ کے جانے کے بعد بڑا جھگڑا ہوا۔

جھگڑا — ؟ کیسا جھگڑا ؟! کس سے ؟ کیوں؟ اسلم نے سوال کیا۔

وہ بولا: کئی مہینے سے ٹال رہے ہیں، وعدہ کرتے ہیں اور مکر جاتے ہیں۔ آج ہم نے اعلان کر دیا، اگر سائیکل نہ ملی تو بھاگ جاؤں گا!

بھاگ جاؤ گے ؟

ہاں — کئی دفعہ بھاگ چکا ہوں، اور جب بھاگا ہوں کسی مطالبے پر تو اُسے پورا کرا کے واپس آیا ہوں!

تو یہ نسخہ کام آ گیا ؟

ہاں ۔۔ (مسکراکر) پہلے تو بہت بگڑے، خفا ہوئے، روپیہ نہیں ہے لیکن جب میں نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا تو ڈھیلے پڑ گئے۔ تجوری کھولی اور روپے گن دیئے۔ خدا کی قسم نہ ہوں گے تو دو ہزار روپے تو ہوں گے ۔۔ جی چاہتا ہے ۔۔

کیا جی چاہتا ہے؟

جی چاہتا ہے چابی بنواؤں اور یہ رقم پار کر دوں!

نہیں بھائی ایسی باتیں نہ سوچا کرو، جب تمھاری وہ باتیں ان ہی لیتے ہیں تو پھر چوری کی کیا ضرورت ہے؟!

وہ ہنستا، قہقہے لگاتا چلا گیا، وہ گیا تو اسلم پر پھر اضطراب، برہمی اور اشتعال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ سوچنے لگا میں نے جو روپے طلب کئے تھے وہ خیرات کی مد میں تو نہیں مانگے تھے، میرے بائیس سو کا جو بقایا اتنے دنوں سے چلا آ رہا ہے وہ اللہ کے نام پر تو نہیں طلب کر رہا ہوں! آنکھیں پھوڑی ہیں، محنت کی ہے، دن رات ایک کر کے کام کیا ہے، اپنی محنت کا معاوضہ طلب کرتا ہوں، اپنی تنخواہ مانگتا ہوں، اپنی مزدوری کا مطالبہ کرتا ہوں! لیکن مجھے دینے کے لئے منشی صاحب کے پاس کچھ نہیں ہے مجھے وہ تیس چالیس روپے بھی نہیں دے سکتے! لیکن پانچ روپے کا آرٹ پیپر خرید سکتے ہیں۔ پانچسو کی سائیکل خرید کر دے سکتے ہیں اپنے لخت جگر اور نور نظر کو! آخر یہ کیسی ذہنیت ہے، یہ کون سا اصول ہے؟

ایک مرتبہ پھر جی چاہا کہ بوریہ بستر باندھے اور رخصت ہو جائے کبھی رُخ نہ کرے اس دفتر کا! لیکن فوراً ہی قرض کی وہ بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی جس کی جلد از جلد ادائیگی کا وعدہ کر کے وہ آیا تھا!

انجن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی:

انجن ـــ بہن، جان سے زیادہ پیاری بہن ـــ جسے کبھی خوشی میسر نہ آئی، جو کبھی سُکھ نہ حاصل کر سکی، جس کی کوئی آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی، جو خالی ہاتھ اپنی سسرال گئی ہے۔ چلتے وقت پانچ روپے کا نوٹ بھی تو اس کے ہاتھ پر نہ رکھ سکا۔

وہ میری حالت سے واقف ہے، وہ میری محبت کو بھی جانتی ہے، وہ میری مجبوریوں کو مجھ سے زیادہ محسوس کرتی ہے۔

یقیناً اسے کوئی شکوہ نہ ہوگا کہ چلتے وقت میں نے اسے کچھ نہیں دیا، شاید اشفاق بھی اسے محسوس نہ کرے، نیک اور شریف لڑکا ہے، لیکن کیا بھیجی (کلثوم) بھی محسوس نہ کریں گی؟ کیا باجی (فرزانہ) بھی اس کمزوری کو نظر انداز کر جائیں گی۔ کیا بھائی جان (نسیم) بھی اس غربت کا مذاق نہیں اڑائیں گے؟

صرف اشفاق ایسا ہے جو کچھ نہیں کہے گا، ممکن ہے باجی بھی خاموش رہیں۔ لیکن بھیجی خاموش نہیں رہ سکتیں۔ وہ تو طعنے دے دے کر اس کا کلیجہ چھلنی کر دیں گی! وہ طعنے سنے گی اور کسی کونے میں، کسی گوشے میں چھپ چھپ کر روئے گی، اپنا حالِ زار بھی تو نہیں کہہ سکتی کسی سے!

نہیں، کچھ بھی ہو، میں کام کروں گا، میں استعفا نہیں دوں گا، اس سنگ دل شخص کی ملازمت کرتا رہوں گا۔ "قوم" کا خاص نمبر دن رات ایک کر کے نکالوں گا اور ایسا شاندار نکالوں گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں گے، جو مضامین لکھوں گا وہ روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھوں گا۔ اور اپنی دھاک بٹھادوں گا!

اور پھر منشی صاحب سے اپنی ایک ایک پائی وصول کرلوں گا

خواہ مجھے گالیاں دیں، بُرا بھلا کہیں کچھ بھی کریں مگر وہ ساری رقم جو منشی صاحب

سے وصول ہو گی وہ انجمن کو جائے گی!

وہ خوش ہو جائے گی، وہ محسوس کرے گی کہ دُنیا میں اس کا ایک بھائی ہے جو اس کے دُکھ سُکھ کا اپنے دُکھ سکھ سے زیادہ خیال رکھتا ہے، روپے دیکھ کر شاید پھپھی بھی نرم پڑ جائیں گی، ان کی خفگی کا راز میری سمجھ میں آ گیا، ان کے پلّے ایسی بہو پڑی ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے، جو غریب ہے مفلس ہے!

قرض بھی ضرور ادا کروں گا لیکن بعد میں۔ ہر مہینے اس مد میں پچاس روپے بھیج دیا کروں گا۔

اسلم یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً بیدار کر دیا گیا، منشی صاحب تشریف لائے اور انھوں نے آتے ہی سوالات کا تانتا باندھ دیا:

کیوں بھئی کاغذ لے آئے؟

اسلم نے رسید ان کی طرف بڑھا دی اور گویا ہُوا: جی ہاں لے آیا ——— بھاؤ کافی چڑھ رہا ہے!

منشی صاحب نے رسید دیکھی اور زیرِ لب کہا: ۹۵ روپے ریم! بہت ہے؟

اسلم نے جواب میں کہا: بڑی مشکل سے ملا ہے، ورنہ بھاؤ تو سو سوا سو تک پہنچا ہوا ہے!

منشی صاحب نے فرمایا: لیکن پچھلے مہینے ایک ریم کی ضرورت پڑ گئی تو میں خود اسّی روپے میں لایا تھا!

اسلم جل گیا! تو یہ کاغذ واپس کر دیجئے! اور جہاں سے سستا لائے تھے وہیں سے خرید لیجئے۔ بیکار مجھے زحمت دی آپ نے!!

منشی صاحب لڑنے کے موڈ میں نہیں تھے؛ وہ تو صرف اسے مرعوب کرنا چاہتے تھے

اس میں احساسِ کمتری پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ اسّی میں نہیں ایک سو دس روپے میں ایک ریم لائے تھے، جب اسلم نے سو روپے کا اندازہ بتایا تھا تو وہ خوش ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کئی کاغذیوں سے اس کے مراسم ہیں وہ ہمیشہ ان کے مقابلے میں سستا مال لاتا ہے، اس لئے بغیر حیل و حجّت کے پانچسو روپے لا کر اس کے سامنے رکھ دیئے تھے اور اس کی بھی پرواہ نہ کی تھی کہ وہ انھیں جھوٹا سمجھے گا! کیونکہ ابھی کہہ چکے تھے دس روپے بھی نہیں ہیں بیگم سے منگا کر دیتا ہوں، اور اب ۹۵ روپے ریم پا کر وہ بہت زیادہ خوش ہو گئے تھے۔ جس نرخ سے خود لائے تھے اس حساب سے پندرہ روپے اور جو اندازہ اسلم نے بتایا تھا اس کے اعتبار سے پانچ روپے فی ریم کا فائدہ ہوا تھا۔ خوشی کی بات ہی تھی، لیکن وہ داد دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا نہیں چاہتے تھے، مرعوب کر کے حوصلہ شکنی کرنا چاہتے تھے، تاکہ آئندہ اور زیادہ سستا لانے کی کوشش کرے!

بہر حال منشی صاحب نے بات بڑھنے نہیں دی، جلدی ہی مفاہمت پر آمادہ ہو گئے!

بھئی اس قدر جلد نہ خفا ہو جایا کرو، غصہ تو تمھاری ناک پر رکھا رہتا ہے نوجوان ہو اور نوجوانی میں ہمارا بھی یہی حال تھا!

خود اسلم بھی بات بڑھانے پر تیار نہیں تھا، منشی صاحب نے ہتھیار ڈال دیے تو وہ بھی خاموش ہو گیا!

پھر اس نے باقی رقم پیش کر دی۔ منشی صاحب نے ایک ایک روپیہ گیا، اور منہ پھیلا کر کہا:

یہ اٹھارہ روپے ہیں — بیس ہونا چاہئیں!

اسلم بھڑک اٹھا: پانچ ریم کا بوجھ اپنے سر پر تو لاد کر نہیں لاسکتا تھا! دو روپے گاڑی والے کو دئیے ہیں!

جہاں فائدہ ہوتا ہو وہاں منشی صاحب مفاہمت کر سکتے تھے، لیکن نقصان برداشت کر لیں یہ کس طرح ممکن تھا! پہلے سے زیادہ حیرت زدہ ہو کر فرمایا:

دو روپے ــــ گاڑی کے دو روپے؟! مزدور کے سر پر اٹھوا لاتے۔ آٹھ آنے لیتا زیادہ سے زیادہ!

اسلم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: میں آدمی ہوں، بازار یہاں سے تین میل ہے! جاتی دفعہ پاپیادہ چلا گیا، کاغذ نہ لاتا تو بھی گاڑی ہی پہ آتا!

جو کچھ ہونا تھا ہو چکا! اب بحث سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔ منشی صاحب نے اٹھارہ روپے احتیاط سے جیب میں رکھے اور تشریف لے گئے، صاف معلوم ہو رہا تھا دو روپے کا غم دل کو ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہا ہے!

منشی صاحب کو زنان خانہ میں گئے تھوڑی دیر ہوئی ہو گی کہ وہی ملازمہ جو صبح دس کے بجائے سو روپے کا نوٹ لے کر آئی تھی، سر پہ آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسلم نے اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور سوال کیا، کیا ہے؟

وہ پانچ پانچ کے تین نوٹ بڑھاتی ہوئی بولی۔ آج نیاز ہے گھر میں، مٹھائی لادو اس کی!

وہ جل کر بولا: تم کیوں نہیں لے آتیں؟

وہ ناز و انداز سے اس کی نظر سے نظر ملاتی ہوئی گویا ہوئی۔ بیگم صاحب نے کہا تو مجھی سے ہے لیکن وہ موا حلوائی مجھے چھیڑتا رہتا ہے، کسی دن شیرے کی کڑھائی میں نہ

دھکیل دیا ہو تو میرا نام شبو نہیں!

اسلم کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا: شادی کیوں نہیں کر لیتیں اس سے؟ دن رات جلیبی، برفی، امرتی، گلاب جامن، لڈو کھایا کرنا!

کہنے لگی: وہ تو یہی کہتا ہے مگر میں کیوں کرنے لگی حلوائی بچے سے شادی؟

اسلم نے ایک دفعہ اسے غور سے دیکھا اور ڈپٹ کر کہا: تو کیا مجھ سے کرو گی؟ گٹ آؤٹ۔ بھاگ جاؤ، خبردار جو کبھی قدم رکھا اس کمرے میں!

اور پھر اس کے جانے کا انتظار کئے بغیر وہ خود چلا گیا کہیں باہر!

---

(۲)

بھاڑ میں

اسلم نے جیسا کہا تھا کر دکھایا، دن رات ایک کر کے، گراں بہا معلومات کا ذخیرہ فراہم کر کے، درجنوں کتابیں پڑھ کر، ممالکِ غیر کے رسائل و صحائف کے بہترین مقالات کا ترجمہ کر کے صوبائی اور مرکزی حکومت کی سالانہ رپورٹوں کا مطالعہ کر کے "قوم" کا نہایت شاندار نمبر مرتب کر دیا۔ منشی صاحب کو ہمہ دانی کا دعویٰ تو ضرور تھا لیکن ہر چیز میں کورے تھے سوا سنسنی خیز خبریں بنانے اور معززین کی پگڑیاں اُچھالنے کے وہ کچھ نہیں جانتے تھے! یہ جان ماری کا کام تھا!۔ —— اعلان تو ذوق شوق سے کر دیا لیکن جب کام کرنے کا وقت آیا تو ہمت ہار گئے! اور ارادہ ملتوی کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگے! لیکن اسلم فرشتۂ رحمت بن کر پہنچا اور اس نے توقع سے زیادہ کامیاب اور شاندار نمبر نکال دیا۔

خاص نمبر کی صرف تین ہزار کاپیاں منشی صاحب نے ڈرتے ڈرتے چھپوائی تھیں۔ یہ بک سکتا ہے یا دھرا رہ جاتا ہے۔ لیکن چٹکی بجاتے میں یہ نسخے بک گئے۔ پلیٹیں ابھی گھسی نہیں گئی

تھیں، پانچ ہزار اور چھپوا لیا۔ وہ بھی چند دن میں ختم ہوگیا پھر تین ہزار چھپوایا تب کہیں جاکر مانگ پوری ہوئی!

اس نمبر نے منشی صاحب کے دلدر دور کر دیئے، نئے حلقوں میں اخبار پہنچا، اس کی مانگ بڑھی براہ راست اور مستقل خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اشتہارات کھٹاکھٹ آنے لگے۔ جو فرمیں التجا اور التماس کے باوجود اشتہار نہیں دیتی تھیں اب خود ان کی طرف سے کنٹریکٹ فارم پہنچے تھے، جو صنعت کار اور کاروباری اصحاب تجارتی نقطۂ نظر سے قوم کو ذرا اہمیت نہیں دیتے تھے اب وہ اشتہار اس امید پر دیتے تھے کہ فائدہ اٹھائیں گے!

خاص نمبر کی گہما گہمی میں پورا ایک مہینہ صرف ہوگیا!

اس مدت میں دو روپے روز پابندی سے اسلم کو ملتے رہے۔ داد و تحسین اور تعریف و ستائش کا جہاں تک تعلق تھا اس کے ڈونگرے برستے رہے، ٹیلیفون پر مبارک باد کے پیام آتے رہے۔ باہر کی ڈاک میں متعدد خطوط خاص نمبر کی مدح و توصیف کے لئے وقف ہوتے، خود منشی صاحب کا جہاں تک تعلق تھا انھوں نے بھی اسلم کو استاد مان لیا لیکن حساب اب تک بیباق نہیں ہوا بلکہ مزید ستم یہ کہ کچھ اور رقم بھی چڑھ گئی۔ منشی صاحب اب کم و بیش چھ سو کے مقروض تھے، اسلم کے! اس نے بھی دو روپے روز سے زیادہ لینے کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ چڑھی ہوئی رقم ملے گی تو بہت سی اچھی اچھی چیزیں خرید کر اور بہت سا روپیہ لے کر بشارت گنج جائے گا! اور اپنے ہاتھ سے یہ سب کچھ دے گا تاکہ وہ زر پرست عورت (کلثوم) بھی محسوس کرے کہ ہاں انجمن کا اس دنیا میں ایک بھائی ہے۔ اور وہ اس کی جھولی سیم و زر سے بھر سکتا ہے، پھر اس کی آؤ بھگت ہوگی، قدر ہوگی، عزت ہوگی!

کپڑے پھٹ گئے تھے، جوتا ٹوٹ گیا تھا، لیکن اسلم کو ذرا فکر نہ تھی، وہ پھٹے کپڑوں اور

ٹوٹے ہوئے جوتے میں مگن تھا، قرض داروں کے خطوط آرہے تھے، وہ ان سے معذرت اور وعدے کررہا تھا۔ لیکن انھیں ابھی نہ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ روپے کی ملنے والی کھیپ صرف انجمن کے لئے مخصوص تھی!

لیکن منشی صاحب خاموش کیوں ہیں، وہ حساب کیوں نہیں بیباق کرتے؟ اب تو تجوری کو تکلیف دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ بیگم صاحبہ سے "قرض" طلب کرنے کی بھی حاجت نہیں۔ منی آرڈروں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ چیک پر چیک اور ڈرافٹ پر ڈرافٹ چلے آرہے ہیں۔ اب کیا کمی ہے ــــ اب کیا عذر ہے؟

یہی سوچ کر ایک روز منشی صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا وہ اس وقت بہت خوش تھے۔ حقے کی سنہال منہ سے لگی تھی۔ اور زوردار کش لگا لگا کر خوشبودار دھواں کمرہ میں منتشر کررہے تھے! پاس کئی بے تکلف لوگ بیٹھے تھے۔ اور سیر و شکار کا پروگرام بن رہا تھا۔ ایک اور صاحب رونق افروز تھے جو دلالی کا کاروبار کرتے تھے، انھوں نے ایک نئی جیپ کا منشی صاحب کے لئے سودا پختہ کیا تھا اور وہ اسے خریدنے پر تل گئے تھے، وہ تھی بھی ایسی ہی۔ کہنے کو جیپ مگر کار سے خوبصورت اور آرام دہ۔ وہ اٹھارہ ہزار پر اڑے ہوئے تھے۔ منشی صاحب بارہ سے شروع ہوکر سولہ ہزار پر آکر رک گئے تھے۔ احباب دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے، بعض منشی صاحب کو راغب کررہے تھے کہ روپے کا منہ نہ دیکھیں جیپ خرید لیں، بعض دلال کو تلقینِ صبر کررہے تھے کہ اس میں نہ سہی آئندہ کسی چیز میں کما لیتا، آخر کافی ردّ و کد کے بعد سترہ ہزار میں فیصلہ ہوگیا۔ منشی صاحب نے فوراً چیک کاٹ کر دے دیا اور فرمایا:

بھئی یہ تو ہُوا لیکن کولر اور ریفریجیریٹر کا وعدہ کرچکے ہو۔ گرمی آرہی ہے، ابھی سے

دم نکلا جا رہا ہے اس کے خیال سے!

دوآل دوست نے وعدہ کر لیا چند ہی دن میں ان دونوں نعمتوں سے بھی ان کا گھر آباد ہو جائے گا!

پھر چائے کا دور چلا، کچھ دیر اور گپ شپ ہوئی اور رفتہ رفتہ مجمع احباب منتشر ہو گیا اسلم خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھا یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ منشی صاحب اپنی جیب ریغر یجیبڑ اور کولر کے تصور میں اتنے مست اور احباب سے باتوں میں اتنے مستغرق تھے کہ اسلم کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا جب میدان خالی ہو گیا تو ان کی نظر اسلم پر جا پڑی!

ارے تم یہاں بیٹھے ہو، کب سے، کوئی خاص کام ہے؟

اسلم اٹھ کر قریب آگیا۔ اس نے نیاز مندانہ لب و لہجے میں کہا:

جی ہاں ایک ضروری کام ہے!

منشی صاحب نے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے، عینک اتار کر خانہ میں کی، فاؤنٹین پن جیب میں رکھا اور کرسی پر اس طرح ہو بیٹھے جیسے اب اٹھنے ہی والے ہیں۔ پھر یک بیک سنجیدہ ہو کر فرمایا:

تو کہتے کیوں نہیں کیا کام ہے؟ تمہارا وقت بھی قیمتی ہے اور میرا بھی، مجھے دفتر کا کام کرنا ہے۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔

یہ باتیں سن کر اسلم کا حوصلہ پست ہو گیا، لیکن جو بات کہنی تھی وہ اتنی ضروری تھی کہ اسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ آخر بھی کڑا کر کے گویا ہوا:

میرا حساب صاف کر دیجئے، بہت ضرورت ہے مجھے!

منشی صاحب نے بے رخی کے ساتھ فرمایا:

ہو جائے گا ۔۔ ذرا چھری تلے دم تو لینے دو ۔۔۔ خاص نمبر نے میرا دیوالہ نکال دیا۔ اندھا دھند خرچ کرتا چلا گیا۔ مگر رقم کی وصولی آہستہ آہستہ ہو رہی ہے، نہ جانے کتنے بل کے ہیں جن کی ادائیگی باقی ہے۔ تم تو اپنے آدمی ہو، گھر کے آدمی، تمھیں تو دیر سویر بھی دے دوں تو کام چل جائے گا، دوسروں سے تو تعلقات کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ انھیں ٹالنا ممکن نہیں، انھیں تو دینا ہی پڑتا ہے!

ان الفاظ میں اپنائیت بھی تھی اور کاروباری ذہنیت بھی۔ اسلم مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

بہر حال میرا حساب صاف کر دیجیے۔ میں بھی مقروض ہوں، میں بھی پریشان ہوں آپ نے وعدہ کیا تھا خاص نمبر کے نکلتے ہی حساب صاف کر دیں گے۔ میں نے آپ کے وعدے سے اپنا پروگرام بنا لیا۔

منشی صاحب ذرا نرم پڑے، تو بھائی انکار کب کر رہا ہوں، گلے گلے پانی دوں گا چند روز اور تھم جاؤ!

اب اسلم کا درجہ حرارت چڑھنے لگا۔ کیوں تھم جاؤں۔ اپنا قرض مانگ رہا ہوں نہ کہ بھیک!

منشی صاحب چونک پڑے۔ انھوں نے گھبرا کر اسلم کو دیکھا، شاید وہ اندازہ کر رہے تھے، اس کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ کہنے لگے،

تمھیں گفت گو کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اس طرح گفتگو کی جاتی ہے؟ مالک اور ملازم، آقا اور نوکر میں گفتگو کا انداز یہ ہوتا ہے؟ ۔۔ یہی ہونا چاہیے؟

وہ بات بڑھا کر اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کہنے

لگا :

اگر کوئی ایسی بات میرے مُنہ سے نکل گئی ہے جس سے آپ کے پندار کو کچھ صدمہ پہنچا ہے تو میں معذرت کرتا ہوں، لیکن براہ کرم میرا حساب صاف کر دیجیے۔ میں اب انتظار نہیں کر سکتا۔

لیکن کہہ جو رہا ہوں اس وقت ہاتھ خالی ہے!

ہاتھ خالی ہے ـــــ آپ کا ہاتھ خالی ہے!؟

ہاں ـــ کیا تمھیں یقین نہیں آتا؟

کس طرح یقین کر لوں؟

ٹھیک ہے ایک جھوٹے آدمی کا یقین کس طرح کر سکتے ہو؟

میرے سامنے آپ نے جیپ خریدی، میری موجودگی میں آپ نے کولر اور ریفریجیریٹر کا آرڈر دیا! میری آنکھوں دیکھتے ہر روز منی آرڈر آ رہے ہیں، چیک آتے رہتے ہیں ڈرافٹ آتے رہتے ہیں، پھر بھی آپ کا ہاتھ خالی ہے! اگر اب بھی میری رقم ادا نہیں ہو سکتی تو پھر کبھی نہیں ہو سکے گی، مجھے مایوس ہو جانا چاہیے!

کیا خوب ـــ گویا میں بے ایمان ہوں ـــ بے مار ہوں؟!

آپ بڑے ایمان دار ہیں، بڑے سخی داتا ہیں، بڑے مہربان اور شفیق ہیں لیکن ـــ ابن مریم ہوا کرے کوئی ـــــ میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی ـــ تب جانوں تب مانوں!

آخر تم چاہتے کیا ہو خدا کے بندے!

میرا روپیہ دیجیے ـــ میرا حساب بیباق کر دیجیے۔ میری حالت آپ دیکھتے ہیں،

کپڑے پھٹے ہوئے ہیں ۔ بدتمیزی تو ہے لیکن ذرا میرے جوتے پر نظر ڈالیئے کیا حال ہو رہا ہے اس کا؟ میری شب و روز کی محنت کا یہی صلا ہے ؟ میں نے آپ سے قرض نہیں مانگا تھا مجھے نہیں معلوم آپ خیرات کرنے کے عادی ہیں یا نہیں ؟ اگر ہیں تو بھی ــ میں نے خیرات کی مد میں طلب نہیں کیا تھا ؟ میں نے خون پانی ایک کر کے کام کیا ہے ۔ رات رات بھر جاگ کر کام کیا ہے ؟ بھوکا رہ کر کام کیا ہے ! دوسروں کا مقروض رہ کر کام کیا ہے ؟ اس دُنیا میں میری صرف ایک بہن ہے ، میں اس کی ماں بھی ہوں ـــ باپ بھی اور بھائی بھی ۔ اس بہن کو اس طرح میں نے سُسرال بھیجا کہ دو روپے بھی اس کے ہاتھ پر نہ رکھ سکا! میری ماں بیمار پڑی ، میں علاج نہ کر سکا ، وہ مر گئی ، میرے پاس کفن دفن کے لئے بھی روپے نہ تھے ۔ پُرسا دینے کے لئے عزیز اور رشتہ دار آئے ، میں انھیں کھانا بھی اپنے پاس سے نہ کھلا سکا ۔ جب یہاں سے گیا تب بھی میری محنت کی کمائی میں سے آپ نے کچھ نہ دیا ایک تو میں خالی ہاتھ تھا ، آپ کے وعدے پر بھروسہ کر کے ، آپ کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر میں نے لگاتار دن رات محنت کر کے کام کیا ۔ نمبر نکال دیا جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا ۔ اسے نکلے بھی ایک مہینے کی مدّت گزر چکی ہے مگر آپ کا ہاتھ خالی ہے ، اب تک آپ مجبور ہیں ، اب تک آپ اس قابل نہیں کہ میرے تھوڑے سے روپے ادا کر سکیں پھر مجھے نوکری کرنے سے کیا فائدہ ؟ بیکار ہوتا تو بھی اس سے زیادہ اور سقیم حالت کیا ہو سکتی تھی ؟!

نہیں ، اب میں وعدوں سے نہیں بہل سکتا !

اب مجھے ٹالا نہیں جا سکتا ، میں روپے لے کر جاؤں گا ! آپ کو میرا حساب بیباق کرنا ہوگا ، ابھی ، اسی وقت !

اسلم کے یہ تیور منشی صاحب نے کبھی نہیں دیکھے تھے ، گھبرا گئے ، ریشم کی طرح ملائم ،

اور مخمل کی طرح نرم لہجے میں فرمایا:
مگر میں نے انکار تو نہیں کیا، تمہارا حساب کرنے سے!
مگر ادا ابھی نہیں کیا ـــ نتیجہ دونوں کا ایک ہے!
اچھا اس وقت تو سو روپے لے لو، پھر اطمینان سے کل حساب کر دیں گے تمہارا!؟
لوں گا تو سب ورنہ کچھ نہیں۔ جہاں اتنے دن صبر کیا ہے کل تک اور سہی۔!
کل ہی دے دیجئے گا!
پیش کش کے مسترد ہونے پر منشی صاحب خفا ہو گئے!
نہیں لیتے تو نہ لو، بھاڑ میں جاؤ!
اسلم کو بھاڑ میں جھونک کر منشی صاحب گارڈن پارٹی میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے
وہ حیرت سے کھڑا تیز تیز قدم اٹھاتے انھیں جاتا دیکھتا رہا!
پھر دفتر میں آیا اور اپنے کام میں سر جھکا کر مصروف ہو گیا۔ اب نہ اُسے اپنے روپے
یاد تھے نہ منشی صاحب کی ناسزا باتیں، صرف یہ فکر تھی اخبار وقت پر نکل جائے اس میں
کسی طرح کی خامی اور کوتاہی نہ رہنی چاہیئے۔ دوسرے اخبارات کے مقابلے میں "قوم" کا
پلّہ بھاری رہے!

(۳)

ہم بھی کیا یاد کریں گے!

منشی صاحب اسے بھاڑ میں جھونک کر گارڈن پارٹی تشریف لے گئے۔ وہ بھاڑ میں یعنی دفتر میں آ کر کام کرنے لگا!

کوئی ایک گھنٹے کے بعد چائے کی طلب ہوئی۔ کاتب کو کافی میٹر دے چکا تھا۔ چپکے سے اٹھا اور پاس کے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ چائے پیتے وقت خیال آیا سگریٹ ایک بھی نہیں ہے۔ باہر والے سے ایک پیکٹ منگایا اور دھواں اڑانے لگا:

ایک ایک گھونٹ چائے پیتا جاتا تھا اور اپنے حالِ زار کا جائزہ لیتا جاتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا: — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی؟

پھر اس گیت کا دوسرا ٹکڑا ذہن میں گونجنے لگا —— نگری مری کب تک یوں ہی برباد رہے گی!

پھر خدا جانے کیسے غالب کا مصرع ذہن گنگنانے لگا: — ہم بھی کیا یاد کریں گے

کہ خدار کھتے تھے!

پھر اس کی نظروں کے سامنے انجمن کا اترا ہوا چہرہ آگیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، اس کے کپڑے میلے تھے، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، شاید کلثوم نے آج پھر کوئی طعنہ دے کر اس کے دل میں چٹکی لی تھی!

اس نے دل ہی دل میں اس سے کہا: نہ گھبرا میری بہن نہ گھبرا ـــ مصیبت کے یہ بادل بہت جلد چھنٹ جائیں گے، تیرا بھائی عنقریب تیرے پاس آتا ہے اور اپنی ساری پونجی تیرے قدموں میں لاکر ڈال دے گا!

پھر کلثوم کے مُنہ سے شعلوں کے بجائے پھول جھڑیں گے!

پھر اس کی آنکھوں سے قہر و غضب کی بجلیاں نہیں برسیں گی، مہر و محبّت کی لہریں اٹھیں گی! پھر تیری قدر کرے گی، تجھ سے خوش ہو گی، تیری عزّت کرے گی!

عزّت ـــ عزّت اس کی ہوتی ہے جس کے پاس کچھ ہو!

جو خالی ہاتھ ہو، جس کے پاس چاندی کی ٹکلیاں نہ ہوں اس کی عزّت نہیں کی جاتی!

کسی عزّت کا سزاوار اُسے نہیں گردانا جاتا!

اور ہاں میری بہن! میں آؤں گا تیرے لئے کپڑے لے کر، روپیہ لے کر اور پھر برابر آتا رہوں گا! ہر مہینے اپنی آدھی تنخواہ لاکر تیری جھولی میں ڈال دیا کروں گا!

پھر تیری ظالم ساس محبّت کرنے والی ماں بن جائے گی!

یہ تیری سسرال جو اب جہنّم سے بدتر ہے جنّت کا نمونہ بن جائے گی، پھر تجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی، کوئی دُکھ نہ ہو گا!

اور پھر اُسے وہ بہت سے قصے یاد آ گئے جنھوں نے نازک وقت میں اس کی

ماں کی مدد کی تھی، دوائیں قرض دی تھیں، دوا علاج کے لئے روپیہ قرض دیا تھا۔ کفن دفن کا انتظام کر دیا تھا!

ان میں سے ہر ایک کو باری باری سے اس نے تسلّی دی: دوستو! کیوں گھبراتے ہو اسلم بے ایمان نہیں ہے، دغا باز نہیں ہے، احسان فراموش نہیں ہے۔ وہ تمھارا ممنون ہے، تمھاری ایک ایک پائی ادا کرے گا — زندگی بھر تمھاری انسانیت اور شرافت کے گُن گائے گا!

لیکن جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور سہی، اگلے مہینے سے میری تنخواہ میں انجمن کے بعد تمھارا سب سے بڑا حصّہ ہوگا۔ خود تکلیفیں اٹھاؤں گا، کپڑے نہیں بناؤں گا، جوتا نہیں خریدوں گا، ایک وقت چائے اور سلائس پر گزر کروں گا دوسرے وقت دال روٹی کھاؤں گا، سگریٹ بہت معمولی قسم کا پیوں گا، سینما بالکل نہیں دیکھوں گا!

اس وقت تک درویش کامل بنا رہوں گا جب تک تمھارا پیسہ پیسہ نہ ادا کر لوں، یہ ایسا بوجھ ہے کہ جب تک اتر نہ جائے قرار نہیں آ سکتا، سکون نہیں مل سکتا!

پھر اس کے دل میں خیال آیا آخر میرے اور منشی صاحب کے مابین اتنا تفاوت کیوں ہے؟

وہ قرض کا ادا کرنا گناہ سمجھتے ہیں، میں اس کا ادا نہ کرنا گناہ سمجھتا ہوں، وہ کام لے کر بھی اجرت اس طرح دیتے ہیں — اہلِ ثروت جس طرح غریبوں کو دیتے ہیں زکوٰۃ — اور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ حق مارا جائے — کسی کی رقم دبالی جائے!

ان کے پاس نقد ہے، تجوری بھری ہوئی ہے۔ بیگم صاحب کے پاس الگ خزانہ

قارون موجود ہے ۔ کئی بینکوں میں حساب ہے اور ہر بینک میں رقم خطیر جمع ہے لیکن روپیہ جمع کرتے وقت جتنے خوش نظر آتے ہیں نکالتے وقت اتنے ہی مضمحل اور پژمردہ نظر آنے لگتے ہیں !

حالانکہ روپیہ ہوتا اس لئے ہے کہ خرچ کیا جائے !

وہ کیسے لوگ تھے جو دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے پل بناتے تھے ، کنوئیں کھدواتے تھے ، سرائیں تعمیر کراتے تھے ، اسپتال کھولتے تھے ، دکھی اور پریشان حال لوگوں کے لئے محتاج خانے قائم کرتے تھے ، بیواؤں اور یتیموں کی دستگیری کرتے تھے ، اپاہجوں اور معذوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے ، ـــــ !

ہمارے منشی صاحب بھی دولت مند ہیں چاہیں تو کیا نہیں کرسکتے ـــ لیکن کچھ نہیں کرتے !

ان کا بس چلے تو دوسروں کے بنائے پلوں پر ٹیکس وصول کر لیا کریں ، دوسروں کی تعمیر کی ہوئی سرائیں اپنے قبضے میں لے لیں ۔ اور کرایہ پر چلائیں !

آخر یہ کیا ہے ، یہ کب تک ہوتا رہے گا ؟

اے خدائے دیرگیر تو کب تک یہ تماشہ دیکھتا رہے گا ؟

واقعی خدا ہونا بھی کیا چیز ہے ؟ ـــ خدا بندوں کی نافرمانیاں دیکھتا ہے اور برداشت کرتا ہے ، کافروں اور مشرکوں کی سرکشی دیکھتا ہے لیکن طبقۂ زمین نہیں الٹ دیتا ۔ دولت مندوں کی سفاکیاں دیکھتا ہے اور ڈھیل دیتا ہے ، آشفتہ حالوں اور بدبختوں کی پریشانیاں دیکھتا ہے اور ان کے اندر صبر کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے !

وہ خدا ہی ہے جو یہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے ، ورنہ ان میں سے ایک بات

بھی ایسی نہیں ہے جو برداشت کی جاسکے! جسے معاف کیا جاسکے، ان میں سے ہر بات ایسی ہے جو جلال کبریائی کو جنبش دینے کے لئے کافی ہے!

بڑی دیر تک وہ اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ پھر گھڑی پر نظر گئی تو معلوم ہوا کہ یہاں آئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ کاؤنٹر پر پہنچا تو باہر والے نے ہانک لگائی: آٹھ آنے!

یہ چائے اور سگریٹ اور ماچس کا مشترکہ بل تھا!

جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ خالی تھی:

ارے آج کی ٹرک جھونک میں وہ دو روپے بھی نہیں لئے! جو روز مل جایا کرتے تھے!

ہاتھ جب جیب سے خالی نکلا تو ہوٹل والا سمجھ گیا، ماجرا کیا ہے، وہ مسکرانے لگا، اس نے کہا:

کوئی بات نہیں ہے صاحب! پھر دے دینا!

ندامت سے سر جھکا کر — لیکن اطمینان کا سانس لے کر وہ پھر دفتر واپس آ گیا، اور کام میں مصروف ہو گیا!

اس اثنا میں منشی صاحب گارڈن پارٹی سے واپس آئے، اسے کام کرتے دیکھا اور مخاطب ہوئے بغیر زنان خانہ میں چلے گئے!

منشی صاحب کو دیکھ کر اُسے اپنے دو روپے یاد آئے، جی چاہا تقاضا کرے، اور وصول کر لے، آخر ابھی رات کا کھانا باقی تھا، صبح کا ناشتہ کرنا تھا، یہ سب کہاں سے ہو گا؟

لیکن اس کی غیرتِ فقر دستِ طلب نہ بڑھا سکی!

آج منشی صاحب کی باتوں نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اسے بے حد صدمہ پہنچا یا تھا۔ وہ برہم تھا منشی صاحب سے بھی اور اپنے آپ سے بھی! وہ ان سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ دو روپے مانگ کر اپنی مفلسی کا مذاق اڑوانا نہیں چاہتا تھا! ان کے پندارِ امارت کا تماشا دیکھنا نہیں چاہتا تھا!

اس نے سوچا: فاقے کر لینا منظور، مگر دستِ طلب بڑھانا منظور نہیں!

اگر منشی صاحب حسبِ معمول باہر سے آکر اس سے ملتے ہنسکر ہنسکر اکر باتیں کرتے اس کی حوصلہ افزائی میں کچھ کہہ دیتے، کچھ ہمدردی کا اظہار کر دیتے تو شاید یہ خلیج نہ پیدا ہوتی! جو اس وقت اسلم کو ناقابلِ عبور نظر آرہی تھی!

اگر منشی صاحب بکبر و نخوت بنے زنان خانے تشریف لے گئے اور اس سے بات بھی نہ کی تو وہ کیوں ان کے سامنے جھک منگا بن کر کھڑا ہو!؟

اگر منشی صاحب میں اتنی انسانیت نہیں ہے کہ اتنا یاد رکھ سکیں کہ شب و روز کام کرنے والے مزدور کو اس کی اُجرت کا ایک حصہ روز دینا پڑتا ہے تو وہ کیوں یاد دلا کر اپنی غربت کو اور زیادہ برہنہ کر دے؟!

ایک مرتبہ پھر اُسے خدا یاد آگیا۔ اس نے کہا: خداوندا! ـــ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا!

اتنے میں آفس بوائے نے آکر اطلاع دی ـــ چلیئے بلایا ہے!

شاید خدا کو رحم آگیا ـــ خداوند نے طلب کر لیا!

قلم وہیں رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور منشی صاحب کی حرم کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی ابھی جو خیالات منشی صاحب کے بارے میں آرہے تھے وہ کافور ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا۔ ہمارے

منشی صاحب بھی خوب آدمی ہیں — ضد کی ہے اور بات، مگر خو بُری نہیں!

شاید آج کے دو روپے نہ دے سکنے پر شرمندہ ہیں — آدمی سے بھول بھی تو ہو جاتی ہے — بھول گئے ہوں گے بیچارے — اب یاد آیا تو فوراً بلا لیا۔ روپے بھی دیں گے اور شاید — کھانا بھی اپنے ساتھ کھلائیں گے!

ان فکروں اور پریشانیوں نے اضطراب اور خلش نے بھوک غائب کر دی تھی، لیکن اب دفعتہً چمک اٹھی، پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے، دوسروں کو دینے میں منشی صاحب بڑے کنجوس تھے، لیکن اپنے اور اپنے متعلقین پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھاتے تھے اچھے سے اچھا پہنتے تھے، زندگی کی کون سی راحت تھی جو میسر نہ تھی، اور جب سے ریفریجیریٹر آیا تھا، اس راحت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ طرح طرح کے الوانِ نعمت اس میں رکھے رہتے تھے، وہ اور اُن کے بیوی بچے خوب خوب کھاتے تھے۔

اتنے میں وہی ملازمہ جسے اس روز اس نے جھڑک کر چلتا کر دیا تھا اور جو شاید اس سے شادی کرنے کی فکر میں بھی آ گئی، اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر بولی: آخر کب چلو گے، اتنی دیر سے تو بلا رہے ہیں صاحب!

اس وقت اسے جھڑکنے اور ڈانٹنے کے موڈ میں وہ نہیں تھا، اس نے کہا: چلتے ہیں خفا کیوں ہوئی جاتی ہو؟ — ہاں یہ تو کہو تمھارے حلوائی کا کیا حال ہے؟ کبھی کوئی اچھی سی مٹھائی لا کر ہمارا منہ بھی میٹھا کر دو تو کون سا غضب ہو جائے گا!

وہ بولی: جب کہو مٹھائی لا کر کھلا دوں گی! لیکن اس حلوائی بچے سے ہرگز نہیں لانے کی، اس کی تو صورت دیکھ کر نفرت آتی ہے!

اسلم نے چھیڑا: اتنا تو خوب صورت ہے ـــ جیسے گلفام، وہ تو محبت کے قابل ہے اور تم اس سے نفرت کرتی ہو، اتنا اندھیر!

وہ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی بولی: اب چلو گے بھی، خواہ مخواہ بیگم صاحب بد نام کرنے لگیں گی مجھے کہ گئی اور بیٹھ رہی وہاں آڈیٹر صاحب کے پاس، نہ جانے انھیں چھیڑنے میں کیوں اتنا مزا آتا ہے؟

اسلم نے سوچا اب گفتگو خطرناک ہو چلی ہے، اس نے کوٹ پہنا اور منشی صاحب کے حرم سرا کی طرف روانہ ہو گیا!

---

(۴)

خالی پیٹ

وہ خوش خوش اوپر پہنچا۔ بالاخانہ کے صحن میں ایک مسہری پر منشی صاحب رونق افروز تھے، کمرے میں بیگم صاحبہ تشریف رکھتی تھیں اور ریڈیو سے دل بہلا رہی تھیں۔ برآمدے میں بچے کھیل رہے تھے اور شور و غل کر رہے تھے!

منشی صاحب مسہری پر متمکن تھے۔ سامنے ایک چھوٹی سی، خوبصورت سی صندل کی تپائی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ ایک پلیٹ میں بھنا ہوا گوشت، ایک میں ایک درجن کے قریب شامی کباب، ایک میں دو پیازہ، ایک میں قورمہ، ایک میں انڈے کا حلوا، ایک دو میں اور آخری میں فیرنی!

مسہری کے پاس ایک اسٹول رکھا تھا، اسلم اس پر بیٹھ گیا!

منشی صاحب کو اس وقت بولنے کا یارا نہ تھا، ملازمہ ہاتھ میں پنکھا لیے مکھیاں اُڑا رہی تھی، اور وہ پورے انہماک اور استغراق کے ساتھ پلیٹوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھے!

ذرا دیر کے لئے وہ یہ بھول گیا کہ خود بھی بھوکا تھا! اور دل میں یہ امید لے کر آیا تھا کہ منشی صاحب روپے بھی دیں گے اور اپنے ساتھ کھانا بھی کھلائیں گے! پورے انہماک اور محویت کے ساتھ منشی صاحب کی بسیار خوری کا ٹکٹ تماشا دیکھنے لگا!

ماشاء اللہ کیا معدہ تھا، کیا حوصلہ تھا!

قورمے کی پلیٹ صاف ہوئی، پھر دو پیازہ نظروں سے غائب ہو گیا، پھر بھنا ہوا گوشت معدہ میں پہنچ گیا، پھر کبابوں کی باری آئی۔ اور وہ چشم زدن میں ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ پھر انڈے کا حلوا، اس ذوق و شوق سے کھایا کہ بس چلتا تو پلیٹ کو بھی نہ چھوڑتے! پھر فرنی اس طرح انگلیوں کے سہارے منہ میں اور منہ سے پیٹ میں پہنچی کہ جیسے کوئی شیر خوار بچہ شیر مادر ہڑپ کر جاتا ہے!

دیکھتے دیکھتے سب پلیٹیں صاف ہو گئیں، ہاں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی کچھ ہڈیاں ضرور بچ گئیں۔ منشی صاحب نے الحمد للہ کہہ کر ـــ اور ان سے زیادہ خدا کی حمد کا کسے حق تھا ـــ کوئی ایک انچ کے قریب تپائی آگے کھسکا دی، ملازمہ نے سیلابچی آگے رکھ دی اور ہاتھ دھلانے لگی! ہاتھ دھوتے دھوتے کچھ خیال آیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے بیگم صاحب سے سوال کیا:

"سنتی ہو ـــ حلوا اچھا رہے؟"

کمرے کے اندر سے آواز آئی ـــ کیوں نہیں ہے ـــ لیکن نقصان نہ کرے!

ہنسنے لگے: کیا باتیں کرتی ہو، کہیں حلوے سے بھی نقصان ہوتا ہے، یہ تو پیٹ میں جاتے ہی خون صالح بن جاتا ہے! اس میں فضلا تک نہیں ہوتا!

اندر سے ملازمہ کو مخاطب کر کے فرمایا: "بے حیا ـــ!

اس نے سیلابچی اٹھا کر نیچے رکھ دی ۔۔۔ دوڑی دوڑی گئی اور دو پلیٹیں حلوے کی لے آئی ۔

دوسری پلیٹ منشی صاحب صاف کر رہے تھے کہ بیگم صاحبہ نے کمرے سے نکل کر دروازے کے پاس برآمدے میں کھڑے ہو کر فرمایا :

آم بھی تو ہیں ۔۔۔ میں بھول ہی گئی ۔۔۔ لنگڑے !

آم ، اور وہ بھی لنگڑا آم ۔۔۔ منشی صاحب ضبط نہ کر سکے ۔ کھاتے کھاتے ارشاد فرمایا : تو بھیج چکو بھیئی ! زیادہ نہیں ، دو تین بھیج دو !

ملازمہ حلوے کی دونوں خالی پلیٹیں لے کر پھر بیگم صاحبہ کے حضور میں حاضر ہوئی اور چار پانچ بڑے بڑے آم لے آئی ۔

منشی صاحب نے للچائی نظروں سے انھیں دیکھا ، پھر جیب سے چاقو نکالا ۔۔ اور قاشیں کر کر کے کام و دہن کو لذت اندوز کرنے لگے ۔ صرف چھلکے اور گٹھلی دستبرد سے محفوظ رہ سکے !

قدرتِ خداوندی کا یہ کرشمہ دیکھ کر اسلم اپنی پریشانیاں کچھ دیر کے لئے بھول گیا ، اس وقت صرف محظوظ ہو رہا تھا ۔

آموں کی قاب بھی سامنے سے ہٹائی گئی ۔ حقہ لا کر سامنے رکھ دیا گیا ۔ خمیرہ نہایت اعلیٰ درجے کا تھا ۔ سارا صحن مہک رہا تھا ۔

منشی صاحب اطمینان سے لیٹ گئے ، دو چار کش لگائے ، چار چھ ڈکاریں لیں ، پھر توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :

بھئی غضب کی پارٹی تھی ، لطف آ گیا ، چائے ، کیک ، پیسٹری نہ جانے کیا الم غلم ۔۔۔

لیکن چیزیں اچھی تھیں ــ بہت مزے دار!

اسلم نے محسوس کیا: اگر منشی صاحب گارڈن پارٹی میں نہ شریک ہوئے ہوتے ـ یا وہاں انھوں نے کچھ نہ کھایا ہوتا تو شاید گھر بھر میں ہر شخص کو فاقہ کرنا پڑتا ـ

منشی صاحب نے پھر فرمایا: میں چاہتا ہوں پارٹی کی کارروائی اخبار میں دے دی جائے!

اسلم نے عرض کیا: دے دی جائے گی!

منشی صاحب مطمئن ہو گئے، ــ بس اسی لئے بلایا تھا ـ ڈپٹی کمشنر نقوی صاحب کے اعزاز میں یہ پارٹی ٹھاکر کریم رضا خاں نے دی تھی ـ کلکٹر صاحب بھی رونق افروز تھے اور معززین شہر تو بڑی تعداد میں تھے ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ موجود تھے، یہ نقوی صاحب کی ہر دل عزیزی کا بین ثبوت ہے ـ میاں فرزند علی صاحب بھی موجود تھے، بڑے قوم پرست بنے پھرتے ہیں! مگر اس طرح موجود تھے جس طرح دسترخوان کے سامنے کتا کھڑا ہو کر دم ہلانے لگتا ہے ـ ان ذات شریف سے بڑی نفرت ہے مجھے!

ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جس کے بارے میں اسلم کچھ کہتا، وہ خاموشی سے سنتا رہا ـ منشی صاحب نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

نقوی صاحب ہمارا اخبار پڑھتے ہیں، تعریف کر رہے تھے ـ لیکن انھیں ایک شکایت بھی ہے!

اب اسلم کے لئے جنبش لب ضروری ہو گئی ـ نقوی صاحب اخبار پڑھتے ہیں؟ یہ بجائے خود ایک اہم خبر ہے ـ تعریف کر رہے تھے، یہ خبر کا سنسنی خیز حصہ ہے لیکن انھیں کوئی شکایت بھی ہے، اس پر حیرت ہے ـ اگر تعریف کی بھی تو شکایت کیوں؟

شکایت ہے تو تعریف بیکار۔ بہر حال کیا کہہ رہے تھے؟

منشی صاحب نے فرمایا: ہر شخص ان سے بات کرنے کے لئے یا کم از کم یہ دکھانے کے لئے کہ ـــ لئے ہوئے یہ دلِ بیقرار ہم بھی ہیں ـــ سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کسی کو بھی منہ نہیں لگا رہے تھے۔ صاحب بڑے دبدبے کا آدمی ہے۔ بڑے بڑے رئیسوں، ساہوکاروں اور حاکموں کو اس کے سامنے لرزتے دیکھا ہے!

یہ قصیدہ شاید اور زیادہ طویل ہو جاتا، لیکن قطع کلام کرتے ہوئے اسلم نے پوچھا:

تو کیا فرما رہے تھے وہ؟

منشی صاحب نے فرمایا: میں جب ملا تو مسکرا کر زوردار مصافحہ کیا۔ ہاتھ کیا ہے فولادی پنجہ ہے کمبخت! اب تک انگلیاں درد کر رہی ہیں۔ ضرور ورزش کرتا ہے یہ، ورنہ یہ زور کہاں سے آیا؟

اسلم کو تائید کرنا پڑی، جی ہاں ورزشی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصل عمر سے دس سال کم لگتے ہیں۔

منشی صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا ـــ ہاں اور کیا ـــ تو خیر مصافحہ کر کے میرا ہاتھ پکڑے پکڑے ایک الگ گوشے میں ٹہلتے ہوئے چلے گئے۔ پھر کہنے لگے۔ منشی صاحب آپ سے ہمیں ایک دوستانہ شکایت ہے، میں نے عرض کیا شکایت! اور اس ناچیز سے! ـــ اس بندۂ بے دام سے ـــ اس نیازمند خصوصی سے! ہنسنے لگے فرمایا: آپ کو ہم اپنا دوست سمجھتے ہیں اس لئے دوستانہ شکایت کر رہے ہیں ورنہ اخبار سے ضمانت طلب کر لیتے۔ ایڈیٹر کو جیل بھیج دیتے۔ میاں اسلم یہ سن کر میں تو کانپ گیا۔ ضمانت جیل! یہ سرکاری لوگ بھی کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ لب ولہجہ اتنا دوستانہ

اور دھمکی ایسی سخت ! بہر حال میں نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا :

کچھ ارشاد بھی تو ہو۔ کیا خطا ہوئی ہے اخبار سے ؟ ویسے اخبار کا مالک میں ہوں لیکن اڈیٹر دوسرا شخص ہے !

اس انکشافِ حقیقت پر اسلم نے لطف لیا، کتنی سادگی سے انھوں نے بھی تقوی کا رول ادا کر دیا۔ ایک طرف تقوی صاحب کو جتا دیا کہ اڈیٹر میں نہیں ہوں اور دوسری طرف اسلم کو بتا دیا کہ اگر گرفتاری کی نوبت آئی تو تیار رہنا بھئی ۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں ۔ !

اسلم نے اس طولِ کلام سے عاجز آ کر کہا : لیکن اب تک آپ نے نہیں بتایا کہ آخر شکایت کیا ہے ؟ ڈپٹی کمشنر بہادر کو !

منشی صاحب نے یہ تمہید اس لئے باندھی تھی کہ اسلم کو زیادہ سے زیادہ مرعوب کر دیں۔ چنانچہ اپنے خیال میں یہ فریضہ ادا کرنے کے بعد فرمایا :

کہنے لگے حکومت پر آپ کا اخبار بڑے کڑے الفاظ میں نکتہ چینی کرتا ہے ، گورنر اور والسرائے تک پر اعتراض ایسے لب ولہجہ میں کیا جاتا ہے جو ناقابلِ برداشت ہے ۔ اس رویّے میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ آپ سے دوستی ہے اس لئے وارننگ دیتا ہوں اور کوئی ہوتا تو باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی ہوتی !

اسلم نے سوال کیا : تو پھر آپ نے کیا جواب دیا ؟

منشی صاحب نے بغیر کسی تامّل اور جھجک کے فرمایا : وہی جو دینا چاہیئے تھا ناک رگڑی ، ہاتھ جوڑ لئے ، حلفِ وفاداری اٹھا لیا ـــــ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا !

اسلم نے کہا : جو ہو سکتا تھا وہی آپ نے نہیں کیا !

منشی صاحب نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا: کیا ہوسکتا تھا جو میں نے نہیں کیا؟

اسلم نے بتایا آپ کو چاہیئے تھا کہ کہہ دیتے میں اخبار بند کئے دیتا ہوں، اس طرح آپ کو کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوگی!

بہ خلافِ توقع جواب سن کر منشی صاحب بھڑک اٹھے:

اخبار بند کر دیتا! کیا اخبار بند کرنے کے لئے نکالا تھا میں نے؟ ـــ اور بند کر دوں تو کھاؤں گا کیا؟ میرے بال بچّے کیا کریں گے؟ تمھاری تو وہ مثل ہے کہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا! جیل بھی جا سکتے ہو، فاقے بھی کر سکتے ہو؟ لیکن میں تو یہ نہیں کر سکتا۔ اور الحمدللہ میرا دماغ بھی خراب نہیں ہے کہ ایسی حماقت کر گزروں!

پھر تو اخبار سرکاری گزٹ ہو کر رہ جائے گا!

رہ جائے ـــ نقوی صاحب کے ایک اشارے میں سارے اشتہارات بند ہو سکتے ہیں۔ ایک اشارے میں تم جیل جا سکتے ہو۔ ایک اشارے میں میرا یہ سارا کارخانہ جسے میں نے خون پانی ایک کر کے بنایا ہے ہست سے نیست ہو سکتا ہے! اُن سے دشمنی مول لے لوں! انھیں مخالف کر لوں؟ نا بھائی یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنا میں نے نہیں سیکھا ہے!

لیکن اب تو مگرمچھ دریا چھوڑ کر بھاگ رہا ہے!

جب بھاگے گا تو ہم بھی پیچھے سے ایک دھول لگا دیں گے۔ لیکن جب تک بھاگ نہیں جاتا ہماری گردن نہیں اٹھ سکتی اس کے سامنے!

یہ بھی تو سوچیے اخبار کا اور کام ہی کیا ہوتا ہے، اگر وہ حکومت پر نکتہ چینی نہ کرے تو کرے کیا؟ دُنیا کے تمام ترقّی یافتہ ممالک میں اخبار ملک کی سب سے بڑی قوت مانا جاتا

ہے۔ وزارتوں کے توڑنے میں، وزارتوں کے قیام میں حکومت کی پالیسی میں اخبار کا سب سے بڑا حصّہ ہوتا ہے، اس کی نکتہ چینی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، اس کے اعتراض پر توجہ کی جاتی ہے، اس کی تجویزوں پر غور کیا جاتا ہے۔ اگر اخبار یہ کام نہیں کر سکتا تو اسے زندہ رہنے کا حق کیا ہے؟

تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے ـــ لیکن دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر، نہ ہمارا ملک ترقی یافتہ ہے نہ ہم ترقی یافتہ ہیں، جو اخبارات حکومت کے دوست ہیں انھوں نے عمارتیں کھڑی کر لی ہیں جو اس سے ٹکر لیتے ہیں وہ بار بار بند ہوئے، ان کے ایڈیٹر صاحبان جیل میں سڑ گئے، بیمار پڑیں تو علاج کا بندوبست نہیں، مر جائیں تو کفن دفن خیرات سے ہو ـــ اچھے دوست ہو، خوب ترکیب بتائی!

میری ایک رائے تھی میں نے عرض کر دی۔ ویسے اخبار آپ کا، آپ اس کے مالک، میرا کیا ہے، آپ کے ساتھ چل سکوں گا تو رہوں گا، نہیں چل سکوں گا تو الگ ہو جاؤں گا! آپ کو ایڈیٹر بہت سے مل جائیں گے، میں آزادیٔ ضمیر کا بوجھ کندھے پر لاد کر ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ لیکن شاید میرا دل آپ سے زیادہ مطمئن ہو گا!

کھانے کا نشہ اب اثر کرنے لگا تھا، بات ختم کر کے اسلم نے منشی صاحب کی طرف دیکھا تو وہ سو چکے تھے۔ بغیر خواب ملیندی! اسے منشی صاحب پر رشک آنے لگا، دولت بھی کیا چیز ہے کتنا غنی اور بے فکر کر دیتی ہے آدمی کو! کتنی آسانی سے نیند آ گئی۔ اور وہ بھی اتنی گہری کہ خرّاٹے لینے لگے!

اتنے میں بیگم صاحبہ نے برآمدے کے ستون سے لگ کر ارشاد فرمایا:

جاتے وقت کہہ گئے تھے ستار کے ہاں سے چمپا کلی لیتا آؤں گا۔ لائے؟

لیکن جواب کون دیتا؟ خرّاٹوں کی آواز انھوں نے بھی سُن لی حیران ہو کر پوچھا:

کیا سو گئے ابھی سے؟ واہ بھئی اچھی نیند ہے، ابھی باتیں کر رہے تھے اور ابھی خرّاٹے لینے لگے!

اسلم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا: شاید تھک زیادہ گئے ہیں اسی لئے اس قدر جلد نیند آگئی!

وہ ہنسنے لگیں۔ اور اسلم چپ چاپ بالاخانے سے نیچے اتر آیا اور دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے لگا!

بڑی کوفت محسوس کر رہا تھا وہ اس وقت، اپنے دو روپے بھی نہ لے سکا! کھانا بھی نہ کھا سکا — اور اب تو ہوٹل بھی بند ہو گیا تھا! — اُدھار کھانے کا چانس بھی نکل گیا!

چونکہ ہوٹل بند ہو چکا تھا اور جیب خالی تھی اس لئے بھوک اور زیادہ چمک اٹھی تھی!

اتنی مایوسی کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج — غضب خدا کا منشی صاحب تین آدمیوں کا کھانا نظروں کے سامنے کھا گئے اور وہ ایک لقمہ بھی نہ کھا سکا!

دفتر میں آکر بیٹھا اور پھر کام میں لگ گیا۔ لیکن قلم سلپ پر چل رہا تھا اور دماغ کہیں اور تھا، اب تک ان اچھے اچھے کھانوں کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ جو منشی صاحب کے دسترخوان پر اس نے دیکھے تھے!

تھوڑا سا کام کرنے کے بعد وہ نیچے اتر آیا تاکہ خوب اچھی طرح ٹہل کر تھک جائے

کیونکہ بغیر تھکے ہوئے نیند نہیں آسکتی تھی، بھوک جو لگی تھی۔

چلتے چلتے ایک خوانچہ والا نظر آیا، یہ مونگ پھلیاں بیچ رہا تھا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ جیب تک اٹھ گیا، حالانکہ معلوم تھا وہاں کچھ نہیں ہے، لیکن ایک کونے میں انگلی کسی چیز سے ٹکرائی، نکال کر دیکھا تو اکنی تھی، طبیعت خوش ہوگئی۔ ایک آنہ کی مونگ پھلی خریدی، کھاتا ہوا دفتر تک آیا۔ پھر ایک بڑا گلاس پانی کا پیا اور پھر کام میں لگ گیا!

(۵)

...ہر طرف

جیسے تیسے اخبار کا کام ختم کر کے بستر پر جا کر لیٹا اور بہت جلد سو گیا!

صبح اٹھا تو باہر والے پر نظر پڑی۔ ہوٹل قریب ہی تھا۔ کمیشن کے لالچ میں باہر والا دن بھر میں کئی پھیرے دفتر کے کر ڈالتا تھا۔ اور لوگوں کو چائے، کھانا، سگریٹ ماچس پہنچاتا رہتا تھا۔ پھر سب سے دام وصول کر لیتا تھا۔ باہر والا خود آگے بڑھا اور پوچھا:

ناشتہ کریے گا صاب؟

رات کے فاقے نے گو بھوک کا احساس کم کر دیا تھا لیکن کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے منہ سے جواب دینے کے بجائے اقرار میں گردن ہلا دی، وہ ناشتہ لینے چلا گیا۔ اور یہ غسل کرنے لگا۔ غسل سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا کہ باہر والا بھی ناشتہ لے کر آگیا۔ چونکہ اسے تفصیل نہیں بتائی گئی تھی لہٰذا اس نے خود ہی "مینو" تیار کر لیا۔ دو انڈے، ڈبل

کا آملیٹ، ایک پیکٹ مکھن، چار سلائس، دو پیالی کی کیتلی!

اسلم اتنے شان دار ناشتے کا کہاں عادی تھا۔ وہ تو صرف ایک پیالی اور دو سادے سلائس پر گزارا کیا کرتا تھا۔ کون حساب رکھے اور کون حساب چکائے! خود ہی ہوٹل چلا جاتا تھا اور زہر مار کر آتا تھا۔ جیب بھی خالی تھی اور آج باہر والا بھی ٹھیک وقت پر آگیا۔ تو اس سے منگا لیا لیکن اس نے ساری کسر پوری کر دی۔ اسلم نے کہا یہ کتنے آدمیوں کا ناشتہ لائے ہو؟

مسکراتا ہوا بولا: آپ کے لئے لایا ہے صاب! کھائیے تم تو ایڈیٹر ہے۔ اس سے زیادہ تو دفتر کا دوسرا لوگ کھا جاتا ہے!

رات کے فاقے سے بھی تھا، اور بحث کرنے کے موڈ میں بھی نہیں تھا، چپ چاپ بیٹھ گیا اور ہر چیز صاف کر دی!

باہر والے نے برتن اٹھائے اور کہنے لگا: ایک روپیہ پانچ آنے صاب!

ایک روپیہ پانچ آنے سن کر اسلم کی روح نکل گئی۔ لنچ تو لنچ اب ڈنر کی بھی خیر نہ تھی۔ دو روپے میں گیارہ آنے ہی تو بچیں گے۔

لیکن پھر یاد آگیا ـــ آج چار روپے ملیں گے، دو کل کے بھی تو باقی ہیں!

اس نے اطمینان سے کہا ـــ اچھا جاؤ، شام کو لینا!

اُسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا برتن اٹھائے اور چلا گیا!

ناشتے سے فارغ ہو کر پھر ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ گیا، پہلے آج کے سارے اخبارات دیکھے، پھر کل کے آئے ہوئے باہر کے اخبارات دیکھے اور سرخ پنسل سے ضروری خبروں پر نشان لگائے۔ پھر انگریزی اخبارات پر ایک نظر ڈالی اور ترجمہ کے لئے بعض مضامین پر

نشان کردیا۔

ان کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے گیارہ بج گئے۔

منشی صاحب ابھی ابھی تشریف لائے تھے۔ اور اپنے خاص کمرے میں رونق افروز تھے! اسلم نے سوچا، پہلے انہی سے نپٹ لیا جائے پھر یکسوئی اور اطمینان سے کام کیا جائے چنانچہ وہ منشی صاحب کے دربار میں حاضر ہوا، وہ ایک آرام کرسی پر دراز تھے اور آہستہ آہستہ حقے کے کش لگا رہے تھے۔ چہرہ کچھ اترا ہوا تھا۔ اسلم نے شکایت آمیز لہجے میں کہا :

کل تو آپ نے دو روپے بھی نہیں دیے۔؟

منشی صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں، جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپے نکالے اور زور سے میز پر اس کے سامنے پٹکتے ہوئے بولے، کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ اب دے دیتا!

اسلم کا جی چاہا کہ کہے، ہاں آپ تو کہیں بھاگے نہیں جا رہے تھے اب دیدیے لیکن مجھے فاقہ کرنا پڑا رات بھر، لیکن بات زبان تک نہ آسکی، دل ہی میں رہ گئی اس نے سوچا بار بار بھیک مانگنے سے کیا فائدہ؟ کہنے لگا :

آج کے دو روپے بھی دے دیجیے!

یہ نیا مطالبہ سن کر وہ اور زیادہ جھلا گئے، تم تو سود خوار پٹھان معلوم ہوتے ہو، خیریت ہوئی کہ ڈنڈا ساتھ نہیں لائے تھے، ورنہ شاید سر پھوڑ دیتے میرا!

پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپے نکالے اور پہلے سے زیادہ زور اور قوت کے ساتھ پٹکتے ہوئے بولے :

یہ لو ـــــ اور کچھ باقی ہو تو وہ بھی پیش کر دوں!؟

اسلم نے اس طنز کی پروا کیے بغیر کہا: آج حساب صاف کرنا ہے آپ کو، چاہے ابھی کر دیجئے چاہے کچھ دیر بعد!

حساب صاف کرنے کا نام سن کر وہ اس طرح بھڑک اٹھے جیسے بارود کو کسی نے چنگاری دکھا دی۔ پیکرِ قہر و جلال بن کر فرمایا:

کوئی مرے کہ جیئے، تمھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام!

ـــــــ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا: کل کا پختہ وعدہ آج اتنا بودا ثابت ہو رہا ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ منشی صاحب نے فرمایا:

صبح سے یہ دو بڑے دست آ چکے ہیں، اس حالت میں حساب کیسے کر سکتا ہوں۔ کل دیکھا جائے گا، اگر طبیعت ٹھیک رہی!

یہ سن کر اسلم کا جی جل گیا، اس نے سوچا، دست اگر آئے ہیں تو بسیار خوری کے باعث اور ان کی وجہ سے دوسرے کام تو نہیں رک گئے ہیں، پھر میرا کام کیوں رکے؟ اس نے کہا: لیکن حساب میں کتنی دیر لگے گی۔ کلرک کو بلایئے رجسٹر میں سب کچھ درج ہے۔ جو لے چکا ہوں وہ لفٹ ہے، باقی رقم جو نکلے وہ ادا کر دیجئے۔ اللہ اللہ خیر سلّا!

منشی صاحب نے اسی کے الفاظ دہرائے: اللہ اللہ خیر سلّا! کیا آسان بات فرما دی آپ نے ـــــ اگر آج کے بجائے کل حساب ہو جائے گا تو کون سا نقصان ہو جائے گا تمھارا؟ تم تو اس طرح تقاضے کرتے ہو جیسے ذرا بھی اعتماد نہیں ہے مجھ پر!

اس نے کہا اعتماد اور عدم اعتماد کا سوال نہیں، ضرورت کا سوال ہے۔ آپ کو اپنی حالت بتا چکا ہوں، آپ ہر روز آج کل، آج کل کرتے جاتے ہیں، اگر آج ہی حساب

کر دیا جائے، تو آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو جائے گا، البتہ میرا کام ضرور بن جائے گا!

لیکن منشی صاحب فیصلہ بدلنے کے عادی نہیں تھے، انھوں نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا:

پریشان نہ کرو بھائی، میری طبیعت ویسے ہی گر رہی ہے، کہہ تو دیا کل کروں گا حساب!

ایک مرتبہ پھر اسلم نے دل کو سمجھایا، اچھا کل ہی سہی، ایک دن کا تو معاملہ ہے جہاں اتنا عرصہ گزرا ہے امید فردا میں، ۲۴ گھنٹے اور سہی!

منشی صاحب کے پاس سے رخصت ہو کر وہ پھر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا! ذرا دیر میں آفس بوائے نے اطلاع دی کہ فوراً بلایا ہے، کام ویسا ہی ادھورا چھوڑ کر وہ پھر خدمت عالی میں پہنچا۔ فرمایا:

رات کی ساری نصیحتیں رائیگاں گئیں، آپ نے پھر من مانی کی، یہ کیا لکھ مارا ہے آپ نے؟ کیا جواب دوں گا میں نقوی صاحب کو؟ آپ تو جیسے کوئی بہت پرانی دشمنی نکال رہے ہیں مجھ سے!

یہ کہہ کر اخبار اس کے سامنے رکھ دیا، اس کا لکھا ہوا ایک نوٹ جس میں متین اور شائستہ لب و لہجے میں حکومت کی بعض کوتاہیوں پر روشنی ڈالی تھی قابل اعتراض قرار دیا گیا۔ اس نے کہا:

اوّل تو اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ سے جو گفتگو ہوئی تھی یہ اس سے پہلے لکھا جا چکا تھا!

منشی صاحب نے فرمایا: نہیں اسلم صاحب آپ اپنی عادتوں سے باز نہیں آ سکتے، ہمارا آپ کا نباہ نہیں ہو سکتا! یہ بچے ایسے نہیں ہیں کہ مجھ جیسا عافیت پسند آپ کی خدمات سے استفادہ کر کے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو خطرہ میں ڈالے آپ تو بل چلوا دیں گے میرے گھر اور دفتر پر!

یہ کہہ کر منشی صاحب اٹھے اور برہمی کے عالم میں حرم سرا میں پہنچ گئے۔ اسلم سر جھکائے آیا اور کام کرنے لگا۔

دوسرے دن صبح جب وہ پھر دفتر میں گیا تو کلرک نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا:

آپ برطرف کر دیئے گئے ہیں اور اس کی اطلاع نقوی صاحب کو دے دی گئی ہے۔

اسلم کی تلے کی سانس تلے اور اوپر کی اوپر، اس نے کہا: بہت خوب، لیکن میرا حساب؟

کلرک نے جواب دیا: اس کے بارے میں ان سے گفتگو کیجیے گا۔ آج صبح سلطانپور ایک تقریب میں گئے ہیں، غالباً کل شام تک واپس آجائیں گے!

(۶)

خودی نہ بیچ

سارا دن بے لطفی اور پریشان حالی میں گزرا۔ دفتر میں بیٹھتے شرم آتی تھی۔ جہاں ایڈیٹر کی حیثیت سے کرسی پر بیٹھا کرتا تھا آج وہاں اس کی وہ حیثیت ہے جو ایک اجنبی کی ہوتی ہے۔ دفتر کے جو لوگ ہر وقت اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے اب آنکھ چرا رہے تھے، جنھیں وہ کام چوری پر جھڑکتا رہتا تھا اب انہی میں سے ایک صاحب اس کی کرسی پر ڈٹے ہوئے تھے۔

دفتر میں جی نہ لگا تو شہر چلا گیا، ادھر اُدھر وقت گزاری کرتا رہا، اتفاق کی بات کسی دوست اور شناسا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پارک میں کچھ دیر ٹہلا، بڑی دیر تک سڑکیں ناپیں، بازاروں کا گشت رہا، آخر رات گئے اپنے کمرے میں پہنچا اور پڑ رہا!

منشی صاحب تشریف نہیں لائے تھے۔

وہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا۔ اگر کل بھی نہ آئے تو کیا ہوگا؟

پہلا سوال روزانہ کے مصارف کا تھا، جیب پھر خالی ہو چکی تھی، دوسرا مسئلہ حساب کی بیباقی کا تھا، اگر حسب عادت پھر ٹال مٹول سے کام لیا تو الجھن پھر راہ تکتی رہ جائے گی۔ اپنے نامراد بھائی کی! تیسرا سب سے اہم اور قابلِ غور مسئلہ تلاشِ معاش کا تھا "قوم" سے الگ ہوتے کے بعد اب کیا کیا جائے؟ کہاں نوکری ڈھونڈی جائے یا کس کے دروازے پر دستک دی جائے؟

کافی دیر گزر گئی اور نیند نہیں آئی!

آتی بھی کیونکر؟ — ایک مدت گزر گئی تھی رات کو دیر تک جاگتے اور کام کرتے رہنے کی، اخبار کی آخری کاپی پریس میں بھجوا کر سونے کا ارادہ کرتا تھا! اکثر ایسا ہوتا کہ سوتے سوتے صبح ہو جاتی!

لیکن آج کی رات کس طرح کاٹی جائے، کوئی کام تو ہے نہیں!

کیوں نہیں ہے؟ یہ سوچ کر وہ اٹھ بیٹھا اور قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا! اور لکھنے لگا — کیا لکھنے لگا، یہ خود اسے بھی نہیں معلوم تھا! لیکن قلم تھا کہ روانی سے چلی رہا تھا! اس تیزی سے جیسے فضا میں طیارہ تیرتا ہے!

صبح ہو گئی اور وہ لکھتا رہا۔ سامنے لکھی ہوئی سلپوں کا ڈھیر پڑا تھا، وہ خود بخود مسکرانے لگا، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ میں نے کیا لکھ ڈالا؟

لیکن اب بھوک لگ رہی تھی، جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ اور کچھ آنے نکل آئے، جی خوش ہو گیا۔ آج بھی اگر منشی صاحب تشریف نہ لائیں تو کوئی پرواہ نہیں، کام چل جائے گا!

حسب معمول باہر والا چائے کی پیالیاں کھڑکاتا ادھر سے گزرا، اور دروازے کے

پاس آکر کھڑا ہوگیا!

ناشتہ کرینگا صاب؟

اسلم نے جواب دیا: ہاں لے آؤ! جب وہ چلا تو اسلم نے پکارا، ارے جا
بھائی سنو تو!

وہ پھر آکر کھڑا ہوگیا دروازے کے پاس، اسلم نے کہا:

صرف ایک پیالی چائے، ایک پاؤ بند ــــ بس! سمجھ گئے نا! کہیں اس دن کی
طرح دلیا الٹا نہ نکال دینا!

باہر والا مسکراتا ہوا چلا گیا! اتنی دیر میں نہا دھو کر وہ فارغ ہوگیا۔
اطمینان سے چائے پی، بند کھایا اور پھر لکھنے بیٹھ گیا، لکھی ہوئی سلپوں کے ڈھیر پر
نظر کئے بغیر لکھتا چلا گیا۔ لکھتا رہا، سر جھکائے اس محویت میں لکھ رہا تھا کہ صاف معلوم ہو رہا
تھا ــــ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!

پھر بہت سی سلپیں ڈھیر ہوگئیں، گھڑی پر نظر ڈالی تو پانچ بج رہے تھے!
ایں! سارا دن ختم ہوگیا ــــ میں سارا دن لکھتا رہا؟

دل سے یہ باتیں کرنے کے بعد اس نے بہ آواز اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ واہ جناب
اسلم صاحب آپ تو چھپے رستم نکلے۔ اتنے بڑے آرٹسٹ ہیں یہ تو خاکسار کو گمان بھی نہ تھا
شاباش ــــ شاباش! ماشاء اللہ، سبحان اللہ! حد النظر بد سے بچائے میرے شیر کو! ــــ
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

اور پھر وہ ہنسنے لگا۔ اس نے سوچا، یہ لکھنے کی مصروفیت کتنی غریب نواز ہے، اس
نے آٹھ آنے بچا دیے میرے ــــ دوپہر کا کھانا غائب، نہ بھوک تھی نہ کھایا نہ احساس ہوا!

اچھا منشی چلو کھانا کھلا لائیں تمہیں! بہت بھوکے ہو گے؟

پھر ہنستا ہوا جیسے اُسے کوئی غم نہیں، کوئی پریشانی نہیں، کوئی فکر نہیں باہر نکلا، ہوٹل پہنچا، چار آنے صبح کے باہر والے کو دیے، چار آنے بچ رہے!

کھا پی کر پھر واپس آیا، کلرک سے پوچھا:

منشی صاحب تشریف لے آئے؟

اس نے بے نیازی سے جواب دیا: کوئی سنائی ہیں کہ آتے اور دکھائی نہ دیتے۔ نہیں آئے — ملازم تو ہیں نہیں۔ آجائیں گے جب جی چاہے گا!

شاید کلرک کی یہ باتیں اسلم کو ناگوار گزرتیں اور وہ بھی کوئی ٹیڑھا میڑھا جواب دے دیتا، لیکن دل میں کوئی اور ہی سودا سمایا ہوا تھا — لکھنے کی دھن!

کلرک کی باتوں کا تلخ جواب دینے کے بجائے ہنستا مسکراتا وہ پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ ایک بجے رات تک پھر بہت سی کاپیوں کا انبار لگا دیا! لیکن اب آنکھیں بوجھل ہونے لگیں، کل رات سے مسلسل کام کر رہا تھا، قلم بے قابو ہو گیا، آدھی لکھی ہوئی سلپ پر قلم رکھا اور دھم سے بستر پر آگرا — فوراً سو گیا! جیسے نیند اسے آغوشِ شوق میں لینے کے لئے بیقرار تھی۔

خوب سویا — صبح نو بجے آنکھ کھلی!

آٹھ گھنٹے مسلسل سو رہنے سے ساری کمی پوری ہو گئی، چاق چوبند اور تازہ دم ہو کر اٹھا۔ باہر والا شاید بایوس ہو کر واپس جا چکا تھا۔ نہا دھو کر ہوٹل پہنچا، چائے پی، بند پاؤ کھایا اور واپس آکر پھر لکھنے بیٹھ گیا۔

آج کا کھانا پھر غائب، چھ بجے شام تک لکھتا رہا!

گھڑی نے جب چھ بجائے تو اٹھا، کچھ دیر اِدھر اُدھر گھوما، پھر ہوٹل پہنچا لیکن دروازے پر ٹھٹک کر رہ گیا، آخری چار آنے۔ صبح کے ناشتے سے بچ گئے تھے، دوپہر کو روزہ رکھ لیا، لیکن کیا رات کو بھی! لیکن نہیں، ہوٹل والا شریف اور مردم شناس ہے اُدھار کرے گا۔ آج ذرا فضول خرچی کی، کیونکہ نقد دینا نہیں تھا! لہٰذا ایک روپیہ چار آنے کا بل مع سگریٹ، ماچس ہوا لیکن لکھتے پر بل تک نہ آیا۔ باہر والے کی آواز سن کر ہوٹل والے نے گاہک کی طرف دیکھا تو اس نے زیر لب تبسم کے ساتھ مطمئن کر دیا۔ دے دیں گے، کہیں بھاگے جاتے ہیں! آج نہیں کل۔ ہوٹل والا بھی مسکرانے لگا۔ اور شاید اس وقت بہت خوش تھا، اس نے خود ایک تجویز پیش کر دی۔

ہفتے کے ہفتے حساب کر لیا کرو!

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، اس پیش کش نے باغ باغ کر دیا، بہایت آمادگی اور مستعدی کے ساتھ فرمایا:

ہاں بھئی یہ ٹھیک ہے، بس اب اگلے منگل کو حساب ہوگا!

اور واقعی یہ ایک قسم کی تائید غیبی تھی۔ منشی صاحب مزید ایک ہفتہ تک تشریف نہیں لائے، وہ بہایت اطمینان سے ہوٹل میں کھانا کھاتا اور ناشتہ کرتا! اور کاغذ کے صفحے سیاہ کرتا رہا۔ یہ تو اطمینان تھا کہ منشی صاحب روپوش نہیں ہو سکتے، آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ اور آتے ہی حساب بھی صاف کر دیں گے، کیونکہ جب برخاست کر چکے تو حساب کیوں روکیں گے؟!

منشی صاحب کے آنے تک نہ اس نے انجمن کو روپے بھیجنے کا خیال کیا نہ قرضداروں کی فکر کی، یکسوئی کے ساتھ قلم فرسائی کرتا رہا!

آخر منشی صاحب تشریف لائے اور بڑے موقع سے تشریف لائے۔ نہ آتے تو دن گزارنا مشکل ہو جاتا کیونکہ لکھتے لکھتے طبیعت اکتا چکی تھی۔ آخر یہ بے ثمر اور بے نتیجہ نوشتۂ تقدیر کام کا وقت گزارنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ روپے ملیں گے تو چند روز بشارت گنج میں رہیں گے۔ پھر سوچا کہ کیا کرنا ہے۔ اور یہاں آج ہوٹل والے کا بھی تو ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ بتایا تھا اس نے بائیس روپے تیرہ آنے!

تو یہ ہے ایک دن میں سات آنے خرچ کرنے والا شخص بائیس روپے تیرہ آنے کا مقروض ہو گیا۔ پیٹ — جہنم!

پھر سوچا اور کلرک کے پاس پہنچا۔ سنا ہے صاحب تشریف لے آئے!

کلرک نے خلافِ معمول مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں بیٹھے ہیں اپنے کمرے میں، جائیے مل لیجئے۔

وہ منشی صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ وہ تو شیر بنے بیٹھے تھے جیسے ہڑپ ہی تو کر جائیں گے۔ کچھ سہم سا گیا یہ منظر دیکھ کر۔ لیکن ضرورت بُری بلا ہوتی ہے سلام کر کے واپس بھی نہ آسکا۔ منشی صاحب نے ایک نظر اس پر ڈالی اور روکھے پن کے انداز میں پوچھا کیا ہے؟

وہ سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا:

آپ کے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ میں برخاست کر دیا گیا ہوں۔

شیر کی طرح غراتے ہوئے بولے: تو کیا میں شہر بدر ہو جاؤں آپ کو الگ نہ کر کے؟

ڈپٹی کمشنر صاحب سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ آپ نے بڑا نقصان پہنچایا —!

اسلم کو غصہ آ گیا، جس محنت جس وفاداری جس اپنائیت سے اس نے کام کیا تھا

اچھا کرچکا یا تھا اس کا صلہ یہ تو نہ ہونا چاہیئے تھا! لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر منشی صاحب کا خون کھول رہا تھا، کیونکہ محسوس کر رہے تھے یہ نالائق شخص عنقریب اُن کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنے والا ہے یعنی رقم کا تقاضا کرنے والا ہے وہ اس اصول سے واقف تھے کہ جو تم پر حملہ کرنے والا ہو تم اس پر پہلے وار کر گزرو، انھوں نے وار کر دیا، فرمایا:

آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہرجانے کا دعویٰ کر دیتا ۔۔ معلوم ہے کتنا نقصان پہنچایا ہے آپ نے؟

اسلم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ڈپٹی کمشنر صاحب ناراض ہیں کیا کچھ اور بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے! کیا اس سے بڑا بھی نقصان ہو سکتا ہے؟ مجھے آپ سے ہمدردی ہے؟

اس حملے کی تاب منشی صاحب نہ لا سکے، پہلو بدل کر برہم لہجے میں فرمایا:

شکریہ! اس ہمدردی کا!

اسلم نے کہا: مجھے بھی شکریہ کا موقع دیجئے، اور میرا حساب صاف کر دیجئے آپ کے انتظار میں اتنے دن گزر گئے جس روز آپ گئے ہیں میری جیب میں صرف ایک روپیہ تھا، سوچئے تو سہی یہ دن کس طرح کٹے ہوں گے؟

منشی صاحب نے فرمایا فاقہ کیا ہوگا آپ نے؟ اس فن کے تو آپ ماہر ہیں بڑے بڑے صائم الدہر لوگ دیکھ ڈالے لیکن آپ جیسا فاقے کا رسیا نہ دیکھا!

اس بے دردانہ طنز پر اسلم کا درجۂ حرارت نقطۂ عروج پر پہنچ گیا، اس نے کہا: آپ کو میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، میں نے فاقہ کیا یا پلاؤ زردہ اُڑایا

رہا یہ میرا اچھی خل ہے، میں جانوں اور میرا کام، آپ کو اس سے کیا، آپ کو ایک شریف آدمی کی طرح میری رقم بیباق کر دینی چاہئے!

منشی صاحب کے پندار کو ان الفاظ نے جھنجوڑ کر رکھ دیا، ٹانگیں پھیلا کر کرسی کی پشتی سے ٹیک لگا کر حقّے کو سامنے سرکاتے ہوئے زہرخند کرتے ہوئے بولے:

اخاہ! آپ کی بھی توہین ہوتی ہے؟ — یہ تو واقعی بڑی سنسنی خیز خبر ہے مجھے تو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ حضور والا کی توہین ہو سکتی ہے؟

پھر کڑک کر ارشاد فرمایا: کیوں جناب اگر ایک شریف آدمی کے بجائے ایک کمینے آدمی کی طرح میں آپ کا حساب بیباق نہ کروں تو کیا کریں گے آپ میرا؟ کیا جاتو جیب میں ہے؟ سینہ تانوں! جاؤ بھاگ جاؤ، اخبار کو غارت کر کے رکھ دیا اور اب چلے ہیں حساب بیباق کرانے؟

اس تقریر کا ہر ہر لفظ اسلم کے لئے بم کا گولا ثابت ہوا۔

اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، وہ سوچنے لگا اگر واقعی منشی صاحب میری رقم ضبط کر لیں تو میں کیا کر لوں گا! عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے نہ وسائل نہ طاقت چاقوزنی کی نہ جرأت نہ ہمت!

اور پھر ذرا دیر کے لئے انجمن اور قرضداروں کو یکسر فراموش کر کے سوچنے لگا: اگر آج ہوٹل والے کے بائیس روپے تیرہ آنے ادا نہ ہوئے تو کیا ہوگا؟ یہ لوگ غنڈے تو ہوتے ہی ہیں، اگر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ منشی صاحب کی آواز پھر فضا میں گونجی:

کھڑے کیا کر رہے ہو جاؤ چلے جاؤ!

اسلم نے طیش، غضب اور برہمی کا سارا طوفان دل کے اندر روک لیا۔ بڑے نرم اور ملائم لہجے میں عرض پیرا ہوا:

میں استدعا کرتا ہوں مجھے نہ ستائیے، میں دکھی ہوں، مجبور ہوں، بے بس ہوں میرا مذاق نہ اڑائیے، نہ میں جاقو چلا سکتا ہوں نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہوں، میں تو آپ ہی سے انسانیت کے نام پر، شرافت کے نام پر — اللہ کے نام پر اپیل کرتا ہوں مجھ پر رحم کیجئے، آپ نے نوٹس دئے بغیر مجھے برخاست کر دیا۔ اچھا کیا! مجھے کوئی شکوہ نہیں کوئی شکایت نہیں، اتنے دنوں سے بیکار بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہوں، اس کا خیال کیجئے۔ اگر آج آپ نے میرا حساب صاف نہ کیا تو —

منشی صاحب نے قہر بھری نظروں سے اُسے گھورا اور پوچھا:

اگر آج میں نے تمھارا حساب صاف نہ کیا تو؟ — تو کیا ہوگا! کیا کر لوگے؟

وہ بےبسی کے ساتھ گویا ہوا: کچھ نہیں — میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟ وہ بھی آپ کا — ہاں مجھے ذلیل ہونا پڑے گا، ممکن ہے سر بازار میرے جوتیاں لگ جائیں۔ آپ میرا حساب صاف کرنے سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن میں ہوٹل والے کی رقم ادا کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ اس لئے انکار کر سکتے ہیں کہ میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور میں اس لئے انکار نہیں کر سکتا کہ ہوٹل والا میرا گریبان پکڑ سکتا ہے — کیا اب بھی آپ کو رحم نہیں آیا؟

سچی بات یہ ہے کہ منشی صاحب کو رحم آگیا، لیکن اسلم پر نہیں اپنی پونجی پر۔ وہ اسلم کو پوری بے رحمی کے ساتھ نکال سکتے تھے، لیکن اس روپے کو جو ان کی جیب میں تھا، تجوری میں تھا، بیگم صاحبہ کے صندوق میں تھا، کلرک کی تحویل میں تھا، کئی بینکوں میں تھا،

کس دل سے نکالتے؟ کیا وہ کہہ نہ اٹھتا ـــــ یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے!

منشی صاحب نے پہلے درا نرم لہجے میں فرمایا: بھئی سچ پوچھو تو تمھاری ایک پائی بھی ہمارے ذمے نہیں نکلتی!

یہ انکشاف سن کر اسلم کا خون خشک ہوگیا۔ اس نے پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا:

میری ایک پائی بھی آپ کے ذمے نہیں نکلتی؟

منشی صاحب نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا: ہاں نہیں نکلتی!

کیا میں اتنے دن کام نہیں کرتا رہا؟

جی ہاں، کیا کہنا ہے آپ کے کام کا، جھنڈے گاڑ دئے آپ نے تو! ـــ اس سے بڑا کارنامہ آپ کا کیا ہوگا کہ ڈپٹی کمشنر کو ناراض کر دیا۔ اگر وہ عدالتی سمنوں کے اشتہار دینا بند کردیں، یا سرکاری محکموں میں خریداری بند کردیں یا پرسنلیٹی کو اشارہ کردیں اور اشتہارات بند کرادیں تو خودکشی کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہوگا میرے لئے ـــــ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

اسلم بیچہ اضطراب بنا یہ باتیں سُن رہا تھا اور منشی صاحب گرج گرج کر کہہ رہے تھے آپ کا تو کچھ نہیں بگڑتا، قلم جب آپ کے ہاتھ میں آتا ہے تو آپ سمجھتے ہیں ساری دُنیا میرے ماتحت ہے، جس کے بارے میں جو چاہا ہو لکھ دو، چڑھتا تیے لوگ واہ واہ کر کے آپ کو بانس پر بھی چڑھا دیتے ہیں لیکن مصیبت تو ہمیں بھگتنی پڑتی ہے۔ آپ بڑی آسانی سے کہیں اور ملازم ہو سکتے ہیں یہاں کی تنخواہ سے دس کم پر یا اس سے زیادہ پر لیکن میں کہاں

جاؤں گا نوکری کرنے؟ مجھے کون ملازم رکھ لے گا۔ آپ کا کچھ نہ بگڑتا، مجھے آپ نے کہیں کا نہ رکھا۔ (ہاتھ جوڑ کر) بھر پایا بھئی آپ سے!

ان میں سے ہر بات کا جواب آئم کے پاس موجود تھا، لیکن کچھ کہتا تو ہر لگ جاتی جاتی آس کی قسمت پر، وہ جو ذرا سی آس ابھی تک باقی تھی وہ بھی ختم ہو جاتی۔ سوچا، اچھا ہے جو چاہیں کہہ لیں۔ دل کا بخار نکل جائے تو شاید رحم آجائے، اور رحم دے دیں۔ یہ سوچ کر وہ خاموشی کے ساتھ منشی رعزیہ سنتا رہا!

آخر کافی دیر تک بک بک جھک جھک کرنے کے بعد انھوں نے فون اٹھایا اور کسی سے باتیں شروع کر دیں کچھ عجیب قسم کی!

آداب بجا لاتا ہوں حضور والا!

اللہ کا شکر ہے، اچھا ہوں!

جی ہاں — ایسا سبق دیا ہے کہ زندگی بھر فراموش نہیں ہو سکتا!

کیا کروں، زمانہ ہی ایسا آگیا ہے، پاؤں کی خاک سر پہ، جیسے دیکھیے دوگز کی زبان لیے ہوئے ہے۔

جی — بالکل — تکلے کی طرح سیدھا —!

میرا خیال تو یہ ہے کہ اب کبھی ایسی جرأت نہیں ہوگی!

جی ہاں — ابھی ابھی — فوراً حاضر خدمت کرتا ہوں۔

ابھی بھیج رہا ہوں ابھی!

اس وقت آپ بہت مصروف ہیں — کل بھیجوں —؟

بہت بہتر — بہت بہتر!

چونکہ کارکر اسلم سے مخاطب ہوئے اور اب پہلے سے بہت زیادہ نرم اور مشفقانہ لہجے میں فرمایا:

صرف ایک صورت ہے — بقایا رقم بھی مل سکتی ہے اور بحال بھی کردوں گا —
بلکہ جتنی مدت برخاست یا معطل رہے ہو اس کی تنخواہ بھی دے دوں گا!

یہ بشارت سن کر منشی صاحب کی تمام تلخ باتیں فراموش ہوگئیں، وہ خوش ہوگیا اور اس طرح ان کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہے فرمائیے کیا صورت ہے وہ کہ — میری بقایا رقم بھی مل جائے، بحال بھی ہو جاؤں اور دوران معطلی کی تنخواہ بھی پالوں —؟

وہ سوچ رہا تھا منشی صاحب زبان کے لاکھ کڑوے ہوں لیکن دل کے اچھے ہیں آخر انھیں رحم آگیا، آخر انھوں نے تلافی مافات کا فیصلہ کرلیا۔ اب پہلے سے بھی زیادہ مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دوں گا، اب پہلے سے بھی زیادہ دیر تک کام کیا کروں گا؟

واقعی بیکاری اور بے روزگاری بھی کیا بلا ہے؟ ان چند دنوں ہی میں نے اندازہ کرلیا کہ بیکاری سے زیادہ خوفناک موت بھی نہیں ہے!

منشی صاحب نے اس کی آنکھوں میں سعادت مندی اور خوش اطواری کی جھلک دیکھ کر فرمایا:

وہ صورت یہ ہے کہ میں نے وقت مقرر کر دیا ہے، کل صبح تم ڈپٹی کمشنر صاحب کی صاحب کی خدمت میں پہنچ جاؤ، ان سے معافی مانگ لو، تمھاری ذہانت اور قابلیت کے وہ بہت مداح ہیں لیکن تمھاری آزادہ روی اور بیباکی سے نالاں ہیں فوراً معاف کردیں گے اور پھر جیسے ہی تم آؤ گے اسی وقت ایک ایک پائی بیباق کردوں گا! کرسی اور ادارت تمھارا انتظار کر رہی ہوگی!

اسلم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا: یہ ہے وہ صورت؟
منشی صاحب نے تڑ سے جواب دیا:۔ ہاں —— کیا تمہیں منظور نہیں ہے؟
اور دفعتہً یہ لودہ خاک چٹان بن گیا —— اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا:
ہرگز نہیں —— میں اپنے مطالبے سے دست بردار ہوتا ہوں، مجھے کچھ نہ دیجئے
میں اب کچھ طلب نہیں کرتا، کسی حالت میں بھی معافی نہیں مانگ سکتا۔ میں نے کوئی غلطی
نہیں کی ہے، میں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی ہے، نہ کر سکتا ہوں۔ اقبال نے جو نصیحت
اپنے بیٹے کو کی تھی اس کا مخاطب ہر مسلمان ہے:

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

میں خودی نہیں بیچ سکتا، خواہ نام پاؤں یا گمنام رہوں!
وہ چلا گیا —— منشی صاحب سراپا حیرت بنے اُسے دیکھتے رہے:

مارا از یں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود!

شروع میں اسلم کے چند قدم بڑے بڑے تیز اٹھے، وہ جوش میں بھرا ہوا تھا
وہ کسی قیمت پر اپنی خودی فروخت کرنے پر تیار نہ تھا، اس نے کوئی غلط بات نہیں
لکھی تھی، اس نے کسی پر غیر اصولی نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ ایک دوست کی طرح
اس نے حکومت کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ٹوکا تھا —— یہ ایسا جرم تھا جس کی
معافی مانگی جائے، یہ ایسا جرم تھا جس کی تعزیر یہ تھی کہ اسے برخاست کر دیا جائے
لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس کے قدموں کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ وہ دم خم چند
سکنڈ میں رخصت ہو گیا، وہ بڑے جوش اور طنطنے کے ساتھ اپنے حال پر، اپنے
مستقبل پر، اپنی تنخواہ پر لات مار کر واپس آیا تھا، لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس کے

پاؤں حقائق کی سنگین چٹان سے ٹکرائے اور لہولہان ہو گئے۔ ان میں لرزش پیدا ہو گئی اس کا جی چاہا یہیں راستے میں بیٹھ جائے۔ اس کو اگر اس وقت منشی صاحب واپس بُلاتے تو شاید واپس چلا جاتا!

لیکن منشی صاحب نے واپس نہیں بُلایا۔ اسے اپنی رفتار جاری رکھنی پڑی۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا!

یہ کمرہ جہاں اس کے شب و روز ایک عرصے تک گزرتے رہے تھے اب اجنبی تھا۔ اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ چلے جاؤ، بھاگ جاؤ اب یہاں تمہاری جگہ نہیں رہی ہے اب یہاں کوئی اور رہے گا جو تم سے زیادہ سعادت مند ہوگا!

---

(۷)

کوچ کردہ

منشی صاحب مہاتما گوتم بدھ کے مجسّمے کی طرح اسی طرح بیٹھے رہے کیا مجال ہے جو پلک بھی جھپکائی ہو، یا ذرا سی جنبش بھی کی ہو اور اسلم سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا!

صد ہا سلیپوں کا وہ ڈھیر اب تک اسی طرح بے ترتیب پڑا ہوا تھا، اسے سمیٹا اور ترتیب وار جمع کرتا چلا گیا۔ اس نے سوچا یہ تو خود بخود ایک کتاب بن گئی، پھر حقارت کی ایک نظر ڈالتا ہوا اس دفتر بے معنی کو اس نے الگ رکھ دیا، اس کے بعد بستر باندھا اور اسی مجموعۂ کاغذات کے پاس اسے رکھ دیا، جو تھوڑے سے بہت کپڑے اور چند کتابیں تھیں ان سب کو بھی بستر میں ٹھونس دیا۔

اسے سوچا کہ: ہاں قافلہ لٹ چکا ہے بس اب یہاں سے چل اے دل!

بستر بندھا سامنے رکھا تھا، کاغذات کا ڈھیر بھی رکھا ہوا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ جائے کہاں؟ کس گھر میں؟ کس ہوٹل میں؟ کس سرائے میں؟ کس فٹ پاتھ پر؟

اور اگر کہیں جا کر یہ لیسٹر ٹیک بھی دے تو ایک خانہ بدوش کے لئے کون ہے جو دیدہ و دل فرش راہ کر دے گا ؛ اور پھر کتنی دیر کے لئے ، کتنے دن کے لیے ؟

چلیئے یہ بھی سہی !

مگر وہ ہوٹل والا پٹھان جو ہے ـــــ وہی ہوٹل کا مالک !

کیا وہ بائیس روپے تیرہ آنے لئے بغیر واپس چلا جائے گا ؟

کیا یہ رقمِ خطیر معاف کر دے گا ؟

یہ معجزہ نہیں صادر ہو سکتا ، ویسے بھی اب معجزوں کا زمانہ نہیں ہے ! اور ہو تو بھی اس معجزے کا صدور تو کسی طرح ممکن نہیں ؛ حیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما !

وہ سوچنے لگا : بہرحال اب یہاں نہیں رہنا ہے !

کوئی سوال ہی نہیں ہے قوم کے دفتر میں اقامت کا ، میں ملازم نہیں ، میرا یہاں سے اور یہاں کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ، تنخواہ ضبط ، ملازمت ختم ، پھر اب رہوں تو کس برتے پر ؟ اور بے غیرتی لاد کر تلاشِ روزگار تک رہنا چاہوں بھی تو کیا عالی جناب پروپرائٹر صاحب اخبار ہٰذا مجھے رہنے دیں گے ! وہ تو کھڑے کھڑے نکلوا دیں گے ، بلکہ ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ پولیس میں رپورٹ کر دیں ، یہ لقب زن ہے ، چوری کے ارادے سے ٹھہرا ہوا ہے ڈپٹی کمشنر صاحب دوست ہیں ، پہلی پیشی پر سزا ہو جائے گی ، چلیئے قصہ ختم !

سامان وہیں رکھا اور خود باہر نکلا ، اتفاق کی بات جیسے ہی ہوٹل کے سامنے پہنچا تو ارجمند خاں صاحب کنجیوں کا گچھا لئے سامنے کھڑے تھے ، شاید کسی کام سے کہیں باہر جا رہے تھے ، اسے دیکھتے ہی پوچھ بیٹھے :

کہاں ؟ ـــ ارے بھئی کہاں ؟

احتیاطاً اسلم نے فٹ پاتھ بدل دیا تھا، یعنی ہوٹل والے فٹ پاتھ کو چھوڑ کر مقابل کے فٹ پاتھ پر ہو لیا تھا۔ کہ اس وقت آمنا سامنا نہ ہو تو بہتر ہے، لیکن قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔ آخر دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل ہونا پڑا۔ ارجمند خاں نے پوچھا:

چپکے چپکے کہاں نکلے جا رہے تھے؟

اسلم نے سوچا: چھپانے سے کیا فائدہ؟ کہتے ہیں کہ سچ بولنا اچھا ہوتا ہے۔ ذرا اسے بھی آزما کر دیکھ لوں۔ اس نے کہا:

آپ ہی کے ڈر سے!

خان صاحب نے سوال کیا: کیوں ہم سے کیسا ڈر؟

اسلم نے جواب دیا: آپ کے بائیس روپے تیرہ آنے کا مقروض ہوں اور میرے پاس کچھ ہے نہیں۔

ارجمند خاں نے تیوری چڑھا کر پوچھا: کیوں نہیں ہے؟

اسلم نے بتایا: منشی صاحب نے مجھے جواب دے دیا۔ تنخواہ کے، جو کئی سو باقی تھے وہ ضبط کر لئے ــــ

ارجمند خاں اچھل پڑے، کنجیوں کا گچھا جیب میں رکھا اور ہاتھ کا ڈنڈا از زور سے فٹ پاتھ پر مار کر فرمایا:

جواب دے دیا، تنخواہ ضبط کر لی! کیوں جواب کیوں دیا؟ تنخواہ کیوں ضبط کی ــــ؟

اسلم نے خاں صاحب کو راز دار بنانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ ساری رام کہانی سنا دی جب تک ڈپٹی کمشنر کا ذکر نہیں آیا تھا۔ ــــــــــــــــــــــــ

————— خان صاحب پکڑ پلال بیٹے سنتے رہے لیکن ڈپٹی کمشنر کا نام سنتے ہی ٹھنڈے پڑ گئے، کہنے لگے:

یہ نقوی صاحب بڑا ——— ہے۔ کیا کرے ہمارا آج امی کی عدالت میں پیشی ہے ورنہ تمھارے منشی صاحب کو ہم مزا چکھا دیتا!

اسلم ان کی اور اُن جیسے لوگوں کی مجبوریوں کو سمجھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کسی کو کیا پڑی ہے دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ——— اس نے کہا ٹھیک کہتے ہیں آپ!

لیکن ارجمند خاں کے پاس ایک مرہم اور تھا۔ کہنے لگے: تم روپے کا پرواہ کرو۔ بائیس روپے نہیں، بائیس سو روپے ہو جائیں کوئی بات نہیں جب تک روزگار نہیں مل جاتا خوب کھاؤ، اچھی طرح کھاؤ، تم بے ایمان نہیں ہو۔ جب روپیہ ملے دے دینا ——— چھوکرا ——— !

وہی باہر والا، جو حسبِ ضرورت باہر والا اور اندر والا بنتا ہے۔ اس طرح چھلانگ لگاتا ہوا سامنے آ کر کھڑا ہو گیا جیسے اسپ تازی کسی نالے کو پار کرتا ہے ارجمند خاں نے کہا:

یہ ہمارا دوست ہے، ہمارا بھائی ہے۔ ہمارا اپنا آدمی ہے اُلّو کا پٹھا اس کی خدمت کرو، اسے کھانا دو، چائے دو، سگریٹ دو، کبھی پیسہ مانگا تو مُنہ توڑ دینگا!

وہ بیچارہ چھوکرا کبھی ارجمند خاں کو دیکھتا کبھی اسلم کو، ارجمند خاں کو اس نظر سے کہ اور جو جی چاہے کہہ لیجئے اور اسلم کو اس نظر سے کہ میں نے کیا خطا کی تھی جس کا انعام دلوایا ہے آپ نے؟ ارجمند خاں نے اس کی نظروں کو نہ محسوس کیا نہ پرواہ کی لیکن اسلم نے یہ پیام پڑھ لیا۔ اور اس کے دل میں کسک سی ہونے لگی۔

جاتے جاتے ارجمند خاں نے اسلم کے شانے پر ہاتھ رکھا اور گویا ہوا: جاؤ چائے پیو! یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ اور اسلم اس چھوکرے کے ساتھ جس کا نام سمندر خاں تھا ہوٹل کے اندر چائے پینے لگا۔ بار بار چاہتا تھا کہ سمندر خاں سے معافی مانگ لے، اس کی غلط فہمی رفع کر دے لیکن ہیاؤ نہ پڑا۔

چائے سے فارغ ہو کر اسلم پھر آگے بڑھا۔

سچ کی برکت دیکھی تھی اس نے، جس منزل کو وہ کسی طرح سر نہیں کر سکتا تھا وہ خود ہی سر ہو گئی۔ خود ارجمند خاں ملے اور ساری تکلیفیں آسان کر دیں۔ نہ صرف بائیس روپے تیرہ آنہ کے فوری ادا کرنے کا سوال نہیں رہا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ایک غیر معین مدت تک کے لیے کھانے پینے سے بے فکری ہو گئی۔

لیکن قیام! رات کہاں گزرے گی؟ قیام کہاں اختیار کیا جائے گا! اس مشکل کا حل کرنا ابھی باقی تھا!

مختلف جگہوں، سڑکوں اور کوچوں کی سیر کرتا وہ سرگشت کر رہا تھا کہ ایک بورڈ پر نظر پڑی،

ممتاز ہوٹل ۔۔ قیام و طعام کا بہترین سستا اور قابلِ اعتماد انتظام!

نہ جانے کیوں اس کے قدم خود بخود اندر پہنچ گئے۔ منیجر بااخلاق اور شائستہ آدمی تھا۔ بیباک سے ملا۔ اسلم نے سوچا آ گیا ہوں تو معلومات بھی حاصل کر لینے چاہئیں، سوال کیا:

کوئی کمرہ خالی ہے؟

منیجر صاحب نے فرمایا: جی ۔۔ جتنے کی ضرورت ہو جتیا ہو سکتے ہیں!

اسلم نے پھر سوال کیا: نرخ کیا ہے؟

مینجر نے بتایا: دس روپے روز سے لے کر دو روپے روز تک!

دو روپے روز میں کچھ کشش نظر آئی، اسلم نے پوچھا:

کیا دیکھ سکتا ہوں؟

مینجر صاحب آگے بڑھتے ہوئے بولے: شوق سے، آئیے تشریف لائیے!

تیسری منزل پر لے جا کر ایک کمرے میں کھڑا کر دیا۔ معمولی سی چارپائی بستر ندارد، ایک طرف میلا سا گھڑا رکھا ہوا تھا، ہوا کا سارے کمرے میں کہیں گزر نہیں، رُخ ایسا کہ گرمی میں دھوپ اور جاڑے میں سایہ!

اسلم کا دم الٹنے لگا۔ اس نے باہر آتے ہوئے پوچھا: اگر زیادہ عرصے تک کے لئے لیا جائے تو کوئی رعایت ہو سکتی ہے؟

کچھ سوچتے ہوئے مینجر نے بتایا: اگر چھ مہینے یا زیادہ عرصے کے لئے لیا جائے تو پچاس روپے مہینہ لے لئے جائیں گے! لیکن سو روپے ڈیپازٹ کرنے پڑیں گے جو کمرہ چھوڑتے وقت مل جائیں گے!

اسلم نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ کمرہ مفت بھی رہنے کے قابل نہیں ہے اور ڈیپازٹ کا نام سُن کر تو اس نے اس بارے میں کچھ سوچنا ہی موقوف کر دیا، نیچے اترتا ہوا بولا:

بہت اچھا، پھر کسی وقت حاضر ہوں گا!

مینجر نے اس اطلاق کا جواب اخلاق سے نہیں دیا۔ رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اسلم نے بھی زیادہ توجہ نہ کی، چپ چاپ نکل آیا۔

لیکن باہر نکلتے ہی پھر سوال پیدا ہوا۔ اب!؟

اس فیصلے میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی کہ موتم اُکے دفتر میں اب جگہ نہیں مل سکتی۔

اب وہاں ایک رات بھی قیام کرنا ممکن نہیں۔ خدا ارجمند خاں کو غریقِ رحمت کرے بیچارے نے کھانے کی طرف سے بے فکر کر دیا لیکن قیام کا انتظام تو دست و بازو کی مدد سے کرنا ہی تھا۔

یہی سوچتا ہوا پھر سڑکوں، گلیوں اور کوچوں کا چکر کاٹنے لگا۔ یکایک پھر اس کی نظر ایک بورڈ پر جا کر رک گئی:

"اسلامی مسافر خانہ!"

وہ دل ہی دل میں یہ بورڈ پڑھ کر اچھل پڑا۔ گویا جنت مل گئی۔ لپکا لپکا اندر پہنچا اور سیدھا منیجر صاحب کے کمرے میں۔ منیجر صاحب نے ایک چبھتی سی نظر اس پر ڈالی اور اس سے کچھ سنے بغیر فیصلہ صادر کر دیا: جگہ نہیں ہے!

یہ الفاظ بجلی بن کر اس پر گرے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ ایک عجیب اضطراب کی کیفیت طاری ہو گئی اس پر۔ اس نے بہت عاجزی کے ساتھ کہا:

کیا صرف چند دن کے لیے بھی ایک کمرہ نہیں مل سکتا؟!

منیجر صاحب نے اور زیادہ ہیکڑی نخوت سے تن کر جواب دیا:

اجی جناب چند گھنٹوں کے لیے بھی نہیں۔۔۔

ایک نیا خیال بجلی کی طرح اسلم کے دل میں چمکا، اس نے کہا:

اگر آپ اجازت دیں ——

منیجر صاحب بات کاٹ کر، تیوری چڑھا کر بولے: کسی کے ساتھ آپ کو ٹھہرا دوں!

یہ تجویز اگرچہ اسلم کے ذہن میں نہ تھی، لیکن بہر حال قابلِ قبول تھی۔ اس نے آمادگی اور اشتیاق کے ساتھ جواب دیا:

اور اگر ایسا ہو سکے ـــــ

لیکن منیجر صاحب نے پھر پوری بات نہیں سُنی اور اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ارشاد فرمایا:

جی بخشئے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے اس طرح چوری چکاری کی کتنی واردا تیں ہو چکی ہیں، نہ کوئی مسافر اس کے لئے تیار ہو گا، نہ میں کسی سے اس کی سفارش کر سکتا ہوں!

اسلم کو پھر اپنی وہ نامکمل تجویز یاد آئی جو اس نے پیش کرنا چاہی تھی۔ مگر منیجر نے موقع نہیں دیا تھا کہنے لگا:

اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں برآمدے میں پڑا رہوں گا! کسی بنچ پر؟

منیجر صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔ پھر دیکھا، پھر دیکھا۔ اور پھر بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا:

آپ ہیں کون صاحب؟

مختصر سے الفاظ میں اسلم نے اپنا تعارف کرا دیا۔

منیجر صاحب بالکل بدل گئے۔ اچھا تو آپ ہیں اسلم صاحب!

اسلم اس تبدیلی پر خوش ہو گیا۔

شہرت نہیں مجنوں کی برابر، یہ مسلّم،
ایسے بھی نہیں ہیں کہ نہ جانے ہمیں کوئی!

یہ شعر نہ جانے دماغ کے کس گوشے میں کب کا پڑھا ہوا بند پڑا تھا، اس وقت دفعتہً ابل پڑا۔ سوچنے لگا "قوم" کی اڈیٹری نے اتنا فائدہ تو پہنچایا کہ جنھیں میں نہیں جانتا وہ مجھے جانتے ہیں۔

منیجر صاحب نے کہا: مجھے آپ کا طرزِ تحریر بہت پسند ہے۔ بہت اچھا کیا آپ نے

"قوم" کو چھوڑ دیا، اس کا مالک نہایت ذلیل آدمی ہے۔ میں جانتا ہوں اسے، آپ جیسا ہنرمند بیکار نہیں رہ سکتا، ضرور کہیں نہ کہیں اس سے اچھی ملازمت مل جائے گی ـــــ

ارے ـــ آپ کھڑے کیوں ہیں، تشریف رکھئے جناب!

اسلم کرسی پر بیٹھ گیا، منیجر نے گھنٹی بجائی۔ فوراً ایک ملازم میلے کپڑوں میں سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ منیجر نے حکم دیا چائے لاؤ۔ وہ چائے لینے گیا تو پھر گھنٹی بجائی۔ ایک دوسرا ملازم اس سے زیادہ میلے کپڑوں میں ملبوس حاضر ہوا، اس سے فرمایا:

دیکھنا وہ کمرہ نمبر ۲۴ صاف کر دو فوراً"

وہ تعمیلِ حکم کے لئے چلا گیا، اتنے میں چائے آگئی۔ چائے ختم ہوئی تھی کہ کمرہ صاف ہونے کی خوش خبری مل گئی۔

منیجر صاحب نے فرمایا: جائیے سامان لے آئیے ـــ یہ خیراتی مسافرخانہ ہے جہاں ایک مہینے سے زیادہ کوئی نہیں ٹھہر سکتا لیکن آپ ہر شرط سے آزاد ہیں جب تک نوکری نہ مل جائے اور پہلی تنخواہ نہ مل جائے اور آپ مکان کا انتظام نہ کرلیں شوق سے یہاں رہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے آپ اپنا نیاز مند سمجھ کر یاد فرمائیں! فوراً تعمیلِ ارشاد ہوگی!

ساری کلفت رفع ہو گئی۔ "قوم" کے دفتر سے جو بہت بڑا بوجھ اپنے قلبِ ناشکیب پر لے کر چلا تھا وہ اتر گیا! وہ اتنا ہلکا پھلکا اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا جیسے نہ کوئی فکر ہے نہ اندیشہ!

وہ خوش تھا ـــــــ بہت خوش ـ جب سے قوم کے دفتر میں اس نے کام شروع کیا تھا ـــ جب سے کالج کی زندگی کو اس نے خیرباد کہا تھا، آج تک

اتنی خوشی اتنی مسرت، اتنی اطمینانی کیفیت کبھی اس پر طاری نہیں ہوئی تھی!

وہ اپنے دفتر کی طرف سامان لینے کے لئے اڑا جا رہا تھا، بار بار خدا کا شکر کرتا کہ اگر غیب سے یہ صورت نہ پیدا ہو گئی تو وہ کیا کرتا، کہاں جاتا؟ کیسی شدید ذلت سے سابقہ پڑتا! سچ ہے:

کوئی نہیں مرا تو مری جان خدا ہے!

خدا کام آگیا!

---

(۸)

خُدا کی زمین!

"قوم" کے دفتر سے اسلم کا "لگیج" "مسافر خانے میں آگیا!

مُسافر خانے کی دُنیا بھی کتنی عجیب، کتنی پُر اسرار اور گوناگوں ہوتی ہے۔ ہر روز نئے چہرے نظر کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ نئے لوگ آتے ہیں، پُرانے لوگ جاتے ہیں۔ کوئی با اخلاق، کوئی شوریدہ سر، کسی کو دیکھ کر فرشتہ کا گمان ہوتا ہے، کسی پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے شیطان سے بھی دو قدم آگے ہے، کسی کی ساری پونجی چوری ہو جاتی ہے مگر دم نہیں مارتا، کسی کی کوئی چیز یا دھر سے اُدھر ہو جاتی ہے تو قیامت آجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے قارون کا خزانہ لٹ گیا۔ ہر شخص کی مصروفیت جُدا، مشاغل الگ، دلچسپیاں علیحدہ کچھ ایسے لوگ تھے جو دن بھر بیٹھے تاش کھیلا کرتے تھے، گپیں لڑایا کرتے تھے، عورتوں پر فقرے کستے تھے، اور بچوں کو چھیڑتے تھے۔ لوگوں کو گالیاں دیتے تھے، اور خنجر کو سینے میں گھونپ دینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ بعض وہ لوگ تھے جو فجر کی اذان سُن کر نکلتے اور عشا

کی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے۔ ان مسافروں کو بیوقوف بنانے والے، سو اگر بھی دن بھر بیٹھے رہتے۔ جس چیز کی قیمت بازار میں ایک روپیہ ہوتی تو تین روپے بنا کر بڑے مزے میں ڈیڑھ روپیہ کھرا کر لیتے۔ کبھی کبھی دنگا فساد، مارپیٹ اور جاقوزنی کی واردات بھی ہو جاتی۔ اس وقت منیجر صاحب کی حالت قابلِ دید ہوتی۔ نہ اتنا یارا کہ لڑنے والوں کو پکڑا سکیں نہ اتنی ہمت کہ پولیس کو اطلاع دے کر امن کرائیں۔ ایسے مواقع پر بالعموم وہ موقع واردات سے غائب ہو جایا کرتے تھے۔ اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی اتنے انجان بن جاتے تھے کہ جیسے واقعی انہیں کچھ نہیں معلوم!

ایک روز اسلم اپنے کمرے میں بیٹھا وقت گزاری کے لئے ان لکھی ہوئی سلپوں پر نظر ڈال رہا تھا جو اس نے منشی صاحب کے انتظار میں قلم بند کی تھیں اور نہ جانے کیا کیا لکھ گیا تھا۔

اتنے میں ایک سات آٹھ سال کا خوبصورت لیکن نہایت میلا کچیلا لڑکا آ کر دروازہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ اندر آنا چاہتا ہے لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ شروع میں تو اس نے توجہ نہیں کی لیکن جب کئی منٹ گزر گئے تو اسے ٹٹولنے کے لئے باتیں شروع کر دیں۔

کیا چاہتے ہو تم — آؤ اندر آ جاؤ!

وہ آیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر تھا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن بچہ ہی تو تھا ہمت ہار گیا۔ اسلم نے باتیں شروع کر دیں کہ شاید اس طرح کھل جائے۔ پوچھا:

تمھارا نام کیا ہے جی؟

وہ بولا : اقبال !

اسلم نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا: واہ بھئی واہ ! بڑا اچھا اور مبارک نام ہے ۔ بڑے آدمی ہوگے، ترقی کروگے ، جانتے ہو اقبال کس کا نام تھا ؟

لڑکے نے جواب دیا: میرا ہی نام تو ہے ۔

اسلم ہنسنے لگا : مزے کے آدمی ہو۔ کہاں کے رہنے والے ہو ؟

سلطان پور کے رہنے والے ہیں ہم لوگ ۔

وہ بھی اچھی جگہ ہے ۔ تمہارے والد کہاں ہیں ؟

کہیں باہر گئے ہیں ۔ روز صبح صبح چلے جاتے ہیں اور رات کو جب ہم سو جاتے ہیں تب آتے ہیں ۔

کوئی کام کرتے ہوں گے ؟

کام کی تلاش میں جاتے ہیں ۔

اچھا یہ بات ہے — کیا نام ہے اُن کا ؟

ان کا نام مرزا صاحب ہے ، سب انھیں یہی کہتے ہیں !

تم پڑھتے بھی ہو کچھ ؟

ہاں پڑھتا کیوں نہیں !

لیکن ہم نے تو تمھیں کبھی اسکول جاتے نہیں دیکھا ۔

یہیں پڑھ لیتا ہوں آپا سے ۔

کیا پڑھتے ہو یہ بھی تو بتاؤ ؟

اُردو کی کئی کتابیں پڑھ چکا ہوں ، اب انگریزی کی پہلی کتاب شروع کی ہے ۔

اسلم ابھی کچھ اور سوالات کرنا چاہتا تھا کہ اقبال کو وہ بات یاد آئی جس کے لئے وہ آیا تھا۔ اس نے کہا کیا آپ کے پاس ماچس ہے؟

اسلم نے جیب سے ماچس نکالتے ہوئے پوچھا: کیا سگریٹ پیتے ہو؟

وہ ہنسنے لگا: آگ سلگانی ہے آپا کو، چائے بنانی ہے۔ امی کی طبیعت کئی دن سے خراب ہے۔

اسلم نے ماچس دے دی اور کوئی مزید سوال نہیں کیا۔

اقبال ماچس لے کر چلا گیا۔ اور اسلم پھر اپنا لکھا ہوا پڑھنے لگا۔ اس وقت اس پر عجیب طرح کی سرخوشی کا عالم طاری تھا۔ یہ جو کچھ اس نے روا روی، پریشانی اور اضطراب و انتشار کے عالم میں لکھا تھا یہ تو ایک ناول تھا!

ناول ——— اور میرے قلم سے ——— اور اتنا زبردست! اپنے اس کمال کا تو مجھے بھی علم نہیں تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں بہت اچھا ناول نویس بن سکتا ہوں۔ میرے ناول چھپیں گے اور دھوم مچ جائے گی، ساری خلقت ٹوٹ پڑے گی ان پر۔ ایک ایک ایڈیشن دس دس ہزار کی تعداد میں چھپے گا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گا میرا نام اونچا ہوگا، میری شہرت کے نعروں سے ملک کے در و دیوار گونج اٹھیں گے۔ اخبارات میں میری کتابوں پر شاندار تبصرے ہوں گے۔ رسائل و اخبارات میں میری تصویریں چھپیں گی۔ جب بھی سفر کروں گا تو ہر اسٹیشن پر دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑا کریں گے تعریف و تحسین سے بھرے ہوئے ہر روز اتنے خطوط میرے پاس آیا کریں گے کہ ڈاکیہ بیچارہ بوجھ لادتے لادتے دوہرا ہو ہو جایا کرے گا۔ میں دولت مند ہو جاؤں گا۔ ہر مہینے ہزاروں روپے کی صورت میں مجھے رائلٹی ملا کرے گی۔ نہایت شاندار کوٹھی بنواؤں گا، نہایت خوبصورت موٹر خریدوں گا

انجمن کا دامن سیم وزر سے بھر دوں گا۔ کلثوم کو آتنا دوں گا آتنا دوں گا کہ وہ زر پرست عورت تنگیٔ داماں کی شکایت کرنے لگے گی، دوست خوش ہوں کے دشمنوں کو دق ہوجائے گی غیر ممالک تک میں میری شہرت کا سورج چمکے گا میری کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوں گے اور میں دُنیا کے چوٹی کے ناول نگاروں میں شمار کیا جانے لگوں گا۔

بعض دفعہ واقعی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جسے اپنا نقصان سمجھتا ہے وہی اس کے غیر معمولی فائدے کا سبب ہوتا ہے۔ اگر فاقے کر کے منشی صاحب کی خدمت میں دن دن بھر مصروف رہ کر اور رات رات بھر جاگ کر یہ ناول نہ لکھتا تو میری یہ صلاحیت کبھی نہ اُبھرتی، میں صرف ایک اخبار نویس، ایک مزدور کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا اور ایک دن اس دُنیا سے رخصت ہوجاتا۔

منشی صاحب نے جب ڈپٹی کمشنر سے معافی مانگ لینے کا مجھے مشورہ دیا اگر اسے میں قبول کر لیتا اور ڈپٹی کمشنر کے سنگِ آستاں پر سر جھکا دیتا تو بے شک بقایا رقم مجھے منشی صاحب عطا فرما دیتے اور میری چھٹی ہوئی جگہ پھر مجھے مرحمت فرما دیتے! مگر ہوتا کیا؟ زندگی بھر اپنے ضمیر سے شرمندہ رہتا۔ ڈپٹی صاحب سے کبھی آنکھ چار نہ کر سکتا۔ باوقار صحافت کے حلقے میں ہمیشہ کے لئے نکو ہوجاتا کہ اس نے پیٹ بھرنے کے لئے معافی مانگ لی۔ یہ اپنا وقار قائم نہ رکھ سکا۔ لیکن میں نے یہ نہیں کیا۔ ٹھوکریں کھاتا اس مسافر خانے میں آکر ٹھہر گیا۔ اور یہاں یہ اپنا ناول پڑھ کر مجھے اندازہ ہوگیا، گو میں قطرۂ ناچیز ہوں لیکن دریا، سمندر اور طوفان بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں، گو میں ہیچ اور ناکارہ ہوں لیکن بڑا آدمی بھی بن سکتا ہوں۔ آج میں کچھ نہیں ہوں لیکن کل کون مجھ سے ٹکر لے سکے گا۔ سچ کہا ہے بڑے لوگوں نے ــــ خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما درآں باشد ــــ منشی صاحب کے

سٹر میں میرا ناول خیر بن کر ابھر آیا۔

مور اپنے جمال صدرنگ سے بیہوش ہو کر رقص شروع کر دیتا ہے، ناچتا ہے اور مست ہو ہو کر ناچتا رہتا ہے لیکن جب اس کی نظر اپنے پائے زشت پر جاتی ہے تو اپنا حسن رعنا بھول کر اس بدنمائی پر خود اپنی آنکھوں میں ذلیل ہو جاتا ہے، رقص بند کر دیتا ہے اور افسردگی کے عالم میں کوئی گوشہ سنبھال لیتا ہے۔

بالکل یہی کیفیت اس وقت الم کی ہوئی — ناول پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی تھی یہ سوچ کر کہ اُسے چھاپے گا کون؟ اتنی ہی پریشانی ہوئی۔

بڑی دیر تک بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ ارجمند خاں کی عالی حوصلگی نے سگریٹ اور کھانے کی طرف سے اسے بے نیاز کر دیا تھا۔ دن بھر میں جتنے پیکٹ چاہے پھونک ڈالے اور جتنا کھانا چاہے نوش جان کرے کوئی کہنے والا نہیں تھا یمندر خاں نہایت خاموشی سے ہر فرمائش پوری کر دیتا۔ بیکاری اور بے زری کے عالم میں آدمی کی بھوک بھی بڑھ جاتی ہے اور ضروریات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں وہ جتنا کھاتے پیتے پر ایک ہفتے میں صرف کرتا تھا اب شاید ہر روز اتنے کا بل بن جاتا تھا۔ چنانچہ ارجمند خاں کا بل چودہ سو روپے تین آنے تک مختصر سی مدت میں پہنچ چکا تھا۔ اور گو ارجمند خاں کی طرف سے کوئی تقاضا نہیں ہوا تھا لیکن وہ بعض وقت سخت پریشان ہو جاتا کہ کسی دن اگر ارجمند خاں نے جامۂ انسانیت اتار کر روایتی انداز میں تقاضا شروع کر دیا تو کیا ہوگا! کہیں کھایا پیا سب نہ اگلنا پڑ جائے! اپنے علاقے میں اس کی دھاک اتنی ہے کہ اگر مار پیٹ پر اتر آیا تو آس پاس سے کوئی ہمدردی نوع انسان بیچ بچاؤ کرانے بھی نہ آسکے گا۔ بھلا ارجمند خاں کے مقابلے میں کون ٹانگ اڑا سکتا ہے۔ توبہ!؟

(۹)

خلا کی ایک اور دین!

اسلم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کتاب چھپنی ہی چاہئے لیکن وسائل اب تک نہیں پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے شہروں کے بڑے بڑے ناشرین کو خط لکھے، نمونے کے طور پر بعض ابواب بھی بھیجے، مگر یا تو جواب نہ آیا اور آیا بھی تو معذرت نامہ!

پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اس شہر میں بھی تو تاجران و ناشرانِ کتب ہیں کیوں نہ یہیں قسمت آزمائی کی جائے!

یہ سوچ کر وہ اپنے گھر سے باہر نکلا اور شہر کی سب سے بڑی فرم رائل پبلشنگ کمپنی کے دفتر میں پہنچا، خوبیٔ قسمت سے جنرل منیجر صاحب سے جو کمپنی کے مالک بھی تھے فوراً ملاقات ہو گئی۔ جنرل منیجر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنے والا اسلم ہے جو "نوم" کا ایڈیٹر رہ چکا ہے تو بہت خوش ہوئے اور بڑے تپاک سے پیش آئے اور اس کے طرزِ تحریر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے، اپنی تعریف سے ہر شخص خوش ہوتا ہے لیکن اسلم تو

اس وقت اتنا خوش تھا کہ بس ڈانس ناچنے کے لیے تیار تھے۔ یہ تعریف وہ شخص کر رہا تھا جو اس کا ناشر بننے والا تھا۔ ایسا قدر دان، ادب دوست اور باذوق شخص تو قسمت سے ہاتھ آیا ہے، وہ یہی سوچ رہا تھا کہ شفقت صاحب نے فرمایا:

بتائیے اسلم صاحب! ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

اسلم نے کچھ تکلّف کچھ انکسار کرتے ہوئے کہا: میں نے ایک ناول لکھا ہے کیا آپ اسے شائع کر سکیں گے؟

شفقت صاحب ہنسنے لگے، پھر انھوں نے چائے کا آرڈر دیا، اس کے بعد اس طرح جیسے اس سوال سے بڑی تکلیف پہنچی ہو، فرمایا:

کیا آپ کو بھی یہ سوال کرنا چاہیئے؟ آپ نے میرے خلوص، میری نیازمندی اور میرے حُسنِ عقیدت کو سخت صدمہ پہنچایا۔

اسلم پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا: واقعی یہ شخص کتنا مخلص اور کتنا نیازمند ہے کہ خفا تک ہو گیا۔ واقعی میں نے اس کی توہین کی ہے، اس کے خلوص کو ذلیل کیا ہے اس کی نیازمندی کو منہ چڑایا ہے، میں کیا اور مجھ سے عقیدت کیا، من آنم کہ من دانم! لیکن عقیدت تو وہ چیز ہے کہ پتھر، درخت، آگ، دریا، سانپ اور بندر تک سے ہو جاتی ہے میں تو پھر آدمی ہوں، اگر شفقت مجھ سے عقیدت رکھتے ہیں تو کیا کر سکتا ہوں، وہ مجھ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ میں ان سے اس طرح کی باتیں کر رہا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ! آدمی کو اتنا بر خود غلط بھی نہ ہونا چاہیئے جتنا میں ہوں۔ اس نے نہایت لجاجت کے ساتھ عرض کیا:

میرا مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کے جذبات مجروح کر دوں۔ میں تو ـــ

شفقت صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا: جناب آپ تو جو جی چاہے لکھتے جائیں اور ہمیں دیتے جائیں ہم آپ کی ہر کتاب چھاپیں گے۔ اور ہمارے سوا کسی اور کو یہ حق دیں گے تو انتہائی ظلم کریں گے اپنے اس نیاز مند پر،!

اسلم دل ہی دل میں اپنا در فخر کرنے لگا میں جو چاہوں لکھوں شفقت صاحب چھاپیں گے اور اس پر مُصر ہیں کہ وہی صرف وہی لاشریک طور پر میرے ناشر بنے رہیں۔ آخر یہ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ ابھی میں نے صرف ایک کتاب لکھی ہے، اور یہ نہ صرف اس کتاب کو جسے اب تک انھوں نے دیکھا تک نہیں ہے بلکہ آئندہ بھی میری ہر کتاب کو چھاپنے کے لئے تیار ہیں۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اتنے میں چائے اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ آگئی شفقت صاحب نے چائے کی پیالی اور یہ اشتہا آور چیزیں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا:

لیجے، شوق کیجئے — ویسے آپ کافی دل شکنی کر چکے ہیں میری۔ اب تکلف کر کے مزید صدمہ نہ پہنچائیے گا!

ویسے بھی ان چیزوں کو دیکھ کر بھوک چمک گئی تھی۔ واقعی اس نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ ڈٹ کے کھایا اور ایک کے بجائے دو پیالیاں پی ڈالیں شفقت صاحب اسے کھاتے پیتے دیکھ کر اس طرح خوش ہو رہے تھے جیسے کوئی ماں اپنے لاڈلے بیٹے کو مزے مزے کی چیزیں کھلا کر خوش ہوتی ہے۔ پھر جیسے انھیں کچھ یاد آگیا۔ ملازم کو حکم دیا، سگریٹ لاؤ۔ سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے، ملاحظہ کیجئے!

اسلم اب تک اپنے حالات کے باعث معمولی قسم کے سگریٹ پیتا رہا تھا، گولڈ فلیک کو اس نے بکتے دیکھا تھا لیکن پیا شاید کبھی نہیں تھا۔ پہلے ہی سگریٹ میں لطف آگیا،

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر!

تابڑ توڑ دو سگریٹ پی کر تیسرا سلگایا تھا کہ شفقت صاحب نے سوال کیا:
اس ناول کا نام کیا رکھا ہے آپ نے؟

اسلم نے بتایا: "عشق پر زور نہیں!"

نام سن کر شفقت صاحب پھڑک گئے: بہت اچھا نام ہے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شخص آیا۔ لمبا سا قد، سفید کرتا، سفید پاجامہ، سیاہ رنگ کی صدری، بال بڑے بڑے اور الجھے ہوئے، شیو شاید کئی دن سے نہیں کیا تھا۔ ہاتھ میں سلگتا ہوا ایک سگریٹ بغل میں ایک چرمی بستہ۔

شفقت صاحب اُسے دیکھ کر سروقد کھڑے ہو گئے: آخاہ! انور صاحب، آئیے — آئیے — بڑے موقع پر آگئے آپ!

پھر اسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا: یہ انور صاحب ہیں۔ باکمال آرٹسٹ، بڑے اچھے آدمی ہیں، بس ایک عیب ہے — اپنے آرٹ کی قیمت بہت لیتے ہیں۔

انور اور شفقت دونوں ہنسنے لگے۔ اور نے کہا: آرٹ کی قیمت بھی ہوتی ہے؟

شفقت صاحب کچھ جھینپ سے گئے، فرمایا: ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو جس طرح آپ انمول ہیں اسی طرح آپ کا آرٹ بھی۔ بل بڑھاتے جائیے ہم ادا کرتے جائیں گے۔
نسخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز!

انور کے ساتھ شفقت صاحب کے اس برتاؤ پر اسلم ششدر رہ گیا۔ واقعی بڑا دل والا آدمی ہے یہ۔ واقعی یہ فن کاروں کو پہچانتا اور ان کی قدر کرنا جانتا ہے۔ ایک ہمارے منشی صاحب ہیں، اخبار کا ٹائٹل منشی زریں رقم سے لکھوایا، انھوں نے تیس روپے

بل دیا۔ یہ تین سے زیادہ دینے پر تیار نہ تھے۔ تیس اور تین کا یہ جھگڑا تین ہفتے تک چلتا رہا پھر انھوں نے یہ سوچ کر دس روپے دیے کہ اب اس شخص سے کبھی کام نہیں لیں گے۔ اور منشی زریں رقم نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی پہ دل ہی دل میں قسم کھا کر یہ فیصلہ کیا کہ اب مرتے مرتے مر جائیں گے مگر اس شخص کا کام کبھی نہیں کریں گے ۔۔۔ اور ایک یہ شخص ہے شفقت جو اپنے آرٹسٹ سے کہہ رہا ہے "رنرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز" خوب گزرے گی اس شخص کے ساتھ

یکایک اس کے کان میں آواز آئی "یہ شفقت صاحب انور سے اس کا تعارف کرا رہے تھے۔ ان سے ملئے ۔۔ یہ ہیں اسلم صاحب! "قوم" کے مشہور ایڈیٹر جن کے زورِ قلم کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ لوگوں کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں ان کے قلم سے گلستان پیدا ہوتا ہے۔

انور نے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا: "کبھی کبھی "قوم" کو میں بھی پڑھتا رہا ہوں لیکن آجکل تو اس کے مقالات ادارت بڑے پھسپھسے نکل رہے ہیں۔

اسلم نے فخر کے ساتھ جواب دیا: جی ہاں ایسا ہی ہوگا، میں تو اب اسے دیکھتا تک نہیں کچھ عرصہ ہوا مستعفی ہو چکا ہوں وہاں سے!

شفقت صاحب نے انور سے کہا: سنو بھئی انور! ایک کام تمھیں کرنا ہے اور جلد از جلد کرنا ہے، زیادہ سے زیادہ چند روز میں!

انور نے ایک قہقہہ لگایا: آپ کا ہر کام ایسا ہی ہوتا ہے حسرت رہ گئی کبھی آپ نے کہا ہوتا: "اس کی کچھ ایسی جلدی نہیں ہے، اطمینان سے ختم کرنا اسے"۔۔ بہرحال فرمائیے ہم ٹھیرے مزدور ۔۔۔ کہیے تو کل ہی لا کر پیش کر دیں۔

شفقت نے اسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اسلم صاحب کا ایک نہایت معرکہ آرا اور تہلکہ خیز ناول ہم چھاپ رہے ہیں اور بہت جلد چھاپ رہے ہیں، اس کے ٹائٹل کا ڈیزائن

نہایت خوبصورت، اتنا کہ خود آپ بھی اس پر فخر کریں۔ بتاؤ اسے۔ جھٹ پٹ!

انور نے نہایت اطمینان سے کہا: بن جائے گا۔

پھر پوچھا: لیکن ناول کا موضوع کیا ہے؟

شفقت صاحب انور کو زیادہ وقت دینے پر تیار نہ تھے۔ اسے آپ خود اسلم صاحب سے ان کی قیام گاہ پر ڈسکس کر لیجئے گا۔ کہاں قیام ہے آپ کا اسلم صاحب!

اسلم نے قیام گاہ کا پتہ بتایا، انور شام کو ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ انور کے جانے کے بعد منشی عبدالخالق صاحب جو اب تک ایک گوشے میں دبکے کھڑے تھے ڈرتے ڈرتے تشریف لائے۔ انھیں دیکھتے ہی شفقت صاحب تیوریاں چڑھا کر بولے، کیا ہے؟

وہ اور زیادہ سہم گئے۔ سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ میرا بل! —

شفقت صاحب نے کہا: بل جائے گا! کہیں بھاگا جاتا ہے، دیکھ رہے ہیں آپ کس قدر مصروف ہوں، کہہ دیا تھا کہ شام کو چھ بجے کے بعد اس سلسلے میں آیا کیجیے۔ لیکن آپ کی عادت ہے جب جی چاہا چلے آئے!

منشی عبدالخالق کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی اگر دن جھکا کر واپس جا رہے تھے لیکن شفقت صاحب نے فرمایا ٹھہریے —

وہ ایک بے بس ل کی طرح پلٹ آئے اور بندہ بے دام کی طرح کھڑے ہو گئے شفقت صاحب نے اسلم سے ناول کا مسودہ لیا اور خالق صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا:

دوسرے کام روک کر اس کی کتابت فوراً شروع کر دیجیے۔

خالق صاحب نے پلندہ ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ چلے گئے۔

اسلم کا اس وقت خوشی کے مارے بہت بُرا حال تھا۔ آج کا دن اس کی زندگی میں تاریخی دن تھا۔ خوش بختی اور کامگاری کا دن۔

اسلم نے ارادہ کیا کہ اب معاملہ کی گفتگو شروع کرے۔ رائلٹی کی شرح کیا ہوگی؟ ادائیگی کب اور کس طرح ہوگی؟ کیا پیشگی نہیں مل سکتی؟ لیکن گفتگو شروع کرنے کا وقت نہ مل سکا۔ شفقت نے زیادہ سے زیادہ بیکر شفقت بن کر کہا:

کیا کل کسی وقت آپ تشریف لا سکتے ہیں؟

اسلم نے مستعدی اور آمادگی کے ساتھ جواب دیا۔ ضرور، جس وقت کہئے۔

شفقت صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا: نہیں، کل نہیں۔ کل بہت سی مصروفیتیں ہیں، ایسا کیجئے پرسوں اتوار کو دوپہر کا کھانا غریب خانہ پر کھائیے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں! یہ ناول تو آپ نے اپنی مرضی سے لکھا ہے، اب ایک کتاب ہم آپ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ ایک خاص موضوع پر۔ اور وہ کتاب صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں!

اسلم کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اس نے کہا: ضرور حاضر ہو جاؤں گا لیکن کھانے کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔

شفقت صاحب گویا اسے اذنِ [illegible] دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ [illegible] شانے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: [illegible]!

اسلم کچھ نہ کہہ سکا، واپس چلا آیا!

اب تک وہ احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ شفقت صاحب نے اُسے احساسِ برتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب تک وہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن وہ اب اپنے آپ کو مستقبل کا عظیم فن کار سمجھ رہا تھا۔ اب تک وہ مایوس تھا اب اس کے

اندر سے زندگی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ اب اُس میں زندہ رہنے کا ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک نیا اسلم تھا!

وہ اسلم جو منشی سجاد حسین کے دفتر میں کام کرتا تھا مر چکا تھا۔ شفقت صاحب کے دفتر نے ایک نئے اسلم کو جنم دیا تھا!

اسلم مستقبل کا عظیم فن کار!

زندگی

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی!

ہم پہ جو بیت گئی، بیت گئی، بیت گئی

کیا کہیں آپ سنیں گے تو پشیماں ہوں گے

یاد اک غم ہے کہ فریاد فسوں ہے کہ جنوں

درد کے رشتے بہ شکل سے نمایاں ہوں گے

تھم گئے اشک کہ آنکھوں میں چمک لوٹ آئے

یہ دیئے شام ڈھلے گی تو فروزاں ہوں گے

یاس کی رات میں ہر آس نے دم توڑ دیا

جانے کب صبح کے آثار نمایاں ہوں گے!

(۱)

غمِ ہستی، الم!

شفقت سے رخصت ہو کر اسلم ارجمند خاں کے ہوٹل پہنچا۔ ارجمند خاں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جی بھر کے کھانا کھایا اور سگریٹ سلگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ آج اس کی طبیعت بے طرح تفریح پر مائل تھی سینما دیکھنے کو بھی جی چاہ رہا تھا۔ افسوس ارجمند کسی سینما کا مالک یا منیجر نہ تھا ورنہ آج کتنی سہولت سے یہ آرزو بھی پوری ہو جاتی۔ اپنے پاس سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جیب مرزند کے گھر کی طرح خالی تھی۔

یوں ہی بے خیالی کے عالم میں قدم بڑھاتا جا رہا تھا کہ یکایک ارجمند خاں سے ملاقات ہو گئی۔ حسب معمول گرمجوشی سے ملے۔ خیریت دریافت کی اور سوال کیا:

کہو ملازمت ملی کہیں؟

اس سوال میں ہمدردی سے زیادہ تقاضا نظر آیا۔ لیکن اب وہ مطمئن تھا۔ بغیر کسی جھجک کے جواب دیا:

ملازمت تو نہیں، نہ کرنا چاہتا ہوں۔

ارجمند خاں بھلا اس سے زیادہ کیا سن سکتے تھے۔ کہنے لگے: ملازمت ملی بھی نہیں اور کام کرنا بھی نہیں چاہتا! پھر کیا چوری کرے گا، ڈاکہ مارے گا۔ نقب ـــــ

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا: نہیں خاں صاحب! بھلا یہ کام مجھ جیسے کے کئے ہو سکتے ہیں۔ انھیں انجام دینے کے لئے تو آپ جیسا جثّہ، آپ جیسا دل گردہ اور آپ جیسے ہاتھ پاؤں چاہئیں! ـــ

ارجمند خاں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: تو ہم چور ہے، ڈاکو ہے ـــ نقب زن ہے ـــ!

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں سُرخ ہونے لگیں، لب و لہجہ بدلنے لگا۔ اسلم نے سوچا کہیں یوں ہی سُرخ ہوتے ہوتے خان کبوتر بن گئیں یا لہجہ بدلتے بدلتے بالکل پٹھانی بن گیا تو قیامت آجائے گی، لینے کے دینے پڑ جائیں گے پھر سے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا:

میرا یہ مطلب کب ہے۔ یہ بھی کیسے سکتا ہے؟ آپ کو سارا محلّہ بہادر اور شریف مانتا ہے بھلا کوئی بہادر اور شریف شخص بھی چور، ڈاکو اور نقب زن ہو سکتا ہے؟ میں تو صرف یہ بتا رہا تھا کہ آپ میں وہ طاقت اور دبدبہ ہے کہ کوئی بھی آپ کے مقابل نہیں ٹھہر سکتا اگر کس کر ایک مُکّا ہاتھی کے مُنہ پر مار دیں تو دو قدم وہ بھی پیچھے ہٹ جائے گا۔

ارجمند خاں کی وہ خطرناک اور خوفناک کیفیت آن کی آن میں دُور ہو گئی مہربانی اور تلطّف کے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ہمدردانہ لہجے میں ـــ جس میں تقاضے کی جھلک ذرا بھی نہ تھی ـــ دریافت کیا:

وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر آخر کرے گا کیا! جوان آدمی ہے کب تک بیکار بیٹھا رہے گا؟

ماں ہوگا، بہن ہوگا، باپ ہوگا، بھائی ہوگا ان سب کو کہاں سے پائے گا؟ خود اپنی شادی کیسے کرے گا؟ ــ روپے کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا!

یہ باتیں سُن کر مرحوم ماں کا پیار اور زندہ بہن کا افسردہ سا چہرہ نظر آیا اور تھوڑا اداس ہوگیا۔ اس نے نشاط و انبساط کے عالم میں کہا:

ٹھیک کہتے ہیں خان صاحب آپ ــ لیکن اب میرا ستارہ گردش سے نکل چکا ہے ماں باپ مر چکے، بھائی کوئی ہے نہیں، بہن ہے اسے اتنا دوں گا اتنا دوں گا کہ یاد کرے گی عمر بھر۔ شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ کماؤں گا اور گلچھرّے اڑاؤں گا!

شادی نہ کرنے کا عزم سن کر ارجمند خاں ہنسنے لگے۔ انھوں نے اپنا چکّی کے پاٹ کی طرح بڑا سا ہاتھ بالکل اسلم کے منہ کے پاس لے جاکر ہنستے ہوئے فرمایا:

شادی نہیں کرینگا، تم شادی نہیں کرینگا۔ کرنا پڑے گا!

اسلم بھی مذاق کے موڈ میں آگیا تھا ــ کیوں کرنا پڑے گا؟ کچھ زبردستی ہے؟

ارجمند خاں نے جواب دیا: تم جوان ہے، خبصورت ہے، خود نہیں کرینگا تو چھوکری لوگ تم سے شادی رچائے گا ــــ

پھر اسلم کا ردِّ عمل معلوم کئے بغیر وہ زور زور سے ہنسنے لگے۔ اسلم کو بھی ہنسی آگئی اور ہنستے ہنستے بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں کوند گیا، وہ سوچنے لگا۔ کیوں نہ آج خان صاحب سے تعلقات کا ایک نیا باب شروع کیا جائے؟ یعنی کیوں نہ ان سے قرض طلب کیا جائے؟ یہ سوچتے ہی اس نے کہا:

بات یہ ہے خان صاحب اب میں مصنّف بن گیا ہوں۔

خان صاحب نے پوچھا: مصنّف کیا ہوتا ہے؟

پھر کچھ دماغ پر زور دیتے ہوئے فرمایا: تم مصنف بن گیا ہے؟

اسلم پھر ہنسنے لگا۔ اس نے کہا: نہیں مصنف تو نقوی صاحب جیسے لوگ بنتے ہیں، میں تو مصنف ہوں، ناول نویس، ادیب، آرٹسٹ، فن کار ــــ

ارجمند خاں کافی مرعوب ہوتے جا رہے تھے۔ اسلم نے کہا:

میں نے ایک ناول لکھا ہے جسے پبلشر نے بےحد پسند کیا ہے، دو ایک دن میں اگریمنٹ ہو جائے گا۔ دس پانچ دن میں پیشگی رقم مل جائے گی۔ کم سے کم ملی تو بھی پانچسو سے کم نہیں"

اسلم کی قابلیت کے بارے میں خاں صاحب کو کسی طرح کا شبہ نہیں تھا۔ ایک ایک بات پر ایمان لے آئے۔ بہت خوش ہوئے، فرمایا:

یہ تو بہت اچھا ہوتا ــــ اس لئے نوکری سے بھاگتا ہے ــ کتابیں لکھا کرے گا؟

اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے اسلم نے کہا: ہاں خان صاحب یہی بات ہے۔

ارجمند خاں نے بزرگانہ شان سے کہا: اچھا بابا لکھو، خوب لکھو ــ ہمیں بھی دینا، ہم بھی پڑھے گا!

اسلم نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ کہا: سب سے پہلا نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

خان صاحب نے اسلم کی ہتھیلی کی برابر کی گھڑی جیب سے نکالی اور ٹائم دیکھنے کے بعد روانہ ہونے کو تھے کہ اسلم نے روک لیا۔

ذرا ایک مشکل تو آسان کرتے جائیے خان صاحب!

خان صاحب کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ نفسیات کا فن پڑھے بغیر ماہرِ نفسیات تھے۔ سمجھ گئے کیوں روکا جا رہا ہے۔ فرمایا: روپیہ چاہئے کچھ؟

اسلم نے انکار نہیں کیا۔ مسکراتے ہوئے کہا: ہاں روپیہ چاہیے۔

خان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ گن دیئے۔ اور پوچھا: بس۔۔۔؟ بس۔۔۔ یا اور؟

اتنی بڑی رقم دیکھ کر اسلم کے اوسان خطا ہو گئے۔ جب سے کالج چھوڑا تھا آج تک انتہائی محنت کرنے اور لگاتار مصروفِ کار رہنے کے باوجود کبھی اتنی بڑی رقم یکمشت نہیں ملی تھی۔ اور یہ شخص، یہ انسان نما فرشتہ ایک طرف تو قرض کھلا رہا تھا دوسری طرف نقد رقم قرض دے رہا تھا۔ وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں!

روپے دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ہیبت بڑا اس رقم خطیر پر ہاتھ ڈالنے کا، اس نے کہا:

نہیں خان صاحب اتنا روپیہ لے کر کیا کروں گا۔۔۔ دس بہت ہیں!

خان صاحب کو پھر ہنسی آ گئی، اس سے کم لے کر جائے گا تو پٹے گا۔ لو۔۔۔ ہم کہتا ہے لو۔۔۔!

اسلم نے روپے لے لیے۔ خانصاحب چلے گئے لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ اس کے کان میں خان صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔ اس سے کم لے کر جائے گا پٹے گا!۔۔۔ مجھے کہاں جانا ہے؟۔۔۔ یہ رقم کسے دینا ہے؟۔۔۔ اس کی کمی پر کون پیٹے گا مجھے۔۔۔؟ اور پھر دفعتہً کچھ سوچتے سوچتے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کی کان کی لویں تپنے لگیں۔ اسے خان صاحب پر سخت غصّہ آیا۔ لاحول ولاقوۃ! یہ کیا سمجھتے ہیں مجھے۔۔۔؟ کیا میں آوارہ، لچا اور بدمعاش ہوں؟

لیکن خان صاحب جا چکے تھے۔ اسلم کا جی چاہا کہ الٹے پاؤں واپس جائے اور

خان صاحب کی یہ رقم واپس کیوں آئے۔ دو چار قدم وہ ان کی طرف بڑھا بھی۔ پھر سوچا شفقت صاحب سے ایگریمنٹ ہونے کے بعد ہی فوراً رقم کا تقاضا کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ لباس واقعی مجنوں کا لباس ہو رہا ہے، جوتہ شاید وہ پہنتا ہی نہ تھا ورنہ اس معاملے میں بھی اس سے کمپٹیشن کیا جا سکتا تھا۔ پرسوں شفقت کے ہاں لنچ پر بھی جانا ہے، ذرا ٹھاٹھ سے جانا چاہیئے، وہ بھی سمجھیں کہ ہاں یہ شخص بالکل قلاش ہی نہیں ہے۔ آدمی کو اپنی حیثیت تو بہرحال کچھ رکھنی چاہیئے!

یہ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ رقم واپس نہیں کی جائے گی۔ خان صاحب جو کچھ سمجھتے ہیں ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ سمجھیں میں تو جو کچھ ہوں وہی رہوں گا!

وہ پھر پلٹ آیا۔ سینما کا پروگرام ملتوی کر کے سیدھا بازار پہنچا اور ایک دکان سے منہ مانگے دام دے کر ایک اوّل درجے کا سوٹ خرید لیا۔ تیس روپے ختم ہو گئے۔ پھر بھی وہ خوش تھا کہ بیس تو جیب میں ہیں اور جب تک شفقت صاحب سے کوئی معقول رقم پیشگی نہ لے لوں یہ کام دیں گے ــــ بہت ہیں!

یہی باتیں سوچتا وہ سرائے میں پہنچا، دروازہ کھولا اور کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ شام ہو چلی تھی اور ارادہ یہ تھا کہ کچھ دیر لوٹ پوٹ کر پھر ہوا خوری کو نکل جائے گا۔ لیکن بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی اور سو گیا۔

آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ تو سو رہا تھا، روشنی کون کرتا؟ گھڑی میں ریڈیم کی سوئی پر نگاہ گئی۔ آٹھ بجا رہی تھی۔ دل ہی دل میں اپنا مذاق اڑایا۔ واہ بھئی واہ اچھے سوئے! ابھی پورے طور پر آرٹسٹ اور فن کار بنے نہیں لیکن اُن کی ادائیں سیکھ لیں۔ بھلا یہ بھی کوئی سونے کا وقت تھا؟ لیٹے اور سو گئے۔ آرٹسٹ کسی

قید کا پابند تو نہیں ہوتا!

وہ مسکراتا ہوا اٹھا کہ بجلی جلائے اور کچھ لکھے پڑھے طبیعت نا وقت سونے کے باعث کچھ بھاری بھاری سی تھی۔ بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی، سوچا آج کا کھانا غائب!

وہ اٹھ کر سوئچ تک پہنچا تھا کہ پاس کے کمرے سے ایک کمزور سی نسوانی آواز کان میں آئی۔

سلمٰی! کیا کر رہی ہو، اتنی دیر ہو گئی اور چائے تک نہ بنا سکیں ہیں تو نڈھال ہوئی جا رہی ہوں۔ سوچ تو سہی کے دن سے غذا نہیں گئی ہے مُنہ میں!

جواب میں سلمٰی نے کہا: امّی بناؤں کہاں سے؟ چائے ہے کہاں؟ سوچ رہی تھی ابا جی آجائیں تو ان سے منگواؤں! لیکن وہ تو آئے نہیں!

ماں نے بیٹی سے جلے ہوئے لہجے میں کہا، وہ آچکے ــــ انھوں نے معمول بنا لیا ہے صبح ہوئی اور بھاگے اور رات کو جب سب سو گئے تو خود بھی آکر پڑ رہے اس کی فکر ہی نہیں ہم لوگ کس طرح بسر کر رہے ہیں؟!

سلمٰی بولی: امّی یہ نہ کہئے، ہمارے ابا جی کا حال دیکھا نہیں جاتا۔ داڑھی کے بال اور زیادہ اُلجھ گئے ہیں، چہرہ اتنا اتر گیا ہے جیسے مدّتوں کے بیمار، آنکھیں دھنس گئی ہیں میرے خیال میں تو وہ بھی کڑاکے کے فاقے کر رہے ہیں، بیچارے نوکری ڈھونڈنے ہر جگہ جاتے ہیں اور دھتکار دئیے جاتے ہیں۔ امّی مجھے ڈر لگتا ہے کہیں انھیں کچھ ہو نہ جائے۔ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائیں۔ بیمار نہ پڑ جائیں ــــ کتنی محبت کرتے ہیں وہ آپ سے، اقبال سے، مجھ سے، لیکن اب وہ ہم لوگوں کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے سوچتے ہوں گے اپنے بیوی اور بچّوں کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا۔ بیمار

بیوی کی دوا بھی نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکتا، ایسی زندگی سے کیا فائدہ؟ جب وہ جاتے ہیں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور جب تک نہیں آجاتے دھڑکتا رہتا ہے ـــــ امی انھیں ایسا نہ کہئے۔ کاش میرے پاس کچھ روپیہ ہی رہ گیا ہوتا ـــــ تو وہ بھی ان پر قربان کر دیتی۔

سلمیٰ خاموش ہوگئی اور کمرے کی خاموش فضا میں سسکیوں کی ہلکی ہلکی مدھم آواز آنے لگی۔ سلمیٰ نے درد بھری آواز میں کہا:

نہ روئیے، میری امی نہ روئیے! مجھ سے آپ کا حال بھی نہیں دیکھا جاتا۔ ہائے کس طرح آپ کو اچھا کر دوں! کس طرح آپ کا دکھ خود لے لوں! کس طرح آپ کا غم ـــــ

وہی بیمار سی، کمزور سی آواز آئی "سلمیٰ! مجھے کچھ ہو رہا ہے میرے پاس آ، میرے کلیجے سے لگ جا میری بچی!

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے تیز تیز قدم چلتا کوئی آگے بڑھ رہا ہے۔ پھر یہ آواز بند ہوگئی۔ اور سلمیٰ نے کہا:

میری امی! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں ـــــ خدا یہ دن بھی دور کر دے گا، آپ اچھی ہو جائیں گی ـــــ ابا جی کو اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ اقبال پھر اسکول جانے لگے گا!

وہی کمزور اور بیمار آواز پھر پردۂ گوش سے ٹکرائی "نہیں میری بچی، یہ کچھ نہیں ہوگا کم سے کم میری زندگی میں تو ہوگا نہیں!

ایک دردناک آواز آئی "امی ـــــ امی! خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔ ہم سب آپ ہی کے دم سے زندہ ہیں!

وہ بولیں: میں مرجاؤں گی، میں چند دن کی مہمان ہوں۔ اب وہ آئیں تو انھیں جانے نہ دینا، روک لینا، میں ان سے معافی مانگوں گی جب تک وہ معاف نہ کر دیں گے مجھے چین نہ آئے گا۔ ہائے کیوں اتنی چڑچڑی ہو گئی ہوں۔ میری زبان کو کیا ہو گیا ہے اس وقت نہ جانے کیا کیا کہہ گئی اُن بیچارے کو! یہ ساری زندگی راحت، آرام اور عیش سے انہی کے زیر سایہ تو بسر ہوئی ہے۔ انھوں نے میرے لئے کبھی روپے کا منہ نہ دیکھا، ہر آرزو پوری کی، ہر خواہش اپنی خواہش سمجھی! اور میں نے اس وقت نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا انہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی وہ بیچارے نہ جانے کہاں کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے ــــ لیکن بیٹی یہ الفاظ جو میرے مُنہ سے نکلے اپنے لئے نہیں تیرے لئے، اقبال کے لئے۔ تیرا اور اقبال کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا، کسی طرح نہیں دیکھا جاتا!

پھر رونے کی ہلکی ہلکی آواز سسکیوں کے ساتھ آنے لگی۔ پھر سلمیٰ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:

امّی! میں سب کچھ جانتی ہوں، لیکن آپ ہماری فکر ہی نہ کیجئے، یہ کام خدا کا ہے آپ اس کی ذمّہ داریوں میں کیوں شریک ہوتی ہیں؟

ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: اچھا بیٹی ــــ چائے کا پانی اُتار کر رکھ دے پیاس لگ رہی ہے ذرا سا پانی ہی پلا دے!

ابھی لائی امّی!

اور پھر دبی ہوئی سے قدم زور زور سے اُٹھنے لگے گھڑے سے پانی اُنڈیلنے کی آواز آئی۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے پانی کا گلاس لے کر وہ ماں کے پاس جا رہی ہے۔ پھر اس نے کہا:

امّی لیجیے — پی لیجیے بڑا ٹھنڈا پانی ہے!

امّی نے پوچھا: اقبال سوگیا کیا؟

سلمیٰ نے جواب دیا: سوگیا، صبح کے بچے ہوئے دو سلائس رکھے تھے، وہی بہلا پھسلا کر کھلا دیے، بیچارے نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کھا کر پانی پیا اور سوگیا!

(ٹھنڈی سانس لینے کی آواز) اور تجھے تو شاید سلائس بھی میسّر نہ آیا ہوگا!

سلمیٰ نے جواب دیا آگیا تھا۔ امّی مجھے بھوک بھی کم لگتی ہے آجکل!

ماں نے کہا: ہاں جیسے مجھے لگنی بند ہوگئی ہے!

(غٹ غٹ پانی پینے کی آواز) پی لیا بیٹی! اب تو بھی لیٹ جا — اپنے باپ کا دھیان رکھنا اُن سے مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں!

اسلم بغیر روشنی کیے پھر آیا اور دھڑ سے بستر پہ گر گیا!

---

(۲)

بوڑھا باپ

اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ پڑوس کے کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ اب وہاں سے کوئی آواز بات کرنے کی نہیں آ رہی تھی۔

اسلم بستر پہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ اب تک وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ مظلوم سب سے زیادہ بدبخت اور سب سے زیادہ آشفتہ حال سمجھ رہا تھا۔ آج معلوم ہوا کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اس سے آنکھیں ملا سکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اس کی یکتائی چھین سکتے ہیں۔ وہ کچھ جھنجلا سا گیا، اس بات پر کہ زندگی کا کوئی ایسا میدان نہیں ہے جہاں اس کی انفرادیت دوسروں سے بالا، وہ کامگاری، دولت اور خوش بختی میں دوسروں سے بازی نہ لے جا سکا تو نہ لے جا سکا لیکن اس سے بڑھ کر صدمے کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ محرومی، ناکامی اور زبوں حالی میں بھی وہ سب سے آگے نہیں ہے۔ یہاں بھی اُسے پیچھے چھوڑ جانے اور شکست دینے والے لوگ موجود ہیں۔ کیا یہ بدبختی کی انتہا

نہیں ہے؟

اقبال کی ماں نے جو گفتگو اپنی بیٹی سے کی تھی اور سلمیٰ نے اپنے باپ کی جو حسرت بھری تصویر کھینچی تھی، یہ الفاظ برابر اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا: کون لوگ ہیں یہ؟

کس لئے اپنا دیس چھوڑ کر، اپنا کنبہ چھوڑ کر شہر شہر مارے پھرتے ہیں ۔۔ ؟

کیا ان کا کوئی گھر نہیں، کیا ان کا کہیں آسرا نہیں، کیا ان کے پاس کچھ بھی پونجی نہیں؟

نوکری تلاش کرنے کے لئے گھر سے نکلنا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن بیمار بیوی، نوجوان لڑکی اور معصوم لڑکے کو لے کر ملازمت ڈھونڈنے نکلنا، سرائے میں اقامت اختیار کرنا اور وہ بھی اس ٹھاٹھ سے کہ بیوی بیمار پڑی ہے، لڑکا فاقے سے ہے۔ لڑکی جان سے گزری جارہی ہے مگر ملازمت ہے کہ رات کے بارہ بارہ بجے تک تلاش کی جارہی ہے۔ ایسا سربستہ راز ہے جس کے حل کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی!

اسلم نے ایک مرتبہ پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ریڈیم کی سوئی گیارہ کے ہندسے پر چمک رہی تھی۔ ارے گیارہ بج گئے! وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

سارا مزا کرکرا ہوگیا آج ۔۔ آج کی ساری کامیابیاں دکھ اور کوفت سے بدل گئیں۔

کاش میں اس وقت یہاں نہ ہوتا جب ماں بیٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ کتنی دلدوز، کتنی جگر فگار اور کتنی حسرت ناک گفتگو تھی! ایک ایک لفظ کلیجے کے پار ہوا جاتا تھا۔ پردیس اور یہ مصائب! اور ایسا کچا سا تھ ۔۔ واہ ری دنیا ۔۔ یہاں کیا نہیں ہوتا

یہاں سب کچھ ہوتا ہے !

لیکن اب بھوک لگ رہی تھی ۔ اور اس کی شدّت بڑھتی جا رہی تھی ۔ ارجمند خاں کا ہوٹل بند ہو چکا ہوگا ، کوئی پروا نہیں ، جیب میں بیس روپے نقد موجود ہیں ، ان سے تو نہایت شان دار ڈنر کھایا جا سکتا ہے !

لیکن اب تو دوسرے ہوٹل بھی بند ہو رہے ہوں گے ۔ اگر جانا ہے ، اگر کھانا ہے ، جلدی کرنا چاہیئے ۔

ایک مرتبہ پھر اس نے گھڑی دیکھی ، ریڈیم کی سوئی ساڑھے گیارہ پر چمک رہی تھی ابھی وقت تھا ، ابھی کام بن سکتا تھا ـــــ یہ سوچ کر وہ پھرتی سے اٹھا کہ بجلی روشن کرے ، کپڑے بدلے اور باہر جائے ، ابھی وہ سوئچ تک نہیں پہنچا تھا کہ ایسا معلوم ہوا کسی نے پڑوس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے ۔ فوراً اندر سے آواز آئی :

آبا جی آئی ۔

پھر کوئی بستر سے اٹھا اور جا کر کنڈی کھول دی ۔ اب آنے والے اور دروازہ کھولنے والی میں باتیں شروع ہوگئیں ۔

آبا جی آج بھی آپ نے بہت دیر کر دی ۔ دیکھئے تو سہی پونے بارہ ہو رہے ہیں ۔

(افسردہ اور غم گین آواز میں) ہاں ۔ بیٹی آج بھی دیر ہوگئی !

لیکن اس طرح آوارہ گھومتے گھومتے آپ بیمار پڑجائیں گے ، ویسے ہی کون سے تندرست ہیں؟

" بیٹی دعا کر کہ بیمار پڑجاؤں ۔ اور فوراً ہی بیمار پڑتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں ۔ میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا ۔ کیا کروں گا زندہ رہ کر ، جب اپنے پیاروں کے کام نہ آسکا ، اپنے بچّے کا پیٹ نہ بھر سکا ۔ اپنی جان سے زیادہ پیاری بیٹی کو مسکھ نہ دے

سکا۔ اپنی زندگی بھر کی وفادار اور جاں نثار بیوی کے کام نہ آسکا۔ لعنت ہے میری زندگی پر، پھٹکار ہے میرے جینے پر!

(گلوگیر آواز میں) ابا جی ایسی باتیں نہ کیجئے۔

ایسی باتیں نہ کروں؟

جی ابا جی ایسی باتیں بالکل نہ کیا کیجئے!

ایسی باتیں نہ کروں، ایسی باتیں نہ کیا کروں، تکلیف ہوتی ہے تجھے؟ آنسو آجاتے ہیں تیری آنکھوں میں ـــ کیوں بیٹی؟

(اور زیادہ مغموم اور دل گرفتہ لہجے میں) جی۔

اچھا بیٹی چپ رہوں گا۔ اب کچھ نہیں کہتا۔ سوچا ـــ میں بھی سوچتا ہوں۔ نہ جانے تیری ماں کا کیا حال ہے؟

وہی حال ہے۔

وہی حال ہے۔ وہی دیرینہ بیماری ـــ وہی ناتحکمی دل کی!ـــ لیکن جس آب سے اس کا علاج ہوتا ہے وہ کہاں سے لاؤں ـــ اگر ہم دونوں ایک ساتھ مر جائیں اُدھر فاخرہ آخری ہچکی لے ــــــــ اِدھر تیرا باپ آنکھیں بند کر رہا ہو

(ہراساں لہجے میں) چپ رہیے۔

نہیں بیٹی مجھے بولنے دے، میرے دل کا بخار نکلنے دے۔

خدا سے دعا کیجئے۔ وہ مدد گار ہے، وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔

سچ کہتی ہے بیٹی خدا کو اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے ہماری مدد کرے ہماری! سُنے

ابا جی ـــ یہ آپ کہہ رہے ہیں ـ کیا آپ خدا سے بھی بدگمان ہیں ! !

نہیں ـ خدا سے بدگمان ہو کر کہاں جاؤں گا ـ لیکن وہ کیوں ہماری سُنتے !

نہیں سُنتا ـ ہم مجبور ہیں کچھ نہیں کر سکتے ـ میرے بس میں اس کے سوا کیا ہے کہ !

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھتا !

خدایا کتنا غیر متزلزل عقیدہ ہے آپ کا ـ خدا کی کارفرمائیوں کے کیسے کیسے واقعات سُنایا کرتے تھے آپ ـــ اور آج ؟

اور آج کیا ـ آج کیا بیٹی، کیا تو مجھ پر کفر کا فتویٰ لگانے والی ہے ؟ کیا میرے اور خدا کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دینا چاہتی ہے ـ نہیں بیٹی ایسا نہ کر ـــ باپ کے خلاف خدا کو غضب میں لانے کی کوشش نہ کر ـــ !

ابا جی ـ آج کیا ہو گیا ہے آپ کو ـــ کبھی اور تو ایسی باتیں نہیں کی تھیں آپ نے !

آج میں پاگل ہو گیا ہوں بیٹی ـ آج میں دیوانہ ہو گیا ہوں ـ آج میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں آج میں سب سے خفا ہوں ـ تجھ سے، تیری ماں سے ـ اقبال سے ، خود اپنے آپ سے ـــ اور خدا سے بھی !

یہ کیوں ـــ کیوں سب سے ، خدا تک سے خفا ہیں آپ ؟

اس لئے ـــ اس لئے کہ میں سب سے مایوس ہو گیا ہوں ـــ نہ خدا سے امید ہے نہ دُنیا والوں سے ـ جانتی ہے بیٹی آج کیا ہوا ، کیا گزری مجھ پر ؟

نہیں جانتی ـ لیکن جو کچھ گزرنا تھی گزر گئی ـ اب اسے یاد کرتے سے ، پریشان ہونے سے ، اس کا ذکر کرنے کیا حاصل ؟

اس کا تعلق میری زندگی سے ہے ، تیری زندگی سے ہے ، سارے گھر کی

ہاں بیٹی ۔ سُن رہا ہوں !

کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ راجہ صاحب آدھی یا پوری تنخواہ پیشگی دے دیں پھر ساری پریشانیاں رفع ہو جائیں گی ۔

بیٹی ! کیا تو سمجھتی ہے کہ میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا ؟

تو آپ نے راجہ صاحب سے کہا تھا ؟

کہا تھا ــــ بے وقوف راجہ صاحب سے کہا نہیں جاتا، عرض کیا جاتا ہے ۔ استدعا کی جاتی ہے، التجا کی جاتی ہے ۔ میں نے عرض کیا تھا گڑگڑا کر جیسے تیری ماں مصلّے پر بیٹھ کر خدا سے عرض کرتی ہے ۔ میں نے استدعا کی تھی جیسے چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتے ہیں ۔ میں نے التجا کی تھی جیسے فقیر بھیک مانگتے ہیں ۔

(اکتا کر) تو کیا ہوا ؟ راجہ صاحب نے کچھ دیا ؟

ہاں رحم آ گیا بچارے کو مرزا اسکندر علی بیگ پر ۔ انھوں نے مرزا صاحب پر ایک نظر ڈالی ۔ اس نظر میں حقارت بھی تھی اور رحم بھی، پھر اپنے پیشکار سے کہا ۔ انھیں تیس روپے دو ۔

(خوش ہو کر) یا اللہ تیرا شکر ہے ۔ پھر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں ابا جی ! میں اس رقم میں سارا کام چلا لوں گی ۔ بچارہ اقبال بھوکا سو گیا آج ؟

صرف اقبال ہی کیا، کیا تو نے پلاؤ زردہ کھایا ہے، کیا تیری ماں نے بریانی اور باقرخانی نوش کر لی ؟ کیا میرے لئے تو نے الوان نعمت تیار کر رکھے ہیں ؟ ــــ ہم سب بھوکے ہیں اقبال ہی کیا بھوکا ہے !

جی ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر خیر اب کوئی بھوکا نہیں رہے گا ۔ اب سب کھائیں گے

کیا کھائیں گے ــــ کیا مٹی پھانکیں گے ؟

کیوں ! ــــ وہ روپے جو ہیں !

(ہلکا سا جنون آمیز قہقہہ) تیس روپے !

ابا جی وہ تیس روپے کہاں ہیں ؟ (پریشان ہوکر) کیا آپ نہیں لائے ؟

کیوں نہیں لایا ؟

(بہت زیادہ پریشان ہوکر) لیکن کیا ابا جی ــــ روپے دیجیے ۔ لائیے !

(زہرخند کے ساتھ) دیکھ بیٹی ! دیکھا تو نے ۔ دیکھ لیا تو نے یہ کیا ہے ؟

(حد درجہ افسردہ، غمگین اور گریہ آلود آواز) جیب ــــ کٹی ہوئی جیب !"

"ہاں بیٹی یہ جیب ہے ! کٹی ہوئی جیب ۔ کسی چالاک دست نے میری جیب کاٹ لی ۔ اور تیس روپے اڑالئے ۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہوگا ! شکر ہے میرے ذریعے اس کی ضرورت رفع ہوگئی !

(حسرت کے ساتھ) ابا جی، کیا سب روپے لے گیا وہ ؟

(جذبۂ رحم کے ساتھ) ہاں میری بچی، کیا چھوڑ جاتا ؟ کیا گرہ کٹ لوگ اتنے منصف ہوتے ہیں کہ جیب تراش لینے کے بعد آدھوں آدھ کرلیں ۔ نہیں بیٹی ایسا نہیں ہوتا ۔ صرف تیس روپے ہی نہیں گئے ۔ جیب بھی گئی ! ــــ دہن کا ذکر کیا یاں سر بھی غائب ہے گریباں سے !

اب کیا ہوگا ابا جی ؟

بیٹی ادھر آؤ میں بتاؤں کیا ہوگا !

یہ آواز فاخرہ کی تھی ۔ سلمیٰ باپ کو وہیں چھوڑ کر ماں کے پاس گئی ۔ ذرا دیر کے

بعد پھر واپس آگئی۔ باپ نے پوچھا:

کیسی ہیں تیری ماں؟ — کیوں بُلایا تھا تجھے؟

یہ دو سونے کی چوڑیاں ہیں یہ دی ہیں کہ انھیں بیچ ڈالو۔ اور کام چلاؤ۔ اللہ اور دے گا تو دوسری بن جائیں گی۔

چوڑیاں! — ذرا دکھانا تو بیٹی!

لیجئے — یہ رہیں۔

نہیں بیٹی یہ نہیں بک سکتیں! انھیں بیچ کر تو میں کفن خریدنے کے لئے بھی تیار نہیں! تو نہیں جانتی ان چوڑیوں کے ساتھ ایک تاریخ وابستہ ہے۔

تاریخ! — میں تو نہیں جانتی آبا جی!

میں جانتا ہوں — میں کبھی نہیں بھول سکتا — یہ چوڑیاں تین سو روپے کی میں نے خرید کر فاخرہ کو دی تھیں۔ خود فاخرہ نے انھیں پسند کیا تھا اور ضد کر کے مجھ سے منگایا تھا۔ تو اس وقت بچّہ تھی جب فاخرہ یہ چوڑیاں دیکھ رہی تھی، اور خوش ہو رہی تھی۔ اور پہننے ہی والی تھی کہ کھیلتی کھیلتی تو آگئی۔ تو — سلمٰی تو — میری بچّی (گریہ گلوگیر ہوگیا) تو تو نے چوڑیاں دیکھ کر چھین لیں ماں کے ہاتھوں سے، اس نے مانگیں، نہیں دیں۔ میں نے بھی کہا تو ضد پر اڑی رہی اور پھر تو نے، میری معصوم بچّی نے بڑے بھولے پن کے ساتھ کہا: امّی! یہ چوڑیاں جب میں دلہن بنوں گی تب پہنوں گی، آپ نہیں پہن سکتیں انھیں۔ یہ میری ہیں، انھیں ہاتھ نہ لگائیے۔ (رونے لگے) اور فاخرہ نے انھیں فوراً ڈبے میں بند کر دیا۔ اس نے تجھے گلے سے لگالیا، خوب سا پیار کیا اور کہا: ہاں بیٹی یہ تیری ہیں۔ میں ہاتھ نہیں لگاؤں گی انھیں — دُلہن بن کر اللہ چاہے گی تو پہنے گی —

(آواز اور زیادہ گریہ آمیز ہوگئی) میں نے لاکھ لاکھ اصرار کیا، سمجھایا۔ دوسری ایسی ہی چوڑیاں لا دینے کا وعدہ کیا، لیکن فاخرہ نے، تیری ماں نے میری ایک نہ سنی۔ اس نے کہا یہ تو اب سلمیٰ کی ہوگئیں اور میں نے کہا ایسی دوسری لا دوں گا۔ وہ بولی۔ نہیں سلمیٰ یہ بھی نہیں چاہتی کہ ایسی چوڑیاں میں پہنوں، میں اس کا دل میلا نہیں کر سکتی ۔ (سسکیاں) اس نے ایک نہ سنی، چوڑیاں سینت کر رکھ دیں۔ بڑے بڑے نازک وقت آئے، گھر نیلام ہوگیا، برتن بک گئے، کڑاکے کے فاقے گزر گئے، میں بیمار پڑا، اقبال بیمار پڑا خود چارپائی سے لگی پڑی ہے۔ لیکن آج تک اس نے یہ امانت اپنے کلیجے سے لگائے رکھی۔ ہوا تک نہیں دی، میں تو بھول بھی گیا تھا انھیں، مجھے تو یاد ہی نہیں تھی لیکن آج۔ آج وہ خیانت پر مجبور ہوگئی۔ آج میرا حال زار سن کر وہ یہ آخری پونجی بھی داؤ پر لگانے اور ہارنے کے لئے تیار ہوگئی۔ وہ مجھ سے خفا ہے، مجھ سے بات بھی نہیں کرتی۔ شاید اس کا خیال ہے میں جی سے نوکری تلاش نہیں کر رہا ہوں۔ شاید اس کا خیال ہے گھر سے باہر نکل کر کچھ کھا پی لیتا ہوں لیکن بیٹی اس کا خیال صحیح نہیں۔ قسم لے لے کہ صبح سے اب تک چائے کی ایک پیالی بھی پی ہو، دیکھنا اس وقت بھی اس نے تجھے بلایا مجھے نہیں۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی، شاید مجھ نکمّے نکھٹّو کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی

دفعتہً تیز تیز سانسوں کے چلنے کی آوازیں اور گلے میں اٹک جانے والی کھنکار سنائی دی۔ سلمیٰ بھاگی بھاگی گئی اور پھر اس کی دردناک آواز آئی:

ابّا جی — ابّا جی! ادھر آئیے — امّی! —

لیکن مرزا سکندر علی بیگ کے قدموں کی آواز نہیں آئی۔ وہ اپنی جگہ پر پھر کھڑے رہے۔ پھر انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا:

آپا جی ۔ کیا امی مر گئیں ؟

ہاں بیٹی وہ مر گئی ۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ سے فریب کیا وہ مر گئی اور مجھے زندہ چھوڑ گئی ۔ وہ روٹھ گئی مجھ سے ، لیکن کیوں ؟ کیا خطا کی تھی میں نے ۔۔۔ میں نے کبھی اس کا دل میلا نہیں کیا تھا کبھی اُسے ناراض نہیں کیا تھا کبھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا !

آپا جی امی مر گئیں ؟

ہاں بیٹی ! وہ مر گئی ۔۔۔ مجھے زندہ درگور کرنے کے لئے ۔۔۔ اب تک ہر بوجھ اس کے کمزور لیکن مضبوط کندھوں پر تھا ۔ اب یہ بوجھ مجھ پر ڈال گئی !

آپا جی ! (سسکیاں) امی مری نہیں ہیں ۔ وہ ایسی کچھ بیمار بھی تو نہیں تھیں ۔ کسی حکیم کو بلائیے ، کسی ڈاکٹر کو بلائیے ۔ شاید وہ بچ جائیں ، شاید کسی کا علاج کارگر ہو سکے

ہا ! بیٹی تو بھی مذاق کرتی گی اپنے باپ کا ! حکیم کو بلاؤں ؟ ڈاکٹر کو لے آؤں

ہاں آپا جی جلدی کیجئے ۔۔۔ خدا کے لئے جائیے !

(تھکی ہوئی آواز میں) اچھا جاتا ہوں ۔۔۔ جاتا ہوں بیٹی ۔۔۔ لیکن جب وہ دیکھ چکے گا تو فیس دینے کی بجائے اپنی کٹی ہوئی جیب دکھادوں ؟ وہ پیدل تو نہیں آئے گا ؟ تانگے پر آئے گا ، ٹیکسی میں آئے گا ، کرایہ دیتے وقت بھی اپنی کٹی ہوئی جیب دکھادوں ؟

(روتے ہوئے) یا اللہ اب کیا ہوگا ؟ کیا ہو گیا میرے خدا !

کوئی نئی بات نہیں ہوئی بیٹی ، یہ ہوتا ہی رہتا ہے ۔ ہر روز نہ جانے کتنے لوگ مرتے رہتے ہیں ، اب سوال فاخرہ کے مرنے کا نہیں ہے ، یہ غم تو زندگی بھر کا ہے ۔

ابا جی اس وقت بھی کچھ دوسرے خیالات آرہے ہیں آپ کے دل میں۔ آپ بالکل نہیں چاہتے تھے امّی کو — میری امّی کو!

پھر وہ رونے لگی اور مرزا سکندر علی بیگ بھی رونے لگے اور روتے روتے کہنے لگے۔ بیٹی تو نے میرے دل پر گھونسہ مار دیا۔ ناعزہ زندہ ہوتی تو وہ بھی تیرا منہ نوچ لیتی میں محبت نہیں کرتا تھا اس سے! — میں؟ اگر مُردے بول سکتے ہوتے تو وہ خود بھی گواہی دیتی!

"ابا جی بھول ہوگئی مجھ سے، انھوں نے آپ کے آنے سے پہلے گواہی دی تھی، مجھے یاد آگیا۔ وہ خود بھی تو محبت کرتی تھیں آپ سے!

(بھرّائی ہوئی آواز میں) ہاں کرتی تھیں — سوال یہ ہے کہ تجہیز و تکفین کے لئے کیا ہوگا —؟ کفن کون اُدھار دے گا! قبر کون اُدھار دے گا۔ لکڑی کے تختے کہاں سے اُدھار آئیں گے؟ — دیکھا بیٹی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی رفیقۂ حیات کے مرنے پر اپنی محبوبہ کے مرنے پر اپنے پیارے بچوں کی ماں کے مرنے پر، روتے نہیں بین نہیں کرتے، گریبان نہیں پھاڑتے، آہ وفغاں نہیں کرتے، یہ سوچنے لگتے ہیں۔ یہ دفن کیسے ہوگی؟ اُسے دفن کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ روپیہ، روپیہ، روپیہ ہر کام میں روپیہ، زندہ رہنے کے لئے روپیہ، مرنے کے لئے روپیہ — اُف میرے خدا تو نے کیوں پیدا کیا تھا روپے کو؟ — آہ!

"ارے ابا جی غضب ہوگیا، اقبال جاگ گیا۔ ادھر آرہا ہے۔ اسے کیسے روکوں؟ اسے کیسے بہلاؤں، وہ تو امّی پر فدا تھا، کن الفاظ میں —

"آپا تم کیوں رو رہی ہو؟ ابا جی کیوں رو رہے ہیں؟ کیا امّی مرگئیں؟

بگلا ــــ زندہ ہیں ــ بیہوش ہوگئی ہیں ـ

جھوٹ ــــ میں بڑی دیر سے جاگ رہا ہوں، تمھاری باتیں سُن رہا ہوں ــ امّی مرگئیں ـ اور پھر وہ رونے لگا ـ

روتے روتے سلمیٰ اُسے سمجھانے لگی، دیکھو، روتے نہیں، اللہ میاں خفا ہوں گے اور پاس پڑوس والوں کی نیند خراب ہوگی، وہ کیا کہیں گے ـ

اقبال رونے کے لئے مچلا ہوا تھا، اس نے کہا: کہنے دو ہم تو روئیں گے ـ تم بھی تو رو رہی ہو، وہ اسے تسلّی دیتی ہوئی بولی میں تو چپکے چپکے رو رہی ہوں!

وہ کہنے لگا: ہم سے چپکے چپکے نہیں رویا جاتا!

اور یہ کہہ کر وہ چیخ چیخ کر رونے لگا ـ

درحقیقت وہ اب تک مرنے کی ماہیت کا اور اس کی اذیّت کا پورا پورا اندازہ نہیں لگا سکا تھا ـ جو فاخرہ کی موت سے اُسے پہنچا تھا ـ کچی نیند سے آنکھ کھلی، پھر باپ کو بلکتے اور بہن کو روتے اور ماں کے مرنے کا سُنا تو آکر شریکِ نواسنجی ہوگیا ـ ورنہ اس کے رونے میں وہ جذب و خلوص نہیں تھا، جو سلمیٰ کے رونے میں تھا ـ وہ پھوٹ پھوٹ کر نہیں روئی تھی، لیکن شدّتِ غم اور شدّتِ گریہ سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی، دُنیا اس کی آنکھوں میں تاریک تھی، لیکن حتیٰ الامکان ضبط سے کام لئے جا رہی تھی ـ وہ رو رو کر اپنے دُکھی باپ کو اور زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی ـ نہ اقبال کو رونے کا موقع دینا چاہتی تھی ـ لیکن آنسو نکلے ہی جا رہے تھے ـ دل بیٹھا جا رہا تھا ـ وہ بار بار اقبال کو اپنے سینے سے لگاتی تھی، اسے تسلّی دینے کے لئے نہیں ـ وہ کیا اور اس کا غم کیا خود تسلّی پانے کے لئے،

اور مرزا اسکندر علی بیگ صاحب با دیدۂ گریاں، با چشمِ حیراں، با حالِ پریشاں اِدھر اُدھر تکے جا رہے تھے، کبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سفید چادر اوڑھے ہوئے ہمیشگی کی نیند سونے والی رفیقۂ حیات کو دیکھتے، کبھی لختِ جگر سلمیٰ کو روتے اور روتا رو کنے کی کوشش کرتے دیکھتے اور کبھی اقبال کو بہن کے شانے سے لگے روتے اور چپ ہوتے، چپ ہوتے اور روتے دیکھتے۔ اور وہ خود اب تک کچھ نہ کر سکے سوا اس کے کہ اداس و مغموم کھڑے تھے، جیسے جواری اپنی آخری پونجی ہار چکا ہو اور اب ملول و متاسف کھڑا ہو، نہ آگے بڑھنے کا یارا نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ ـــ آخری پونجی ہاری جا چکی تھی۔ اب تھا کیا جس کے برتے پر کچھ سوچا جاتا۔

رات کی حکومت اب تک قائم تھی مگر کچھ زوال آشنا ہو چلی تھی۔

اسلم کے کمرے میں اندھیرا اب تک چھایا ہوا تھا، اور وہ بدستور سوئچ کے پاس کھڑا تھا۔ اُسے یہ احساس تک نہ تھا کہ اتنی دیر سے کھڑے کھڑے پاؤں تھک چکے ہیں اور وہ نڈھال ہوتا جا رہا ہے۔

دفعتہً ایک دھماکے کی آواز آئی اور اوسان خطا کر دینے والی ایک چیخ اس سنسان فضا میں بلند ہوئی۔

ہائے میرے اللہ یہ کیا ہو گیا، ہائے میرے آبا جی!

اور پھر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسلم سمجھ گیا، صورتِ احوال کیا ہے؟ خاموش رہنا، ضبط کرنا، اس کے لئے یہ بھی ناممکن ہو گیا۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور مرزا صاحب کے کمرے کے دروازہ پر پہنچ کر اس نے زور سے آواز دی: اقبال! ـــ اقبال!!

مگر کوئی جواب نہ ملا۔ مرزا صاحب کی اہلیہ مری پڑی تھیں۔ مرزا صاحب بیہوش پڑے تھے، سلمیٰ کو شدتِ گریہ سے تابِ تکلم نہ تھی۔ اور اقبال سوالیہ نظروں سے بہن کی طرف دیکھ رہا تھا کہ جواب دوں یا نہ دوں؟

اسلم نے پھر اور زیادہ زور سے پکار کر کہا،

اقبال — اقبال — پردہ کرلو — میں آرہا ہوں!

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ زور زور سے پاؤں رکھتا اندر داخل ہوگیا۔ سلمیٰ نے وہ چادر جو سر پر پڑی تھی سر سے پاؤں تک اوڑھ لی۔ اور منہ ڈھانک کر بیٹھ گئی۔ اقبال اس کے جسم سے ہٹ کر لیکن بالکل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اسلم آیا، اس نے آتے ہی مرزا صاحب پر ایک نظر ڈالی، پھر ان کی نبض ٹٹولی۔ گو کمزور تھی لیکن چل رہی تھی۔ وہ کچھ کہنے والا تھا کہ سلمیٰ نے اسی طرح چادر میں لپٹے لپٹے اندوہ گیں آواز میں پوچھا:

کیسے ہیں میرے ابا جی؟ — کیا زندہ ہیں، خدا نہ کرے انھیں تو کچھ نہیں ہوگیا؟

اسلم نے تسلی دی، زندہ ہیں، غم کی شدت سے بیہوش ہوگئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوش آجائے گا۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ والدہ کے انتقال کا مجھے بہت صدمہ ہے

پھر وہ اقبال سے مخاطب ہوا: اقبال میاں ہماری تمھاری دوستی ہے، جو بات ہو جو ضرورت ہو، جو کام ہو، آدھی رات کو بھی مجھے جگا سکتے ہو؟

اس کے بعد پھر اس نے بغیر کسی کو مخاطب کئے لیکن درحقیقت سلمیٰ کو مخاطب کرکے کہا:
ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد والدہ کی آخری منزل کا بھی انتظام ہوجائے گا کسی طرح کی فکر کی ضرورت نہیں۔

اور پھر وہ باہر چلا گیا، جاتے جاتے اس نے کہا:

میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں، دوسرے انتظامات بھی ہو جائیں گے اقبال میاں!

اقبال میاں اپنے اس رتبۂ بلند پر بہت خوش تھے کہ بہت جلد اقبال سے اقبال میاں ہو گئے۔ ماں کی جدائی کا غم اور کم ہو گیا۔ اسلم کے چلے جانے کے بعد اقبال نے سلمیٰ کو بتایا:

یہی ہیں وہ اسلم صاحب جن سے اس روز ماچس لا کر میں نے دی تھی تھیں!

سلمیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اقبال کو جب اپنی بات کا جواب نہ ملا تو اس نے پھر ایک سوال کر ڈالا:

انھیں امّی کے مرنے اور ابّا کے بیہوش ہونے کا پتا کیسے چل گیا آپا؟

لیکن آپا کو رونے سے کہاں فرصت تھی جو اس سوال جواب سے کوئی دلچسپی لیتی!

اس نے اس کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا:

چُپ رہو اقبال!

اقبال چُپ ہو گیا۔ پھر وہ کہنے لگا:

ذرا پانی لا دو حلق خشک ہوا جا رہا ہے۔

اقبال ایک پورا کٹورا پانی کا بھر کر لے آیا۔ اور سلمیٰ نے ایک ہی سانس میں پی لیا جیسے نہ جانے کتنے دن کی پیاسی تھی!

اقبال کو پھر شکایت پیدا ہوئی، کہنے لگا: سب پی لیا، میں بھی تو پیتا!

سلمیٰ نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا: جاؤ پی لو!

دفعتہً اقبال کی نظر مرزا صاحب پر گئی، کہنے لگا: ابّا جی یہاں کیوں لیٹے

ہیں ؟

وہ بولی : بیہوش ہو گئے ہیں اقبال کے غم میں !

پھر دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی : ڈاکٹر بھی نہیں آیا اب تک !

(۴)

آخری منزل

تھوڑی دیر کے بعد اسلم ڈاکٹر کو لے کر آ گیا، ڈاکٹر نے فاخرہ کو دیکھا اور نہایت افسوس کے ساتھ مرزا صاحب کے اعلان کی تصدیق کر دی۔ ڈاکٹر کے آنے کے بعد امید کا دیا سلمیٰ کے نہاں خانۂ دل میں پھر ٹمٹمانے لگا تھا شاید امی زندہ ہوں! لیکن ڈاکٹر کی تصدیق کے بعد بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔

مرزا صاحب کی نبض دیکھ کر ڈاکٹر نے اسلم کے خیال کی تصدیق کر دی:۔

صدمے سے متاثر ہو کر بیہوش ہو گئے ہیں، بڑھاپا اور پھر یہ غم! دل کی حالت ٹھیک ہے نبض کی رفتار بھی درست ہوتی جا رہی ہے، کچھ دیر کے بعد ہوش آ جائے گا!

اسلم نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا، انھیں باہر تک لے کر آیا، دو روپے تانگے والے کو دیے، دس روپے ان کی فیس کے دیے۔

ڈاکٹر صاحب کو رخصت کر کے سیدھا منیجر صاحب کے بالاخانے پر پہنچا۔ وہ اب تک

مست خوابِ خرگوش تھے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین مرتبہ کھٹکھٹانے کے بعد آنکھیں ملتے، برہمی کے عالم میں برآمدہ میں آئے۔ لیکن اسلم کو سامنے کھڑا دیکھ کر برہمی کو ضبط کیا اور فوری طور پر خوش اخلاق بن گئے۔ منیجر صاحب دنیا میں اتنے کسی سے خائف نہیں تھے جتنے اخبار والوں سے، کبھی کبھی ان کے خلاف یا ان کے مسافر خانے کے خلاف کوئی رپورٹ کسی اخبار میں نکل جاتی تھی تو بھاگے بھاگے پھرتے تھے، کبھی کبھی تو اسہال کی شکایت بھی لاحق ہو جاتی تھی۔ اسلم گو فی الوقت کسی اخبار کا ایڈیٹر نہیں تھا۔ لیکن رہ تو چکا تھا۔ اور نہ جانے کب پھر "قوم" کا یا کسی دوسرے اخبار کا ایڈیٹر ہو جائے۔ ایڈیٹر کی تلوار کبھی کند نہیں ہوتی نہ کبھی میان میں جاتی ہے۔ یہی سب سوچ کر نیاک کے ساتھ اس طرح گویا ہوا جیسے اس قدر نا وقت اٹھا کر اسلم نے بہت بڑا احسان کیا ہے۔

ارے، اسلم صاحب آپ، اس وقت؟ خیریت ہے!

اسلم نے افسردگی اور پریشانی کے لہجے میں کہا: خیریت ہی تو نہیں ہے،

اس طرح آمادہ ہو کر جیسے اس کے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ کر لانے کو تیار ہیں، فرمایا:

تو کہئے، کیا بات ہے؟ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

اسلم نے اسی افسردہ اور مغموم لہجے میں کہا: میرے پڑوس میں مرزا اسکندر علی بیگ رہتے ہیں ــــ!

ہاں ہاں بیچارے شریف آدمی ہیں ــــ پریشان بہت رہتے ہیں۔ نہ معلوم کیوں؟

منیجر صاحب نے شرافت کی تعریف اس لئے نہیں کی تھی کہ مرزا صاحب واقعی شریف

تھے، اس لئے کی تھی کہ نہایت رازداری کے ساتھ دو مہینے سے پندرہ روپے ان کی جیب میں ڈال دیا کرتے تھے۔

جی ہاں، بڑے شریف آدمی ہیں، بیچارے کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا!

بہت پریشان اور مضطرب ہوکر منیجر صاحب نے فرمایا:

انتقال ہوگیا؟ کب؟ کس بیماری میں؟ کہیں ہیضہ تو نہیں ہوگیا تھا؟

منیجر صاحب کی چھٹی حس نے انھیں بتادیا تھا کہ وہ ہیضے ہی میں مریں گے لہٰذا اس مرض کے مریضوں کی بڑی فکر رکھتے تھے، اسلم نے اطمینان دلایا:

نہیں — عرصے سے بیمار تھیں بیچاری، اور اس حادثہ کے باعث خود مرزا صاحب بیہوش ہوگئے ہیں۔ بستر پر مُردہ پڑے ہیں۔ ابھی ڈاکٹر کو میں لایا تھا اس نے اطمینان تو دلایا ہے کہ ہوش آجائے گا!

پھر قبل اس کے کہ منیجر صاحب کچھ کہیں، اسلم نے کہا:

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان کی اہلیہ کی تجہیز وتکفین کا ہے، وہ جلد از جلد ہونی چاہیئے۔ آپ مجھے پچاس روپے دے دیجئے اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن شام کو شفقت صاحب سے لے آؤں گا اور آپ کو دے دوں گا!

منیجر صاحب بغیر کسی تامّل کے تیار ہوگئے ضرور ضرور، شوق سے، ابھی حاضر کرتا ہوں آپ تشریف رکھیں!

اسلم وہیں کھڑا رہا۔ اور ذرا دیر میں منیجر صاحب پچاس روپے لے کر تشریف لے آئے۔ انھوں نے رقم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

یہ لیجئے۔ کوئی اور خدمت؟

اسلم نے کہا : جی ہاں ، ایک زحمت اور دینا چاہتا ہوں ، کسی عورت کا بندوبست کر دیجئے جو ان کی میت کو غسل دے سکے ۔

ذرا دیر کے لئے تیوری چڑھا کر منیجر نے کچھ سوچا ، پھر ارشاد فرمایا : ہو جائے گا ۔ قریب ہی ایک عورت رہتی ہے ۔ وہ یہی کام کرتی ہے ۔ ابھی بلوائے دیتا ہوں ۔ پانچ روپے لے گی !

اسلم نے کہا : کوئی مضائقہ نہیں !

اور پھر کچھ سوچ کر وہ گویا ہوا : لیکن دفن کہاں ہوں گی ؟ میں تو اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا !

منیجر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا : اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا ، اپنے آدمی کو قبرستان بھیجے دیتا ہوں ۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں قبر تیار ہو جائے گی ۔ قبر کھودنے والے دس روپے لیں گے ۔

اسلم اس پر بھی تیار ہو گیا ، بہت بہتر ، دس روپے دے دئے جائیں گے لیکن یہ کام بہت جلد ہونا چاہیئے ۔ ویسے بھی حدیث میں آیا ہے کہ میت کو دفن کرنے میں جلدی کرنی چاہیئے ۔ اور مرحومہ کے انتقال کو کئی گھنٹے بھی گزر چکے ہیں ۔ اور جب تک اس کی لاش رکھی رہے گی مرزا صاحب ہوش میں آ آ کر بے ہوش ہوتے رہیں گے ۔ اقبال برابر روتا رہے گا اور سلمی کے آنسو بھی نہیں تھمیں گے ۔

لڑکی کا نام سن کر منیجر صاحب ذرا سے چونکے ، ان کا خیال تھا دال میں کچھ کالا ہے ۔ نہیں ہے تو ہونے والا ہے ، لیکن یہ باتیں دل میں رکھی جا سکتی تھیں دوسروں سے ان کا تذکرہ کیا جا سکتا تھا مگر خود متہم شخص سے اس بارے میں کچھ کہنا مناسب نہ تھا ۔

فرمایا:

جی ہاں اور کیا۔ مطمئن رہیئے، سارا بندوبست ہو جائے گا۔

اسلم نے شکریہ ادا کیا اور کہا: تو اب میں کفن لینے جاتا ہوں۔

منیجر صاحب نے جیسے اُسے چھیڑتے ہوئے پوچھا: کتنا کپڑا لائیے گا؟

اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے آسان نہ تھا، ان الجھنوں میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کا مُنہ تکنے لگا۔ پھر منیجر صاحب کے ہونٹوں پر تبسّم کھیلنے لگا۔ انھوں نے فرمایا:

آپ جائیے اپنے کمرے میں بیٹھ جائیے، میں درزی کو بلائے دیتا ہوں، وہی کپڑا بھی حسب ضرورت لیتا آئے گا، جو دام ہوں گے وہ لے لے گا!

بہت بڑا بوجھ اتر گیا اسلم پر سے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کیا اور چُپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اقبال دروازے پر کھڑا تھا۔ اُسے بھی اپنے ساتھ کمرے میں لیتا آیا!

نئی دنیا

نئی زندگی

نئی کہانی

حیرت کی آنکھ سے اسے دیکھا کرے کوئی!

سر پہ کلاہِ کج دھری زلفِ دراز خم بہ خم

آہوئے چشم ہے غضب ترکِ نگاہ ہے ستم!

عشوہ وہ ظلم دوست ہے قتل کرے جو بے چھری

ناز وہ دشمنِ وفا رحم کی جس کو ہے قسم!

نرگسِ پُرخمارِ یار کرتی ہے کام زہر کا،

بادۂ خوشگوار میں گھول دیا کسی نے سم!

یاس پہ یاس ہر گھڑی چوٹ پہ چوٹ رات دن

درد پہ درد، دکھ پہ دکھ رنج پہ رنج، غم پہ غم!

(۱)
سودا

سارا کام خیر و خوبی کے ساتھ انجام پا گیا۔ مرزا صاحب اسلم کی شرافت اور انسانیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسے سینے سے لگا کر شکریہ ادا کرنے کے بجائے رونے لگے۔ صرف اتنا کہہ سکے:

اگر دُنیا میں تم جیسے لوگ نہ ہوں تو خدا کا قہر و غضب اس کائنات کو ختم کر دے!

اسلم مطمئن تھا، خوش تھا کہ اس نے مرزا صاحب کی اس نازک مرحلے پر مدد کی!

لیکن اب سب سے مشکل منزل درپیش تھی، ارجمند خاں سے جو پچاس روپے لئے تھے وہ ادا کرنے تھے، مسافر خانہ کے منیجر سے جو روپے لئے اُن کی ادائیگی کرنی تھی۔ کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی بہانہ سے مرزا صاحب کو بھی کچھ نہ کچھ دینا تھا کہ کام چل سکے۔ آخر اُن کا ان کی لڑکی اور لڑکے کا پیٹ کس طرح بھرے گا؟

مُلّا کی دوڑ مسجد، شفقت صاحب یاد آئے۔ اس نے سوچا۔ اگرچہ کچھ اچھا نہیں معلوم

کہ ابھی سے رقم طلب کر لی جائے لیکن حالات ایسے ہیں کہ بغیر اس کے چارہ بھی نہیں!

اسے بالکل نہیں یاد تھا کہ شفقت صاحب اُسے مدعو بھی کر چکے ہیں لیکن وہ ٹھیک ایسے وقت پہنچا جب وہ بھوک سے بیقرار اس کے انتظار میں سراپا اضطراب بنے ہوئے تھے اسے دیکھتے ہی لپکے :

آہا اسلم صاحب آئیے! بہت دیر کر دی تھی آپ نے!

اسلم کو یاد آ گیا "تقریب بہر ملاقات" اچھی رہی۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا بہت نادم ہوں کہ دیر ہو گئی لیکن ایک ایسا حادثہ پیش آ گیا کہ بالکل ہی مجبور ہو گیا۔

شفقت صاحب ہنسنے لگے : ارے صاحب حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں میرا خیال تو یہ ہے کہ اللہ میاں نے یہ دُنیا بنائی ہی اس لئے ہے کہ حادثوں کا تماشا دیکھا کریں ــــ

لاحول ولا قوۃ! کیا کلمۂ کفر بک گیا! میرا مطلب یہ ہے کہ حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہوتے ہی رہیں گے، انسان بھلا کیا کر سکتا ہے سوا اس کے کہ ان حادثوں کا شکار ہوتا رہے ــــ لیکن (فکر مند چہرہ بنا کر) اس حادثہ کا تعلق خدا نخواستہ آپ کی ذات سے تو نہیں ہے؟

اسلم نے کہا جی نہیں میرے پڑوس سے!

شفقت صاحب کی فکر مندی رخصت ہو گئی۔ اچھا صاحب آئیے پہلے کھانا کھا لیں وہ اسلم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ڈائننگ روم میں لے گئے۔ بڑا آراستہ کمرہ تھا، دیوار پر روغنی تصویریں آویزاں جگہ جگہ گلدان موجود، نہایت اعلیٰ درجہ کی میز، نہایت شاندار کُرسیاں، نہایت قیمتی کراکری! وہ حیران رہ گیا کہ یہ غریب خانہ تو واقعی دولت کدہ ہے! کھانا چُنا گیا، وہ بھی ایک سے ایک اور عمدہ سے عمدہ، مُرغ مسلّم، شامی کباب،

کوفتے، نرگسی کوفتے، قورمہ، دھوئی ماش کی دال، پراٹھے، باقر خانیاں، چپاتیاں، سادہ قیمہ، سبزی قیمہ، مٹر قیمہ، شاہی ٹکڑے، شیر برنج، چنے کا حلوہ ۔۔ اسلم کی قوتِ انتخاب جواب دے دیا۔ عقل حیران تھی کہ کیا کھائے، کیا چکھے، کیا چھوڑے!

اور شفقت صاحب تھے کہ انتہائی شفقت کے ساتھ اصرار فرمارہے تھے:

یہ بھی لیجئے اسلم صاحب، اجی اسے تو چکھئے۔ ہمارے گھر میں جیسا قورمہ پکتا ہے ہم نے تو آج تک ایسا کہیں اور کھایا نہیں، ۔۔۔ اور یہ نرگسی کوفتے، قیمہ تو چکھئے اسلم صاحب!

اتنا اچھا، اتنا زیادہ اور اتنا رنگا رنگ کھانا ۔۔۔۔ آج پہلی مرتبہ اُسے کھانے کو ملا تھا، لہٰذا اس نے بھی تکلف کا کچھ زیادہ مظاہرہ نہیں کیا، ڈٹ کر کھایا، پھر شیرینی کی باری آئی۔ بدقسمتی سے جو تین چیزیں میز پر رکھی تھیں وہ تینوں مرغوب تھیں، پھر شفقت صاحب کا اصرار سونے پر سہاگہ، نتیجہ یہ ہوا کہ شیر برنج، ٹکڑے اور حلوا سب ہی سے کام و دہن کو آشنا کیا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا، اس کے بعد شفقت صاحب حرفِ مطلب زبان پر لائے، کہنے لگے:

اسلم صاحب! ایک اچھی سی کتاب لکھ دیجئے ہمیں بچوں کے لئے ۔۔۔ میرا مطلب ایک کتاب سے نہیں سیٹ سے ہے۔

اسلم نے سوال کیا: کس موضوع پر؟

شفقت صاحب نے جواب دیا: تاریخ اسلام پر!

وہ کہنے لگا: یہ موضوع تو میرا پسندیدہ ہے لیکن بچوں کے بارے میں اب تک میں نے کچھ لکھا نہیں ہے۔ شاید کامیاب نہ ہو سکوں!

شفقت صاحب کو اسلم کی اس سادگی پر ہنسی آگئی ، فرمایا : آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں ۔ زبان کو ذرا آسان بنا دیجئے ، چلیئے بچوں کی زبان ہو گئی ۔ فلک پیر کے بجائے آسمان لکھئے ۔ کرۂ ارض نہ لکھئے زمین لکھ دیجئے ۔ نشاط و انبساط کے الفاظ نہ استعمال کیجئے ، ہنسی خوشی سے مفہوم ادا کر دیجئے ۔ سفاک سخت لفظ ہے ۔ ظالم ہر بچہ سمجھ لے گا ــــ اب فرمائیے لکھ سکتے ہیں یا نہیں ۔ ؟

وہ سکرایا ــ بولا : اب تو امید پڑتی ہے لکھ لوں گا ۔

شفقت صاحب نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا : امید ــــ ارے صاحب ضرور لکھ لیں گے آپ ! تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے !

اسلم ہنسنے لگا : محنت تو میری عادت ہے ۔

شفقت صاحب کو بھی ہنسی آگئی ۔ بس تو پھر منظور کرا لینا میرا ذمہ !

اسلم چونکا ــ منظور کس سے کرائیں گے آپ ؟

شفقت صاحب نے بتایا : یہ کتابیں محکمہ تعلیمات سے منظور کراؤں گا پھر یہ اسکولوں میں لگ جائیں گی !

یہ سُن کر اسلم کی باچھیں کھل گئیں ، اُسے معلوم تھا یہ خاصا نفع بخش کام ہے مصنّف اور ناشر دونوں فائدے میں رہیں گے ۔

لیکن محکمہ تعلیمات میں صرف میری ہی کتابیں تو نہیں پیش ہوں گی اور بھی مجھ سے کہیں قابل لوگ اپنی اپنی کتابیں پیش کریں گے ، میں لاکھ محنت کروں لیکن منجھے ہوئے اور قابل لوگوں کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا ۔

شفقت صاحب نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا : ہنسی دھر کے ہاتھ میں سارا

کام ہے اور وہ خاص اپنا آدمی ہے، وہ ہمارا کام کرے گا تو کیا ہم اس کا کام نہیں کریں گے؟

یہ کہہ کر انھوں نے اسلم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا:

جو مانگتا ہے پاتا ہے، جو مانگے گا پائے گا!

اسلم حیرت سے شفقت صاحب کی طرف دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا:

اسی داد و ستد سے کام چلتا ہے، جو زیادہ دے گا وہ اسی کا ساتھ دے گا اور یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ شفقت کا دل کتنا وسیع ہے! اور ہاتھ کتنا کھلا ہوا ہے! لہٰذا سو فیصد کامیابی ہمارے ساتھ ہے۔

ان تفصیلات سے اسلم کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، اس نے کہا بس تو بہت سے کام شروع کر دوں گا کل ہی سے ــــ کل کتنی کتابیں لکھنی ہیں۔

بس پانچ! شفقت صاحب نے فرمایا: مختلف ضخامتوں کی، مجموعی طور پر آپ کو پورے چار سو صفحے لکھنے پڑیں گے ــــ یہ تو بتائیے کتنے دن میں کام ہو جائے گا؟

اسلم نے غور کر کے بتایا: تین چار مہینے تو لگ جائیں گے!

شفقت صاحب ہتھے سے اکھڑ گئے۔ تین چار مہینے! ــــ ارے صاحب یہ تو بہت زیادہ مدت ہوئی۔ اگلے مہینے کی ۲۲ تاریخ کو صاف شدہ مسودے ہمیں پیش کرنا پڑیں گے۔ گویا صرف ایک مہینہ اور ۲۲ دن ہیں) اور یہ ۲۲ دن مسودے خوش خط لکھانے میں صرف ہو جائیں گے، جگہ جگہ آرٹسٹ سے تصویریں بھی بنوانا پڑیں گی ــــ یہ کام تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں ہو جانا چاہیے!

اسلم سوچنے لگا، شفقت صاحب نے فرمایا: سوچ کیا رہے ہیں آپ؟

یعنی کہ اتنی مختصر مدت میں یہ کام کیسے ہو سکے گا؟ اسلم نے کہا۔

میں بتاتا ہوں، شفقت نے جواب دیا:

اور پھر اٹھ کر اس نے ایک الماری کھولی اور اس میں سے کئی کتابیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں اور فرمایا:

دیکھیے جناب یہ ہیں کتابیں جو اس وقت چل رہی ہیں!

پھر دوسری کتابوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

یہ وہ کتابیں ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں!

اور پھر ہدایت نامہ پیش کیا: ان دونوں کو سامنے رکھیے، کچھ قطع و برید کیجیے، کچھ حذف و اضافہ کیجیے، کچھ نوک پلک درست کیجیے، چلیے کام ختم! —— کوئی تحقیقی مقالہ تو لکھنا نہیں جو چار مہینے چاہئیں!

اسلم مطمئن ہو گیا! —— اس نے کہا: قطعاً یہ کام وقت مقررہ پر ختم ہو جائے گا۔

شفقت صاحب خوش ہو گئے: پھر دیکھیے گا مصنف کی حیثیت سے آپ کی شہرت کا ڈنکا کیسے بجتا ہے؟ وہ مانگ ہو گی آپ کی کہ فرصت نہیں ملے گی لکھتے لکھتے!

اس کے بعد نہایت احتیاط سے شفقت صاحب نے کتابوں کا بنڈل بنایا اور اسلم کے سامنے رکھ دیا۔ اور اس طرح بیٹھ گئے جیسے کہہ رہے ہوں آپ تشریف لے جائیے!

اسلم نے یہ نگاہیں پہچان لیں، وہ نہ لنچ کھانے آیا تھا نہ کتابیں لکھنے وہ تو کسی اور ہی کام سے آیا تھا۔ ان نگاہوں کو دیکھ کر اگر رخصت ہو جاتا تو پھر ارجمند خاں کو کیا جواب دیتا، منیجر صاحب کے روپے کس طرح ادا کرتا؟ مرزا صاحب کے آذوقے کا

بندوبست کس طرح کرتا؟ آخر کچھ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد کہنے لگا:

شفقت صاحب ایک استدعا ہے آپ سے!

شفقت صاحب نے کسی کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی، کسی یونیورسٹی میں کسبِ فیض نہیں کیا تھا! کسی عالم، پروفیسر یا دانشور کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ نہیں کیا تھا، کوئی لائبریری نہیں کھنگالی تھی، علمی، تاریخی، مذہبی، سیاسی، ادبی اور فنی قسم کی کتابوں کے ٹائیٹل سے زیادہ کچھ نہیں پڑھا تھا۔ عربی نہیں جانتے تھے فارسی نہیں جانتے تھے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اُردو مادری زبان تھی، دو سطریں صحیح نہیں لکھ سکتے تھے، املا غلط، انشاء غلط، لیکن ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بہت بڑے ماہر نفسیات تھے، سمجھ گئے، اسلم کی طرف سے کوئی مطالبہ ہونے والا ہے ذرا کے ذرا ماتھے پر بل پڑے، پھر خوش اخلاقی کے ساتھ فرمایا:

فرمائیے، حکم!؟

اسلم کا حوصلہ جواب دیئے جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے بڑی مشکل سے کہا:

مجھے دو سو روپے درکار ہیں!

دو سو روپے کا نام سن کر شفقت صاحب کا چہرہ دھوئیں کی طرح سیاہ پڑ گیا۔

دو سو روپے!؟

اسلم نے حواس بجا کرتے ہوئے کہا: جی ہاں معاملہ عزّت کا ہے، اس سے کم میں کسی طرح بھی کام نہیں چل سکتا! میں خود آپ کو ابھی زحمت دینا نہیں چاہتا تھا لیکن صورتِ احوال نے مجبور کر دیا۔

شفقت صاحب اپنی کچھ معذوریاں اور مجبوریاں بیان کرنا چاہتے تھے۔ مگر

اسلم صاحب نے موقع نہیں دیا۔:

یہ کام جس طرح بھی بنے کر دیجیئے، میں آپ کا زندگی بھر ممنون رہوں گا۔ شفقت صاحب نے سوچا اگر دو سو روپے دے کر زندگی بھر کی ممنونیت خریدی جا سکتی ہے تو پھر یہ سودا مہنگا نہیں ہے، انھوں نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ فرمایا:

اسلم صاحب معاملہ کی بات معاملہ ہی کی طرح ہونی چاہیئے۔ بخشش سو سو حساب جو جو۔ ذاتی تعلقات کا جہاں تک تعلق ہے ہر خدمت کو حاضر ہوں لیکن کاروبار تو کاروبار ہی کی طرح ہوگا۔

اس تمہید کے بعد ایک نظر اسلم کے خستہ اور درماندہ چہرے پر ڈالی اور پھر کہا:

ہمارا اصول یہ ہے کہ ہر سال پہلی مارچ کو ہم حساب کرتے ہیں۔ اس مدت میں جتنی کتابیں چھپی ہوتی ہیں ان کی رائلٹی مصنف کو ادا کر دیتے ہیں ـــ آپ کی تو ابھی کتاب بھی نہیں چھپی!

اسلم نے دیکھا یہ تو بہت ٹیڑھا معاملہ نکلا، کتاب چھپے گی، پھر سال بھر تک بکے گی، پھر حساب ہوگا کہ کتنی بکی، پھر جتنی بکی ہوگی اس کی رائلٹی ملے گی! ـــ کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی! ـــ اس طرح کیسے کام چلے گا، لیکن یہ موقع بحث کرنے اور معاملہ طے کرنے کا نہیں تھا۔ اس وقت تو دو سو روپے لینے تھے، اس نے یہی سب کچھ سوچ کر کہا:

لیکن شفقت صاحب! ـــ

مگر شفقت صاحب کب آگے چلنے دیتے تھے، خود ہی فرمانے لگے: تو جناب کس حساب میں روپے دے دوں آپ کو؟

اسلم نے کہا : اس وقت سوال حساب کتاب کا نہیں، عزت و آبرو کا ہے ۔ ناول کے حساب میں یہ مدپیشگی دے دیجیے پھر جب حساب کتاب کا وقت آئے گا سب سے پہلے یہی رقم کاٹ لیجئے گا ۔

شفقت نے پوچھا : یعنی جو حساب ابھی شروع نہیں ہوا

پھر وہ ہنسنے لگے ۔ لیکن یہ ہنسی نہ تھی ، مایوسی کی تاریکی میں امید کا شرارہ تھا، اسلم نے اپنے آپ کو عاجز اور لاجواب پاکر انتہائی پریشانی کے عالم میں کہا : تو پھر اب کیا ہوگا؟

اندھیرے میں وہ شرارہ چمکا، شفقت صاحب نے فرمایا :

ناول کے حساب میں تو اس وقت جب چھپے گا ، البتہ ایک بات ہوسکتی ہے ۔ یہ نصابی کتابیں بھی ارادہ تو یہی تھا کہ رائلٹی پر لکھواؤں گا لیکن آپ کے حالات ایسے ہیں کہ خطرہ خود لیتا ہوں ، آپ کو اس سے بچالیتا ہوں ۔

یکایک یہ خطرہ کہاں سے نمودار ہوگیا ، امید کا شرارہ پھر بجھنے لگا ۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا : خطرہ کیسا شفقت صاحب ؟

شفقت صاحب نے بتایا : بیشک یہ کتابیں منظور ہو جانے کی پوری امید ہے لیکن کام کرتے وقت ہر پہلو مدنظر رکھنا چاہیئے ۔ ہوسکتا ہے نامنظور ہو جائیں !

اسلم کا دل مایوسی سے دھڑکنے لگا ، شفقت صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا : منظور ہو جانے کی صورت میں رائلٹی آپ کو ضرور ملے گی ، لیکن نامنظور ہو جانے کی صورت میں رائلٹی یا معاوضے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا !

امید کا وہ شرارہ بجھ گیا ، اسلم کا دل پھر ڈوبنے لگا لیکن شفقت صاحب نے اسے پھر سنبھال لیا ۔

ان کتابوں کا یکمشت معاوضہ پانچسو روپئے آپ کو دے دوں گا۔ کتابیں میری ہوگئیں، خواہ منظور ہوں یا نامنظور! فائدہ بھی میرا، نقصان بھی میرا، کہئے کیا کہتے ہیں؟

اسلم کو اوّل تو رائلٹی اور معاوضے کی باریکیاں نہیں معلوم تھیں، دوسرے اس سے اس وقت جو کچھ بھی کہا جاتا بے چون و چرا منظور کر لینے پر مجبور تھا۔ چنانچہ بے تامل کہا ہوا

مجھے کیا کہنا ہے جو آپ کہتے ہیں درست ہے!

شفقت صاحب خوش ہو گئے۔ جیب سے نکال کر دو سو روپے اسی وقت سامنے رکھ دیے اور فرمایا: جس روز کام ختم ہو جائے تین سو اس دن دے دوں گا!

اسلم کے دل کا سارا بوجھ اتر گیا۔ خوش ہو کر روپے لے لئے۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ اب ارجمند خاں سے سُرخرو ہو جائے گا، منیجر صاحب کا قرض ادا کر دے گا، مرزا صاحب کے ہاتھ میں کچھ دے سکے گا!

ایک مرتبہ پھر اس نے شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ شفقت صاحب نے جیب سے فاؤنٹین پن نکالا، میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

اس پر رسید لکھ دیجئے، ویسے تو کوئی بات نہیں، لیکن آڈیٹر اعتراض کرتے ہیں، شکریہ!

اسلم نے ذرا بھی بُرا مانے بغیر رسید پر دستخط کر دیئے اور خوش خوش باہر نکل آیا۔

(۲)

پیش قدمی

ایک مہینہ گزر گیا، فاطمہ کا جسم فانی قبر کے گوشے میں پہنچ گیا۔ مرزا سکندر علی بیگ ہوش میں آ گئے۔ اقبال اس غم کو اچھی طرح نہ سمجھ سکا تھا نہ محسوس کر سکا تھا۔ ماحول سے مانوس ہو چلا۔ لیکن ایک ہستی۔ سلمیٰ ـــــ ایسی تھی جس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں اور اب تک رونا بند نہیں ہوا تھا۔ جس کی ہچکیوں اور سسکیوں کا تار کچھ ایسا بندھا کہ ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس جگہ جا کر بیٹھ جاتی جہاں اس کی ماں بستر مرگ پر دراز تھی اور رونے لگتی۔ وہ اقبال کو کپڑے پہنانے کے لئے صندوق کھولتی اور اسے ماں کے ہاتھ کا سیا ہوا کوئی کپڑا دکھائی دے جاتا اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ وہ باپ کے لئے کھانا پکانے بیٹھتی تو اس کے کانوں میں وہ ہدایتیں گونجنے لگتیں جو مرزا صاحب کے لئے وقتاً فوقتاً وہ دیا کرتی تھیں۔ اور اس کے لئے ضبط گریہ ناممکن ہو جاتا، کوئی فقیر صدا لگاتا گزرتا تو اسے یاد آ جاتا بیماری، کمزوری اور مفلسی کے باوجود ایک پیسہ دو پیسہ اقبال کے ہاتھ ضرور بھجوا دیا

اور پھر روانیٔ اشک کا عالم دیکھنے کے قابل ہوتا۔ وہ لاکھ بھلاتی تھی مگر یاد آتا رہتا تھا کس طرح فاخرہ اس کے دُکھ درد کا خیال رکھتی تھی، اقبال سے پیار کرتی تھی۔ کس طرح شوہر کی خدمت اور دلداری کرتی تھی، اور جیسے ہی یہ باتیں یاد آتیں اس کی چشمِ میگوں سے دریائے اشک رواں ہو جاتا۔

مرزا صاحب اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتے اور کڑھتے لیکن کر کیا سکتے تھے۔ بس میں کیا تھا؟ بیوی کی موت اور ذہنی پریشانیوں نے وہ ٹیوشن بھی چھڑا دیا جس سے آس اور لو لگی ہوئی تھی۔ اب پھر صبح سے شام تک تلاشِ روزگار میں گھومتے اور پاؤں دل گرفتہ واپس آجاتے۔ اگر کہیں اسلم خضرِ راہ بن کے نمودار نہ ہو گیا ہوتا تو نہ جانے کیا حالت ہوتی!

اسلم نے اس دن جس روز فاخرہ کا انتقال ہوا تھا اور مرزا صاحب کافی دیر کے بعد ہوش میں آئے تھے اور سارا حال معلوم کرنے کے بعد سراپا شکر و سپاس بن گئے تھے سو روپے ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تھا:

آپ مجھے اپنا بچہ کہہ چکے ہیں ۔۔ بتایئے کیا اقبال آج بڑا ہوتا اور ماں کے مرنے پر خرچ کرتا اور جتنے روپے پاس ہوتے لاکر نذر کر دیتا تو کیا آپ انکار کر دیتے؟ یقیناً نہ کرتے، تو پھر میں نے کیا خطا کی ہے؟

مرزا صاحب سے کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے لیکن انھوں نے ضبط سے کام لیا، ذرا دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

یہ تو سچ ہے بیٹا، لیکن تمھارے احسانات سے گردن نہیں اٹھ سکتی! اگر زندگی ہے اور ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو ایک ایک پیسہ ادا کروں گا۔ آخر باپ کی کمائی بیٹے

کے سوا اور حق کس کا ہوتا ہے! پھر تم انکار نہ کر سکو گے!

اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ اسلم نے جواب دیا تھا:

ہرگز انکار نہیں کروں گا۔ جھپٹ لوں گا آپ کے ہاتھ سے!

اس جواب نے مرزا صاحب کو خوش کر دیا، انھوں نے روپے لے لئے اور خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن جب اسلم کسی کام سے باہر جا رہا تھا، اقبال نے اسے روکا اور کہا:

تھم جائیے!

وہ سمجھا شاید مرزا صاحب کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہوں گے، رک گیا۔ کام بھی کوئی ایسا خاص اور ضروری نہیں تھا۔ روشنائی، کاغذ اور پنسل کی خریداری کرنی تھی۔ اتنے میں اقبال پھر آیا۔ لیکن اس مرتبہ خالی ہاتھ نہ تھا، جو کچھ لایا تھا سامنے رکھ دیا۔ یہ ناشتہ تھا، گرم گرم چائے کی پیالی، ایک خستہ سی روغنی روٹی، ایک انڈا۔ اسلم حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر پوچھا:

یہ کیا ہے؟

اقبال مسکراتا ہوا بولا: ناشتہ ہے!

اسلم نے سوال کیا: لیکن کیوں؟ کیا ضرورت تھی اس کی ۔۔۔ ؟

اقبال نے جواب دیا: ضرورت نہ ہوتی تو بھیجا کیوں جاتا! کیا آپ ناشتہ نہیں کرتے؟

اسلم جواب میں ابھی کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا صاحب تشریف لے آئے۔ اسلم نے اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: دیکھئے اقبال کی شرارت؟!

مرزا صاحب کے افسردہ ہونٹوں سے ذرا سا تبسم ابھرا۔ انھوں نے کہا: اس میں شرارت کی کیا بات ہے؟ دیکھو چائے ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔ فارغ ہو جاؤ تو کچھ

ضروری باتیں کرنی ہیں!

اب اسلم کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ کام و دہن کو لذت اندوز کرنے میں لگ جائے۔ روغنی روٹی تو اتنی لذیذ تھی کہ مزا آ گیا۔ انڈا بھی اچھا بنا ہوا تھا، روغنی روٹی اور انڈے کا شمار تو اتفاقات میں تھا۔ ایسی چیزیں روز روز کہاں ملتی ہیں لیکن چائے میں بھی وہ ٹیسٹ تھا کہ اگر پوری کیتلی سامنے موجود ہوتی تو ساری کی ساری پی جاتا۔ کتنے دنوں بعد آج ہوٹل کی بدمزا اور بے رنگ چائے پیتے رہنے کے بعد یہ ملی تھی مرزا صاحب نے فرمایا:

میں کہنا چاہتا ہوں بیٹے کہ ہم تم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں، نہ تمھارا کوئی گھر ہے نہ میرا۔ نہ تمھارے پاس کوئی مستقل روزگار ہے نہ میرے پاس پھر کیوں دکھ جھیلتے ہو۔ ہوٹل میں کھاتے ہو صحت کا ستیاناس ہو جائے گا۔ نہ چائے مزے کی نہ کھانا اچھا ایسا کرو کہ یہیں کھانا شروع کردو۔ حساب ہوتا رہے گا! حساب کا لفظ میں نے یوں استعمال کیا کہ بڑے حساس قسم کے آدمی ہو، یہ نہ سمجھ لینا کہ مفت کھا رہے ہو اور ویسے اس وقت تم سب خود تمھارا دیا کھا رہے ہیں۔

یہ الفاظ سن کر وہ تڑپ گیا، اس نے کہا: کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں آپ!

مرزا صاحب نے اصرار کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: بہرحال تمھیں میری بات ماننی پڑے گی۔

اگر اسلم نے ناشتہ نہ کر لیا ہوتا تو شاید یہ ناقابلِ عمل تجویز مسترد کر دیتا۔ اس نے مرزا صاحب کی مدد اس لئے نہیں کی تھی کہ تعلقات بڑھائے اس لئے کی تھی کہ حالات کا تقاضا یہی تھا۔ دوسرے وہ آزاد طبع آدمی تھا، یہ پابندیاں بھی نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ اس وقت ناشتہ کرنا ہے، کھانے کا وقت آ گیا اب پہنچ جانا چاہئے، ارجمند خاں کے

نے ان تمام باتوں سے اسے بے فکر کر دیا تھا۔

لیکن ــــ آج ناشتے نے اسے دوسری دُنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ گھر کے کھانے کی بات ہی اور ہے۔ ہوٹل کتنا ہی اچھا ہو مگر وہ بات کہاں جو گھر کی سوکھی روٹی میں ہوتی ہے۔ ادھر ارجمند خاں کا ہوٹل تو یوں بھی تھرڈ کلاس تھا۔

کافی ذہنی کشمکش کے بعد اس پیش کش کو وہ مسترد نہ کر سکا۔ لیکن کچھ تکلف کرنا بھی ضرور تھا، کہنے لگا:

مجھے تو کوئی عذر نہیں، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، لیکن خواہ مخواہ زحمت دینے کو جی نہیں چاہتا!

مرزا صاحب نے فرمایا: مجھے کیا زحمت ہو گی بھئی! کوئی میں پکاتا ہوں، لڑکی پکاتی ہے وہی پکائے گی!

اسلم نے کہا: جی ہاں یہ تو بجا فرمایا آپ نے لیکن میں انھیں بھی تکلیف کیوں دوں؟

مرزا صاحب آپ کی اس بزرگانہ عنایت کا شکریہ! لیکن اس زحمت فرمائی کو مستقل نہ کیجیے!

مرزا صاحب کے پاس دلائل کی کیا کمی تھی۔ کہنے لگے: جہاں تین آدمیوں کا کھانا پکے گا وہاں چوتھے کا اضافہ معلوم بھی نہیں ہو گا! ویسے ایک بات پوری بے تکلفی سے کہے دیتا ہوں بھئی، !:

اسلم سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا،

فرمایا: جو کچھ روکھا سوکھا گھر میں پکے گا وہی سامنے رکھ دیا جائے گا تمھارے لئے کوئی الگ ہانڈی نہیں پک سکے گی!

(قائل ہوتے ہوئے) آپا یہ تو ٹھیک ہے، ویسے آدمی بھی بڑے اچھے ہیں، مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اگر ایک دن، ایک وقت نہ کھائیں گے تو کیا ہو جائے گا؟

(پیار بھرے لہجے میں) نہیں بھیا بُری بات — جس دن آبا جی تنخواہ لائے اس دن سیر بھر گوشت منگا کر صرف تمھارے ہی لئے طرح طرح کی چیزیں پکا کر رکھ دوں گی، خوب کھانا پیٹ بھر کے!

آبا جی کی تنخواہ! — ابھی انھیں نوکری تو ملی نہیں تنخواہ کا حساب کرنے لگیں بیٹھ کر!

(ہنستے ہوئے) نوکری بھی خدا دلا دے گا، تنخواہ بھی ملے گی، مجھے دیکھو کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ دال کم پڑ گئی کسی وجہ سے تو تھیں اور آبا جی کو کھلا دیا اور میں نے چٹنی کے ساتھ روٹی کھالی۔

(بگڑ کر) واہ، ایسا کیوں کرتی ہو؟ تم پہلے کیوں نہیں کھا لیا کرتیں ہم سب سے؟ اکثر یہی ہوتا رہتا ہے، کبھی روٹی کم پڑ گئی، کبھی دال کم پڑ گئی۔ کبھی فاقہ کر لیا کبھی چٹنی سے کام چلا لیا۔ اسی لئے تو روز بروز دُبلی ہوتی جا رہی ہو!

(پیار بھرے لہجے میں) تو پھر بڑے ہو جاؤ جلدی سے، کما کر لانا اور ہمیں کھلانا!

(بے بسی کے ساتھ) لیکن میرے بڑے ہونے میں تو ابھی بہت دن ہیں، جب تک کیا اسی طرح فاقے کرتی اور چٹنی کھاتی رہو گی؟

تو کیا ہوا! فاقہ کرنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے اور چٹنی کھانے سے منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے!

نہ جانے ابا جی کو نوکری کب ملے گی؟

خدا چاہے گا جلد مل جائے گی، بیچارے اس بڑھاپے اور کمزوری میں دوڑ دھوپ تو پوری کر رہے ہیں۔

لیکن جب تمھاری شادی ہو جائے گی تب کیا ہو گا؟

بتاؤں کیا ہو گا؟

پھر ہمیں کون کھلایا کرے گا، کون ہمارے لئے پکایا کرے گا؟ کون فاقے کرے گا اور چٹنی کھا کھا کر ہمیں دال روٹی کھلایا کرے گا؟

تمھاری بیوی!

ابا جی بیچارے کیا کریں گے؟

ابا جی کو کیا ہوا پگلے؟

جیسی خدمت تم ان کی کرتی ہو میری بیوی تو نہیں کرے گی!

کیوں نہیں کرے گی؟ نہیں کرے گی تو پیٹنا!

لیکن بیٹی کی بات ہی اور ہے!

کچھ پاگل ہو گیا ہے۔ آج یہ کیسی انہونی باتیں تمھیں سوجھ رہی ہیں؟!

خود ابا جی کہہ رہے تھے کل۔۔

ابا جی کہہ رہے تھے ـــــ کیا کہہ رہے تھے؟

جب تم کھانا پکا رہی تھیں تو لیٹے لیٹے خود سے کہنے لگے، سارا بوجھ سلمیٰ نے اٹھا لیا ہے، بیچاری نے ایک دن بھی شکوہ نہ دیکھا! میری اس طرح خدمت کرتی ہے کہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ لیکن ایک دن وہ بھی چلی جائے گی۔

میں نے پوچھا : کہاں چلی جائیں گی ؟ آپا جی !

کہنے لگے : اس کی شادی ہو جائے گی ۔ سسرال چلی جائے گی ! ـــ اپنے گھر ۔

سوچتا ہوں پھر کیا ہوگا ؟ اس کی کمی کون پوری کرسکتا ہے ؟

یہ کہتے کہتے آبا جی کی آنکھیں بھر آئی تھیں ـــــ کیوں آپا تم شادی کے بعد ہمارے

گھر کبھی نہیں آیا کروگی ؟

میں شادی ہی نہیں کرنے کی !

(خوش ہو کر) سچ ـــ سچ مچ شادی نہیں کروگی !

کہہ تو دیا نہیں کروں گی !

آپا تم کتنی اچھی ہو ، شادی بھی نہیں کروگی تم ! ـــ لیکن اگر آبا جی نے کردی؟

وہ بھی نہیں کریں گے ۔

یہ تم نے کیسے جانا ؟ ـــ کیوں نہیں کریں گے ! کیا اُن کا حکم ٹال سکتی ہو تم ؟

وہ کر ہی نہیں سکتے ۔ یہی تو اطمینان ہے مجھے !

واہ آپا آبا جی کے لئے ایسی باتیں کیوں کہتی ہو ؟ کیوں نہیں کر سکتے !

بھولے بچے ! آجکل داماد خریدے جاتے ہیں ، اور آبا جی کے پاس کھانے کو تو کچھ

ہے نہیں وہ داماد کہاں سے خریدیں گے ؟ داماد خریدنے کے لئے ہزاروں روپیہ چاہئے ۔

داماد کیا ہوتا ہے آپا ؟

لڑکی کا شوہر !

تو مجھے بھی کوئی خریدے گا ، مجھے بھی بکنا پڑے گا ؟

ہاں تم بھی خریدے جاؤ گے ۔ اور بڑے دام اٹھیں گے تمھارے ، اگر پڑھ لکھ کر

قابل بن گئے !

اسلم صاحب کی طرح ؟

ہاں اسلم کی طرح ــــ لیکن تم کیا بن سکو گے ان کی طرح ۔ وہ تو بہت قابل ہیں ۔

تم پر اُن کا سایہ پڑ جائے تو آدمی بن جاؤ ۔

ان کا سایہ تو نہ جانے دن میں کتنی مرتبہ پڑتا رہتا ہے مجھ پر ــــ تو کیا ابھی لئے آدمی ہوں ؟

اور کیا ــــ ورنہ تو پہلے آدمی کب تھا ، بندر تھا !

دیکھو آپا زبان سنبھال کر بات کرو ــــ ورنہ پھر غصہ آجائے گا مجھے !

اچھا بھئی بہنیں ــــ معافی مانگتی ہوں ــــ بخش دو مجھے !

معاف کر دیا ــــ لیکن آپا پھر اسلم صاحب بھی کب چھکے ہوں گے یا یکھ دالے ہوں گے !

ہاں اور کیا ــــ ضرور یک چھکے ہوں گے !

پھر ان کی بیوی کہاں ہے ؟

تمھارے کلیجے میں ــــ اب مجھے کام بھی کرنے دو گے ؟

بس آپا ایک بات اور بتا دو ، پھر کچھ نہیں پوچھنے کا !

اور نہ ــــ پوچھ بھی لو کسی طرح ــــ تمھاری باتیں تو شیطان کی آنت ہوتی ہیں !

اگر آج اسلم صاحب کھانا نہ کھائیں پھر تو یہ دونوں گردے میرے رہے ؟

واہی ہو ا ہے کیا ؟ ہر پھر کر بس گردوں کا ذکر ۔ کہیں نظر نہ لگ جائے تیری ؟

لے یہ آدھا کھا لے !

آپا بڑے مزے کا ہے ۔ باقی آدھا بھی دے دو !

اب تو یہ جلتی ہوئی لکڑی ٹھونس دوں گی تیرے منہ میں! میرا بھائی ہو کر اتنا بدنیت۔ سچ ہی تو سُنا تھا میں نے آپا جی گھورے پر سے اٹھا لائے تھے تجھے!

یہ بات ہے تو پھر مجھے اتنا چاہتی کیوں ہو؟

آدمی کتا بھی پالتا ہے تو اس سے محبت ہو جاتی ہے!

کیوں آپا میں کتا ہوں؟

(ہنستے ہوئے) کتا نہ سہی بندر سہی! ــــ گدھا سہی!

کہہ لو جو جی چاہے۔ میں بھی ایسا بدلا لوں کہ عمر بھر یاد کرو گی اور کچھ بتائے نہ بن پڑے گی!

تُو کیا کرے گا مسخرے!

خالی دال لے جا کر دوں گا اسلم صاحب کو، گردہ راستے میں کھا لوں گا، نہ تم پوچھ سکتی ہو اُن سے، نہ آپا جی اتنی چھوٹی سی بات دریافت کریں گے۔ اور نہ وہ پوچھیں گے

کیوں بھئی اقبال وہ ہمارا گُردہ کہاں ہے؟

اچھا یہ ہمّت ہے ــــ ذرا ایسا کر کے تو دیکھ!

وہ تو کروں گا اور کر کے رہوں گا!

نہیں پوچھ بھی لوں گی۔

کس طرح پوچھو گی؟ ــــ کیا بات شروع کر دو گی اُن سے!

میں کیوں شروع کرنے لگی بات ــــ آپا جی سے پچھواؤں گی! وہ دریافت کریں گے ــــ کہیے کیسا پکا تھا، اگر پسند ہو تو کل پھر پکوا دیا جائے؟!

(خوش ہو کر) کل پھر ــــ تو آج اور کل دونوں دن چوری کروں گا ــــ آپا بڑا

مزا آجائے گا!

اچھا یہ بحث اس بند کر دو۔ پہلے وہ دونوں پلیٹیں دھو دو۔ اتنے میں کھانا نکالوں!

تم جا کر دیکھ آؤ۔ وہ ہیں بھی یا نہیں؟

نل کے پاس بیٹھ کر اقبال پلیٹیں دھونے لگا۔ کیونکہ نل سے پانی گرنے اور پلیٹوں کے چھن چھنانے کی آواز آ رہی تھی۔ اسلم چپکے سے اٹھا، آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اور دبے پاؤں منیجر صاحب کے بالاخانے کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر ٹہل کر واپس آ گیا۔

جب وہ لوٹا تو اقبال اُسے دیکھ کر واپس جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا:

کھانا لاؤں؟

اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: نہیں بھئی آج بھوک نہیں ہے بالکل، کچھ پیٹ خراب ہے۔ نہ اس وقت کھائیں گے نہ رات کو۔ کل دیکھا جائے گا۔

اقبال نے ایک میزبان کی طرح اصرار کرتے ہوئے کہا: کچھ تو کھا لیجئے!

اسلم نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور بولا: نہیں بھئی۔ اگر ذرا بھی کھایا تو بیمار پڑ جاؤں گا۔

اقبال کو رخصت کر کے اسلم اپنے کمرے میں آیا۔ اس کے کانوں میں سلمیٰ کی مدھم آواز آ رہی تھی۔:

بڑا انتظار ہے تو، خدا تجھ سے ہر کسی کو امان میں رکھے! — بیچارہ کا آج کا کھانا بھی گیا!

پھر پتیلی کھڑکنے کی ہلکی سی آواز بھی آئی۔ اور سلمیٰ نے اقبال سے کہا: لے ٹھونس لے، مجھے بھی قسم ہے جو اب کبھی گردہ پکاؤں!

اقبال ہنسنے لگا۔ اور اسلم کاغذات ایک طرف رکھ کر دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔

---

(۴)

کیا ہے یہ دُنیا!

"اسلم کی بھوک مر گئی تھی۔ خیالات کی جولانی رک گئی تھی۔ اب نہ وہ کھا سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا۔ سلمیٰ اور اقبال کی باتوں نے اسے دوسری دُنیا میں پہنچا دیا تھا۔

اُسے اپنے وجود پر شرم آ رہی تھی۔ اب تک جتنے دِلوں سے دال کے علاوہ جو کچھ مزے لے لے کر کھاتا رہا تھا جی چاہتا تھا وہ سب اگل دے!

وہ سوچ رہا تھا، کیا اس دُنیا کی یہی ریت ہے کہ امیر زیادہ امیر اور غریب اور زیادہ غریب ہوتے چلے جائیں!؟

امیر لکھ پتی سے کروڑ پتی اور کروڑ پتی سے ارب پتی اور اس سے بھی زیادہ بن سکتے ہیں لیکن غریب ۔۔۔ غریب جب غربت میں ترقی کرتا ہے تو اسلم بن جاتا ہے۔ اقبال بن جاتا ہے، سلمیٰ بن جاتا ہے، فاخرہ بن جاتا ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور مرزا اسکندر علی بیگ بن جاتا ہے!

یہ بچّہ (اقبال) جس کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں جسے اگر مواقع میسّر ہوں، وسائل حاصل ہوں تو یہ کیا نہیں بن سکتا؟ یہ سب کچھ بن سکتا ہے۔ وکیل، سیاست داں، زعیم مدبّر، وزیر، وزیر اعلیٰ، صدرِ مملکت، سب کچھ۔ یہ کچھ نہیں بن سکتا، اس لئے کہ اس کی ساری ذہنی توانائیاں برباد ہو رہی ہیں۔ نہ اسے اچھی غذا ملتی ہے نہ تعلیم نہ تربیت یہ غنڈا بن سکتا ہے اچھا انسان نہیں بن سکتا۔

یہ لڑکی (سلمیٰ) میں نہیں جانتا اس کی صورت شکل کیسی ہے؟ نہ یہ جانتا ہوں اس کی عمر کیا ہے؟ نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی تعلیم کہاں تک ہے، لیکن اتنا تو اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک آئیڈیل عورت میں ہونی چاہئیں صبر و برداشت، حلم و ضبط، سلیقہ اور تہذیب، غیرت اور شرافت ہر چیز اس کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

لیکن — لیکن جیسا کہ اس نے خود کہا، اس کا باپ اس کے لئے شوہر نہیں خرید سکتا اس کے پاس کھانے کو روٹی تک نہیں۔ وہ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے داماد کہاں سے خرید سکے گا؟ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ جو کسی گھر میں جا کر اسے جنّت بنا دینے کی طاقت رکھتی ہے زندگی بھر جہنم سے لذّت آشنا ہوتی رہے گی۔ اپنے کردار اور سیرت کے اعتبار سے یہ مستحق ہے کہ سکھ، شانتی اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرے،

مگر ایسا نہیں ہو سکتا، اس لئے نہیں ہو سکتا کہ یہ غریب ہے — اس کا باپ غریب ہے!

نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو یونہی باپ اور بھائی کی خدمت کرتے کرتے بوڑھی ہو جائے گی یا ایسے شخص کے پلّے باندھ دی جائے گی جو کسی طرح بھی اس کا ہمسر نہ ہوگا جو اسے ڈانٹے گا،

ڈپٹے گا، گالیاں دے گا، کبھی کبھی ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا، اُسے روکھی سوکھی کھانے کو دے گا، لونڈی اور باندی کی طرح اس سے خدمت لے گا، اسے بچّوں کی مشین بنا دے گا اور یہ بھوکی رہ کر تکلیف اٹھا کر، بیمار رہ کر ان کی خدمت کرے گی، انھیں پالے گی اور ایک دن مر جائے گی۔

وہ عورت (فاخرہ) کتنی نیک، کتنی شریف کتنی بھلی تھی لیکن عزیزوں نے اس کا کس بھی نکال دیا۔ وہ بیمار پڑی تو اس کا علاج تک نہ ہو سکا، مری تو کفن دفن تک کا انتظام نہ ہو سکا ___ کیا وہ اسی کی مستحق تھی؟

اور وہ مرد پیر (مرزا سکندر علی بیگ) جس کی کمر زمانہ کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے جھک گئی ہے جس کے چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی ہیں، جس کی بینائی جواب دیتی جارہی ہے، جس کے پیروں میں سکت نہیں رہ گئی ہے۔

جو اس کا مستحق تھا کہ آرام کرتا، سکون کی زندگی بسر کرتا، اچھے سے اچھا کھاتا، لیکن قسمت کی طرف سے اُسے کیا مل رہا ہے وال روٹی:

دال ارہر کی بے مزہ پھیکی

مطلقاً جس میں بو نہیں گھی کی!

جو اس بڑھاپے میں اس کمزوری میں دن دن بھر تلاشِ روزگار میں سڑکوں کا گز بنا رہتا ہے!

یہی دُنیا ہے، اسی کا نام دنیا ہے ___ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر!؟

بعض وقت تو خیال آتا ہے روزِ مکافات سے بھی یا نہیں کہیں یہ صرف ایک فرضی مغالطہ تو نہیں!؟

اور یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں کے سامنے بھیانک، خوفناک اور بیہودہ کی صفت

وہ قرضدار آگئے جن کا ایک پیسہ بھی وہ اب تک ادا نہ کرسکا تھا۔ اور جن کی ایک ایک پائی ادا کرنی تھی۔

اور پھر یک بیک اس کی نگاہوں کے سامنے انجمن کا افسردہ، پژمردہ اور سہمگیں چہرہ پھرنے لگا!

کلثوم کیسی کیسی گت نہ بنا رہی ہوگی اس کی!!

اور اس بیچاری کی خطا اس کے سوا کیا ہے کہ اس نے شوہر حاصل کیا، خرید نہ سکی۔ اگر اس نے اشفاق کو خرید ا ہوتا تو یہی کلثوم بیگم اس پر واری اور صدقے ہوا کرتیں۔

کیا ماحول ہوگا، کن حالات میں وہ زندگی کے دن بسر کر رہی ہوگی؟

میں اس کے لئے کچھ بھی تو نہ کرسکا! ایک پیسہ بھی نہ بھیج سکا۔ واقعی وہ لوگ بجا طور پر طعنہ دیتے ہوں گے کہ اس کا بھائی کتنا نکما اور نکھٹو ہے کہ بہن کی خبر تک نہیں لیتا خط تک نہیں لکھتا۔

لیکن خط لکھ کر کیا کروں؟ کیا لکھوں خط میں؟

سوچا تھا روپے مل جائیں گے تو خط لکھوں گا بلکہ خود ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اس کے پاس پہنچوں گا اور اس کا دامن سیم و زر سے بھر دوں گا!

لیکن روپے نہ مل سکے، جو تھوڑے بہت ملے وہ سب سے اہم کام میں صرف ہوگئے!

کیا میں انجمن کو کبھی مُنہ نہ دکھا سکوں گا؟

کیا میں کبھی اسے کلثوم کے سامنے سُرخ رو ہونے کا موقع نہ دے سکوں گا؟

کیا وہ اسی طرح طعنے سنتی رہے گی؟ ظلم سہتی رہے گی؟

اور پھر ــــ اس کے سامنے ایک اور روئے زیبا کھڑا ہوگیا آکر،

یہ مسرت تھی۔

اسلم کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گویا اس کا، اس کی غربت کا مذاق اڑا رہی تھی گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھی، بتاؤ تو اسلم اگر میں تمھاری رفیقۂ حیات بن جاتی تو آج میرا کیا حال ہوتا!؟

کیا میں بھی فاقے نہ کر رہی ہوتی! کیا میرے بدن پر بھی میلے کچیلے کپڑے نہ ہوتے؟ کیا میرا دستِ نگاریں طلائی چوڑیوں سے، میرا گلو ہیروں سے، میری انگلیاں ہیرے جڑے ہوئے نگینوں سے محروم نہ ہوتا، اس طرح محبت سے میرا پیٹ بھر جاتا؟ میری حسرتیں اور آرزوئیں پوری ہو جائیں؟ میرے لئے نوکروں اور خادماؤں کا بندوبست ہو جاتا؟ میرے لئے کار مہیا ہو جاتی؟ میرے لئے ریشمی کپڑے فراہم ہو جاتے؟

نہیں اسلم یہ کچھ نہ ہوتا۔ ہم تم دونوں تھوڑی دیر بیٹھ کر رو لیا کرتے اور پھر تم غمِ روزگار میں مبتلا ہو جاتے! میں غمِ آرزو میں! یہ غم ہم دونوں کی زندگی لے لیتا — میں تمھیں نہ بچا سکی، لیکن کم از کم اپنے کو تو بچا لیا!

مانا کہ سلیم مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتا جتنی کہ تم کرتے تھے، نہ کرے، میں بھی کب اس کی پرستش کرتی ہوں، لیکن سلیم نے محبت نہ کر کے جو کچھ مجھے دے دیا ہے تم محبت کر کے وہ کچھ ہرگز مجھے نہیں دے سکتے تھے۔

اچھا اسلم الوداع! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔

مسرت چلی گئی! انجمن چلی گئی۔ سب چلے گئے، اسلم پھر تنہا رہ گیا! پھر ماضی، حال، مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا!

یہ زندگی کس طرح گزرے گی؟ یہ ناؤ کس طرح پار لگے گی؟ ساحلِ مراد کبھی نظر کے سامنے

آئے گا یا نہیں؟

اتنے میں پھر اس کے کان میں آواز آئی۔ اقبال تم تو بڑے اچھے لڑکے ہو شاباش جاؤ۔ ذرا اسلم صاحب سے پوچھ آؤ۔ شاید اب بھوک لگ آئی ہو! ـــــ دو چار لقمے ہی کھالیں!

وہ مچل گیا۔ نہیں جاتا بار بار

وہ پیار بھرے لہجے میں بولی: شاباش! بڑی بہن ماں کی طرح ہوتی ہے۔ تم میرا کہنا نہ سنو گے؟

وہ شرائط طے کرانے لگا: اچھا اب تو میں چلا جاتا ہوں مگر پھر سے نہ بھیجنا!

وہ ہنستی ہوئی بولی: نہیں بھیجوں گی۔

لیکن اقبال جب پہنچا تو اسلم بہ ظاہر سو رہا تھا

وہ واپس چلا آیا!

(۵)

اَنوَر

تقریباً سارا دن اسی کش مکش و اضطراب میں گزر گیا۔

آج جیسی بے چینی بے کلی اسلم نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ شام کو مغرب سے ذرا پہلے اس نے محسوس کیا کہ یوں لیٹا رہنا ٹھیک نہیں، کام بہر حال کرنا ہے، سوچنے اور سوچتے رہنے سے حاصل کیا؟ حاصل اگر کچھ ہے تو صرف کام سے، صرف سوچ سوچ کر کوئی آدمی ترقی نہیں کر سکتا۔ کشمکش حیات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ کشمکشِ حیات میں حصہ لینے اور ترقی کرنے کی پہلی اور آخری شرط ہے ——— کام، عمل، مسلسل کام اور نہ ختم ہونے والا عمل!

اتنی دیر تک لیٹے لیٹے اور سوچتے سوچتے دماغ بھی تھک گیا ہے اور جسم بھی، کچھ دیر ہوا خوری کر کے آؤں! ——— پھر دوات قلم لے کر بیٹھ جاؤں!

وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ محسوس ہوا مرزا اسکندر علی بیگ اپنے غریب خانہ میں تشریف

لے آتے ہیں۔ ان کا معمول تھا آتے ہی ایک مرتبہ بہ بانگ دہل اپنی تشریف آوری کا اعلان کرتے تھے — "اقبال — سلمیٰ"!

یہ دو لفظ دہلیز پر قدم رکھتے ہی بے ساختہ ان کی زبان پر آجایا کرتے تھے، اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔

اقبال کو تو سلمیٰ نے کسی کام سے باہر بھیجا تھا۔ شاید مٹی کا تیل لینے کے لئے لہٰذا اس کی اور اپنی طرف سے سلمیٰ نے جواب دیا: جی — آبا جی!

پھر وہ کہنے لگی: آج بھی دیر لگادی آنے میں آپ نے؟

وہ غم انگیز لہجے میں بولا: ہاں بیٹی! دیر لگ گئی مگر کام پھر بھی نہیں بنا۔ ایک صاحب نے کل بلایا ہے شاید کوئی سبیل نکل آئے!

سلمیٰ کہنے لگی: آبا جی اسلم صاحب کچھ آج بیمار ہیں۔ میرے خیال میں تو کچھ زیادہ طبیعت خراب ہے، اتنے میں کھانا نکالوں آپ انھیں دیکھ آئیے!

وہ پیر مرد نیک باطن فوراً تیار ہو گیا، لیکن تشویش و اضطراب کے لہجے میں کہنے لگا: ابھی جاتا ہوں، لیکن کیسے معلوم کہ وہ بیمار ہے۔؟

سلمیٰ نے بتایا: آج تو انھوں نے کچھ کھایا بھی نہیں، لقمہ تک نہیں توڑا، لوں ہی پڑے ہوئے ہیں جب سے بستر پر کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو!

مرزا صاحب نے چلتے چلتے بیٹی سے شکوہ کیا لیکن بیٹی اگر طبیعت خراب تھی تو اس کے لئے کھچڑی پکادی ہوتی، دلیہ بنادیا ہوتا۔

وہ بولی: معدہ ہی تو خراب ہے آبا جی!

مرزا صاحب نے پھر کچھ نہ کہا، چپ چاپ باہر نکل آئے۔ اسلم بھی بستر سے اُٹھ

چکا تھا۔ مرزا صاحب نے آتے ہی تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ کہا: ارے میاں اسلم کیسے ہو؟

اسلم نے جواب دیا: اب تو ٹھیک ہے طبیعت، ذرا ڈاکٹر کے ہاں جا رہا ہوں۔

مرزا صاحب پوری تفصیل معلوم کرنے کے درپے تھے۔ لیکن ہوا کیا تھا؟

اسلم نے بتایا: شاید ہیضہ ہو گئی ہو، یا نہ جانے کیا بات تھی؟ درد، اینٹھن، مروڑ، میں تو پریشان ہو گیا۔

مرزا صاحب ہنسنے لگے: بس اس لئے فاقہ فرمایا تھا آپ نے؟ یہ سو فیصد ہیضہ ہے اور اس کا علاج کسی حکیم کے پاس ہے نہ ڈاکٹر کے، خاکسار کے پاس ایسا صدری نسخہ ہے کہ دو خوراکوں میں مرض غائب!

درحقیقت تو ہیضہ تھی نہیں۔ اسلم ڈرا، نہ جانے اب کون سا قدح پینا پڑے گا اور یہ ضرور اپنے سامنے پلائیں گے۔ بس اب اچھا ہی ہوں، اس وقت تو نہ درد ہے نہ اینٹھن نہ مروڑ!

مرزا صاحب تو جیسے ضد پہ آ گئے تھے، نا بھائی بیماری کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ دو خوراکیں ابھی بھیجتا ہوں، ایک ابھی کھا لو، ایک رات کو سوتے وقت، اور صبح اٹھ کر جو چاہو کھاؤ، کوئی پرہیز نہیں۔ ہاں رات کو ضرور فاقہ کرنا پڑے گا!

اسلم کو اس پروگرام پر عمل کرنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا! کہنے لگا بہتر!

مزید کچھ سنے بغیر مرزا صاحب اندر گئے اور فوراً ہی برآمد ہوئے۔ چار گولیاں سیاہ رنگ کی ہتھیلی پر دھری تھیں شفقت کے ساتھ فرمایا:

ابھی میرے سامنے ایک گھونٹ پانی کے ساتھ نگل جاؤ، اور ایک رات کو سوتے

وقت لے لینا!

اسلم نے سوچا بہرحال ان گولیوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور پھر مجبوری ہے کہ جھوٹ بنا ہنا ہے۔ اس نے اسی وقت دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔ مرزا صاحب مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور باہر چلا گیا!

کچھ دیر تک بے مقصد ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ جن خیالات نے دن بھر اُسے پریشان کر رکھا تھا وہ اب بھی ساتھ تھے۔ اور کسی طرح اُن سے گلو خلاصی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایڈورڈ پارک میں جاکر بیٹھ گیا۔ یہ اچھی تفریح گاہ تھی۔ شرفا اکثر ادھر چہل قدمی یا سیر تفریح کے لئے آجایا کرتے تھے۔

وہ خاموشی کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھ گیا، جیب سے سگریٹ نکالا اور اس کا دھواں اڑانے لگا۔ اتنے میں دیکھتا کیا ہے انور چلا آرہا ہے، وہی آرٹسٹ جس کا تعارف شفقت صاحب نے اس سے کرایا تھا۔ اسلم کو دیکھ کر وہ کھٹکا، پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھا،

اوہو! آپ؟

اور مصافحہ کرتے کرتے پاس آکر بیٹھ گیا۔ انور صاف گو اور بے دھڑک قسم کا آدمی تھا۔ کہئے جناب! یہاں کیا ہو رہا ہے؟

اسلم نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا: کام کرتے کرتے جی اکتا گیا تھا، سوچا ذرا تفریح کر آؤں، یہاں آکر بیٹھ گیا۔

انور نے کہا: یہاں کیا تفریح ہوگی، خاک؟ — ہمارے ساتھ چلئے ہم تفریح کرائیں گے!

اسلم نے پوچھا: کہاں چلنا ہے؟

انور نے جواب دیا: بس چند قدم!

اسلم نے سوچا اگر چند قدم پر کوئی واقعی قسم کی تفریح حاصل ہو سکتی ہے تو کیا مضائقہ ہے چلنے میں۔ چلتے چلتے اس نے پوچھا: کوئی فلم دیکھنے کا تو قصد نہیں ہے؟

انور ہنسنے لگا۔ اجی توبہ کیجئے فلم میں کیا رکھا ہے!

دو تین گلیوں میں اِدھر اُدھر گشت کرتے کے بعد انور نے ایک مکان پر دستک دی ایک بوڑھی سی عورت باہر نکلی، اس نے انور کو دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ اور جیسے ہی یہ لوگ اندر داخل ہوئے فوراً بند کر دیا۔ گھر میں کئی کمرے تھے۔ گھر بھی اچھا خاصا تھا معلوم ہوتا تھا کھاتے پیتے لوگ رہتے ہیں یہاں۔ داہنی طرف ایک خاصا بڑا کمرہ تھا جو ڈرائنگ روم تھا۔ نہایت اچھے صوفے، جھاڑ فانوس سے آراستہ، دیواروں پر بیش قیمت رنگین تصاویر آویزاں، بیش قیمتی قالین بچھے ہوئے۔ اسلم کی حیرت ابھی دور نہیں ہوئی تھی کہ سامنے کا پردہ اٹھا اور ایک خاتون آتی نظر آئیں۔ خاتون کو دیکھ کر اسلم اور انور دونوں کھڑے ہو گئے، وہ تبسم کی بجلیاں گراتی آئیں اور انور کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اسلم سوچنے لگا یہ آرٹسٹ کیسے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کتنا اچھا گھر ہے، کتنا اچھا ساز و سامان ہے اور کتنی خوبصورت بیوی ہے۔ ہر آرٹسٹ غریب اور مفلوک نہیں ہوتا۔ انور جیسے آرٹسٹ بھی ہیں جو دنیا میں جنت کے مزے لیتے ہیں۔

انور نے تعارف کی رسم ادا کرتے ہوئے اسلم کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ہیں میرے نہایت ہی عزیز دوست اسلم صاحب۔ بہت بڑے ناولسٹ، بہت اچھے افسانہ نگار بلند پایہ صحافی، مایۂ ناز انشا پرداز۔ پھر وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

یہ ہیں شمیم جہاں، اور واقعی ان کی شمیم انگیزیوں سے جہاں حسن و عشق معمور ہے!

پھر وہ ہنسنے لگا شمیم بھی ہنسنے لگی، اسلم بھی ہنسنے لگا۔

شمیم نے اسلم سے کہا۔ بدقسمتی سے آپ کا کوئی ناول نظر سے نہیں گزرا۔

انور نے کہا: چھپ رہا ہے دیکھ لینا۔ لیکن ہم یہاں ادبیات پر بحث کرنے اور ناولوں پر تبصرہ کرنے نہیں آئے ہیں!

وہ برقِ تبسم گرائی ہوئی بولی وہ تو میں جانتی ہوں کیوں تکلیف کی ہے آپ نے لیکن اسلم صاحب کو اس سے پہلے میں نے آپ کے ساتھ نہیں دیکھا تھا!

انور الجھ پڑا: آخر تم اسلم صاحب سے اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟ نہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہیں نہ مجھ سے بڑے آرٹسٹ ہیں۔ نہ مجھ سے زیادہ شوقین طبع ہیں۔

اسلم بھی جھینپ گیا اور شمیم پر بھی گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اتنے میں انور نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ اور شمیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

آخر تم ہماری خاطر تواضع کیوں نہیں کرتیں! کچھ کھلاؤ پلاؤ!

شمیم نے نوٹ لے لیا اور پھر جس کمرے سے آئی تھی اسی میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اسلم نے پوچھا:

کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؟

انور ہنسنے لگا: میرا گھر؟ اتنا شاندار اور آراستہ و پیراستہ گھر میرا ہو سکتا ہے — ؟

اسلم نے ایک سوال اور کیا: پھر یہ کس کا گھر ہے؟

مس شمیم کا دولت کدہ ہے یہ!

مس شمیم ـــ؟ یہ کون ہیں؟

یہ کون ہیں؟ خدا کے بندے تم اسلم کے سوا کیا ہو ـــ میں انور کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں ـــ مس شمیم، مس شمیم ہیں ـــ اور کیا ہیں؟

اب ساری صورتِ حالات اس کی سمجھ میں آ گئی ـــ اوہو تو یہ مس شمیم ہیں۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز، والی!

انور ہنسنے لگا: دیر میں سمجھے، لیکن خوب سمجھے!

اسلم نے کہا: تم یہاں کب سے آتے جاتے ہو؟

وہ بولا: کئی سال ہو گئے۔ جس دن بھی جیب بھاری ہوتی ہے چلا آتا ہوں۔ جیب خالی ہو جاتی ہے چلا جاتا ہوں۔

اسلم کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ انور کی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی ہے وہ شاید اِن بازاری کے ہاں بھی آتا جاتا ہے یہ معلوم کر کے اُسے دُکھ ہوا۔ اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا:

لیکن یہ زندگی ـــ! کیا مرغوب ہے تمھیں؟

بے تامل انور نے جواب دیا: ہرگز نہیں، بالکل نہیں!

اسلم نے پوچھا: پھر اسے اختیار کیوں کیا ہے؟

انور نے بتایا: اختیار کے مقابلے میں جو چیز ہے اس نے آمادہ کیا ہے مجھے اس پر، وہ مجبوری ہے!

فلسفیانہ رنگ میں انور کو باتیں کرتے دیکھ کر اسلم حیران ہو گیا۔ اس نے کہا: باتیں

اتنی اونچی، کام اتنا نیچ ـــــ نہیں انور صاحب اس زندگی کو چھوڑیے ۔

انور ہنسنے لگا : واہ جناب ناصح مشفق صاحب کیا کہنا ہے آپ کے وعظ و پند کا! اور پھر دفعتہً وہ سنجیدہ ہو گیا ۔ اس نے اسلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا : کیوں چھوڑ دوں ؟ دُنیا مجھے ٹھکراتی ہے ، میں اسے ٹھکراتا ہوں ۔ وہ مجھے ذلیل کرتی ہے میں اُسے ذلیل کرتا ہوں ـــ لیکن میرے دوست ، کچھ بھی ہو ، دُنیا سے میں شکست تسلیم نہیں کر سکتا ۔ میں ہی اس کے مُنہ پر کالک لگاتا ہوں ۔

دعویٰ دلچسپ تھا ۔ اسلم یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا ۔ وہ کس طرح ؟

انور نے کہا : میں آرٹسٹ ہوں ، بہت بڑا آرٹسٹ ، کامیاب آرٹسٹ ۔ میرے آرٹ کی دھوم ہے ! لیکن میں مزدوری کرتا ہوں اور مزدوری مجھے اس طرح ملتی ہے جیسے بھیک ! ـــ

ذرا کے ذرا رُک کر انور نے اسلم کے تاثرات کا جائزہ لیا ، پھر کہنے لگا : میں جس آرٹ کا مالک ہوں اس کا تقاضا یہ تھا کہ میرے پاس بنگلہ ہوتا ، کوٹھی ہوتی ، موٹر ہوتی ، ریڈیو ہوتا ، بینک بیلنس ہوتا لیکن اس میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے ۔ دن رات آنکھیں پھوڑنے کے بعد کبھی آپ کے شفقت صاحب کبھی کوئی اور حاتم دوراں صاحب بھیک کے چند سکّے میری جیب میں ڈال دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے مجھے ، میرے آرٹ کو ، میری رُوح کو خرید لیا ۔ میں بھیک کے یہ چند سکّے لے کر سمجھ لیتا ہوں میں نے ان کو ، ان کی روح کو ذلیل کر دیا ۔ کالک لگا دی ان پر بھی اور ان کی رُوح پر بھی !

سگریٹ سلگانے کے لئے ذرا کے ذرا رُکا ، پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ کہنے

لگا : لیکن میں بھی آرٹسٹ ہوں ۔ ہر ناکامی کو، ہر غم کو، ہر شکست کو مسرت سے، نشاط سے، فتح سے بدل لیتا ہوں ۔

اسلم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا : یہ تو بڑا اچھا کرتے ہیں آپ لیکن کس طرح؟

انور نے بتایا : جس روز سو روپے میرے پاس جمع ہو جاتے ہیں فوراً مس شمیم کے سنگِ آستاں پر حاضر ہو جاتا ہوں ، خوب شراب پیتا ہوں ، داد عیش دیتا ہوں ، غرقِ سرمستی رہتا ہوں اور ذرا دیر کے لئے الف لیلہ کا ابو الحسن عرف سوتا جاگتا بن جاتا ہوں ۔ سمجھنے لگتا ہوں یہ شان دار مکان میرا ہے ، یہ خم کدہ میرا ہے ، یہ ساقیٔ ماہ وش میرا ہے سب کچھ میرا ہے ، اور اس ذرا سی دیر کی لذت میں اپنے بہت سے پرانے غم بھول جاتا ہوں ، ہنستا ہوں ، قہقہے لگاتا ہوں ۔ اور یہ سوچتا بھی نہیں کہ یہاں سے جا کر پھر مزدوری کروں گا ، پھر وہی انور بن جاؤں گا جو اپنے آرٹ کو ہر ہر دکان پر بیچتا پھرتا ہے ۔ سچ کہنا کیا میری پالیسی دُنیا کے مُنہ پر طمانچہ نہیں ہے؟

اسلم کچھ سوچتا ہوا بولا : ضرور ہو گی ، جب تمھارا خیال ہے !

انور نے زور دیتے ہوئے کہا : ہے ۔ یہ دُنیا کی شکست ہے ، وہ مجھے رُلانا چاہتی ہے مگر میں روتا نہیں ۔ وہ مجھ میں احساسِ شکست پیدا کرنا چاہتی ہے مگر میں کسی حالت میں شکست تسلیم نہیں کرتا ۔

اسلم نے بات ختم کرنے کے لئے کہا : واقعی بڑے بہادر ہیں آپ !

انور نے فخر و پندار کے ساتھ کہا : بیشک !

اتنے میں مس شمیم پھر تشریف لے آئیں ۔ رہزنِ تمکین و ہوش اور دشمنِ ایمان و آگہی بن کر !

وہ آئیں اور انور کے پاس بیٹھ گئیں، اتنے میں کمرے کے اندر کچھ سوندھی سوندھی خوشبو کے بھبکے محسوس ہوئے، ایک طباق میں گرماگرم سیخ کے کباب، تکّے اور چانپ۔ دوسرے میں شراب کی بوتل اور تین گلاس!

یہ سب چیزیں لاکر سامنے رکھ دی گئیں۔ انور نے شمیم سے پوچھا: یہ تیسرا گلاس کس کے لئے ہے؟

وہ مسکراتی ہوئی بولی: آپ کے دوست کے لئے!

انور بھڑک گیا۔ میرے دوست کی توہین مت کرو، وہ میری طرح نہیں ہے وہ اونچا، شریف اور رکھ رکھاؤ آدمی ہے۔

یہ کہہ کر اس نے تیسرا گلاس اٹھا کر تڑ سے پھینک دیا۔ شمیم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، وہ اسلم سے کہنے لگا:

تم جاؤ، اسلم تم چلے جاؤ!

اسلم باہر نکل آیا، کچھ مسرور، کچھ مغموم۔ انور کس نفسیات کا آدمی ہے؟ خود ہی مجھے تفریح کرانے لایا اور خود ہی مجھے رخصت کر دیا۔۔۔ لیکن کچھ بھی ہو آدمی اچھا ہے اور دلچسپ!

(۶)

پیشکش

اسلم کو بڑی فکر تھی کہ ارجمند خاں کا قرض ادا کر دے، جب سے اس نے وہاں کھانے کا سلسلہ بند کیا تھا خان صاحب ذرا اُکھڑے اُکھڑے نظر آتے تھے اور ایک روز تو واضح الفاظ میں انھوں نے کہہ ہی دیا:

جب حساب بند ہو گیا تو حساب صاف بھی ہو جانا چاہیئے!

اور اسلم صرف اتنا جواب دے سکا: بس چند دن اور صبر کیجیے۔

خان صاحب نے آنکھیں لال پیلی کر کے سوال کیا لیکن صبر کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہیئے — اتنے دنوں سے صبر کے سوا اور کیا لائق ہے؟

اسلم عرق عرق ہو گیا۔ بارِ ندامت سے اس کی آنکھیں نہیں اُٹھ رہی تھیں پُرشرمسار انداز میں گویا ہوا:

خان صاحب آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آپ کا احسان زندگی بھر تو فراموش

نہیں کر سکوں گا، اُس وقت سہارا دیا آپ نے جب کوئی میرا دست گیر نہ تھا بس چند روز اور انتظار کر لیجئے۔ شفقت صاحب کا کام دن رات کر رہا ہوں ان سے وعدہ لے لیا ہے کہ جس دن کام ختم ہوا اسی دن وہ رقم دے دیں گے۔ رقم ملی اور سیدھا آپ کے پاس آیا!——

ارجمند خاں نے کوئی جواب نہیں دیا، سمندر خاں کو ایک موٹی سی گالی دے کر کچھ ہدایات دینے لگے۔ اسلم نے سمجھ لیا موضوع بدل گیا۔ وہ رخصت ہو کر پھر اپنی قیام گاہ پر واپس آگیا۔

اس عرصے میں اس کا ناول "عشق پر زور نہیں" شائع ہو گیا تھا۔ گو پہلی مرتبہ وہ ایک ناول نویس کی حیثیت سے بازار میں آیا تھا لیکن ہر اعتبار سے اس کا داخلہ نہایت شاندار رہا۔ شفقت صاحب نے پبلسٹی جی کھول کر کی، کتاب کا گٹ اپ بھی بہت اچھا تھا، کتابت، طباعت، جلد بندی بہت بہتر اور برتر، ان تمام چیزوں پر کھلے دل سے انھوں نے روپیہ صرف کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔ اسلم کو بھی ازراہ عنایت انھوں نے پانچ نسخے عطا کئے۔ ایک تو اس نے آتے ہی اقبال کو دے دیا۔ دوسرا مسافر خانے کے منیجر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تیسرا شاید جلانے کے لئے "قوم" کے مالک و مدیر کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری ارسال کر دیا۔ چوتھا الوز نے راستے ہی میں جھپٹ لیا، پانچواں اس کے پاس تھا۔ اور وہ خود انتہائی استغراق اور محویت کے عالم میں سارے کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ایک ہی نشست میں ناول ختم کر ...۔
ختم کر کے اُٹھا تو بہت خوش تھا، شاید وہ اس پر خوش تھا کہ اتنا اچھا ناول اس کے

قلم سے کیسے نکل گیا؟ شاید وہ سوچ رہا تھا ایسا ہی بلکہ اس سے بھی عمدہ ایک اور ناول کل ہی سے لکھنا شروع کر دوں گا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا دُنیائے ادب میں میری شخصیت بہت جلد ایک مانی ہوئی شخصیت بن جائے گی جس کا لوگ احترام کریں گے جس کی عزت ہو گی جس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ موتیوں میں تُلیں گے۔

یہ باتیں سوچ سوچ کر خوش ہونا ہی چاہیئے تھا۔

اتنے میں کھانے کا وقت آ گیا۔ لیکن نہ اقبال کا پتا تھا نہ کھانے کا۔ آخر اس نے پھر کاغذات سنبھالے اور تصابی کتب لکھنا شروع کر دیں۔

دوپہر کا کھانا عام طور پر ایک بجے کھایا کرتا تھا، اس معمول میں کبھی فرق نہیں پڑا۔ اسلمی پابندیٔ وقت کا غیر معمولی طور پر لحاظ رکھتی تھی لیکن آج دو بج گئے تھے اور کھانے کا پتا نہیں تھا۔

پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے، آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ کاغذات سمیٹ کر الگ رکھ دیے اور چپ چاپ آکر بستر پر لیٹ گیا۔ سوچا شاید آج کھانا پکا ہی نہیں ہے چلو فاقہ سہی۔

اتنے میں اقبال صاحب نمودار ہوئے، بہت خوش، سراپا تبسم، جیسے اتنی دیر میں آنے کے بجائے وقت سے پہلے تشریف لے آئے ہیں، انھیں اپنے دیر سے آنے کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ نہ اظہار ندامت، نہ کسی طرح کی معذرت! آئے، پانی کا جگ رکھا اور جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد پھر تشریف لائے، اس مرتبہ کھانا لے کر آئے تھے۔ اسلم جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلا لقمہ توڑنے کے بعد اسلم نے پوچھا کہیں باہر چلے گئے تھے کیا؟

اقبال نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا: نہیں تو، کیوں؟

اسلم نے کہا: روز تو کھانا ایک بجے کھلا دیتے تھے آج دو بج کر دس منٹ ہو گئے ہیں ـــ!

وہ ہنسنے لگا: شکر کیجئے کہ کھانا مل گیا ورنہ آج فاقہ ہی کرنا پڑتا آپ کو!

اسلم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: کیوں کرنا پڑتا؟

اقبال نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اور انکشاف کر دیا۔ کہنے لگا آپ کی وجہ سے کھانا پک بھی گیا ورنہ سب فاقے سے رہتے آج!

اسلم نے اور زیادہ متحیر ہو کر دریافت کیا۔ ارے بھئی کیوں؟

اقبال نے بتایا وہ جو کتاب دی ہے آپ نے مجھے، آپا وہی کتاب پڑھے جا رہی ہیں۔

ساری تکان، انتظار کی ساری بے چینی، بھوک کی ساری شدت یہ الفاظ سنتے ہی ختم ہو گئی۔ وہ ہنسنے لگا اور پھر انتہائی مسرت خوشی کے عالم میں سراپا انکسار و تواضع بنتے ہوئے گویا ہوا: ارے ـــ؟ وہ کتاب اتنی دلچسپ تو نہیں ہے۔

اقبال نے ناقابلِ تردید دلیل پیش کر دی: آپا جو کہتی ہیں۔

اسلم کو سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا: ہاں بھئی پھر ٹھیک ہے۔

ان باتوں میں اسلم کئی لقمے کھا گیا۔ لیکن اب احساس ہوا کہ کھانے میں نمک تو نہیں معلوم ہوتا ہے مطالعے کی مصروفیت نے بے نمک کھلایا ہے؟! اقبال سے کہا: نمک تو لے آؤ ذرا سا!

وہ دوڑتا دوڑا گیا اور فوراً ہی ہنستا ہوا نمک لے کر آ گیا۔ کہنے لگا: آج کیا ہو گیا ہے

آیا کرو؟

اسلم نے پوچھا: بتاؤ کیا ہو گیا ہے؟

اس نے بتایا: نمک ہی نہیں ڈالا نہ دال میں نہ آپ کے سالن میں۔

گرفت کا موقع مل گیا اسلم کو۔ اس نے پوچھا: آپ کے سالن میں؟ یہ سالن میرے ہی لئے پکتا ہے تم نہیں کھاتے!

اقبال کا چہرہ سفید پڑ گیا، جیسے کوئی نیک لڑکا چوری کرتے پکڑا جائے لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اور سلمیٰ کی ٹریننگ کام کر گئی۔ کہنے لگا: کیوں نہیں کھاتا ــــ کھاتے ہیں!

اس سفید جھوٹ پر اسلم کا جی چاہا کہ اس کی خبر لے، لیکن یہ ایک راز ہی تو تھا اور اس کا افشا کرنا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ لہٰذا خاموش ہو گیا۔ اور چپ چاپ زہر مار کرنے لگا۔ واقعی اس وقت یہ سالن جو بڑے مزے کا تھا اور جسے سلمیٰ نے صرف اس کے لئے پکایا تھا زہر معلوم ہو رہا تھا۔

بہرحال جس طرح بنا پیٹ بھرنا ہی پڑا۔ پھر اس نے پوچھا: سیر کو چلو گے؟

کتنا عجیب سوال تھا!

سیر؟ سیر کس طرح کی جاتی ہے۔ یہ تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ یہ تو کسی نے بتایا ہی نہ تھا۔ دوسرے لڑکوں کو سیر کرتے، سیر کو جاتے اس نے کئی بار دیکھا تھا لیکن خود کبھی یہ جرم اس سے سرزد ہوا ہو ایسا آج تک ہوا نہیں تھا۔ وہ گومگو کے عالم میں کھڑا تھا۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے۔

جب کوئی جواب نہیں ملا تو اسلم نے پھر پوچھا: بتاؤ بھئی کیا ارادہ ہے؟ چلو گے

یا نہیں؟

اقبال نے کہا: آپا سے پوچھ آؤں پھر بتاتا ہوں۔

اور پھر چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ اور ذرا دیر میں سوکھا سا منہ بنا کر آیا۔

کہنے لگا: وہ منع کرتی ہیں۔

اسلم کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ خود اسے بھی مایوسی ہوئی۔ پوچھا کیوں؟

منع کرنے کی کیا بات ہے اس میں؟

اقبال نے بتایا: وہ کہتی ہیں تم بہت شریر ہو، ان کے ساتھ جا کر انھیں بھی پریشان کرو گے۔ نہ جانے کیا گل کھلاؤ!

بادل چھنٹ گئے۔ اس جواب نے مایوسی دور کر دی، غلط فہمی رفع کر دی۔

وہ ہنسنے لگا: کیا واقعی تم اتنے ہی شریر ہو؟

وہ صفائی دیتا ہوا بولا: میں تو نہیں ہوں ذرا بھی!

اسلم نے کہا: تو پھر اپنی آپا کو جا کر بتا دو کہ شریر نہیں ہو۔

وہ کہنے لگا: لیکن وہ یقین کب کرتی ہیں میرا!

اسلم کو پھر ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا: اچھا جاؤ کہہ دو اسلم صاحب کہتے ہیں ہم اسے شرارت نہیں کرنے دیں گے۔

وہ پھر چلا گیا بے دلی کے ساتھ۔ اس لئے کہ جانتا تھا اس کے بارے میں سلمیٰ کے فیصلے اٹل ہوا کرتے ہیں۔ ان فیصلوں میں کوئی مداخلت بھی نہیں کر سکتا۔ نہ امی نے کبھی ایسی جرأت کی، نہ آبا جی کے منہ سے کبھی کوئی لفظ نکلا، لیکن پیام بہر حال پہنچانا تھا گیا اور الٹے پاؤں واپس آیا، لیکن اس مرتبہ بہت خوش تھا جیسے کوئی بہت بڑی دولت

مل گئی ہو۔ اسلم نے پھر پوچھا : کیا ہوا ؟

وہ مسکراتا ہوا بولا : اجازت دے دی ، چلوں گا !

اسلم نے کہا : بس تو پھر تیار ہو کر آجاؤ۔ ہم ٹھیک چار بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے ۔۔۔ !

اقبال تیار ہونے چلا گیا۔ اسلم پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ ذرا دیر میں اقبال پھر آیا اس نے پوچھا : کہاں چلیں گے آپ ؟

اسلم نے کہا : تمھیں آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے ، جہاں بھی چلیں چلو۔ یا تو کوئی سینما دکھائیں گے یا ایڈورڈ پارک سیر کرا لائیں گے یا جو نمائش ہو رہی ہے وہاں چلیں گے ! ۔۔۔ لیکن تمھارا کیا جی چاہتا ہے ؟

بے ساختہ اقبال کے منہ سے نکلا۔ نمائش !

اسلم ہنسنے لگا ، چھیڑتا ہوا بولا : نمائش جا کر کیا کرو گے ؟

اس نے بتایا ہمارے پڑوس میں جو صاحب رہتے ہیں اُن کا لڑکا ارشد میرے ساتھ کھیلا کرتا ہے ، وہ دو تین دفعہ نمائش جا چکا ہے ، بڑی تعریف کرتا ہے۔ اور مجھے چڑاتا بھی ہے !

تمھیں چڑاتا بھی ہے ؟ ۔۔۔ یہ کیوں ؟

کہتا ہے تمھارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ نمائش کا ٹکٹ خرید سکو صرف آٹھ آنے کا تو ہے !

بڑا بدتمیز ہے ، کہیں بچّے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں !

وہ کرتا ہے ۔۔۔ اب میں بھی اسے چڑاؤں گا جی بھر کے !

تم کیوں چڑاؤ گے ؟

بدلا لوں گا اس سے !

نہیں بدلا نہیں لیتے ۔۔۔ اچھے بدلا نہیں لیتے کسی سے ، تم تو بڑے اچھے لڑکے ہو ، اب تو نہیں بدلا لو گے ؟

اب آپ نے منع کر دیا ہے ، کیسے بدلا لے سکتا ہوں ؟ ویسے جی بہت چاہتا ہے

اسلم ہنسنے لگا !

(۷)

نمائش

ٹھیک چار بجے اقبال صاحب تیار ہو کر تشریف لے آئے۔ کریچ کا جوتہ، صاف لیکن کئی جگہ سے زخم خوردہ قمیص اور نیکر۔ قمیص پر پیوند کا داغ، نیکر گر دھلی ہوئی لیکن کئی جگہ سے رنگ اڑا ہوا۔ مگر ہشاش بشاش، مشتاق اور منتظر۔ اسلم اس کی اس کیفیت سے بہت متاثر ہوا۔ یہ چھوٹا سا بچہ۔ یہ نونہال جو ابھی سے خستہ و درماندہ ہے آگے چل کر کیا بنے گا؟ اس کے کمزور شانوں پر خود اس کا، اس کے باپ کا، بہن کا اور دوسری ذمہ داریوں کا بوجھ پڑے گا۔ کہیں اس کے شانے ٹوٹ تو نہ جائیں گے؟ اس کی کمر جھک تو نہ جائے گی؟ کہیں اس کا حوصلہ جواب تو نہ دے جائے گا؟ آج یہ خوش ہے، مسرور ہے، ہشاش بشاش ہے۔

لیکن جب اس پر زندگی کا بوجھ پڑے گا۔ کیا تب بھی یہ خوش رہے گا؟ کیا تب بھی یہ مسرور رہ سکے گا۔۔۔ ؟ جب ناسازگاریاں سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوں گی،

اسلم نے سمجھ لیا کہ یہ اپنی تصویر اتروانا چاہتا ہے۔ لیکن جیب خالی ہے اور حرفِ آرزو زبان پر نہیں لا سکتا۔ اس نے پوچھا:

کہئے — کیا ارادہ ہے؟ کھنچواتے ہو تصویر؟

وہ مسکرانے لگا۔ یہی اس کا جواب تھا۔

اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ نیکی اور پوچھ پوچھ!

اسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھتے ہوئے کہا: اگر تصویر کھنچوانی ہے تو کسی اچھی جگہ کھنچواؤ! یہ تصویر تو بڑی خراب ہو گی۔ چند ہی دن میں مدھم پڑ جائے گی!

اتنے میں فوٹو کی ایک اور دُکان نظر آئی۔ یہاں فریم سمیت دو روپے میں تین فوٹو پانچ منٹ کے اندر تیار کر کے دیے جاتے تھے۔

اقبال چلتے چلتے ذرا آگے ذرا رُکا، گویا اس نے اسلم کی توجہ دلائی: کیا یہاں وعدہ پورا ہو گا؟ کیا کوئی دُکان اس سے بھی اچھی آگے آنے والی ہے؟

اسلم اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ آؤ۔ لیکن پہلے ذرا وہ تصویریں بھی تو دیکھ لیں جو نمونے کے طور پر لگی ہیں تاکہ معلوم ہو سکے فوٹوگرافر کیسا ہے؟

مختلف پوزوں کی تصویریں نمونے کے طور پر فوٹوگرافر نے آویزاں کر رکھی تھیں۔ اسلم اور اقبال انھیں دیکھنے لگے۔ واقعی اچھی تصویریں تھیں۔ اقبال نے فیصلہ صادر کر دیا: کتنی اچھی ہیں۔

فوٹوگرافر سے اسلم نے کہا: لو بھئی شکار حاضر ہے — ایک تصویر کھینچ دو۔ اس بچے کی — لیکن بڑی شان دار قسم کی!

فوٹوگرافر اپنا کیمرہ ٹھیک کرتا ہوا بولا۔ ابھی لیجئے صاحب!

اور پھر وہ اقبال کو ایک کرسی پر بٹھا کر دوبارہ اپنے کیمرے سے الجھنے لگا۔ لیکن اقبال کرسی سے اُٹھا اور اسلم کے پاس سرک آتا ہوا آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسلم نے پیار بھرے انداز میں پوچھا۔

کیوں اٹھ کیوں آئے؟ کیا تصویر نہیں کھنچواؤ گے؟

اس نے بہت مختصر سا جواب دیا، نہیں۔

اسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ کہ اتنی دیر میں کیا بات ہوئی جس نے اس لڑکے کو رُلا دیا۔ اس نے پوچھا:

بتاؤ تو کیوں نہیں کھنچواؤ گے؟ یا تو اتنا شوق تھا یا اتنی بیزاری!

اقبال نے دل گرفتہ لہجے میں کہا: اکیلی تصویر کھنچوا کر کیا کروں گا — میں نہیں کھنچواتا۔

اور پھر وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا۔ اسلم کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا:

اکیلے نہیں کھنچواؤ گے تو پھر کس کے ساتھ؟

اقبال اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، آپ کے ساتھ!

اس عجیب و غریب مطالبے نے اسلم کو پریشان کر دیا۔ پہلے تو وہ ہنس پڑا۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا۔:

عجیب لڑکے ہو — مجھے بھی کیا لڑکا سمجھ رکھا ہے!

وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ تو پھر میں بھی نہیں کھنچواتا!

فوٹو گرافر نے دیکھا شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اس نے بھی اقبال کا ساتھ دیا۔ ارے صاحب بچے اسی طرح مچل جاتے ہیں اور بڑے ان کی ضد پوری کرتے ہیں۔ بیٹھ جائیے آپ بھی!

اسلم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میں کیوں مینگ ٹاکر جھگڑوں میں شامل ہو جاؤں لیکن ایک طرف اقبال اڑا ہوا تھا دوسری طرف فوٹو گرافر بضد تھا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو پھر فوٹو گرافر نے کہا۔ آجائیے صاحب، کیوں بچے کو رلا رہے ہیں آپ؟!

بچے کو رلانا تو وہ بھی نہیں چاہتا تھا، لیکن یہ بچہ تو خواہ مخواہ رو رہا تھا۔ اس کی یہ ضد غلط قسم کی تھی، لیکن وہی اصرار کر کے اُسے ساتھ لایا تھا۔ اسی نے تصویر اترانے کی دعوت دی تھی۔ اب وہی اگر اس کی یہ معمولی سی ضد نہ پوری کرے تو واقعی اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ واقعی اسے بہت صدمہ ہو گا۔ آخر اسے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

آئیے اقبال صاحب آپ کا کہنا ہی سہی۔

دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے۔ فوٹو گرافر پھر لپک کر کیمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دفعہ کیمرے کو اپنی جگہ چھوڑ کر الٹے قدموں واپس آیا۔ اقبال کا نیکر کھینچ کر ٹھیک کیا، اس کے بعد پھر جا کر کیمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس نے "ریڈی" کا نعرہ بلند کیا۔ کٹ کی آواز آئی اور وہ فوراً کیمرے کے پردے سے باہر نکل آیا۔

اقبال اور اسلم ان تصویروں کو دیکھنے لگے جو دیوار پر آویزاں تھیں۔ اور واقعی پانچ منٹ میں تین فریم کی ہوئی تصویریں لا کر فوٹو گرافر نے سامنے رکھ دیں۔ واقعی دونوں کی تصویر بڑی اچھی آئی تھی!

(۸)

قسمت کا دھکّا

آج کل اسلم کو ایک ہی فکر تھی، کسی طرح وہ کام ختم ہو جو شفقت صاحب نے اسے سونپا تھا۔ بار بار ارجمند خاں کی باتیں یاد آتی تھیں اور دل پر ایک تیر سا لگتا تھا، وہ کسی چیز سے اتنا دہشت زدہ نہیں ہوتا تھا جتنا قرض سے لیکن قرض اس طرح لپٹ گیا تھا جیسے سانپ درخت کی شاخ سے لپٹ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ اُسے اپنی زندگی سے نفرت ہونے لگتی۔ اپنا وجود بیکار معلوم ہونے لگتا۔ وہ سوچتا تھا میں کیوں زندہ ہوں؟ مجھے اس دُنیا سے یا اس دُنیا کو مجھ سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ بڑے بڑے فلاسفر "سروائول آف دی فٹسٹ"، یعنی بقائے اصلح کے قائل ہیں مطلب یہ کہ زندہ صرف وہ رہ سکتا ہے جو زندہ رہنے کا حق چھین سکتا ہو مگر میں زندہ ہوں، زندگی کی کلفتیں اور نارسائیاں جھیل رہا ہوں، مگر کیا مجھ میں اتنی سکت ہے کہ زندہ رہنے کا حق چھین سکوں؟ کیا میں اپنے کس بل پر زندہ رہنے کی

صلاحیت رکھتا ہوں ؟

پھر خیال آتا۔ میں زندہ اس لئے ہوں کہ خدا مجھے ابھی زندہ رکھنا چاہتا ہے اور جب اس نے مجھے زندہ رہنے کی چھوٹ دے دی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مجھ میں میرے اندر، میرے باطن میں یہ صلاحیت مخفی ہے اسے بروئے کار لانے کی جد و جہد کرنی چاہیئے، بالآخر یہ جد و جہد کامیاب ہوگی اور میں — میں —

اور پھر وہ خواب دیکھنے لگتا — عالم بیداری کے خواب!

پھر اس کے سامنے مستقبل کے سنہرے لمحات آجاتے:

مستقبل! جب وہ نہ جانے کیا کیا ہوگا، جب دُنیا اس کے سامنے سر جھکائے گی اور وہ دُنیا کو اپنے سامنے سرِ عقیدت خم کرنے پر مجبور کر دے گا!

اور پھر —

اور پھر خواب کی دُنیا سے حقائق کی دُنیا میں پہنچ جاتا۔ سنگین اور ٹھوس حقائق، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جن سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا۔ جن کا سامنا کئے بغیر چارا نہیں۔

اور پھر وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنے کام میں لگ جاتا، جیسے اسے کچھ نہیں بننا ہے۔ جیسے وہ کچھ نہیں بن سکتا۔ جیسے وہ صرف ایک مزدور ہے۔ اور مزدور کو حق نہیں کہ وہ ماضی کے حسین بے نظیر کی طرف دیکھ سکے، اسے حق نہیں کہ وہ مستقبل کی خوش آئند دُنیا کا جلوہ دیکھ سکے۔ وہ صرف حال میں اور حال کی دُنیا میں مگن رہتا ہے اسے یہ زندگی ہر حالت میں خوش یا ناخوش گزارنا ہی پڑتی ہے۔

میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کا اس نے جائزہ لیا۔ پھر سامنے لٹکے ہوئے کیلنڈر

پر ایک نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ کل پہلی تاریخ ہے اور آج رات کو سونے سے پہلے پہلے کام ختم ہو جائے گا۔

اور واقعی گو رات صبح میں تبدیل ہو گئی یعنی ٹھیک ۴ بجے کام ختم ہوا لیکن ختم ہو گیا!

اب سونے کا کوئی موقع نہیں تھا، وہ اٹھا اور ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے از سر نو تازہ دم ہو گیا نیند دور ہو گئی۔ اور تکان باقی نہیں رہی۔ نہایت یکسوئی اور انہماک کے ساتھ نظر ثانی کے کام میں مصروف ہو گیا۔

اقبال صاحب ٹھیک وقت پر تشریف لے آئے، جب سے ان کی تصویر اتری تھی بہت خوش تھے۔ بڑے اصرار سے ایک فریم انھوں نے اسلم کی میز پر بھی رکھ دیا تھا باقی دو اپنے ساتھ اپنے گھر یعنی اپنے کمرے میں لے گئے تھے۔ جب بھی اسلم کے کمرے میں تشریف لاتے ایک نظرے خوش گزرسے اپنی یا اسلم کی یا دونوں کی تصویر پر ذرا دیر ٹھٹک کر ضرور ڈال لیتے۔

اس وقت بھی آئے اور اسلم سے مخاطب ہونے کے بجائے تصویر دیکھنے لگے پھر تصویر کا ملاحظہ کرتے کرتے پوچھا:

کیا ناشتہ لے آؤں؟

اسلم نے محویت سے چونک کر کہا: لے آؤ، ضرور لے آؤ۔

یہ جواب پا کر بھی اقبال چند سکنڈ کھڑا تصویر کو ۔۔۔ جسے گھر میں اکثر و بیشتر دیکھتا ہی رہتا تھا ۔۔۔ دیکھتا رہا۔ اور اس کے بعد اچھلتا کودتا ناشتہ لینے چلا گیا اور ذرا دیر میں ناشتہ لے کر واپس آ گیا۔

اسلم نے جلدی جلدی اس فرض سے فراغت کی اور پھر نظر ثانی کرنے بیٹھ گیا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ کھانا آیا اور اس نے کھا پی لیا مگر اس طرح کہ قلم ہاتھ میں تھا اور نظر تحریر پر!

آخر شام ہو گئی، سہ پہر کی چائے پی کر خوش خوش کمپنی کے دفتر پہنچا۔ مسودہ بغل میں تھا۔ اور فریب آرزو کے نئے نئے نقشے تصور میں تھے! پہلی بدشگونی یہ ہوئی کہ شفقت صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے۔ بس خون ٹپک پڑا انکھ انتظار سے!

لیکن وہ باحوصلہ آدمی تھا، بیٹھ گیا، اس نے سوچا، دفتر اور دکان بند ہونے سے پہلے بہر حال وہ تشریف لائیں گے۔

وہ بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ رات کے آٹھ بج گئے۔ دکان بند ہونے لگی، دفتر بند کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس اثنا میں کئی اور امیدوار بھی آئے، کچھ دیر بیٹھے اور مایوس و محروم واپس چلے گئے۔ اس نے سوچا، اب انتظار بیکار ہے چنانچہ وہ بھی اٹھا، لیکن ابھی کرسی چھوڑی نہیں تھی کہ شفقت صاحب تشریف لے آئے۔ انہیں دیکھ کر اس کا جی خوش ہو گیا۔ جیسے بھاگ ان کے روشن ہو گئے۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی شفقت صاحب کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، یا کسی سے لڑ کر آئے تھے یا کسی نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ خدا نخواستہ ایسی حالت میں آئے ہوں ایسا کبھی اور تو نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے آتے ہی سیلزمین کیشیر، کلرک اور دوسرے ملازموں کو بات بے بات پر جھاڑا، اور ڈپٹ کارا، پھر اسلم سے مخاطب ہوئے:

کہئے ___ خیریت؟

اسلم کانی سہم گیا تھا گرمیٔ مزاج کے یہ جوہر دیکھ کر، لیکن اس التفات نے پھر سے

حوصلہ پیدا کر دیا۔ اس نے خوش خوش وہ مسودہ، وہ خونِ جگر سے لکھا ہوا مسودہ پیش کر دیا۔
مسودہ کا شفقت صاحب کو جتنا انتظار تھا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسے دیکھتے ہی وہ پھول کی طرح کھل جاتے لیکن کچھ زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ نہیں فرمایا۔ ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر کہیں کہیں سے دیکھا پھر ورق گردانی کرنے کے بعد میز کی دراز میں رکھ دیا اور فرمایا:

شکریہ ۔۔۔ واقعی ٹھیک وقت پر آپ نے کام ختم کر دیا۔

اسلم اور زیادہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے کہا: دن رات ایک کر کے یہ کام ختم کیا ہے شفقت صاحب!

شفقت نے اس محنت کی داد دینا ضروری نہیں سمجھا۔ ملازم سے کہا۔ دروازہ بند کرو اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اسلم نے سوچا، یہ تو کام بگڑ گیا۔ مسودہ کے ساتھ ہی رقم بےباق کرنے کا وعدہ تھا۔ مگر اس کا تو کوئی ذکر نہیں۔ لیکن اب دکان بند ہو رہی تھی۔ اس موقع پر تقاضا کچھ مناسب بھی نہ تھا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ البتہ چلتے چلتے اتنا عرض کر دیا۔

تو پھر کل حاضر ہو جاؤں گا کسی وقت!

شفقت صاحب نے تیوری چڑھا کر ارشاد فرمایا: کل کیوں؟ ۔۔۔ ہاں چیک لینا ہے آپ کو۔ لیکن نہیں اسلم صاحب کل نہیں دو چار روز ٹھہر جائیے، ذرا ایک نظر ہم بھی تو مسودہ پر ڈال لیں۔ شاید کچھ ترمیم کرانا ہو!

اسلم نے بڑی سعادت مندی سے کہا: ہاں ہاں ضرور۔ جب کہیے ترمیم اور تبدیلی پر حاضر ہوں ۔۔۔ لیکن بڑا ممنون ہوں گا اگر چیک کل نہیں تو پرسوں دے دیجئے۔ میں اسی بنیاد پر ایک قرض خواہ سے وعدہ کر چکا ہوں۔

شفقت صاحب جھلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ انھوں نے ذرا خشک لہجے میں کہا:

صاحب! اس طرح کام چلنا تو مشکل ہے، کاٹا اور لے دوڑی، کچھ مہلت تو دینی ہی پڑے گی آپ کو، میں کسی طرح بھی۔

اسلم نے دیکھا بحث ناگوار ہوتی چلی جارہی ہے اور اس کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ اس نے کہا بہت بہتر۔ جب کہئے حاضر ہو جاؤں۔

شفقت صاحب نے پہلے سے زیادہ سرد مہری کے ساتھ جواب دیا۔ بس آج ہی کے دن!

آج ہی کے دن! اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورے ایک ہفتے کے بعد!

کوئی حرج نہ تھا یہ رقم اگر ہفتے بھر بعد نہیں ایک مہینے بعد مل جاتی۔ نہ شفقت صاحب کہیں بھاگے جاتے تھے نہ وہ مرا جاتا تھا۔ لیکن ارجمند خاں سے وعدہ تھا کہ پہلی تاریخ کو رقم ملے گی اور رقم ملتے ہی سیدھا تمھارے درِ دولت پر حاضر ہوں گا۔

آج وہ انتظار کرے گا، اگر میں نہ پہنچا تو کل سمندر خاں کو بھیجے گا۔ اور اگر اس کو بھی ٹال دیا تو شام ہی کو یا زیادہ سے زیادہ دوسرے دن وہ خود اپنا آبنوسی ڈنڈا ہاتھ میں لے کر پہنچ جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟

کون بچائے گا اس ظالم اور ستمگر سے۔ مسافر خانہ کے منیجر صاحب خود دبک کر بیٹھ جائیں گے ایک کونے میں۔ لیکن خیر اب تو یہ ایک ہفتہ کسی نہ کسی طرح گزارنا ہے:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر!

دیکھا جائے گا جو کچھ ہوگا!

(۹)

باتوں باتوں میں

شفقت صاحب کے ہاں سے واپسی پر اسلم کے پاؤں دس دس من کے ہو رہے تھے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ ایک طرف ارجمند خاں کی دہشت دوسری طرف مصارفِ یومیہ کی فکر، سب سے بڑھ کر بے روزگاری کا دھڑکا۔ کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی تھا نہیں، کتابیں لکھنا اور معاوضے یا رائلٹی کی رقم پر زندگی بسر کرنا خیالی اعتبار سے جتنا خوش آئند تھا عملی اعتبار سے اب اُتنا ہی دشوار نظر آ رہا تھا۔ کسی دفتر میں ملازم ہوتا تو مہینے کی پہلی تاریخ کو ایک رقم مل تو جاتی، یہاں تو دن دن بھر اور رات رات بھر کام کرنے کا صلہ وعدۂ فردا کے سوا اب تک کچھ نہیں ملا تھا۔ تنہا ہوتا تو فاقے کر لیتا، ہر طرح کی تکلیفیں جھیل لیتا۔ لیکن اب اس نے ایک معذور و مجبور چھوٹے سے کنبے کی ذمّہ داری بھی تو قبول کر لی تھی۔ اقبال، سلمیٰ، سکندر بیگ کتنے اچھے لیکن کتنے بدقسمت لوگ ہیں۔ یہ بھی گھر سے بے گھر ہوئے، پردیس میں کوئی بات پوچھنے والا

نہیں۔ یہ بڑھاپا، یہ کمزوری یہ عمر، لیکن بچارے مرزا صاحب ہیں کہ زمین کا گز بنے ہوئے ہیں۔ کسی پہلو قرار نہیں۔ کبھی اس در پر کبھی اس آستانے پر، یہاں سے وعدہ وہاں سے انکار۔

یہی باتیں سوچتا ہوا آیا اور تھکا ہوا بستر پر دراز ہو گیا۔

سوچنے لگا: ایک ہفتہ کی یہ طویل مدت کیسے گزرے گی۔!

اتنے میں پاس کے کمرے سے آواز آئی: آپا ہم چائے پئیں گے!

سلمیٰ نے جواب دیا: دودھ نہیں ہے، چائے کیا میرے خون کی پیوگے؟

اقبال بھی گپ مارنے والا تھا، یہ رکھا جو ہے پتیلی میں۔

جواب میں کہا گیا: اس دودھ سے صرف دو پیالیاں بن سکتی ہیں۔ ایک ابا کے لئے ــــ ایک ــــ

اسلم صاحب کے لئے۔؟

ہاں ــــ جانتے تو ہو سب کچھ، پھر کیوں جلے جا رہے ہو؟

تم کیا کروگی؟

ہم بھی نہیں پئیں گے!

مگر اسلم صاحب کو تو چائے کا کچھ ایسا شوق نہیں ہے۔

لیکن ہمیں تو ہے۔

تمھیں کس چیز کا شوق ہے؟ کیا پلانے کا؟

ٹھیک سمجھے، یہی بات ہے؟

آخر اسلم صاحب کا اتنا خیال کیوں کیا جاتا ہے؟

خیال تو تمھارا کیا جانا چاہیئے ـــــ کیوں میاں نکھٹو؟!

ہم نکھٹو ہیں، کیوں آپا؟

اور کیا ہو؟ ـــــ بڑے ہوتے، کسی قابل ہوتے، تو آج اس بڑھاپے میں آپا یوں در در سارے پھرتے نوکری کی تلاش میں، مسالہ پیستے پیستے، کھانا پکاتے پکاتے جھاڑو دیتے دیتے میرے ہاتھوں کی یہ حالت ہوتی ـــ دیکھ ـــــ دیکھتا ہے یہ گھٹے؟!

گھٹوں سے کیا ہوتا ہے، اتنے خوبصورت ہیں تمھارے ہاتھ؟

اب تو لے گا کچھ ـــــ شامت آئی ہے شاید تیری ـــ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے لگا ہے!

تو کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں؟

اور کیا سچ کہہ رہا ہے؟ اپنی بیوی کے ہاتھوں میں گھٹے دیکھ کر اس کے خوبصورت ہاتھوں کی تعریف کیا کرنا!

تعریف نہیں کرتا میں کسی کی!

ارے تو کیا وہ خوب صورت نہیں ہوگی!

تم سے زیادہ ہوگی تو گلا گھونٹ دوں گا، تم سے خراب ہوئی تو بھی گلا گھونٹ دوں گا!

(ہنستے ہوئے) واہ رے دیوانے، کچھ دماغ چل گیا ہے۔ بڑا آیا گلا گھونٹنے والا ـــ اور وہ تجھے چھوڑ دے گی۔ وہ بھی ایسا ٹینٹوا دبائے گی کہ یہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر نکل آئیں گی!

(بگڑ کر) آنکھیں کس کی چھوٹی چھوٹی ہیں؟

تیری اور کس کی۔ اوہو آپ تو آہو چشم ہیں شاید!

اور نہیں تو کیا! ــــ اپنی آنکھیں تو دیکھو آئینہ لے کر!

جی تو بہت چاہتا ہے، لیکن اتنا بڑا آئینہ کہاں سے لاؤں؟ گھر والے آئینے میں تو تم ہی اپنی ننھی منی سی آنکھیں دیکھ سکتے ہو میری آنکھوں کے لئے تو قدِ آدم آئینہ چاہیئے۔

(ہنستے ہوئے) اپنے منہ میاں مٹھو بننا خوب آتا ہے۔ اور میری آنکھیں کونسی چھوٹی ہیں ــــ اسلم صاحب سے تو بڑی ہیں۔

پھر تو نے اسلم صاحب کا نام لیا، بدتمیز کہیں کا!

کیوں نہ لیں ان کا نام! تمھارے وہ کون ہوتے ہیں؟

میرے کون ہوتے!

ہمارے تو دوست ہیں۔

ہاہا! بالشت بھر کے پودنے سے اتنا بڑا آدمی دوستی کرے گا، اپنی اوقات کیوں بھول جاتا ہے؟

تم تو بڑی دس گز کی ہو!

اور نہیں کیا تیری طرح! کہ جب تک عینک نہ لگائی جائے نظر ہی نہیں آتا!

دیکھو پھر مجھے غصّہ آجائے گا۔

غصّہ آجائے گا تو کیا کرے گا؟ اپنا منہ نوچ یا اپنی بیوی کے جھونٹے پکڑ کر

پٹخنیاں دے اُسے!

اچھالا دُوہ تصویر دے دو ہماری!

تصویر کیسی، خواب کی باتیں کر رہا ہے۔!

خواب کی باتیں کیسی! کہاں ہے وہ فریم جو میں نے تمھارے پاس رکھوایا تھا؟

وہ جس میں اسلم صاحب کی تصویر ہے؟

ہاں، ان کی بھی اور میری بھی!

میرے پاس تو صرف انہی کی ہے۔

میری بھی تو تھی وہ کیا ہوئی؟

وہ تو میں نے قینچی سے تراش کر پھینک بھی دی کوڑے میں!

اور وہ تھی کس قابل؟ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل!

اور اسلم صاحب!

ان کا کیا کہنا ہے، ان کا تمھارا کیا مقابلہ؟ تم تو ان کی خاکِ پا کی برابری بھی نہیں کر سکو گے، کہاں وہ کہاں تم، کہاں راجا بھوج کہاں گنگو تیلی!

(بہت زیادہ برافروختہ ہو کر) میں گنگو تیلی ہوں؟

تم سے وہ بھی اچھا تھا۔

میں کچھ نہیں جانتا میرا فریم دے دو چُپ چاپ!

نہیں دیں گے، نہیں دیں گے ___ بکواس بند کرو۔ سر میں درد ہو رہا ہے ہمارے!

میں تمھارا بکس توڑ دوں گا، میری چیز کیوں رکھی ہے اپنے بکس میں؟

تیری چیز تو قینچی سے کاٹ کر پھینک دی میں نے۔ اب تو وہی چیز ہے جو ہماری
ہے!

وہ بھی میری ہے۔

(نقلاتے ہوئے) ہونہہ — وہ بھی ہماری ہے — پھر دن کو جگمگاتے والا
سورج بھی تمھارا ہے، اندھیرے میں جھلملانے والے تارے بھی تمھارے ہیں،
رات کو چمکنے والا چاند بھی تمھارا ہے؟!

نہیں دوگی تم؟

کہہ تو دیا نہیں دیں گے! — دیکھو خبردار میرے بکس کی طرف بڑھے تو اتنے
طمانچے لگاؤں گی کہ یہ کالے کالے گال لال ہو جائیں گے۔

تو آخر تم نے اسے بکس میں بند کر کے کیوں رکھا ہے؟

اس لئے کہ ہماری چیز ہے تم پوچھنے والے کون؟

اسلم صاحب نے تو مجھے دی تھی!

ہاں تمھیں دی تھی — لیکن میرے لئے؟

تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو تمھیں دی تھی — میں کچھ نہیں جانتا
میری تصویر مجھے واپس کر دو۔ ورنہ — اچھا نہیں ہوگا!

منہ دھو رکھو — تمھاری تصویر تو غائب ہے۔ یہ اسلم صاحب کی ہے!

میں اسے کاٹ ڈالوں گا،

دیکھو اقبال قینچی کو ہاتھ لگایا تو انگلیاں تراش دوں گی۔ ننھے ہو کر گھورو گے۔ بڑے اچھے لگو گے

کچھ بھی ہو میں تو کاٹوں گا، پھاڑ کر پھینک دوں گا!

ذرا ہاتھ تو لگا کر دیکھو بکس میں ۔۔۔ خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا، میرا غصہ بہت بُرا ہے ۔ پھر گھنٹوں بیٹھ کر بھوں بھوں روؤ گے ۔ سارے مسافر خانہ کے لوگ بے ٹکٹ کا تماشا دیکھنے جمع ہو جائیں گے ، بڑا مزا آئے گا !

مرد بھی کہیں روتے ہیں ، میں کیوں رونے لگا !

اچھا تو جناب مرد صاحب ذرا تکلیف کیجئے ، باہر نکلئے ، دیکھئے اسلم صاحب آ گئے ہیں یا نہیں ۔ آ گئے ہوں تو پوچھئے کھانا حاضر کیا جائے ؟

جب تک میری تصویر نہیں دو گی تمھارا کوئی کام نہیں کروں گا !

کام تو جوتے کے زور سے کرنا پڑے گا ۔ نہ کرو گے تو جاؤ گے کہاں ! ابا جان الگ گوشمالی کریں گے ! اور اسلم صاحب الگ پٹائی کریں گے !

وہ بڑے اچھے آدمی ہیں ۔

اوہو اب تو تعریفیں ہونے لگیں ان کی ۔ واقعی بڑے خوش قسمت آدمی ہیں

ہاں تو بڑے اچھے آدمی ہیں ۔۔۔ کیوں ؟

آخر تم کرید کرید کر انہی کی باتیں کیوں پوچھا کرتی ہو ؟ ۔۔۔ میں نہیں جانتا کچھ !

اسلم بستر پر لیٹا بڑے انہماک کے ساتھ بھائی بہن کی یہ نوک جھونک سن رہا تھا اور لطف لے رہا تھا ۔ کبھی کبھی مسکرا اٹھتا ۔ اقبال کے آخری جملے پر سلمیٰ خاموش ہو گئی ۔ شاید وہ جھینپ گئی تھی ۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا :

خبردار جو آئندہ ایسی بات کہی ہو گی !

اقبال اس تنبیہ کا مطلب نہ سمجھ سکا ۔ اس نے بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ کہا : ایسی کونسی بات کہہ دی میں نے ؟

وہ بولی: میں کیوں کرید کرید کر کسی کی باتیں پوچھنے لگی۔

اقبال بحث پر اتر آیا: تو اتنی دیر سے کیا کر رہی تھیں؟

وہ جل کر بولی: تیرا سر ۔ بچّے ایسی باتیں نہیں کرتے!

اقبال نے طنز کیا: تو پھر بچّوں کو ستاتی کیوں ہو؟

وہ کہنے لگی: میں تو کسی بچّے کو نہیں ستاتی! ہاں ایک بچّے سے اقبال اسے کبھی کبھی ضرور چھیڑ لیتی ہوں، وہ میرا بھائی بھی تو ہے۔ اور جانے کیوں مجھے اتنا اچھا، اتنا پیارا، اتنا بھلا لگتا ہے کہ جی چاہتا ہے۔

اسے کچّا چبا جاؤں۔؟

(ہنستے ہوئے) ہاں۔

لیکن دانت جو ٹوٹ جائیں گے!

میرے دانت بڑے مضبوط ہیں۔

ہاں اور کیا۔ اسی لئے تو اپنے آگے کی بوٹی مجھے دے دیتی ہو۔

تو کیا اس لئے دے دیتی ہوں کہ میرے دانت کمزور ہیں۔ وہ تو اس لئے دیتی ہوں کہ تجھے بوٹی کا بہت شوق ہے، ایک میرے حصّے میں آتی ہے اور ایک تیرے، سوچتی ہوں ایک کے بجائے دو کھالے میرا بھائی تو اچھا ہے۔ میرا کیا ہے، کھایا کھایا نہ کھایا نہ کھایا۔

اچھا اب اپنا حصّہ بھی میں تمھیں دے دیا کروں گا۔

شکریہ! لیکن اس ایثار پر طبیعت کیوں لہرا رہی ہے حضور کی؟

کیا میں اپنی بہن سے محبت نہیں کرتا، کتنی پیاری، کتنی اچھی، کتنی نیک ہے

میری بہن !

ارے اب تو شاعر بھی بنتا جا رہا ہے ــــ اگر بہن کو چاہتے ہو تو اس کا کہنا مانا کرو۔

وہ تو مانتا ہوں ، کیا نہیں مانتا ؟

بڑا مانتے ہو ، اتنی دیر سے تو ذرا سی تصویر کے لئے لڑ رہے ہو ، تمھارے پاس تو خراب ہو جائے گی ۔ توڑ پھوڑ دو گے ، میرے پاس احتیاط سے رہے گی۔

میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا ، اب نہیں مانگوں گا تم ہی اپنے پاس رکھو میرا جب جی چاہتا ہے اسلم صاحب کے پاس دیکھ آتا ہوں جا کر ــــ لیکن آپا تم نے میری تصویر کیوں تراش دی قینچی سے !؟

پاگل ہوا ہے ۔ تیری تصویر کس ہاتھ سے کاٹ سکتی ہوں ، وہ دل کہاں سے لاؤں گی جو تیری تصویر کو کٹتا دیکھ سکے ، میں تو یونہی چھیڑ رہی تھی تجھے !

لیکن ایک بات سوچ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے آپا۔

ایسی باتیں جن سے دُکھ ہو نہیں سوچا کرتے ــــ کیا بات ہے وہ ؟

کچھ دنوں میں ابا جی کو نوکری مل ہی جائے گی ۔

ہاں خدا کرے ــ پھر ؟ ــ اس میں دُکھ کی کیا بات ہے ؟

پھر کوئی مکان کرایہ پر لے کر ابا جی وہاں رہنا شروع کر دیں گے ، کہہ تو رہے تھے اس دن !

ہاں تو کیا اسی مسافر خانہ میں ساری زندگی بسر کر دیں ؟

یہ کب کہتا ہوں ــــ لیکن پھر اسلم صاحب کہاں ملیں گے ، وہ تو چھوٹ جائیں

گے ہم سے !

بہت خیال ہے ان کا ؟

ہاں آپا بہت زیادہ ۔ مجھے وہ اتنے اچھے لگتے ہیں کہ کیا کہوں ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ انھیں بھی ہم اپنے ساتھ نئے گھر میں لے چلیں ؟ اور وہیں رکھیں !

ہو تو سکتا ہے ، بلکہ ایسا ہو تو کیا کہنا ! لیکن وہ بھلا کیوں ہمارے ساتھ جانے لگے !

کیوں ان کا کیا بگڑ جائے گا ؟ جیسے یہاں رہتے ہیں ایسے ہی وہاں رہیں گے۔ یہاں بھی ان کا کھانا ہمارے ہاں پکتا ہے وہاں بھی پکے گا ۔ کیا نہیں پکاؤ گی ؟

میں تو بڑے شوق سے پکاؤں گی ، لیکن بھیا وہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ آج کل ان کا کھانا اس لئے تھوڑی پکتا ہے ہمارے ہاں کہ وہ کہیں اور نہیں کھا سکتے اس لئے پکتا ہے کہ وہ اس بہانہ سے ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں ، سو زندگی بھر تو کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا ۔ ہم پر ان کے اتنے احسانات ہیں کہ جن کا بدلا ہم کبھی نہیں چکا سکتے اماں جی کے انتقال پر جو کچھ انھوں نے کیا اگر ہم بڑے ہوتے تو اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے ۔

اسی لئے تو انھیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔

جی اور کس کا چاہتا ہے ۔ لیکن مجبوری تو مجبوری ہی ہے کب تک وہ ہم بیچاروں کی مدد کرتے رہیں گے ۔ ہر چیز کی ، ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے !

تم تو نہ جانے کیا کیا کہہ رہی ہو میری سمجھ میں تو نہیں آیا ۔ اچھا میں خود اُن سے بات کروں گا ۔

واہ رے پگلے خبردار ـــــ کیا بات کرے گا!

یہی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ نئے گھر میں اٹھ چلیئے، وہیں رہیئے، یہاں سے زیادہ
ہم آپ کو وہاں آرام پہنچائیں گے کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دیں گے ـــــ دیکھ لیناوہ
ان جائیں گے۔

نہیں اقبال ایسی بات ٹھیک نہیں۔

کیوں ٹھیک نہیں آپا؟

کہہ تو رہی ہوں تم ابھی بچے ہو، بہت سی باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔
س سے بڑھ کر کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ نئے گھر میں ہمارے ساتھ رہیں، مجھے خود بہت
وشی ہوگی۔ دن بھر اور رات بھر اگر ان کے لئے کام کرنا پڑے تو سکھ محسوس کروں گی۔

لیکن یہ بات زبان پر نہیں لائی جا سکتی، میرے بھیا!

آپا! کیوں یہ بات زبان پر نہیں لائی جا سکتی؟

کہیں گے ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔

کون کہے گا یہ، کون کہہ سکتا ہے؟

ممکن ہے وہ خود دل میں یہی خیال کریں۔ ممکن ہے ان کے گھر کے لوگ ایسا ہی
سمجھیں ـــــ ہم کچھ ہوتے، ہماری مالی حالت اچھی ہوتی، ہم ان کے ممنونِ کرم نہ ہوتے
ہم ان کی مدد قبول نہ کر چکے ہوتے تو بے شک اصرار کر سکتے تھے اس پر، لیکن اب نہیں
اب دنیا اُسے خلوص نہ سمجھے گی لالچ سمجھے گی، خود غرضی سمجھے گی ـــــ خبردار اقبال جو کبھی
یہ بات زبان پر لائے تم۔

اچھا آپا اگر وہ خود کہیں؟

خود کیا کہیں گے ؟

وہ کہیں ہم بھی تمھارے ساتھ چلتے ہیں، یہاں مسافر خانے میں نہیں رہیں
وہیں رہیں گے تمھارے پاس تب ؟!

ایسا نہیں کہیں گے وہ !

فرض کرو کہیں تب ؟ — کیا تب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ خود غرض
ہیں، لالچی ہیں !

جب کی بات اور ہے، لیکن دُنیا والوں کا منہ کون بند کر سکتا ہے !

میں بند کر دوں گا، کیا مجال جو کوئی کچھ کہہ سکے !

(مسکراتے ہوئے) کیا کہنا ہے ہمارے گاما پہلوان کا !

آپا بہت بھوک لگ رہی ہے۔ نہ کھانا دیتی ہو نہ چائے دیتی ہو۔ دیدی
محبت ہے۔ اپنے بھائی سے !

(ہنستے ہوئے) کتنا تیز ہے تو ابھی سے — کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں۔
جا دیکھ آ — اسلم صاحب آگئے یا نہیں — جب تک وہ نہ کھالیں اور آپا جی نہ
آجائیں تمھارا دانہ پانی بند۔ نہ کھانا ملے گا نہ چائے !

آپا جی تو نہ جانے کب آئیں گے ؟

ہاں انھیں تو دیر ہو جاتی ہے کوئی وقت نہیں بیچارے کا، کبھی جلدی آگئے کبھی
دیر میں۔ لیکن اسلم صاحب ؟

اچھا بھئی جاتا ہوں۔

اسلم کان لگائے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اقبال کو اپنی طرف آتا دیکھ

کرکے اس نے چادر اوڑھ لی۔ اور سوتا بن گیا۔ اقبال آیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور اسے سوتا دیکھ کر الٹے پیروں لوٹ گیا اور سلمیٰ سے کہا:

وہ تو نہ جانے کب کے آئے ہوئے ہیں ــــ لیکن سو رہے ہیں۔

سلمیٰ نے پریشان لب و لہجے میں پوچھا: سو رہے ہیں؟

وہ بولا: ہاں ــــ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔

وہ کہنے لگی: لیکن یہ تو سونے کا وقت نہیں ہے۔ کہیں کچھ طبیعت تو خراب نہیں خدانخواستہ؟

اقبال نے جواب دیا: کیا معلوم؟

سلمیٰ نے بیقراری کے ساتھ کہا: تو جاؤ دیکھ آؤ جاکر!

وہ چڑ کر بولا: کیا دیکھ آؤں جاکر، کیا جگا کر پوچھوں کچھ بیمار تو نہیں ہیں آپ؟

سلمیٰ نے سوال کیا: کیا چادر اوڑھے سو رہے ہیں؟

اس نے جواب دیا: ہاں چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔

سلمیٰ نے ہدایت دی: ایسا کرو، جاؤ چادر کا کونہ آہستہ سے اٹھا کر ماتھے پر ہاتھ رکھو معلوم ہو جائے گا گرم ہے یا نہیں؟

اور اگر وہ جاگ گئے تو کیا ہوگا؟ پوچھیں گے نہیں کیا کر رہے تھے تم؟

ماتھے پر گھونسہ مار دو گے تو بے شک جاگ جائیں گے۔ لیکن آہستہ سے ــــ دیکھو ناں ــــ دیکھ لینا۔ شاباش چلے جاؤ فوراً۔

اقبال نے حرف بہ حرف تعمیل کی، دبے پاؤں گیا، چپکے سے چادر کا کونہ اٹھایا۔ آہستہ سے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جیسے ہی پیچھے ہٹا دو مضبوط اور توانا ہاتھوں نے اس کے

چھوٹے سے اور کمزور ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسلم اٹھ بیٹھا۔ اقبال سہم گیا۔ اس نے سارا راز اگل دیا۔

میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہیں آپ کو بخار تو نہیں ہے!

اسلم نے انجان بن کر سوال کیا: بخار؟!

وہ بولا: ہاں بے وقت جو سو رہے تھے آپ؟ آپا کو خیال ہوا شاید آپ کو بخار آگیا ہے، انھوں نے کہا تھا جاؤ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر دیکھ آؤ۔

اسلم ہنسنے لگا: بھئی مجھے بخار وخار کچھ نہیں ہے۔ ہاں بھوک لگی ہے کھانا لاؤ۔

وہ چلا گیا۔

اسلم کے کان میں سرگوشی کی آواز آئی۔ سلمیٰ اقبال سے کہہ رہی تھی: بیوقوف تو نے میرا نام کیوں لے دیا؟

اس نے جواب دیا: ہم جھوٹ نہیں بولتے۔

---

(۱۰)

شیر کا سامنا

شفقت صاحب سے نصابی کتابوں کا معاوضہ وصول کرنا آندھی روگ ہو گیا۔ ایک ہفتے کے بجائے دو ہفتے گزر گئے تب کہیں جاکر انھوں نے چیک دیا، وہ بھی ایک ہفتے کے بعد کی تاریخ کا۔ اسلم نے لاکھ لاکھ سر ٹپکا، اصرار کیا، التجا کی لیکن شفقت صاحب اپنی بات پر اٹل رہے

یہ دن اسلم نے جس کرب، بے چینی اور اضطراب کے عالم میں گزارے اس کا حال بس خدا ہی جانتا ہے۔ البتہ تسکین اس بات سے تھی کہ اس کا ناول "عشق پر زور نہیں" توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ یہ اس کا پہلا ناول تھا۔ بازارِ ادب میں جو ہری پونجی لے کر پہلی مرتبہ وہ پہنچا تھا لیکن ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شوق اور تحسین کی نظروں سے اس کا پہلا کارنامہ دیکھا گیا۔ اخبارات نے اچھے تبصرے لکھے، رسائل و صحائف نے اس کے اقتباسات شائع کیے۔ بزم و انجمن میں اس کا چرچا چل نکلا۔

اپنے تابناک اور زرفشاں مستقبل سے متعلق جو آس لگائی تھی اس کے پورے ہونے کی گھڑی بالکل قریب آتی نظر آئی۔ لیکن صرف واہ واکی حد تک۔ شفقت صاحب نے ابھی تک کوئی رقم نہیں ادا کی تھی۔ اور اُن کے تیور سے معلوم ہوتا تھا مستقبل قریب میں ایسا ارادہ بھی نہیں ہے۔ اس اثنا میں اس نے تین ساڑھے تین سو صفحے کا ایک اور ناول بھی لکھ لیا تھا۔ لیکن اب شفقت صاحب سے ڈرتا تھا، یہ بھی ان کے کولڈ اسٹوریج میں پہنچ جائے گا۔ چھپ جائے گا، بکے گا۔ داد تحسین کے ڈونگرے برسیں گے لیکن جیب خالی کی خالی رہے گی۔ اس محنت سے اس کاوش سے پھر فائدہ کیا۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ کسی دوسرے ناشر تک رسائی نہیں تھی۔ ایک پبلشر شیخ غلام احمد کی بڑی تعریف سنی تھی کہ معاملات کے بڑے صاف اور کھرے ہیں لیکن وہ دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ ان سے جان پہچان نہ تھی۔ خط کتابت کے ذریعے معاملات کا طے ہونا مشکل تھا!

یہ ساری مدت اس نے چوروں کی طرح بسر کی، ارجمند خاں کے سایے سے دُور بھاگتا تھا، اس سے وعدہ کر چکا تھا اور اب وعدہ خلافی پر مجبور تھا اور وہ مرد باہمہ و بے ہمہ کچھ ایسی وضع کا تھا کہ نہ بزاری نہ بزورے نہ بہ زری آید! وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ ایک روز سمندر خاں سے سرِراہ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ خان صاحب ہرنیا کے مرض میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے، آپریشن کیا گیا اور اب تک صاحبِ فراش ہیں۔ انسانی نقطۂ نظر سے یہ واقعہ الم انگیز تھا۔ خان صاحب کا جو برتاؤ اب تک اس کے ساتھ تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ عیادت کے لئے جاتا لیکن انسانی نقطۂ نظر سے یہ بات بھی ضروری تھی کہ عیادت کو جاتا اور روپے لے کر جاتا۔

مگر روپے کہاں تھے؟

آخر وہ مبارک دن آیا کہ شفقت صاحب کا دیا ہوا چیک لے کر وہ بینک کی طرف شاداں و فرحاں روانہ ہوا۔

آج وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ آج اسے ایک رقم خطیر ملے گی۔ آج وہ ارجمند خاں کی ایک ایک پائی بیباق کر دے گا، آج وہ سمندر خاں کو دو روپے انعام دے گا۔ آج وہ اقبال کو پھر اپنے ساتھ بازار لے جائے گا۔ اور اس کے لئے ایک پتلون ایک شرٹ اور ایک جوڑ جوتہ خرید دے گا۔ بیچارہ کی قمیص کئی جگہ سے مسک گئی ہے شلوار میں جگہ جگہ پیوند کاری نظر آتی ہے، جوتہ تو بالکل جواب دے چکا ہے، آج مہینے بھر کی تمام خانگی ضروریات کی چیزیں آٹا، دال، گھی، مسالہ وغیرہ خرید لائے گا۔ آج پھر قرض حسنہ کے نام سے وہ مرزا اسکندر علی بیگ کو پچاس روپے قبول کرنے پر مجبور کر دے گا۔ آج کم از کم پچاس ہی روپے انجمن کو بھی ضرور بھیجے گا۔ نہ جانے بیچاری کس حال میں ہے اور کس طرح زندگی بسر کر رہی ہے اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد اگر کچھ رقم بچی تو اپنے لئے بھی کم از کم دو جوڑے بنالے گا۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ ارجمند خاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ کوئی اور دن ہوتا تو خان صاحب کو دیکھ کر اس کا خون خشک ہو جاتا۔ ممکن تھا انھیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن آج مسکراتا ہوا مصافحہ کے لئے وہ ان کی طرف بڑھا۔ خان صاحب کو اس ڈھٹائی کی توقع نہیں تھی۔ انھوں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ تیر کی سی تیز نگاہ کے ساتھ اسے گھورا، پھر فرمایا:

تم جھوٹا ہے، دغاباز ہے، بے ایمان ہے۔ ہمارا پیسہ کیوں نہیں دیتا؟

یہ تلخ اور تند الفاظ سن کر اسلم کو جھکّا آ گیا۔ اگر وہ کمزور نہ ہوتا اور خان صاحب شہ زور نہ ہوتے تو شاید خون ہو جاتا۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے گویا ہوا:

خان صاحب آپ تو بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں۔

خان صاحب کا پارہ اب تک چڑھا ہوا تھا۔ کہنے لگے: تم ہمارا پیسہ تو دیتا نہیں مخول کرتا ہے ہنستا ہے ہم تمھارا منہ توڑ دے گا۔ دانت گرا دے گا۔

اس کا خون پھر کھولنے لگا۔ اس نے چاہا خان صاحب کا چاقو چھین کر سینے میں پیوست کر دے وہ خود خان صاحب کا منہ توڑ دے اور دانت گرا دے لیکن شاخِ گل بجلی بن کر پہاڑ پہ نہیں گر سکتی۔ ضبط کر گیا۔ پھر ایک دفعہ مسکرانے کی ناکام کوشش کی اور کہا:

آپ میرے محسن ہیں خان صاحب! —

خان صاحب نے جملہ پورا نہ ہونے دیا۔ فرمایا: اور اب تم ہمارا محسن بن جاؤ۔ لاؤ نکالو ہمارا پیسہ! ہم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ سارا روپیہ خرچ ہو گیا۔

اس نا ممکن کو ممکن سمجھ کر تائید میں گردن ہلاتا ہوا وہ بولا: یہ تو ٹھیک ہے خان صاحب کئی دفعہ جی چاہا کہ ہسپتال میں آ کر آپ کی مزاج پرسی کروں۔ لیکن میں نے دل میں عہد کر لیا تھا جب تک حساب بیباق کرنے کے لئے روپے نہ ہوں آپ کو منہ نہ دکھاؤں گا کسی طرح!

خان صاحب بھی کافی ذہین تھے کہنے لگے: آج تم نے منہ دکھایا ہے لیکن روپیہ بھی لایا؟

اسلم نے اطمینان دلاتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک نکالا۔ لیکن چیک کو دیکھتے ہی خان صاحب بھڑک گئے: بہت لوگ ہمیں چیک لا لا کر دکھاتا ہے۔ ہمیں روپیہ چاہیئے چیک نہیں۔

اسلم نے خوشامدانہ انداز میں کہا: میں یہ چیک لے کر بینک جا رہا ہوں، وہاں سے سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔ اور ایک ایک پائی بیباق کر دوں گا۔

کچھ تامل کے بعد خان صاحب نے اس وعدہ کا یقین کر لیا۔ فرمایا: جاؤ ہم انتظار کرے گا۔ لیکن یاد رکھو اگر نہ آیا تو پھر ـــــ

اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ نہ تھا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اگر وہ بینک کے بجائے شفقت کے پاس جا رہا ہوتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ کیونکہ ان کی فطرت سے یہ بعید نہ تھا کہ پھر وعدۂ فردا پر ٹال دیتے، لیکن بینک وعدہ خلاف نہیں ہوتے ٹال مٹول کے عادی نہیں ہوتے۔ ان کے ہاں وعدۂ فردا کی کوئی مد نہیں ہے۔ ایسا کریں تو ساکھ ختم ہو جائے۔ دیوالہ نکال دیا جائے۔ اس نے اپنا حوصلہ قائم رکھا اور یقین آفریں لہجے میں کہا:

ایسا نہیں ہو سکتا کہ نہ آؤں۔ آؤں گا ضرور آؤں گا۔ اور ابھی ایک گھنٹہ کے اندر آؤں گا آخر آپ کو منہ دکھانا ہے۔ آپ کی عنایتوں سے بار بار فائدہ اٹھانا ہے آپ سے بھاگ کر آپ کو دھوکا دے کر کہاں جاؤں گا!

یہ سب ایسی غیر ضروری باتیں تھیں کہ خان صاحب نے ان کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ سیدھے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور اسلم بینک کی طرف!

خان صاحب دبدھے میں تھے کہ اسلم کہیں دھوکا تو نہیں دیتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے

چیک کی رقم لے کر الٹے تلّلے میں صرف کر دے لیکن انھیں اپنے ڈنڈے پر اتنا اعتماد تھا کہ جلد ہی یہ اندیشہ رفع ہو گیا۔

اسلم بنیک کی طرف اڑا جا رہا تھا، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سب سے پہلا کام یہ کرے گا کہ خان صاحب کی ایک ایک پائی ادا کر دے گا اور آئندہ ایسے خطرناک آدمی سے ایک پائی بھی قرض نہیں لے گا!

باب ۱۱

ارجمند خاں سے رخصت ہو کر اسلم سیدھا بینک پہنچا۔ یہ بینک بھی ایک دُنیا تھا۔ کیسی عجیب دُنیا!

کلرک اپنی اپنی میز پر بیٹھے کام میں منہمک تھے۔ جیسے یہ آدمی نہیں مشین تھے۔ کوئی ٹائپ کر رہا ہے، کوئی رجسٹروں کی خانہ پُری کر رہا ہے، چپراسی کاغذات کے پشتارے اِدھر سے اُدھر لئے گھوم رہے ہیں۔ روپیہ داخل کرنے والوں اور چیک پیش کر کے روپیہ وصول کرنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہیں۔ روپیہ داخل کرنے والی صف پر نگاہ ڈالئے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے زمین اپنے خزانے اگلے دے رہی ہے۔ نوٹوں کی بڑی بڑی گڈیاں ہاتھوں میں مضبوط تھامے یا چرمی بیگ میں بند کئے اپنی باری کے منتظر کھڑے ہیں۔ چیک پیش کر کے روپیہ وصول کرنے والوں کی قطار پر ایک نگاہ ڈالئے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دھن برس رہا ہے۔ سو پچاس، ہزار دس ہزار اور اس سے بھی بڑی بڑی رقمیں

لوگ وصول کر رہے ہیں ۔

اسلم نے اپنا چیک پیش کیا ۔ ۲۱۲ نمبر کا ٹوکن ملا ۔ اور اس انتظار میں ٹہلنے لگا کہ اس کے ٹوکن کا نمبر پکارا جائے ، رقم وصول کرے اور چلان کے منہ پر مار دے ۔ طرح طرح کے خیالات آرہے تھے ۔ وہ سوچنے لگا ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس بینک کا انتظام ایک دن کے لئے میرے ہاتھ میں آجائے ۔ صرف ایک دن کے لئے !

کوئی پروا نہیں اگر ہتکڑیاں لگ جائیں ، جیل بھیج دیا جاؤں ۔ عمر قید کی سزا مل جائے لیکن ضرور اپنی سی کر کے رہوں ۔

اس ایک دن کے عرصے میں ان تمام لوگوں کو دیوالیہ کر دوں جن کی رقم بیکار پڑی ہوئی ہے ۔ کسی مصرف میں نہیں آتی ۔ جو اندھا دھند لوٹ کھسوٹ کر کے ذہانت کا غلط استعمال کر کے ، بلیک مارکیٹ کر کے ، مزدوروں کی اُجرت دبا کے ، جوا کھیل کر ، سٹے کا کاروبار کر کے ، اسمگلنگ کر کے ، ملک ، قوم اور مذہب سے غداری کر کے اپنے بینک بیلینس میں ہر روز اضافہ کرتے رہتے ہیں ۔ اور ان تمام لوگوں کی ہتھیلیاں سیم و زر سے بھر دوں جو شب و روز محنت کرنے کے بعد بھی فاقے کرتے ہیں ۔ اپنے لئے ، اپنے بچوں کے لئے ، اپنے متعلقین کے لئے نہ نانِ شبینہ کا انتظام کر پاتے ہیں نہ تن ڈھانپنے کے لئے لباس کا ، نہ سر چھپانے کے لئے مکان کا ، نہ زندہ رہنے کے لئے علاج معالجے کا !

پھر وہ خود ہی مسکرانے لگا ۔ اس نے دل ہی دل میں کہا ، غلط بخشی کا مرض اتنا عام ہے کہ صرف کسی ایک بینک کی عنانِ انتظام ہاتھ میں لے لینے سے اور وہ بھی ایک دن کے لئے کچھ نہیں ہوسکتا ۔ یہ کام تو حکومت کا ہے ۔ حکومت اگر میرے ہاتھ میں آجائے تو دُنیا کو بتا دوں کہ خدا کے مجبور اور ناچار بندوں کو کس طرح آرام پہنچایا جاسکتا ہے ، کس طرح ان کے

دُکھ دُور کئے جا سکتے ہیں۔

کاؤنٹر کلرک مختلف ٹوکن نمبروں کو بہ آوازِ بلند پکار رہا تھا اور اسلم اپنے خیال میں مگن شیخ چلی کی دنیا کی سیر کر رہا تھا۔

اتنے میں اس نے سنا نمبر ۲۲۶ ۔۔۔ ارے ۲۲۶ تک کی باری آگئی اور میں اب تک یہیں کھڑا ہوں۔ شاید میں اپنے ٹوکن کا نمبر نہیں سُن سکا۔ اس نے ٹوکن ہاتھ میں لیا اور کاؤنٹر پر پہنچا اور جب ۲۲۶ نمبر اپنی رقمِ خطیر جو سو سو روپے کے بہت سے نوٹوں پر مشتمل تھی لے چکا تو کلرک سے پوچھا:

کیوں جناب ۲۱۲ نمبر؟"

یہ سنتے سنتے کلرک نے ایک اور شخص سے ٹوکن لے لیا تھا۔ اس کے روپے گننے لگا، پھر اس نے ان بہت سے چیکوں پر ایک نظر ڈالی جو شیشے کے موٹے سے پیپر ویٹ تلے دبے ہوئے تھے۔ اور پھر اس نے ٹوکن لے کر وہی چیک جو اس نے داخل کیا تھا خاموشی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

نوٹوں کے بجائے چیک!

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بدن میں سنسنی سی ہونے لگی۔ اتنے میں کہنی مار کر دوسرے ٹوکن والے آگے بڑھے، اُسے مجبوراً پسپا ہونا پڑا، حلقے سے باہر آ کر اس نے چیک پر ایک نظر ڈالی تو ایک چٹ نتھی پائی۔ جس میں ایک چھپی ہوئی عبارت پر سُرخ نشان لگا تھا، جو یہ تھا: "ادائیگی کی ممانعت کر دی گئی ہے"۔

یہ عبارت پڑھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کلرک کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا: "ادائگی کی ممانعت کس نے کی ہے؟"

کلرک نے اس اناڑی شخص پر جو بینک کے کاروبار اور اصطلاحات سے بالکل ناواقف معلوم ہوتا تھا ایک حقارت آمیز نظر ڈالی اور جواب دیا:

جس نے یہ چیک آپ کو دیا ہے!

چٹ پڑھ کر پہلے اگر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا تو اس مرتبہ یہ عجیب اور انوکھی سی بات سن کر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ بھلا شفقت صاحب یہ مذاق کیسے کر سکتے تھے کہ خود ہی چیک دیں اور خود ہی ادائگی کی ممانعت کر دیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کلرک کو مخاطب کیا اور گویا بہت بڑا اور وزنی اعتراض وارد کیا:

مگر یہ چیک تو مجھے شفقت صاحب ہی نے دیا تھا۔

کلرک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے کام میں لگ گیا۔ پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ارے صاحب یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگوں کو ٹالنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے لیکن آپ وقت ضائع کیوں کر رہے ہیں۔ جائیے پوچھئے جاکر ممکن ہے وہ دوسرا چیک دے دیں۔ ابھی وقت ہے، آکر کیش کرا لیجئے گا۔

بات اسلم کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے تعویذ کی طرح موڑ کر چیک جیب میں رکھ لیا۔ اور سیدھا شفقت صاحب کے پاس پہنچا۔ دھوپ بڑی تیز تھی۔ پسینے میں شرابور پہنچا۔ پہلا پنکھا چل رہا تھا۔ اور شفقت صاحب کے سامنے شربت روح افزا کا جام رکھا تھا۔ وہ اطمینان سے ایک ایک گھونٹ کر کے اس طرح پی رہے تھے جیسے دنیا کی ساری لذتیں اس جام زمرّدیں میں سما گئی ہیں۔

آج خلاف معمول شفقت صاحب بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ کہنے لگے

آئیے اسلم صاحب!

اسلم سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ شفقت صاحب نے فرمایا: آپ کا ناول تو ماشاء اللہ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے، دیکھیے یہ ہے ہماری پبلسٹی کا کرشمہ! ایک ایسا شخص جس کی کوئی مارکیٹ ویلیو نہیں تھی۔ اس وقت بازارِ ادب میں سب سے اونچا جا رہا ہے۔ اسلم صاحب آپ کو دو تین ناول ہمیں مفت دینے چاہئیں۔ تاکہ دل کھول کر ہم پبلسٹی پر روپیہ خرچ کر سکیں اور آپ کو دنیائے ادب کی ایک اہم شخصیت بنا دیں ۔۔۔ ایک خوش خبری اور سنئے:

اسلم کو بہت کچھ کہنا تھا، اور تلخ و ترش انداز میں کہنا تھا۔ آج کے چیک کی ادائیگی رد کر کے شفقت صاحب نے اس کے قلبِ مضمحل پر خنجر کا بھرپور وار کیا تھا، وہ لڑنے آیا تھا، ایسی خوش آئند باتیں سننے کے لئے نہیں، لیکن ان خوش آئند باتوں نے اس کا دامن پکڑ لیا چیک کا تعلق اگر حال سے تھا تو ان باتوں کا مستقبل سے۔ اور مستقبل حال سے ہر نوع زیادہ اہم اور توجہ طلب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ نئی خوش خبری سننے کے لئے تیار ہو گیا۔ شفقت صاحب نے فرمایا:

محکمہ تعلیمات نے آپ کی کتابیں منظور کر لیں، آپ کو ایک نیا اور وسیع میدان مل گیا۔ اسلم کے جی میں آیا کہ کہے، اس نئے اور وسیع میدان سے فائدہ تو آپ اٹھائیں گے، ہر ہر اسکول میں یہ کتابیں بکیں گی۔ اور بلیک مارکیٹ میں بکیں گی۔ میرے حصے کے تو وہ چند سو روپے تھے جن کا چیک واپس آ گیا۔ لیکن یہ الفاظ ذہن سے دماغ تک نہ آ سکے البتہ آغازِ سخن کا ایک بہترین موقع ضرور مل گیا، اس نے جیب سے چیک نکالا اور سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا: یہ آپ کا چیک واپس آ گیا۔

شفقت صاحب نے چیک اٹھا کر دیکھا، پھر اسے اپنے سامنے رکھ لیا اور گھنٹی بجائی،

سیدھا ارجمند خاں کے ہاں پہنچا اور حساب کر کے اُن کا ایک ایک پیسہ بیباق کر دیا۔ سمندر خاں کو بھی دو روپے بخشش کے دیے پھر مسافر خانے پہنچا، وہاں سے اقبال کو ساتھ لیا۔ اس کے لئے پینٹ، شرٹ اور شو خریدا، اس کی خوشی کا کیا کہنا۔ معلوم ہوتا تھا دولتِ جاوید مل گئی ہے۔ وہاں سے ڈاکخانہ پہنچا کہ انجمن کو بھی پچاس روپے روانہ کر دے، لیکن ڈاکخانہ بند ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ ارادہ کل پر ملتوی کرنا پڑا۔ اقبال صاحب خوش خوش گھر پہنچے۔ انھوں نے نعرہ لگایا:

آپا! ادھر دیکھو!

سلمیٰ کی آواز آئی: ارے یہ سب تو کہاں سے چُرا لایا۔؟

اقبال نے کہا: میں چوری نہیں کرتا۔ یہ چیزیں تو اسلم صاحب نے دلائی ہیں۔

پھر وہی ہلکی سی آواز آئی: بے عزت کہیں کا۔

اقبال نے صفائی دی: کچھ میں نے تو نہیں کہا تھا۔

سلمیٰ کی آواز پھر سنائی دی۔ اسی طرح لوٹتا رہے گا تو ایک دن دیکھ لینا وہ بھاگ جائیں گے۔

اقبال نے سنجیدگی کے ساتھ کہا: تو کیا واپس کر آؤں جا کر؟

سلمیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا یا اگر دیا تو اسلم سن نہیں سکا۔ ذرا دیر کے بعد پھر سلمیٰ کی آواز اس کے پردۂ گوش سے ٹکرائی: اچھا نمائش کر چکے اب، یہ کپڑے لے جا کر احتیاط سے رکھ دو بکس میں۔ شاباش!

اقبال مچل گیا: واہ کیوں رکھ دوں!

سلمیٰ نے پیار بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا: خراب ہو جائیں گے۔ عید سر پر ہے

ملازم کو حکم دیا : غلام رسول کو بُلا لاؤ۔
غلام رسول فرم کا منیجر اور کیشیر تھا۔ وہ فوراً حاضر ہوا۔ شفقت صاحب نے تند نظروں سے اسے دیکھا اور منہ بگاڑ کر پوچھا :

یہ چیک کیسے واپس آ گیا ؟
غلام رسول نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا : آج کی تاریخ کے تمام چیکوں کی ادائگی آپ ہی نے تو روک دی تھی۔
شفقت صاحب کو غصہ آ گیا، کیوں جھوٹ بولتے ہو! وہ دوسرے چیک تھے جن کی ادائگی بعض مصلحتوں سے میں نے رکوائی تھی۔ اسلم صاحب کا چیک کیسے روکا جا سکتا تھا !
غلام رسول کے تبسم کا دائرہ کچھ اور وسیع ہو گیا۔ گویا اس کا تبسم زبانِ خاموش سے کہہ رہا تھا۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو یار، وہ بھی ہمارے منہ پر، ہمیں کیا پڑی تھی کسی کا چیک رکوانے کی۔ تم ہی اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کیا کرتے ہو، لوگوں کو ٹرخانے، جھوٹے وعدے کرنے، ان کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے، لوگوں کو پریشان کرنے اور خود مزے اڑانے میں کمال حاصل ہے تمھیں۔ پھر اس نے ادب کے ساتھ کہا :
غلطی ہو گئی، معاف کیجیئے گا اسلم صاحب !
شفقت صاحب نے کہا : بہرحال اسلم صاحب کو چیک کی رقم ابھی اور اسی وقت نقد ملنی چاہیئے۔
غلام رسول نے سرِ اطاعت خم کیا اور تھوڑی دیر میں رقم لا کر اسلم کے سامنے رکھ دی۔ اس نے رقم جیب میں رکھی اور شکریہ ادا کر کے اجازت چاہی۔ ساری کلفت اور ماندگی رفع ہو گئی

عید کے دن پہننا کوئی روز روز تو آنے سے رہے!

بات سمجھ میں آ گئی۔ تعمیل کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بادل ناخواستہ اس نے کہا: اچھا رکھے دیتا ہوں۔ لیکن آپا تم کیا کرو گی عید پہ، تمھارے پاس بھی تو کچھ نہیں ہے!

وہ بولی: میری فکر کیوں کرتے ہو، مجھے کہیں باہر تو جانا نہیں ہے تم تو باہر آتے جاتے ہو، تمھارے کپڑے اچھے ہونے چاہئیں۔

اقبال نے دلسوزی کے انداز میں کہا: پھر میں بھی نہیں پہنوں گا۔

وہ بولی: تو دعا کرو آپا میاں کی نوکری لگ جائے پھر میں بھی بنا لوں گی۔

اقبال نے مشورہ دیا: تو ان روپیوں سے کیوں نہیں بنا لیتیں جو اسلم صاحب نے آپا جی کو قرض دیے ہیں۔

سلمیٰ نے پوچھا: قرض! مجھے تو آپا جی نے بتایا نہیں۔

اقبال نے بتایا: یہ دیکھو سو روپے دیے ہیں کہ آپا جی کو دے دینا۔ ان کے ساتھ خط بھی ہے۔ میں نے پوچھا، یہ روپے کیسے ہیں۔ کہنے لگے، قرض دے رہا ہوں جب وہ ملازم ہو جائیں گے ادا کر دیں گے ۔۔۔ ہاں آپا اسلم صاحب آج رات کو کھانا نہیں کھائیں گے۔

سلمیٰ نے پوچھا: کیوں نہیں کھائیں گے؟

اقبال نے بتایا: کہیں دعوت ہے ان کی ۔۔۔ جو کچھ ان کے لئے پکایا ہے لاؤ سب میرے سامنے رکھ دو، ابھی چٹ کر جاؤں گا۔

ہنسی کی آواز آئی۔ پھر اسلم نے سنا، بدنیت کہیں کا!

---

(۱۲)

نئی افتاد

اسلم کی کہیں دعوت نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا آج ارجمند خاں کے ہوٹل میں رات کو کھانا کھائے گا۔ پھر اِدھر اُدھر ذرا سیر گشت کرے گا۔ ذہنی بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ اتنے دن سے کام ہی کام میں مصروف رہا تھا، پھر کلفتیں اور پریشانیاں جُدا۔ پریشانیاں داخلی بھی، خارجی بھی۔ ایک طرف مرزا صاحب، ان کی لڑکی سلمیٰ اور لڑکے اقبال کا حالِ زار، دوسری طرف اپنی ناداریاں اور محرومیاں، تیسری طرف گھر سے باہر کی مصیبتیں، کام کی کثرت لیکن معاوضے سے محرومی۔ اچھا ہے ذرا دل بھی بہل جائے گا، کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی ایک خاص ماحول سے کچھ دیر کے لئے ہٹ جانا بھی دل و دماغ کے لئے تسکین کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ارجمند خاں کے ہاں پہنچا۔ ممند رخاں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خود ارجمند خاں بھی بچھ بچھ گئے۔

ارجمند خاں کے ہوٹل میں کھانے سے فارغ ہو کر اسلم باہر آیا۔ تو الوز آرٹسٹ سے مڈبھیڑ

ہوگئی ۔ آج وہ پھر نشے میں دھت تھا ۔ اس بے تکلفی سے ملا جیسے برسوں کا یارانہ ہے ۔

"ارے اسلم بھائی یہاں کہاں ؟"

اسلم نے سرد مہری کے ساتھ جواب دیا : بھوک لگی تھی آگیا : تم کہاں مٹرگشت کر رہے ہو ؟

انور نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا : ہمارا دن تو اب شروع ہوا ہے ، چلو تمھیں بھی سیر کرا لائیں ۔

اسلم نے معذرت کر دی ۔ نہیں بھئی مجھے معاف کر دو ، بڑے ضروری کام سے جا رہا ہوں اس وقت !

انور کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ کہنے لگا : چلو آج تمھیں ایک بڑی بارگاہ میں لے چلوں ۔

اسلم نے کہا : شکریہ میں بارگاہوں کا طواف نہیں کرتا ۔

انور نے ایک قہقہہ لگایا اور آگے بڑھتا چلا گیا ، اسلم بھی اپنی راہ چل پڑا ۔ کچھ دور جانے کے بعد غلام رسول سے ملاقات ہو گئی ۔ وہ بہت تپاک سے ملا ، کہنے لگا ۔ اسلم صاحب آپ خفا ہوں گے کہ میری وجہ سے آپ کو دشواری پیش آئی ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شفقت صاحب "چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا" اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا : آئیے چائے پئیں گے ذرا ۔

سامنے ایک ریستوران تھا ، اسلم اسے لے کر وہاں پہنچا ، پُرتکلف چائے کا آرڈر دیا ...

بڑی دیر تک غلام رسول شفقت صاحب کی بُرائیاں کرتا رہا ۔ کہنے لگا : یہ شفقت صاحب عجیب ذات شریف ہیں ، اس شخص کے پاس پیسہ ہوتا ہے مگر وعدہ خلافیاں کرتا رہتا ہے جھوٹ بولتا ہے ۔ دوسروں کو دُکھ دینے میں مزا آتا ہے اُسے ، مجھ سے صاف الفاظ میں

کہا تھا اسلم صاحب کے چیک کی روانگی رکوا دو۔ میں نے کہا بھی کہ اتنے پھیرے کرنے کے بعد تو انھیں چیک ملا ہے پریشان ہوں گے بیچارے۔ کہنے لگے جب تک محکمہ تعلیمات سے ان کی کتابوں کا فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا جا سکتا ایسا کون سا خزانہ ہے ہمارے پاس کہ لٹاتے رہیں اسے۔ بات معقول تھی۔ اور نہ ہوتی تو بھی تعمیل کے سوا میں کر کیا سکتا تھا، لیکن جب آپ پہنچے تو محکمہ تعلیمات کی طرف سے آپ کی جملہ کتابوں کی منظوری آ چکی تھی۔ بہت خوش تھے کہ اب وارے نیارے ہوں گے اتنے میں آپ آ گئے۔ موڈ میں تھے، نقد رقم دے دی، ورنہ ابھی اور نہ جانے کتنے چکر لگانا پڑتے آپ کو!

اسلم نے کہا: عجیب ذہنیت ہے۔ بہرحال اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کوئی کتاب نہیں دوں گا ان حضرت کو!

غلام رسول نے پُرجوش الفاظ میں تائید کی۔ بالکل ٹھیک، آپ کا ناول تو اتنا کامیاب جا رہا ہے کہ ریکارڈ قائم کر دیا ہے اس نے۔ اور اب یہ نصابی کتب بھی مَن برسانے لگیں گی آپ کے گھر میں ــ کیا رائلٹی طے پائی ہے؟

اسلم نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا: یہ کتابیں تو انھوں نے دار روپیہ صفحہ کے حساب لی ہیں۔ جو رقم دے دی وہ پہلا اور آخری معاوضہ ہے!

غلام رسول اُچھل پڑا: یہ کیا غضب کیا آپ نے؟

افسردہ لب و لہجے میں اسلم نے کہا ضرورت!

غلام رسول نے پوچھا: اور ناول، وہ تو رائلٹی پر ہے؟

جی ہاں ہے تو، مگر جب دادا مریں گے تب زمین تقسیم ہو گی۔ وہ کہتے ہیں سال بھر

کے بعد ہم حساب کرتے ہیں اور فروخت شدہ کتابوں کی رائلٹی تب ادا کرتے ہیں۔ ابھی سال ختم ہونے میں تو بڑی مدت ہے!

ترحم آمیز نظروں سے غلام رسول نے اسلم کی طرف دیکھا اور کہا: یعنی معاف کیجئے گا آپ بھی بڑے سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خیر جو ہونا تھا ہوگیا ۔۔ کوئی اور بھی کتاب لکھی ہے آپ نے؟

اسلم نے جواب دیا: لکھی تو ہے ۔ دیکھئے اس کا کیا حشر ہو!

غلام رسول نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ کتاب کا معاملہ میں کراؤں گا شفقت صاحب سے نہیں کسی اور اچھے ناشر سے!

ناامید سے اسلم کا چہرہ چمک اٹھا۔ کہنے لگا: آپ کی اس نوازش کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں!

غلام رسول نے اثر انگیز الفاظ میں کہا: اسلم صاحب آپ نہیں جانتے میرے دل میں آپ کی کتنی منزلت اور وقعت ہے۔ آپ کی اس کتاب نے دھوم مچادی ہے۔ آپ میں ایک عظیم فن کار بننے کی پوری صلاحیت ہے مستقبل کی دنیائے ادب میں آپ کا مقام سب سے بلند ہوگا!

اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ پھر ایک نومشق کو۔ اسلم ان تعریفی الفاظ سے بہت خوش ہوتا۔ اپنے بارے میں جو اس نے امیدیں قائم کر رکھی تھیں اُن میں پھر سے جان آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔ لیکن کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ خاموش ہوگیا۔ غلام رسول نے تسلی دیتے

ہوئے کہا: اتنے مایوس کیوں ہوتے ہیں آپ ابھی سے؟

وہ بولا: اس لئے کہ قسمت کے دربار سے مایوسی، ناکامی اور محرومی کے سوا کچھ اور آج تک نہیں ملا۔

حوصلہ افزائی کرتے ہوئے غلام رسول نے کہا: زندگی کا ایک دور یہ بھی ہوتا ہے لیکن کوئی دَور بھی مستقبل نہیں ہوتا۔ دھوپ چھاؤں کی طرح آتا ہے اور چلا جائے گا!

ان امید افزا باتوں سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اسلم نے کہا: کیا آپ اس سے بھی بدتر دور کی پیشن گوئی کر رہے ہیں؟

غلام رسول ہنسنے لگا جی نہیں! روشن، تابناک اور شاندار دور کی نوید سنا رہا ہوں آپ کو، آپ خود نہیں جانتے آپ کیا ہیں؟ آپ کیا بن سکتے ہیں؟ آپ میں کیسی کیسی صلاحیتیں پنہاں ہیں؟ (گھڑی دیکھ کر) اف، بہت دیر ہوگئی! اب چلنا چاہیئے!

اتنے میں ہوٹل کا ملازم بل لے کر آگیا۔ باتوں باتوں میں غلام رسول نے کھانے سے غفلت نہیں برتی تھی۔ کھائے جاتا تھا اور باتیں کرتا جاتا تھا۔ خوب خوب کھایا چنانچہ چھ روپے بارہ آنے کا بل آیا۔ غلام رسول نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن اسلم نے دس روپے کا نوٹ بیرائے کی طرف بڑھا دیا۔ غلام رسول نے کہا: آپ تو تکلف کرتے ہیں۔ میں لایا تھا آپ کو، آپ خود تو نہیں آئے تھے۔

اسلم ہنسنے لگا: تو اس سے کیا ہوتا ہے ایک ہی بات ہے میں نے دیا تو، آپ نے دیا تو!

غلام رسول اٹھ کھڑا ہُوا، دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے۔ اسلم نے سوال کیا: کدھر کا ارادہ ہے؟ کیا پروگرام ہے؟

غلام رسول نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا: کیا کہوں کچھ خریداری کرنے نکلا تھا، لیکن جیب خالی ہے اس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں تو بیگم صاحبہ خبر لیں گی۔ بچے چمٹ جائیں گے ۔۔۔ کیا آپ کے پاس کچھ ہوگا؟۔ دو چار دن میں ادا کر دوں گا ۔۔۔!

اسلم نے پوری جیب الٹ دی، ایک سو دس روپے اور کچھ آنے تھے۔ اس نے کہا ۔۔۔ لے لیجئے۔

کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا، شاید کہنا چاہتا تھا۔ یہی میری پونجی ہے شاید وہ کہنا چاہتا تھا، یہی میری پونجی ہے، اس میں سے پچاس روپے انجمن کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ کتنے دنوں سے راہ تک رہی ہوگی، اپنے جھوٹے لیکن مجبور بھائی کے ایفائے وعدہ کی۔ باقی پچاس میں سے اپنے چند جوڑے بنوانا چاہتا ہوں اس سے جو رقم بچے گی۔ وہ سگریٹ اور دیگر مصارف میں کام آئے گی۔

غلام رسول نے حریص نظریں اس رقم پر ڈالیں۔ سو روپے اٹھا لئے اور کہنے لگا بس سو کافی ہیں۔۔ انشاء اللہ اس ہفتے میں واپس کر دوں گا۔ مطمئن رہئے، بالکل مطمئن رہیئے۔ اور ہاں دیکھیئے شفقت صاحب کو نہ بتا دیجئے گا۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ کتنے نیک مزاج ہیں۔

اسلم نے اطمینان دلایا: کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں شفقت صاحب کو میرے اور آپ کے نجی معاملہ کا کیوں پتا چلنے لگا۔

دس روپے اور کچھ آنے جیب میں رکھ کر وہ مسافر خانے کی طرف بڑھا۔ اب واقعی رات کافی آ گئی تھی اور اسے اپنے مستقر پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مشکل سے دو قدم چلا ہو گا کہ نہ جانے کہاں سے الور نمودار ہو گیا۔ اب وہ نشے میں نہیں تھا۔ اس نے: غلام رسول کی طرف جو پردۂ تاریکی میں گم ہوتا جا رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے کہا: بہت گاڑھی چھن رہی تھی ان حضرت سے!

اسلم نے پیچھا چھڑانے کے انداز میں کہا: ہاں کچھ ضروری باتیں ہو رہی تھیں، نجی قسم کی!

الور نے یہی الفاظ دہرائے: ضروری قسم کی، نجی قسم کی، کچھ دماغ چل گیا ہے تمھارا! قرض تو نہیں مانگ رہا تھا!؟

اسلم نے جھنجلاتے ہوئے کہا: کیوں کسی کے پرائیویٹ معاملات کی کھوج لگاتے ہو؟ اگر مانگ بھی رہا تھا تو مجھ سے نہ کہ تم سے، تمھیں کیا؟ قاضی جی کیوں دُبلے شہر کے اندیشے میں، چھوڑو یہ باتیں، اپنا راستہ لو!

اس نے جواب دیا: اچھا بھئی جاتا ہوں، لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لو خبردار اس شخص کو کبھی قرض دیا ہو گا کچھ —— ہاں! یہ قرض اس طرح لیتا ہے جیسے تحفہ —— ایک دفعہ میں بھی پھنس چکا ہوں۔ پندرہ روپے کل کے وعدے پر لئے تھے اور پندرہ ہفتے سے زیادہ کی مدّت گزر چکی ہے۔

بے ساختہ اسلم کے منہ سے نکلا: پندرہ روپے کی کیا بات ہے؟!

الور نے یہی بات پکڑلی۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم نے پندرہ روپے سے زیادہ قرض دئے ہیں، بتاؤ کتنے دیے ہیں؟

اسلم کے لئے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا ـــ اس نے کہا: نہیں بتاؤں گا!
انور جھنجلایا ہوا چلا گیا۔

اسلم پھر مسافر خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن اس مرتبہ اس کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ بار بار ذہن میں ایک سوال اُبھر رہا تھا: کیا یہ سو روپے گئے؟ کیا انجمن پھر محروم رہ گئی!؟

(۱۳)

خیالاتِ پریشاں

اپنے کمرے میں وہ اس طرح پہنچا جیسے کوئی ہارا ہوا جواری۔ داؤں پر اپنی آخری پونجی لگا کر، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس آتا ہے۔ وہ دل کا غنی تھا سو روپے اس غربت اور پریشانی کے عالم میں کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے اس کی نظر میں لیکن غلام رسول نے جس طرح اور جس نازک موقع پر یہ رقم ہتیائی تھی اس سے بہت زیادہ ملول، اور افسردہ تھا۔ انور کی باتوں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ یہ رقم اب گئی۔ اب، یہ واپس نہیں ملے گی۔ لیکن انجمن کی تھوڑی سی مدد کرنے کا، اسے سُسرال میں ذرا سا سُرخ رُو کرنے کا جو موقع مل گیا تھا غلام رسول نے اسے بھی چھین لیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اب پھر ایک عرصے تک، نہ معلوم کب تک وہ اسے کچھ نہیں بھیج سکے گا۔ جی چاہا ایک معذرت نامہ لکھ دے اسے، ایک خط میں اپنا سارا کچا چٹھا لکھ دے لیکن اس ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ وہ سوچنے لگا، خط لکھ کر دبے ہوئے زخم کو کُریدنے سے کیا فائدہ؟ کتنی امیدوں اور

اور آرزوؤں سے میرا خط کھولے گی مگر اسے ملے گا کیا؟ افسانۂ غم! کلثوم کی حریص اور لالچی نظریں اس لفافے میں نوٹوں کی جستجو کریں گی، اور مایوس ہو کر صلواتیں سنانے لگیں گی میری بہن کو، بہتر یہ ہے کہ معاملہ جس طرح ہے اسی طرح رہنے دیا جائے جس زخم کی تدبیر رفو نہیں ہو سکتی اُسے چھیڑنا بیکار ہے۔

یہ سوچ کر اس نے چادر اوڑھ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند کا کہیں دور و نزدیک پتا نہیں تھا۔ وہ روٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس دیس میں نکل گئی تھی، لاکھ لاکھ اسے پکارا مگر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا!

پھر اسے مرزا سکندر علی بیگ کا حالِ زار یاد آنے لگا۔

یہ بیچارہ بوڑھا شخص کس پامردی اور استقلال کے ساتھ زندگی کی سختیوں سے لڑ رہا ہے۔ کیا مجال ہے جو تیور میں ذرا فرق آجائے۔ حوصلہ ذرا کمزور پڑ جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنی سعی و کوشش اور لگاتار محنت سے یہ زندگی کی سختیوں کو کچل کر رکھ دے گا، ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے زندگی کی ہر دشواری، ہر سختی ہر ناکامی اس کے سمندِ عزم پر مہمیز کا کام کرتی ہے۔ رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور، اور یہ پہلے سے زیادہ ہمّت اور جوش کے ساتھ اپنی نامعلوم منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

اور وہ سلمیٰ!

جس کی میں نے صورت نہیں دیکھی، لیکن جس سے نہ جانے کیوں اتنی ہمدردی محسوس کرنے لگا ہوں۔

کیا میں اس سے محبت کرتا ہوں؟

نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے محبت تو مجھے اس بے وفا سے ہے جس کا نام مسرت ہے۔

جس نے میری خوشی چھین لی، میری حسرتوں کو پروان چڑھایا اور پھر انھیں پاؤں تلے روند ڈالا، میری آرزوؤں کے مرقع میں رنگ بھرا۔ اور پھر اس مرقع کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ میرے پاس آئی۔ اور میری وہ پونجی جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا لے کر چلی گئی، میں اس کا دامن نہ پکڑ سکا، اسے روک نہ سکا، اس سے فریاد تک نہ کر سکا، ہاں وہ بیوفا ہے لیکن ــــ

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!

میں نے اس سے محبت کیوں کی؟ کی ہے تو اب اسے زندگی کی آخری سانسوں تک نبھا ہوں گا محبت کوئی کھلونا نہیں ہے کہ؛ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا! محبت تو ایک عہد ہے، نہ ٹوٹنے والا عہد، یہ عہد کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ زندگی کی وہ کون ساعت ہے جب اس کی یاد نہیں آتی جب اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتی جب اس کی باتیں دل کے کانوں میں نہیں گونجتیں۔ وہ ہر وقت ہر جگہ ہر موقع پر ساتھ رہتی ہے۔ اس نے سلیم سے شادی کر لی، وہ کسی اور کی ہو گئی، اس نے مجھے فراموش کر دیا، شاید وہ مجھ سے نفرت بھی کرنے لگی، لیکن میں، میں کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کسی اور کا نہیں بن سکتا۔ کسی قیمت پر، اور کسی حالت میں بھی اس سے نفرت نہیں کر سکتا، وہ میرے صنم خانے کا بُت ہے جس کی پُوجا کرتا رہتا ہوں، وہ میری رُوح ہے، میری زندگی ہے، اس سے محبت نہ کروں تو زندہ نہ رہوں۔ اسے فراموش کر دوں تو اپنے آپ کو بھی بھول جاؤں اس کا نہ رہوں تو کسی کا بھی اس دُنیا میں نہیں بن سکتا۔

لیکن اس کے باوجود سلمیٰ سے مجھے ہمدردی ہے۔

ویسی ہی ہمدردی جو ایک انسان کو ایک انسان سے ہوتی ہے!

کسی عورت کو میں نے اتنے قریب سے نہیں دیکھا جیسے چشم ظاہر سے دیکھے بغیر سلمیٰ کو دیکھا ہے۔ اس کی زندگی کلفت، سوز دروں اور چشم خوں فشاں کے سوا کیا ہے۔ یہ زمانہ ہوتا ہے، امنگ کا، حوصلے کا، خوشیوں کا، بے فکری کا، لیکن وہ اپنا یہ زمانہ اس طرح کاٹ رہی ہے کہ لونڈیوں کی طرح صبح سے شام تک کام کرتی رہتی ہے اسے اچھا کھانا نہیں ملتا، کپڑا نہیں ملتا، زندگی کی کوئی آسائش اور راحت میسر نہیں ہے اسے، وہ پکا پکا کر مجھے کھلاتی ہے خود نمک بھی نہیں چکھتی، وہ بچا کھچا بوڑھے باپ اور چھوٹے بھائی کو کھلا دیتی ہے مگر خود؟ کبھی کچھ رہ گیا تو پتیلی پونچھ لی ورنہ روکھی روٹی سہی، فاقہ سہی!

کیا اس کے دل میں امنگیں نہ ہوں گی، کیا اس کا جی نہ چاہتا ہوگا کہ اچھا کھائے، اچھا پہنے، اچھا اوڑھے، سینما دیکھے، ریڈیو سنے، کسی بھلے مانس کی بیوی بن کر یہاں سے رخصت ہو اور سکھ چین کی زندگی بسر کرے۔ آزادی، خودمختاری اور خود اعتمادی کی زندگی!

ضرور ان سب باتوں کا جی چاہتا ہوگا۔ لیکن وہ ایک پنچھی کی طرح پنجرے میں قید ہے، شاید اس کے خیالات بھی قید ہیں۔ وہ اڑ نہیں سکتی، وہ پنجرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کی آواز تک باہر نہیں نکل سکتی۔ کیا اس کی ساری زندگی اسی طرح گزر جائے گی؟ کیا اس کے دن کبھی نہیں پھریں گے؟ کیا وہ یونہی بوڑھی ہو جائے گی؟ ہائے اقبال نے بہن کی محبت سے سرشار ہو کر جب عید کے کپڑوں کا ذکر کیا ہے تو کیا حالت ہوئی ہوگی اس کی؟ مگر جس چمن میں وہ زندگی بسر کر رہی ہے وہاں آہ کرنا بھی منع ہے اور آنسو بہانا بھی!

نہ وہ آہ کر سکتی ہے نہ آنسو بہا سکتی ہے ۔ اگر آہ کرتی ہے تو دل ہی دل میں اگر آنسو بہاتی ہے تو بس آنکھوں ہی آنکھوں میں، کوئی اس کی آہ نہیں سن سکتا۔ کوئی اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔

اور وہ بیچارہ اقبال جسے بالکل نہیں معلوم دُنیا کیا چیز ہے ۔ دُنیا کی کٹھنائیاں کیسی ہوتی ہیں ؟ زندگی کتنی ظالم ہوتی ہے اور غریبوں کے ساتھ اس کا برتاؤ کتنا سفاکانہ اور سنگ دلانہ ہوتا ہے ۔ اس کے نزدیک دُنیا نام ہے پکا پکایا کھانا مل جانے کا، سلے سلائے کپڑے مہیا ہو جانے کا۔ وقت پر سو جانے کا اور جب جی چاہے تب بیدار ہونے کا ۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ تو نہیں رہے گی ، وہ زمانہ بھی آئے گا جب اس خوابِ پریشاں سے اس کی آنکھ کھلے گی اور زندگی اپنی پوری بھیانک تباہ کاریوں کے ساتھ اس کی نظر کے سامنے ہوگی۔

تب وہ کیا کرے گا !؟

یہ وہ زمانہ ہوگا جب کھانا اسی وقت ملے گا جب وہ گیہوں، گھی، مسالہ، دال چاول، لکڑی خرید سکے گا۔ اُسے کپڑے اسی وقت ملیں گے جب وہ بزاز کی دکان پر جاکر خود کپڑے خریدنے کی استطاعت اور درزی کے ہاں جاکر سلائی ادا کرنے کی طاقت حاصل کر لے گا۔ اُسے اُسی وقت تک سونا پڑے گا جب تک فرائض اجازت دیں گے ۔ اسی وقت بیدار ہونا پڑے گا جب فرائض کی پکار بلند ہوگی، خواہ رات بھر نہ سوئے، خواہ ذرا دیر بستر پر لیٹ کر فوراً اٹھ جانا پڑے ۔ آج اس مسافر خانے میں اس کمرے کا انتظام کس طرح ہوا ہے ، وہ نہیں جانتا، جان بھی نہیں سکتا، لیکن کل اسے رہنے کے لئے، سر چھپانے کے لئے، پناہ کے لئے مکان، چار دیواری، جھونپڑی جو کچھ بھی

ہو، اپنے دست و بازو کی مدد سے بہم کرنا پڑے گی!

کیا آج کے یہ کمزور دست و بازو کل اتنے توانا ہو سکیں گے کہ یہ بار برداشت کر سکیں؟

اس سوال کا جواب نہ میرے پاس ہے نہ مرزا صاحب کے پاس نہ سلمیٰ کے پاس، نہ خود اقبال کے پاس ــــ اس سوال کا جواب مستقبل کے پاس ہے۔ اور مستقبل امانت میں خیانت نہیں کرتا۔ وہ وقت سے پہلے اپنا دامن نہیں جھاڑتا۔ اپنا روپ نہیں دکھاتا۔ خواہ کچھ کیوں نہ ہو جائے!

ہاں جس طرح ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر آگے کی بات سوچی جاتی ہے اسی طرح انسان کے حالات دیکھ کر مستقبل کا حکم لگایا جاتا ہے!

حالات نظر کے سامنے ہیں، علم و ہنر حاصل کرنے کے بعد بھی دُنیا میں جگہ بنا لینا کچھ آسان نہیں ہے اور علم و ہنر کے بغیر تو انسان دنیا میں پاؤں ٹکانے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ اس لڑکے کا باپ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے ــ بہن خود مدد کی محتاج ہے ــ دنیا میں کوئی نہ اس کا دستگیر ہے نہ شفیع۔ جب مرزا کی آنکھ بند ہو گی اور خدا کرے بہت دیر میں بند ہو تب یہ سوکھی روٹی بھی اسے میسّر نہ آئے گی ممکن ہے فاقے کرنا پڑیں ممکن ہے کاسۂ گدائی لے کر کسی فٹ پاتھ پر صدا لگانا پڑے" اللہ کے نام پہ!

اور یہ مرزا سکندر بیگ یہ سلمیٰ خانم یہ اقبال کچھ تنہا تھوڑے ہیں نام بدلے ہوئے ہیں مقام بدلے ہوئے ہیں ورنہ دُنیا انہی مرزاؤں سلماؤں اور اقبالوں سے بھری پڑی ہے۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند ــــ کس کی حاجت روا کرے کوئی

دُکھ کی چھایا

گھوم گھام کے ساری بستی آج بھکاری لوٹ آیا

اپنے آپ سے پوچھ رہا ہے بولو تم نے کیا پایا ؟

لمبے رستوں پر چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں
گھر کے باہر دھوپ کڑی ہے اور بھی چہرہ سنولایا
گھونگھر والے بال سفر میں اور بھی دھول سے اَٹ جاتے ہیں
گورے مکھڑے پر پڑتی ہے اور بھی گہری دکھ کی چھایا
دُکھڑا کہنے سے یہ دیوتا اور بھی پتھر بن جاتے ہیں
اپنا بھید زباں پہ لا کر جانے کتنا پچھتایا
اپنے غم کی دیواروں سے ٹکرا کر مر جانا تھا
من مورکھ ہے کس کس کی چوکھٹ پہ جا کر سر کو جھکایا
دُنیاداری کر کے یہ دل اور بھی کچھ کنگال ہوا
اپنی جھولی میں جو کچھ تھا اُسے بھی جا کر کھو آیا!

(۱)

روشنی کی کرن

صبح سو کر دیر سے اٹھا، اقبال کئی دفعہ ناشتے کو آکر دیکھ گیا تھا مگر اُسے سوتا پاکر واپس چلا گیا۔ ۹ بجے کے قریب وہ پھر آیا۔ اسلم غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک آرام کرسی پر نیم دراز صبح کے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اقبال نے پوچھا، ناشتہ لاؤں؟

آنکھ کے سامنے سے ذرا سے ذرا اخبار ہٹا کر اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا: بھئی اور پوچھ پوچھ!

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا اور ذرا دیر میں ناشتہ لے کر آ گیا۔ اسلم نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سوال کیا۔ تم نے بھی کر لیا؟

اس نے اصل سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ آج آپ اتنی دیر تک کیوں سوتے رہے، رات کس وقت لوٹے تھے؟

اسلم ہنسنے لگا۔ اس نے کہا: بڑے تیز ہو بھئی! رات کو دیر سے لوٹا تھا۔ دیر میں سویا، دیر سے اٹھا، یہ تو تمھارے سوال کا جواب ہو گیا لیکن میرے سوال کا جواب تو دو ۔۔ ناشتہ کر چکے تم!

ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مرزا صاحب تشریف لے آئے، انھیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مرزا صاحب نے کہا: بس یہ تکلف نہیں ہونا چاہیئے!

اسلم نے کہا: آپ بزرگ ہیں، آپ کی عزّت کرنا ہم چھوٹوں پر فرض ہے۔

مرزا صاحب ہنسنے لگے فرمایا: کیا خوردی بزرگی کا قصّہ لے کر بیٹھے ہو صاحبزادے! سنا نہیں تم نے: بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال! اچھا بھئی ایک خوش خبری سُن لو جلدی سے!

اسلم نے آمادگی اور اشتیاق کے ساتھ سوال کیا: کیا ہے وہ خوش خبری؟

مرزا صاحب نے فرمایا: خدا نے ہماری سُن لی، بلکہ میں تو کہتا ہوں تمھاری سُن لی، میری سُنتا تو اتنے دن ٹھوکریں کیوں کھاتیں؟ تم نے ہم ناچاروں کی دستگیری کی اور بادل چھنٹ گئے۔ آج سے ملازمت پہ جاؤں گا!

اسلم خوش ہو گیا، واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے! ۔۔ کہاں ملی ہے یہ تو بتائیے؟

مرزا صاحب نے اقبال کو حکم دیا: بٹیا ایک پیالی میرے لئے اور، نیت نہیں بھری اس کمبخت چائے سے!

پھر اسلم سے کہا: کوئی سیٹھ نور وز علی ہیں، انھیں ترس آ گیا مجھ پر، دیکھا یہ بوڑھا کسی طرح ہمّت ہارتا ہی نہیں روز سر ٹکرتا چلا آتا ہے ۔۔ فی الحال اسّی روپے

ملیں گے۔ تین مہینے بعد ترقی کا وعدہ ہے! میاں ہمارے لئے اتنی بھی بہت ہیں!

مرزا صاحب کی اس قناعت پسندی سے اسلم دنگ رہ گیا۔ اس نے کہا: لیکن کام کیا کرنا پڑے گا آپ کو؟

فرمایا: کمپنی میں جتنے اُردو خطوط آتے ہیں اُن کا جواب لکھنا پڑے گا، چالیس اس کے دیں گے، دو لڑکے ہیں انھیں اُردو پڑھانا پڑے گی چالیس اس کے ہو گئے چلو اسّی ہو گئے ــــ رمضان کا مہینہ آرہا تھا اللہ کریم نے مشکل آسان کر دی!

اسلم نے حیرت سے مرزا صاحب کو دیکھا اور پوچھا: تو کیا آپ روزے رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

ٹھا ٹھے لوگوں کی طرح اکڑ کر گویا ہوئے: کیوں نہیں رکھوں گا! ضرور رکھوں گا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج تک تو کوئی روزہ قضا نہیں ہوا۔

تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اسلم نے کہا: آپ کی ہمّت واقعی قابلِ داد ہے۔ لیکن یہ عمر یہ مشقّت!؟

مرزا صاحب اس سے زیادہ نہ سُن سکے: تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ اصل چیز انسان کی قوتِ ارادی ہے۔ تم نے بہت سے سنڈے مسٹنڈوں کو دیکھا ہوگا جلیبی امرتی کی طرح روزہ کھا جاتے ہیں لیکن ہم جیسے بہت سے بوڑھے تمھاری نظروں سے گزرے ہوں گے جو کبھی روزہ ترک نہیں کرتے! کیوں؟ اس لئے کہ گو وہ توانا ہیں لیکن قوتِ ارادی ضعیف ہے، ہمّت ہار جاتے ہیں!

اسلم نے تائید میں گردن ہلائی اور مسکراتے ہوئے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مرتبہ قوتِ ارادی کا امتحان ہمیں بھی دینا پڑے گا!

مرزا صاحب ہنسنے لگے : تو کیا رکھتے نہیں آئے ہو اب تک ؟

اسلم نے ندامت کے ساتھ کہا : دو چار سے زیادہ رکھنے کی کبھی ہمت نہیں پڑی ۔ لیکن اس مرتبہ پورے رکھوں گا !

مرزا صاحب نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا : جزاک اللہ ، جہاں دو چار تابڑ توڑ رکھ لئے پھر ساری کٹھنائی ختم ہو جائے گی ۔ پانی ہو جائیں گے ! اس چھوکرے (اقبال) کو دیکھو ، یہ رکھتا ہے !

اسلم کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی : یہ رکھتا ہے ؟ کیوں بھئی اقبال ، تم تو چھپے رستم نکلے !

اقبال مسکرانے لگا ۔ مرزا صاحب کا سینہ فخر سے پھول گیا ۔ کہنے لگے : ہمارے ہاں آدمی سنار تو چاہے گنڈے دار رہے لیکن کیا مجال ہے جو روزہ کسی کا قضا ہو جائے ۔ یہ رکھتا ہے ، اس کی بہن سلمیٰ رکھتی ہے ، ماں رکھتی تھی ۔

اس مخزنیہ قصیدہ کے سننے کی زیادہ تاب اسلم نہ لا سکا ، اس نے اعتراف کر لیا واقعی بہت بڑا کارنامہ ہے یہ !

مرزا صاحب چائے کی پیالی ختم کر چکے تھے ، اٹھے اور یہ اعلان کر کے کہ اپنی نئی ملازمت کا افتتاح کرنے جا رہے ہیں تشریف لے گئے ۔ ان کے جانے کے بعد اسلم نے اقبال سے کہا : دیکھو بھئی ہم تم ٹھیرے دوست اور وعدہ ہے کہ دوست ، دوست سے اپنی کوئی بات چھپاتا نہیں ۔ سچ کہو ، واقعی روزے رکھتے ہو تم ؟

وہ مسکرانے لگا پھر گویا ہوا : کیوں نہیں رکھتا ۔۔۔ کبھی کبھی نہیں بھی

رکھتا!

اسلم ہنسنے لگا: غسل خانہ میں جا کر پانی پی لیتے ہو گے؟

اقبال کو بھی ہنسی آ گئی۔

اسلم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ لیکن گھن نہیں آتی وہاں پانی پیتے اور کھانا کھاتے!

اقبال نے بتایا آتی تو ہے لیکن ایک طرف آبا جی سختی کرتے ہیں دوسری طرف آپا ہر وقت جاسوسی کرتی رہتی ہیں۔

اسلم نے ہنستے ہوئے پوچھا: کیا تمھاری آپا رکھتی ہیں؟ ـــ وہ بھی کھانا پکاتے میں کھا لیتی ہوں گی۔

اقبال نے ہونٹوں پر اس طرح انگلی رکھی جیسے بڑی تکلیف دہ بات ہے اور وہ اسے سننا نہیں چاہتا۔ پھر بڑے پُریقین اور پُر اعتماد لہجے میں کہا ـــ ہماری آپا ایسی نہیں ہیں۔ وہ تو بغیر سحری کے بھی روزے رکھ لیتی ہیں۔ چاہے آبا جی منع کریں، چاہے اماں جی سر پٹکیں!

اسلم نے تصویرِ حیرت بن کر سوال کیا: بغیر سحری کے؟

اقبال نے بتایا: ہاں کبھی سحری کو کچھ نہیں بچتا۔ اگر کچھ ہوتا بھی تھا تو آبا جی کو کھلا دیتی تھیں۔ اور خود یوں ہی پانی پی کر رکھ لیتی تھیں۔ اور سارا دن گھر کا کام کرتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ تو چکر آ گیا۔ بیہوش ہو کر گر پڑی تھیں۔

اسلم نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا: تو اپنی والی تدبیر انھیں بھی کیوں نہیں بتا دیتے؟

اقبال نے اس انہونی بات پر بُرا مانتے ہوئے کہا: کہہ تو دیا وہ ایسی نہیں ہیں!

اسلم نے کہا: اچھا بھئی تو تمھارے آپا جی اور آپا جی جو چاہیں کریں، ہم تم پانی بھی پئیں گے اور بسکٹ بھی کھائیں گے۔ یہیں چلے آیا کرنا کمرہ بند کر کے۔

اقبال نے پوچھا: اور چائے! وہ کہاں ملے گی؟

اسلم نے جواب دیا: بس چائے اور کھانے کا روزہ رکھیں گے!

وہ ہنسنے لگا۔ پھر برتن اٹھائے اور چلا گیا!

(۲)

اندرونِ خانہ

مرزا صاحب پابندی سے اپنی ملازمت پر جانے لگے۔ سیٹھ صاحب سے انھوں نے طے کر لیا تھا کہ دو روپے روز دے دیا کریں۔ باقی رقم مہینے کے ختم پر چنانچہ یہ معمول ہو گیا کہ شام کو دو روپے جیب میں ڈال کر اٹھتے اور بازار سے کسی دن مٹھائی، کسی دن پھل کسی دن کوئی اور "تحفہ" لے کر آتے اور جوں کا توں اسلم کو بھجوا دیتے اس سے بچ رہتا تو خود کھاتے، سلمیٰ اور اقبال کو کھلاتے، ادھر اسلم کی حالت بھی کچھ سنبھل گئی تھی۔ غلام رسول نے وہ روپے تو واپس نہیں کیے جو قرض کے نام سے لئے تھے البتہ اپنے ایک پبلشر دوست سے دوسرے نئے ناول کا سودا کرا دیا، ان صاحب کی مالی حالت بھی کچھ ایسی ہی سی تھی۔ امنگوں اور حوصلوں کی کمی نہ تھی لیکن جیب خالی تھی۔ طے یہ ہوا کہ ناول کا معاوضہ دو سو روپے دیں گے لیکن یکمشت نہیں، پانچ پانچ روپے۔ یہ عجیب قسم کا سودا اسلم کو اس لئے کرنا پڑا کہ سارے قرض ادا کرنے اور باقی

رقم غلام رسول کو دینے کے بعد اس کے پاس ایک پیسہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ نہ جوتہ سلامت تھا نہ کپڑے، رمضان کا مہینہ سر پر تھا اور عید بھی قریب آ رہی تھی۔ یہ معلوم ہی ہو چکا تھا کہ مرزا صاحب سے لے کر اقبال تک سب روزے رکھیں گے۔ وہ رکھے یا نہ رکھے لیکن روزہ دار بننا پڑے گا۔ اور ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا بندوبست خفیہ طور پر کہیں اور کرنا پڑے گا جس کے لئے نقد روپے کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں پانچ روپے روز بُرے نہیں تھے۔ گھر کا خرچ بھی چلتا رہے گا اور جو رقم پس انداز ہو گی اس سے کپڑے بنائے جائیں گے۔

آخر رمضان کا چاند شروع ہو گیا، ہر طرف تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مرزا صاحب کے ہاں بھی آج رت جگا تھا۔ سیٹھ صاحب سے وہ دس روپے مزید پیشگی کے حساب میں لے آئے تھے۔ اور اس برتے پر رمضان کا افتتاح بڑے شاندار پیمانے پر کر رہے تھے۔ سحری اور افطار کے لئے بہت سی چیزیں لا کر انھوں نے سلمیٰ کے سامنے ڈھیر کر دی تھیں اور وہ پورے انہماک و استغراق کے ساتھ اپنے کام میں لگی تھی۔

گھومتا پھرتا جب کوئی آٹھ بجے رات کو اسلم اپنے کمرے میں پہنچا تو اقبال صاحب منتظر کھڑے تھے۔ اسلم نے پوچھا: کیوں بھئی کل روزہ رکھ رہے ہو؟

اقبال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: رکھوں گا!

اسلم نے بسکٹ کا پیکٹ اسے دکھاتے ہوئے کہا: ضرور رکھو، بس دوپہر کو چپکے سے چلے آنا۔

وہ ہنسنے لگا، پھر دوسرے کمرہ کی زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اقبال کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ وہ گفتگو کو ناتمام چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ ذرا دیر کے بعد

کھانا لے کر آیا۔ اور سوال کیا: کیا آپ روزہ نہیں رکھیں گے؟

اسلم نے جواب دیا: کیوں نہیں رکھیں گے۔

اقبال نے کہا تو کہہ آؤں جاکر۔

اسلم نے سوال کیا: کس سے کہو گے جاکر؟

وہ بولا: آپانے پوچھوایا تھا کہ آپ کے لئے سحری رکھی جائے یا نہیں؟ یہ بھی کہا تھا اگر عادی نہ ہوں تو صبح کو ناشتہ آجائے گا۔

اسلم کچھ شرمندہ سا ہوگیا کہنے لگا: اوّل تو رکھوں گا لیکن اگر کسی دن نہ رکھ سکا تو ناشتہ کا کیا سوال ہے!؟

اقبال نے یہی بات اندر جاکر کہہ دی۔ ذرا دیر کے بعد وہ پھر آیا۔ اس نے کہا: تکلّف نہ کیجئے، آپ کو جو عادت ہو اس پر قائم رہیئے۔ ہمیں نہ سحری کا انتظام کرتے میں کوئی دشواری ہوگی نہ ناشتے کا!

اسلم ہنسنے لگا: اس نے کہا، بہت بہت شکریہ، لیکن میں تو ضرور رکھوں گا، سچی بات تو یہ ہے کہ پہلے کبھی بھی پابندی سے یہ فرض ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ رمضان کا مہینہ اکثر گھر سے باہر گزرا۔ اور پھر اس میں نہ سحری کا انتظام ہوسکتا تھا نہ افطاری کا لیکن اب تو خدا نے وہ تمام سہولتیں عطا کر دی ہیں جو گھر میں میسّر آسکتی ہیں پھر کس عذر سے نہ رکھوں گا۔؟

اقبال کے کہے بغیر بھی یہ سب باتیں اندر سُن لی گئیں۔

کھانے کے بعد اسلم لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوگیا اور وقتِ مقررہ پر سوگیا۔ صبح چار بجے کے قریب کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سمجھ گیا اقبال ہے۔ کیونکہ ساتھ والے کمرہ میں

روشنی ہو رہی تھی۔ اور باتوں کی آواز آرہی تھی۔ دروازہ کھولا تو اقبال صاحب ایک خوان لئے موجود تھے۔ خوان کھولا تو اس میں کئی چیزیں موجود تھیں۔ دو شامی کباب ایک پلیٹ میں، سوئیوں کا زردہ، ایک پیالے میں دودھ اور اس کے اندر تین چار جلیبیاں! اسلم نے اقبال کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اور کہا ہم دونوں ساتھ کھائیں گے۔ اس نے لاکھ لاکھ انکار کیا۔ پہلو بدلے، معذرت کی لیکن اسلم نے ایک نہ سنی، آخر بچہ تھا۔ مان گیا اور بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے لگا۔ اسلم اس کیفیت سے کافی لطف اندوز ہوا برتن لے کر جب اقبال اپنے کمرے میں واپس گیا تو اس سے پوچھا گیا: تم کیوں وہاں کھانے کے لئے بیٹھ گئے؟

اقبال نے جواب دیا: میں خود تھوڑی بیٹھا تھا انھوں نے زبردستی بٹھا لیا تھا۔

کہا گیا: بڑے بھولے بیچارے . . . تہجد کی نماز پڑھ لیں تو کہوں گی سب یہی کھا گیا، وہ بیچارے بھوکے رہ گئے۔

اقبال کی آواز بھرا گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: جھوٹ کیوں بولتی ہو؟

دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ پھر شفقت آمیز لہجے میں اسے مخاطب کیا گیا — ڈرپوک — روتا کیوں ہے؟ کبھی آج تک آپا جی سے میں نے تیری شکایت کی ہے

وہ خفا ہو کر بولا: پھر کیوں کہہ رہی تھیں؟

جواب ملا: مذاق کر رہے تھے اپنے بھیا سے! — جاؤ پوچھ آؤ چائے پئیں گے؟

وہ الجھتا ہوا بولا: ہر بات پہلے چھپاتی کیوں ہو؟ لاؤ دے دو، بینا ہوگی پی لیں گے ورنہ واپس کر دیں گے!

پھر دبی دبی سی ہنسی کی آواز آئی : آخر بات بات پر خفا کیوں ہو رہے ہو؟ اگر بھوکے رہ گئے ہو تو بتا دو تمھارا حصّہ الگ رکھا ہے ___ کھاؤ گے کچھ!

بہت مختصر سا جواب ملا : سوّیاں کھاؤں گا ۔

پھر ہنسی کی مدھم سی آواز آئی ۔ سچ کہنا وہاں کھائی تھی یا نہیں؟

جواب ملا : کھائی تو تھی تھوڑی سی ۔

"پھر اب کیوں مانگ رہے ہو ندیدے صاحب!

"تم ہی نے تو پوچھا تھا ۔

"اچھا چائے دے آؤ پھر آ کر کھا لینا ۔ میں نے پہلے ہی تمھارا حصّہ الگ کر دیا تھا ۔ نہ جانے میٹھے سے اتنا شوق کیوں ہے تمھیں!؟

اور تمھیں نہیں ہے تم تو گڑ تک کھا جاتی ہو!

شاید مرزا صاحب نمازِ تہجّد سے فارغ ہو چکے تھے ۔ اُن کی آواز بلند ہوئی :

"اقبال!"

سلمیٰ نے جواب دیا : جی ابّا جی وہ ابھی آتا ہے ذرا چائے دے آئے جا کر!

"کیا سحری لاؤں؟"

مرزا صاحب نے جواب دیا ___ ہاں بیٹی لے آؤ ___ لیکن یہ سب کیا لے آئیں؟ میں تو صرف چائے پیوں گا ۔

یہ ذرا سا دودھ جلیبی تو کھا لیجیے ۔

تو کھا لے ___ میرا معدہ اس قابل کہاں؟

اچھا تو یہ سوّیاں چکھ لیجیے ذرا سی!

نہیں بیٹی یہ بھی نہیں، بس میرے لئے تو چائے کی ایک پیالی کافی ہے ۔ ہاں اسلم کو بھیج دیا تم نے یہ سب ؟

جی ہاں ۔ اقبال صاحب بھی وہاں حقّہ لگا آئے ۔

اسے یہاں کھلا دیا ہوتا، کہیں اسلم بھوکا نہ رہ گیا ہو!

نہیں آپا جی، کوئی بھوکا نہیں رہے گا، کافی سامان بھیج دیا تھا میں نے !

تو نے اپنے لئے بھی کچھ رکھا ؟

جی ہاں بہت ہے ۔

جھوٹی کہیں کی ۔ لا جو کچھ ہے میرے سامنے بیٹھ کر کھا !

(ہنستے ہوئے) نہیں آپا جی آپ کے سامنے نہیں کھایا جائے گا !

اقبال چائے کی گرما گرم پیالی لے کر اسلم کے پاس پہنچ چکا تھا ۔ اسلم نے تکلّف کرتے ہوئے کہا : اس کی کیا ضرورت تھی ؟

وہ بولا : ہمارے ہاں تو سب پیتے ہیں ، کیا آپ نہیں پیا کرتے سحری میں ؟ واپس لے جاؤں ؟

(ہنستے ہوئے) نہیں نہیں ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا ، میں تو یونہی تکلّف کر رہا تھا ۔

اقبال بھی ہنسنے لگا ۔ پھر جب اسلم نے پیالی واپس کی تو اس نے پوچھا ایک پیالی اور لے آؤں ؟

اسلم نے انکار کر دیا : نہیں بھئی شکریہ !

اقبال نے بتایا : لیکن ہمارے ہاں تو سب لوگ دو دو پیالیاں پیتے ہیں ۔

اسلم نے کہا: تم نہ پیا کرو، اس سے رنگ کالا ہو جاتا ہے۔
وہ زور سے ہنس پڑا: ہمارے ہاں تو کسی کا رنگ کالا نہیں ہے۔
اسلم نے کہا: نہیں ہے تو ہو جائے گا، کبھی نہ کبھی ایک دن!
اقبال مطمئن لہجے میں گویا ہوا: نہیں ہو گا، آپا جی کو دیکھ لیجئے کتنے بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن کہیں سے کالے ہیں؟
اسلم ہنس پڑا اور سوال کیا: کیا آدمی کہیں سے کالا اور کہیں سے گورا ہوتا ہے؟!
اقبال بھی مسکرانے لگا، پھر اسلم نے پوچھا: کیوں بھئی وہ نمائش میں جو تصویر کھنچوائی تھی کیا ہوئی۔ ہے یا پھاڑ کر پھینک دی کہیں؟
اقبال پھر افشائے راز پر، نادانستگی کے عالم میں اتر آیا، کہنے لگا: ہے بڑی احتیاط سے رکھی ہے!
بڑی احتیاط سے کیسی رکھی جاتی ہے کوئی چیز؟
بکس میں ـــ وہاں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا!
تو تمھارے پاس بکس بھی ہے؟ ـــ اور کیا کیا چیزیں رکھی ہیں اس میں؟
میرے پاس کہاں سے آیا، آپا کے پاس ہے۔ انہی کے پاس رکھی ہے وہ تو اتنی احتیاط رکھتی ہیں کہ مجھے تک نہیں دیکھنے دیتیں!
اچھا تصویر کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ روزہ رکھ رہے ہو کل یا بکٹ اڑیں گے دوپہر کو کمرہ بند کر کے!؟

اس مرتبہ سارے روزے رکھوں گا، آپا کہہ رہی ہیں جو چھپا کر روزہ توڑتا ہے خدا دیکھ لیتا ہے اور پھر سزا دیتا ہے! کیا آپ مجھے خدا سے سزا دلوانا چاہتے ہیں؟

نہیں بھئی ہرگز نہیں ۔

آپ رکھیں گے؟ ـــ سچ سچ کہئے!

ہاں اس مرتبہ ہم بھی رکھیں گے کیا مجال کہ ایک بھی چھوٹ جائے!

اور اگر کبھی بسکٹ کھائے؟

تو سارے بسکٹ ضبط کر لینا!

وہ پھر کوئی سوال کرنے والا تھا کہ مرزا صاحب کی صدائے رعد آسا گونجی:

اقبال ـــ!

اقبال اس طرح رفوچکر ہو گیا جیسے اس کمرے میں تھا ہی نہیں!

اسلم نے سوچا اب سونا بیکار ہے اور نماز کی تیاریاں کرنے لگا!

(۳)

چرکا!

اسلم کا ارادہ تو یہ تھا کہ یوں ہی جھوٹ موٹ محض دکھاوے کو روزے رکھے گا اور باہر کسی ہوٹل میں کھانے پینے کا سلسلہ ہمیشہ کی طرح جاری رہے گا، لیکن ایسا نہ کرسکا۔ ماحول کا اثر انسان پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ مرزا صاحب کے گھرانے کی روزہ داری سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ بلا ارادہ پابندی سے روزے رکھنے لگا۔ سحری اور افطار میں وہ مزا آنے لگا جو بڑی سے بڑی پُرتکلف دعوتوں میں کبھی نہیں آیا تھا۔ مرزا صاحب اس کی راحت و آسائش کا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے باپ بیٹے کا رکھتا ہے۔ سلمیٰ عزیب بھی اپنا سارا ہنر کھلانے پر صرف کر دیتی تھی۔ اور اقبال تو بندۂ بے دام تھا ہی۔ اس ماحول میں کچھ ایسی اپنایت تھی، کچھ ایسا خلوص تھا کہ رفتہ رفتہ یہ زندگی لذت آفریں معلوم ہونے لگی۔ سحری کے وقت خود بخود آنکھ کھل جاتی۔ اور افطار کے وقت بلا ارادہ قدم مسافر خانے کی طرف اٹھنے لگتے۔

غلام رسول نے جس نئے سیلسٹر سے معاملہ کرایا تھا چند روز تک تو اس نے پابندی کے ساتھ پانچ روپے روز دیے، پھر دو دو دن ناغہ ہونے لگے کبھی کوئی عذر، کبھی کوئی بہانہ۔ لیکن اس وعدہ خلافی اور پیمان شکنی سے اسلم کو زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ روزانہ کے مصارف بہرحال چل ہی جاتے تھے۔ اور کچھ نہ کچھ پیس انداز بھی ہو جاتا تھا اس نے جو اندازہ لگایا تھا اس کے مطابق ناغوں کے باوجود امید تھی کہ عید تک جملہ رقم وصول ہو جائے گی۔ رقم ہی ایسی کیا تھی دو سو روپے ــــ اور اگر کچھ باقی بھی رہ گیا تو زندگی عید کے بعد بھی تو گزارنی ہے۔ یہ دوسرا ناول بھی بازار میں آ چکا تھا اور امید افزا طور پر نکل رہا تھا!

اس اثنا میں اشاعت گھر سے اس کا تعلق ہو گیا، یہاں سے ایک بڑی انگریزی کتاب جو تاریخ کے موضوع پر تھی ترجمے کے لئے مل گئی۔ ڈیڑھ روپیہ صفحہ طے پایا۔ کتاب بڑے سائز کے باریک اور گنجان ٹائپ پر تھی۔ ایک پابندی یہ تھی کہ کام دفتر میں کیا جائے گھر پر نہ کیا جائے۔ صبح سے شام تک بیٹھنے کے بعد مشکل سے دو صفحے ہو پاتے کبھی کبھی اس سے بھی کم کبھی کوئی مبارک دن ایسا بھی ہوتا کہ ڈھائی صفحے ہو جاتے۔ اشاعت گھر والے معاملے کے کھرے تھے۔ طے پایا تھا کہ ہر سنیچر کو کارگزاری کا حساب ہوگا اور جو رقم بنے گی ادا کر دی جایا کرے گی۔ چنانچہ کسی سنیچر کو تقاضے کی نوبت نہیں آئی۔ ادھر دفتر بند ہونے کا وقت آیا اُدھر اٹھارہ بیس روپے لے کر کلرک آ گیا۔ رقم گنائی، رسید پر دستخط لئے اور چلا گیا۔

رمضان کا مہینہ بہت اچھی طرح گزر گیا۔ عید بھی بڑے ٹھاٹھ سے منائی گئی۔ روزانہ کے مصارف کے بعد ساٹھ ستر روپے اسلم کے پاس جمع ہو گئے، ڈیڑھ سو روپے

اس نے ارجمند خاں سے قرض لے لیے ۔ اپنے کپڑے بنوالئے اور مرزا صاحب کی نہیں نہیں کے باوجود اقبال کے بھی ۔ خود مرزا صاحب بھی کیوں پیچھے رہتے ۔ انھوں نے بھی اپنے سیٹھ صاحب سے سو روپے قرض لے لئے ۔ لیکن بڑے ایثار سے کام لیا ، ساری رقم سلمیٰ پر خرچ کر دی ، اپنے لئے صرف معمولی سا جوتہ خرید لائے ، کیونکہ بغیر اس کے اتنی لمبی مسافت طے کرنا آسان نہ تھا ۔ سلمیٰ نے بہت ضد کی ، اصرار کیا ، روئی کہ اپنے لئے بھی کچھ بنالیں ، لیکن ان کی نہیں ہاں سے نہیں بدلی جا سکی ۔

عید ختم ہوئی اور پھر وہی ڈھرّا چلنے لگا ۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ۔

اسلم نے دس پندرہ دن کے وعدے پر ارجمند خاں سے رقم قرض لی تھی ۔ اس نے تقاضا تو نہیں کیا تھا لیکن یہ مدّت گزر چکی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وقت مقررہ پر قرض کا بوجھ اتار دے ۔ اشاعت گھر والوں سے استدعا کی کہ ڈیڑھ سو روپے قرض دے دیں ۔ اور ہفتے کے ہفتے جو رقم دیتے ہیں ان میں سے دس روپے کاٹ لیا کریں لیکن وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہنے لگے : ہمارا اصول یہ ہے کہ نہ قرض لیتے ہیں نہ دیتے ہیں نہ ہمارے ہاں پیشگی کا اصول ہے نہ باقی رکھنے کا ۔ جواب اگرچہ تلخ تھا لیکن اصل پر مبنی تھا ۔ اسلم نے بُرا نہیں مانا ، البتہ مسکرانے لگا کہ کوئی اور صورت آمدنی کی پیدا کی جائے دوسرا ناول جہاں سے شائع ہوا تھا وہاں ابھی اسّی روپے باقی تھے لیکن اب وہ پانچ روپے روز کے بجائے پانچ روپے ہفتے پر اتر آئے تھے ۔ اور اس اصول میں ذرا بھی لچک پیدا کرنے کو تیار نہیں تھے ۔

اتفاق کی بات اِنھیں حالات میں اُلجھا ہوا وہ اشاعت گھر کی طرف جا رہا تھا کہ غلام رسول سے مڈبھیڑ ہوگئی ۔ اس نے سوچا شاید ان تلوں تیل نکل آئے اور سو روپے کی ڈبلی

ہوئی رقم وصول ہو جائے ۔ وہ تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ غلام رسول سے ملا۔ تپاک اور گرم جوشی کا جہاں تک تعلق تھا یہ پونجی اسلم سے کہیں زیادہ غلام رسول کے پاس موجود تھی ۔ اس نے مصافحہ کیا، وہ معانقے پر تیار ہو گیا۔ اور بغیر کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر سامنے کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: کہئے اسلم صاحب بہت دنوں بعد درشن ہوئے ۔ وہ بھی سر راہ!

اسلم کو لب کشائی کا موقع مل گیا۔ آج کل پریشانیاں کچھ بہت بڑھ گئی ہیں!

اس طرح جیسے ان پریشانیوں کو وہ رفع کر کے رہے گا۔ چہرے پر تشویش اور اضطراب کے آثار پیدا کر کے اس نے پوچھا: کیسی پریشانیاں میرے دوست! ہم جیسے مخلصوں کی موجودگی میں بھی اگر تم پریشان رہ سکتے ہو تو لعنت ہے ہماری زندگی پر!

اسلم کے دل میں خوشی کی لہریں اٹھنے لگیں ۔ اس نے سوچا: انور نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، بالکل غلط کہا تھا۔ یہ تو بڑا ہمدرد اور حساس آدمی ہے ۔ اب تک اگر رقم ادا نہ کر سکا تو کوئی مجبوری ہو گی ۔ کیوں نہ دل کھول کر ایسے آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے! چنانچہ اس نے کہا:

کوئی مستقل روزگار تو ہے نہیں، ادھر اُدھر کام کر کے گزارہ کر رہا ہوں ۔

"ہاں بھئی کام کا تو آج کل یہی حال ہے ۔

جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بیکار بیٹھے ہیں!

"قرض بھی کافی ہو گیا ہے ۔

"(ہنستے ہوئے) تو آپ قرض کی وجہ سے پریشان ہیں!؟ کیوں صاحب کتنے لاکھ کے مقروض ہیں آپ؟

بھئی قرض کے معاملے میں میری طبیعت بہت حساس ہے۔ ڈیڑھ سوارجمند خاں کے ہیں پچاس متفرق ـــ جان پر بنی ہوئی ہے!

(کھلکھلا کر ہنستے ہوئے) تو بھئی آسان ترکیب یہ ہے کہ خودکشی کرلو، تم جیسے آدمی زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے۔

یہ تو بہت عجیب مشورہ دے رہے ہیں آپ!

ہاں ـــ لیکن بہت مناسب ـــ خدا کے بندے کون شریف آدمی ہے جو مقروض نہیں۔؟ ـــ جس کے پاس نہیں ہے وہ قرض لے گا۔ جس کے پاس ہے وہ قرض دے گا۔ میں ضرورت مند تھا تم سے سو روپے لے لئے، تمہارے پاس تھے تم نے دے دیے۔ آج پھر مجھے پچاس روپے کی ضرورت ہے۔ کیا تم دے سکتے ہو؟ ـــ نہیں نہیں انکار کرنے کی ضرورت نہیں، جانتا ہوں تمہاری جیب خالی ہے لیکن جس طرح میں اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے پچاس روپے کسی سے قرض لوں گا تم کیوں نہیں کسی سے دو تین سو لے لیتے!

مجھے کون دے گا؟

یہ نہ کہو ـــ قرض لینا ایک فن ہے اور تم اس فن سے نابلد ہو، لیکن چاہو تو حاصل کرسکتے ہو!

نہیں ـــ میں نہیں چاہتا ـــ کیا آپ وہ سو روپے جو ـــ

مجھے یاد ہے۔ میں نے تم سے سو روپے لئے تھے۔ اور کم از کم سو مرتبہ واپس کرنے کی نیت کرچکا ہوں، لیکن تنخواہ کم خرچ زیادہ، کہاں سے ادا کروں؟ کچھ اور لکھا ہو تو بچوا سکتا ہوں، لکھا ہے کچھ؟

ہاں ایک چھوٹا سا ناول لکھا تو ہے!

بس تو اس کا فروخت کرنا میرا ذمہ رہا۔ لیکن ایک شرط ہے بھئی!

شرط کیسی؟

ہماری ضرورت بھی پوری کرنی ہوگی! ___ ڈیڑھ سو ہو جائیں گے، یقین کرو ___

۲۵ روپے ماہوار کی صورت میں ادا کر دوں گا!

اسلم کو یہ تجویز پسند آئی۔ کچھ نقصان اٹھا کر بھی اگر ارجمند خاں کی رقم ادا ہو جائے تو یہ سودا بُرا نہیں ___ کبھی نہ کبھی اس سے بھی رقم وصول ہو ہی جائے گی!

یہ سوچ کر اس نے کہا: میں تیار ہوں ___ لیکن یہ سودا جلد از جلد ہو جانا چاہیئے۔

غلام رسول نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا: ہاں صاحب جلد از جلد ___ لوگ کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا مشکل ہے لیکن ہمارا کام یہی ہے ___ کل اسی وقت یہیں پر سودہ لے کر ملو!

اسلم کی ساری پریشانیاں رفع ہوگئیں۔ بھئی میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔

اتنے میں بیرا دو روپے پیترہ آنے کا بل ایک چینی کی طشتری میں لئے کر حاضر ہوا۔

غلام رسول اُٹھ کھڑا ہوا: اچھا بھئی ہم چلے۔

غلام رسول چلا گیا گویا وہ اسلم کو یہاں گھسیٹ کر نہیں لایا تھا اسلم اسے پکڑ کر لایا تھا۔ بہر حال یہ ایسی چیز نہ تھی جو زیر بحث آتی۔ اسلم نے تین روپے نکال کر طشتری پر رکھ دیے اور خود بھی باہر نکل آیا۔ اب اس کی جیب میں کچھ روپے اور چند آنے تھے۔ لیکن ایک بکاؤ مسودہ بھی تو تھا، راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

(۴)

پرسشِ پنہاں

تین چار مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس مدت میں کہیں سے کوئی بندھی ہوئی رقم تو نہیں ملی کہ وہ اپنی دیرینہ حسرت پوری کر سکتا، یا انجمن کو کچھ بھیج سکتا۔ لیکن روزمرہ کا کام بہت اچھی طرح بلکہ ٹھاٹھ سے چلتا رہا، کسی دن پانچ روپے ہفتے والی قسط مل جاتی کبھی تیسرے سودے کے حساب میں کچھ دستیاب ہو جاتا۔ یہ تیسرا سودہ غلام رسول نے تین سو میں فروخت کرایا تھا۔ پچاس روپے نقد مل گئے تھے۔ جو غلام رسول نے لے لئے تھے۔ باقی رقم کے بارے میں طے پایا تھا کہ ہفتہ وار بیس روپے ملتے رہیں گے۔ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے اسی اصول کے ماتحت یہ سودا قبول کرنے پر اس نے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔

مرزا صاحب بھی مزے میں تھے، بہت اچھی طرح کام چل رہا تھا۔ سیٹھ صاحب کے یہاں سے دو روپے روز تو بندھے ہوئے تھے ہی اس کے علاوہ مہینے کے ختم پر بھی

بیس روپے یکمشت لے آتے

ادھر کچھ دنوں سے مسافر خانہ کے منیجر نے اسلم اور مرزا صاحب دونوں سے شدید اصرار اور مطالبہ کر رکھا تھا کہ اپنے اپنے کمرے خالی کر دیں۔ مسافر خانہ بہرحال مسافر خانہ ہے مستقل اقامت کے لئے اسے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی اس اصرار اور مطالبہ میں سختی اور درشتی بھی آجاتی۔ لیکن مرزا صاحب اور اسلم دونوں منیجر صاحب کے ممنون تھے، ان کی تلخ باتوں کو بھی خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتے ـــــ یہ مروّت کی انتہا تھی کہ اب تک کسی نہ کسی طور پر ان کا قیام برداشت کئے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب سے تو خیر پرائیویٹ حساب بھی چل جاتا تھا لیکن اسلم تو بالکل مفت رہ رہا تھا اور اب آخری طور پر منیجر صاحب نے نوٹس دے دیا تھا کہ ۳۱ تاریخ کو قطعاً کمرے خالی کر دئیے جائیں۔ ایسا نہ ہوا تو وہ دوسرے طریقے اختیار کریں گے۔

مرزا صاحب اور اسلم کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک محلے میں ایک مختصر سا مکان مل گیا۔ تین کمرے غسل خانہ، باورچی خانہ، تھوڑا سا صحن، ایک کمرے کے سامنے برآمدہ، کرایہ خاصا تھا۔ چالیس روپے ماہوار، لیکن کچھ ایسا زیادہ بھی نہ تھا کیونکہ شہری آبادی میں غیر معمولی اضافہ جنگ کے زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مکان اتنے تھے نہیں لہٰذا کرایہ کی شرح آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ یہ مکان دراصل مرزا صاحب کے سیٹھ نے ابھی حال میں خریدا تھا ـــ مکان خریدنے کا انھیں بہت شوق تھا ـــ اور طے کر لیا تھا کہ پچاس روپے مہینہ کرایہ لیں گے۔ اور سال بھر کا پیشگی۔ لیکن مرزا صاحب کے زہد و تقدس سے ذرا متاثر تھے۔ لہٰذا کرایہ بھی پچاس کے بجائے چالیس کر دیا۔ اور سال بھر کی پیشگی کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔

مرزا صاحب نے جب یہ خوش خبری سنائی تو سارے گھر میں دھوم مچ گئی سلمیٰ بھی خوش، اقبال بھی نہال، اسلم کی بھی باچھیں کھلی جا رہی ہیں اور خود مرزا صاحب کے تو وفورِ مسرت سے بندِ قبا ٹوٹے جا رہے تھے۔ ایک تو اس لئے کہ مسافر خانے کی زندگی بڑی پُرشور تھی ــ جس سے وہ طبعاً متنفر تھے۔ دوسرے صرف ایک کمرہ تھا وہ بھی نہایت مختصر اور اسی میں تینوں کو بیٹھنا پڑتا، مکان ملنے کے بعد یہ دشواری رفع ہو گئی۔ تین کمرے تھے۔ اور ہر کمرہ مسافر خانہ کے کمرے سے خاصا بڑا تھا۔ ایک کمرہ مرزا صاحب نے اپنے لئے مخصوص کر لیا، دوسرا سلمیٰ اور اقبال کو بخش دیا اور تیسرا اسلم کے لئے وقف کر دیا گیا۔ بازار بھی یہاں سے قریب تھا ضرورت کی ساری چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ سامان کے منتقل کرنے میں اور نئے گھر کے سلسلے میں کئی ضرورت کی چیزیں ــ چارپائی، میز، کرسی وغیرہ خریدنے میں ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ خرچ ہو گئے۔ چار چار پائیاں خریدی گئیں، مسافر خانے کی تو یہاں لائی نہیں جا سکتی تھیں، اپنے لیے اسلم نے ایک میز خریدی۔ اور چار کرسیاں، دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز اندر کے لئے، لیکن یہ سارا سامان آسانی سے خرید لیا گیا۔ کیونکہ ارجمند خاں کی تجوری پھر کام آئی۔ اس نے پہلے ہی اشارے پر چیک سے دو سو نکال کر گن دیے۔ اور یہ بھی نہیں پوچھا کب واپس کرو گے۔ دو تین مرتبہ کے تجربے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسلم کے پاس رقم ڈوب نہیں سکتی۔ ایک ایک پیسہ وصول ہو جائے گا۔

مسافر خانے کے مقابلے میں یہ مکان ہر اعتبار سے آرام دہ اور کشادہ تھا۔ لیکن بہت جلد مکان اپنی قیمت وصول کرنے لگا۔ سیٹھ صاحب دو روپے روز مرزا صاحب کو دیتے تھے اب ایک روپیہ روز رہ گیا۔ پہلے مہینے کے ختم پر بیس ملے

تھے اب دس ملنے لگے۔ اور یہ دس بھی بھنگی اور بجلی کے بل کی نذر ہو جاتے۔ گویا اسّی روپے تیس روپے میں تبدیل ہو گئے۔ اسلم ایک مرتبہ پھر ارجمند خاں کے حضور میں باریاب ہوا ملّا کی دوڑ مسجد۔ اور سو روپے مزید لے آیا۔ مہینہ بھر کی جنس از قبیل آٹا، چاول، گھی، لکڑی وغیرہ لاکر اس نے جمع کر دی اور ایک روپے روز کے حساب سے تیس روپے اندر بھیج دیے کہ اس سے گوشت اور سبزی وغیرہ خرید لی جایا کرے۔ پھر بھی بائیس تئیس روپے اس کے پاس بچ گئے جو بچے تانگے اور سگریٹ وغیرہ کے لئے مخصوص کر لئے۔ مرزا صاحب جو ایک روپیہ لاتے تھے وہ بھی گھر ہی میں صرف ہو جاتا تھا۔ آخر دھوبی کی دھلائی بیماری آزاری کا سلسلہ جاری ہی رہتا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی بکنے پر آجاتے، حوصلہ تو اب بھی قائم تھا لیکن اعضا رجواب دیتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بری طرح ماندگی اور خستگی محسوس کرنے لگتے تھے۔

شروع شروع میں نئے ماحول کی یہ مالی نارسائیاں بہت کھلیں لیکن چند ہی روز کے بعد گاڑی چل پڑی اور طبیعت عادی ہو گئی۔

اسلم نے کئی کاموں میں ہاتھ ڈالا، کئی جگہ کوشش کی، لیکن مستقل آمدنی کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ اشاعت گھر میں ترجمے کا کام جاری تھا اور ۱۸-۲۰ روپے ہفتہ مل جاتے تھے لیکن یہ ساری رقم پابندی سے وہ ارجمند خاں کو دے آتا تھا تاکہ ساکھ قائم رہے اور کسی ہنگامی موقع پر اگر ضرورت ہو تو پھر خان صاحب کو تکلیف دی جا سکے۔ ادھر ادھر سے یعنی دوسرے اور تیسرے ناول کے حساب میں کبھی کبھار چھوٹی موٹی جو رقم مل جاتی وہ زندگی کی گاڑی کو چند قدم اور آگے بڑھا دیتی تھی۔ آمدنی میں مزید اضافے کے لئے اسلم نے اشاعت گھر والوں سے یہ استدعا کی کہ دفتری اوقات کے علاوہ اُسے

رات کو گھر پر کام کرنے کی بھی اجازت دے دی جائے۔ یہ استدعا منظور کر لی گئی، تقریباً دو صفحے دفتر میں بیٹھ کر ترجمہ کر لیتا تھا۔ ایک اور کبھی کبھی ڈیڑھ صفحے کا ترجمہ رات کو گھر پر کرنے لگا۔ اس طرح آمدنی میں کچھ اضافہ ہو گیا اور نسبتاً سکون حاصل ہو گیا۔

ایک روز ناشتے کے بعد اقبال صاحب جاتے جاتے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے،

اسلم نے پوچھا کیا بات ہے؟

اس نے لے جانے کے لئے برتن اٹھا لئے تھے پھر ویسے ہی رکھ دیے اور کہا:

رات آپ دو بجے تک کام کرتے رہے تھے۔؟

اسلم نے جواب دیا: ہاں بھئی.. بات تو یہی ہے۔

اقبال نے پوچھا، روز اتنی رات تک کام کرتے رہتے ہیں آپ؟

اقبال نے کہا: ہاں کرتا تو رہتا ہوں، پھر؟

اقبال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بری سی بات ـــ!"

اسلم ہنس پڑا: کیا کہا بری بات، کام کرنا بری بات ہے صاحبزادے؟

وہ کہنے لگا: اس طرح آپ بیمار پڑ جائیں گے!

اسلم سنجیدہ ہو گیا: لیکن حکیم اجمل خاں صاحب آپ نے تو نبض دیکھے بغیر ہی فیصلہ صادر فرما دیا۔

اقبال کچھ سوچتا ہوا بولا: اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیئے!

اسلم نے اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا: یہ تم نہیں بول رہے ہو ـــ یہ الفاظ تمہارے نہیں ہو سکتے، بتاؤ کون کہہ رہا تھا؟ ـــ کہاں سے یہ الفاظ چُرائے ہیں تم نے؟

اقبال ہنسنے لگا ۔ کہیں الفاظ بھی چرائے جاتے ہیں !

اسلم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : یہ کھڑا جو ہے چور ـــ سچ سچ بتاؤ کیا تم نے مجھے جاگتے دیکھا ؟

اقبال نے انکار میں گردن ہلائی اور کہا : نہیں رات کو میری آنکھ ہی نہیں کھلتی ۔

اسلم کہنے لگا : پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا میں رات کو دیر تک جاگتا اور کام کرتا رہتا ہوں ؟

طائر معصوم دام میں آ گیا ۔ کہنے لگا : آپا کہہ رہی تھیں ۔

اسلم نے پوچھا : کیا کہہ رہی تھیں ؟

اقبال نے حق گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا : بتا تو چکا ہوں ابھی سب کچھ آپ کو !

اسلم نے پھر سوال کیا : تو کیا یہ ساری باتیں آپا کہہ رہی تھیں ؟

اس مجسم بچے نے تنگ آ کر بلکہ جھنجلا کر اس نے کہا اور نہیں تو کیا ۔

اسلم ہنسنے لگا : بڑے سچے آدمی ہو !

اقبال نے پوچھا : اب تو اتنی دیر تک کام نہیں کیا کریں گے آپ ؟

اسلم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا : جب تک ہم بڑے نہیں ہو جاتے کرتے رہیں گے ۔ اقبال شاید ابھی کچھ اور کہتا کہ مرزا اسکندر علی بیگ صاحب تشریف لے آئے ۔ انھیں دیکھ کر اسلم تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا اور اقبال برتن لے کر اندر چلا گیا ۔

---

(۵)

نوک جھونک

بھائی بہن میں آج پھر نوک جھونک ہو رہی تھی :

میں کہتی ہوں تو نے میرا نام کیوں لیا؟

تو کون سا غضب ہو گیا، کیا جھوٹ بول دینا۔ تم نے کہا نہیں تھا؟

میں نے تو کہا تھا اپنی طرف سے باتیں کرنا، پوچھنا، منع کرنا رات کو دیر تک جاگنے اور کام کرنے سے!

یہی تو کہا تھا میں نے لیکن انھوں نے کرید کرید کر پوچھ ہی لیا!

اے ہے بڑے ننھے منے — کرید کرید کر پوچھ لیا اور ننھے میاں نے سب اگل دیا — خبردار جو اب کبھی میرا نام لیا ہو گا، ورنہ ایسی بے بھاؤ کی جوتیاں پڑیں گی سر پر تڑاتڑ کہ زندگی بھر یاد کرو گے!

پھر تم نے مجھے غصہ دلایا — کہوں گا، ضرور کہوں گا!

کچھ ہوش میں ہے لڑکے ۔ تمھارے اسلم صاحب بھی بس یوں ہی سے ہیں !

پھر تم ان کا ذکر لے بیٹھیں، کیا بگاڑا ہے انھوں نے تمھارا ؟

ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھیں دنیا میں کسی چیز کا شوق ہی نہیں ہے، کبھی بھولے سے تو کہا ہوتا کہ آج یہ کھائیں گے آج فلاں چیز پکا لو، گوشت دے دو تو شوق سے کھائیں گے۔ دال بھیج دو تو آل نور کر کے چٹ کر جائیں گے۔ جی چاہتا ہے کسی دن خالی برتن بھیج دوں !

خالی برتن بھیج کر کیا کروگی ؟

دیکھوں گی، کیا کہتے ہیں ؟۔ اقبال جس دن خالی برتن بھیجوں بس برتن رکھ کر فوراً چلے آنا، تا کہ کچھ پوچھ نہ سکیں اور تھوڑی دیر کے بعد جب برتن لینے جانا، تب پوچھنا کہئے نمک تو کم نہیں تھا ؟

(ہنستے ہوئے) بڑا مزا آئے گا، آج خالی برتن ہی لے جاؤں گا !

اور اگر انھوں نے ابا جی سے کہہ دیا تب کیا ہوگا ؟ تم ہی بتاؤ کچھ ؟

میں تو بھئی کہہ دوں گی اقبال کی شرارت ہے۔ سر میں درد تھا، میں نے اس سے کہہ دیا تو ہی سالن نکال لے۔ یہ جلبلا کر خالی برتن لے گیا۔ اہا ہا وہ پٹائی ہوگی اقبال میاں کی کہ سارا محلہ جمع ہو جائے گا تماشا دیکھنے۔ کیونکہ جب وہ روتے ہیں تو اس طرح گلا پھاڑ کر کہ دور دور یہ سہانا نغمہ سنائی دیتا ہے۔ لوگ ریڈیو کا فرمائشی پروگرام تک بند کر دیتے ہیں ــــ یاد ہے اس دن کی مار جب دھریئے اپنا شروع کر دیا تھا۔

تم بھی تو پٹا کرتی تھیں جب چھوٹی تھیں، کیا تم نہیں روتی تھیں ؟

اوّل تو ہم کبھی پٹے نہیں۔ اور اگر کبھی ایک آدھ چانٹا لگا یا بھی تو اماں جی نے

اتنے آہستہ سے جیسے پھول رکھ دیا گال پر، رہے آبا جی تو انھوں نے پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا۔ ہمارا مقابلہ تم کیا کروگے میاں لے پالک!

لے پالک کیا ہوتا ہے؟

جس کسی کے لڑکا نہیں ہوتا وہ ادھر ادھر سے کوئی گرا پڑا لڑکا لے کر پال لیتا ہے تم بھی کوڑے کے ڈھیر پر پڑے ٹھیوں ٹھیوں کر رہے تھے، سنا ہے لونا چمار کے ہاں تم پیدا ہوئے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: بھگوان کھانے کو تو کچھ دیتے نہیں اُلٹے یہ لڑکا دے دیا۔ اسے کہاں سے کھلاؤں، یہ کہہ کر تمہالے سمیت جو پھینکا ہے تو سڑک پر جہاں کوڑا کرکٹ جمع رہتا ہے وہاں سے اس طرح پٹ سے گرے جیسے چھت سے چھپکلی گرتی ہے۔ ابا جی کا ادھر سے گزر ہوا ترس آگیا، پال لیا۔

اور تم تو جیسے آسمان سے اتری ہو!

ہاں بیشک آسمان سے نہیں پرستان سے اترے ہیں۔ آئینہ لاؤ اور دیکھ لو شہزادی کون ہے اور چمار کون؟

اتنا زیادہ اترانا بھی ٹھیک نہیں ہوتا ذرا خوبصورت کیا ہیں دماغ ہی نہیں ملتے۔

تو کیا جانے خوبصورتی کیا ہوتی ہے؟

کیوں نہیں جانتا، میری بیوی تم سے زیادہ خوبصورت ہوگی۔

(بے تحاشا ہنستے ہوئے) ان کی بیوی خوبصورت ہوگی، تمھیں تو کوئی چمارن ہی پوچھے گی۔

جہاں اسلم صاحب شادی کریں گے وہیں میں بھی کروں گا۔ ان کی بیوی تو خوبصورت ہوگی

یا وہ بھی بدصورت ہوگی؟

اور نہیں تو کیا ــــ بالکل بدصورت ہوگی۔

اس کے سامنے تو تم بھی چمارن لگوگی اتنی خوبصورت ہوگی وہ؟

ہو چکی!

وہ تو ہوگی اور ضرور ہوگی۔ لیکن اگر آپا جی نے کسی نکھٹو، منحنے، کالے کلوٹے سے تمھاری شادی کر دی تب کیا کروگی؟

گلا گھونٹ دوں گی۔

کس کا ــــ کیا آپا جی کا؟

دیکھو اقبال اب شامت آگئی ہے تمھاری ــــ زبان بند رکھو۔

خود جو اتنی دیر سے نہ جانے کیا کیا کہے جا رہی تھیں!

ہماری تیری برابری ہے۔ ہم ہم ہیں تو تو ہے ــــ وہی چمار کا چمار سوچتی ہوں کسی دن خط لکھ دوں لوتا چمار کو آ کر لے جائے اپنی امانت ہم سے نہیں سنبھلتی۔

اور ہمیں پڑی کیا ہے سنبھالنے کی! ــــ کیوں اقبال ایک کام کر دوگے ہمارا؟

نہیں کرتا کسی کا کام وام!

تم تو بڑے اچھے بھیّا ہو ہمارے!

کام پڑا تو بھیّا ہوگیا، ویسے تو اب تک چمار تھا!

وہ تو مذاق کر رہے تھے ہم ــــ تم کیوں چمار ہوتے ــــ بھلا کہیں گلفام بھی چمار ہوتے ہیں!

اب میں گلفام بھی ہوگیا!

کچھ آج سے ؟ ۔۔۔ ہمیشہ سے ! ۔۔۔ بولو کر دو گے نا !

تھوڑی دیر اور تعریفیں کر لو میری، پھر سوچوں گا !

واپس آ لو پھر ۔۔۔ بہت دیر ہوئی جا رہی ہے ۔

بتاؤ کیا کام ہے ؟

آدھ پاؤ گوشت لا دو بس تیر کی طرح جاؤ اور تیر کی طرح آ جاؤ !

لیکن صبح آپاجی لائے تو تھے، کیا خود ہی صاف کر گئیں ؟

نہیں اقبال میں کہاں کھاتی ہوں اسلم صاحب کھاتے ہیں، تھوڑا سا آپاجی کو

دے دیتی ہوں پھر بھی بچ جاتا ہے تو تمھیں کھلا دیتی ہوں ۔

ہاں یہ تو میں دیکھتا رہتا ہوں ۔۔۔ لیکن وہ ہوا کیا، کہیں بلی تو نہیں کھا گئی ؟

تم سے باتوں میں لگی رہی پتیلی کی طرف سے دھیان ہٹا دیکھا تو جل چکا تھا سارا

اوہ ! تو کیا ہوا ؟ دال ہی ہی !

تو کیا اسلم صاحب کو بھی دال بھیج دوں لڑکے ؟

ہاں کھائیں گے ۔۔۔ اس دن کہہ رہے تھے ۔ ارہر کی بگھری ہوئی دال بڑے

مزے کی پکتی ہے ہمارے گھر میں، بگھار دینا !

بری بات ہے ۔۔۔ بیچارے اتنا کام کرتے ہیں، اتنی محنت کرتے ہیں، کس

کس طرح ہمارے کام آتے ہیں ۔ انھیں دال پر ٹرخا دینا کوئی اچھی بات ہے ؟

تو پھر آدھ پاؤ کیوں منگا رہی پاؤ بھر منگاؤ ۔۔۔ آپاجی تو کبھی آدھ پاؤ

نہیں لاتے !

وہ تو ٹھیک ہے بھیا، لیکن پیسے اتنے ہی ہیں ۔ آلو رکھے ہوئے ہیں وہ ڈال

دوں گی، کام بن جائے گا! — بھیا جلدی سے لے آ، کھانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

لاؤ بھئی!

لو یہ پیسے — ہاں دیکھنا بڑیاں ہی بڑیاں نہ لے آنا! اور چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بھی کرا لینا۔

اقبال چلا گیا — یہ باتیں بھائی بہن میں آہستہ آہستہ ہو رہی تھیں۔ لیکن اسلم نے ایک ایک لفظ سن لیا۔ جب بھی اقبال اور سلمیٰ میں نوک جھونک ہوتی تھی وہ بڑی دلچسپی سے ان دونوں کی باتیں سنا کرتا تھا!

اقبال کو گئے ہوئے ذرا دیر ہوئی ہو گی کہ مرزا صاحب تشریف لے آئے وہ عام طور پر صبح کے گئے شام کو اور کبھی کبھی رات کو واپس آیا کرتے تھے۔ آج ۱۱ بجے ان کا واپس آجانا حیرت انگیز تھا۔ دوسرے سے خلاف معمول بات یہ تھی کہ سیدھے اندر نہیں گئے اسلم کے کمرے میں آ گئے۔ اسلم نے پذیرائی کرتے ہوئے سوال کیا۔:

آج تو بہت جلد تشریف لے آئے؟

وہ ایک آہ کر کے کرسی پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے: ہاں بیٹا جلدی آ گیا۔ طبیعت خراب ہے کچھ، یہاں تک آتے آتے قیامت آ گئی۔ بڑی مشکل سے پہنچ سکا ہوں۔

اسلم نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں پوچھا: خیریت تو ہے۔ کیا طبیعت ناساز ہے؟

کہنے لگے: چکر آ رہے ہیں، بار بار آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے ساری دنیا مجھ سمیت جھولا جھول رہی ہے۔ کئی جگہ تو گرتے گرتے بچا!

تو کیا آپ پا پیادہ تشریف لائے ہیں؟

ہاں بیٹے جیب خالی تھی سیٹھ صاحب تھے نہیں ورنہ ان سے کچھ لے لیتا۔ دفتر کے دوسرے آدمیوں سے کچھ مانگنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ ورنہ تانگے پر آتا!

تانگے پر آجاتے، کرایہ یہاں دے دیا جاتا!

ہر وقت ہر بات پر کہاں تک بہتی کو تکلیف دیے جاؤں۔ ویسے اندھے کی لاٹھی بہتی ہو اور کون ہے؟

اب کیا حال ہے ۔۔ کم ہوئے چکر؟

نہیں بیٹا ۔ کچھ اور بڑھ گئے ہیں، اسی لئے تو اندر نہ جا سکا ۔۔ یہاں آکر بیٹھ گیا۔

تو آئیے بستر پر لیٹ جائیے!

بستر پر لیٹ جاؤں؟ ۔۔ اچھا، لیکن میرا ہاتھ پکڑ لو، مجھے سہارا دو، میں اٹھ بھی نہیں سکتا۔ دو قدم بھی نہیں چل سکتا ۔۔ نہ جانے کیا ہوا جا رہا ہے۔

کمزوری ہے۔ انشاء اللہ طبیعت اٹھ جائے گی، ذرا دیر آرام کرنے کے بعد!

نہیں بیٹے، یہ تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے ۔۔ خیر مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ!

اسلم نے لپک کر مرزا صاحب کو سہارا دیا اور بستر پر لٹا دیا!

اسلم نے مرزا صاحب کو بستر پر لٹایا تو محسوس کیا یہ اپنے آپ کو سنبھال بھی نہیں سکتے۔ ان میں اتنا دم بھی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو گرنے سے روک سکیں۔ اگر کہیں خود ہی بستر تک آتے تو ضرور گر پڑتے اور لہو لہان ہو جاتے یہ بڑی بری علامت تھی۔ وہ سوچنے لگا کہیں مرزا صاحب کی حالت زیادہ نازک

نہ ہو جائے ؟!

اتنے میں ان کے منہ سے "اللہ" کا لفظ نکلا، لیکن نہایت درد اور کرب کے ساتھ!

اسلم نے قریب آکر انھیں تسلّی دیتے ہوئے کہا: دھوپ بھی تو بہت سخت ہے۔ آپ ویسے ہی کمزور اور نڈھال ہو رہے ہیں اس لیے چکّر آ گئے، آرام سے لیٹے رہیے۔ انشاء اللہ بہت جلد طبیعت درست ہو جائے گی۔

مرزا صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، آنکھیں بند کر لیں، جیسے اپنی توجہ ان باتوں سے ہٹا کر کچھ اور سوچنے لگے ہیں!

اسلم نے بھی مداخلت نہیں کی خاموش ہو گیا اور پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا!

(۶۱)

کوچ کا بگل

مرزا صاحب کے چہرے پر عجیب طرح کے کرب اور بے چینی کے آثار ہویدا تھے۔ وہ بڑے ضابط اور صابر آدمی تھے، مر جائیں مگر اُن میں فرق نہ آنے پائے۔ لیکن اس وقت بیقراری اور اضطراب کے عالم میں کروٹیں بدل رہے تھے۔ زبان سے بار بار آہ کا لفظ نکل رہا تھا!

یہ دیکھ کر اسلم گھبرا گیا، اس نے اقبال کو آواز دی، وہ گوشت لے کر ابھی ابھی آیا تھا۔ آواز سنتے ہی آموجود ہوا۔ اسلم نے مرزا صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

تم یہاں بیٹھو میں ڈاکٹر کو لے کر ابھی آتا ہوں۔

اقبال باپ کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گیا، اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسلم کی طرف دیکھنے لگا۔ اسلم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور محبت بھرے لہجے میں کہا:

گھبرانے کی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے تھوڑی دیر میں!

اسلم ڈاکٹر کو لینے چلا گیا۔ ایک ڈاکٹر پاس کی بلڈنگ میں مطب کرتے تھے اور ان کا مطب اچھا خاصا چلتا تھا۔ وہاں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب ہجومِ عاشقاں میں گھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک تو وہ ان کی بے پناہ مصروفیت کا نظارہ کرتا رہا۔ پھر ہمت کر کے گویا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب آپ کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہے!

ڈاکٹر صاحب نے اس عجیب و غریب فرمائش پر جس میں تحکم بھی شامل تھا حیرت سے اسلم کی طرف دیکھا۔ پھر ارشاد فرمایا:

اس وقت تو میں نہیں جا سکتا، دیکھ رہے ہیں آپ مریضوں کا ہجوم، انھیں نمٹا لینے کے بعد میں چل سکوں گا۔

اسلم نے کہا: ان حاضر الوقت مریضوں میں سے بہ فضلِ خدا کسی کی حالت نازک نہیں ہے، لیکن میں جس مریض کے لئے آپ کو لے جانا چاہتا ہوں اس کی حالت بہت نازک ہے۔ بعد از وقت آپ پہنچے بھی تو کیا!

ڈاکٹر صاحب کو رحم آ گیا۔ انھوں نے پوچھا: کہاں جانا ہے؟

اسلم نے اپنے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: بس چند قدم۔ ابھی واپس آ جائیے گا۔

ڈاکٹر صاحب تیار ہو گئے، ذرا دیر میں دونوں منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ کمرے میں اقبال بھی موجود تھا اور مرزا صاحب کے پاس بستر پر ایک ہی چادر میں لپٹی ہوئی سلمیٰ بیٹھی تھی اس کا رخ مرزا صاحب کی طرف تھا اور پیٹھ دروازے کی طرف، اسلم نے

دروازے پر کھڑے کھڑے کہا : ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں !

سلمیٰ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔ ڈاکٹر صاحب نے مریض کا معائنہ شروع کر دیا ۔ اسلم نے اقبال سے کہا : جاؤ تم اندر جاؤ ۔ (سلمیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) انھیں بھی لے جاؤ ، پھر آجانا !

اقبال نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اندر جانے لگا ۔ سلمیٰ ذرا ٹھٹکی ۔ اسلم نے کہا : اچھی طرح معائنہ ہو لینے دیجیے پھر بعد میں آجائیے گا ! ہر وقت آسکتی ہیں آپ ۔ لیکن اس وقت مخل ہونا مناسب نہیں !

وہ اقبال کے ساتھ اندر چلی گئی ۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد ایک انجکشن دیا ۔ اور نسخہ بھی لکھ دیا ۔ پھر ساتھ ساتھ دونوں باہر نکلے ۔ اسلم نے فیس اور انجکشن کے روپے اسی وقت پیش کر دیے اور نسخہ لینے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ان کی ڈسپنسری کی طرف بڑھا ۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے پوچھا :

کوئی خطرناک بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب ؟

ڈاکٹر صاحب نے خفیف سے تامل کے بعد کہا : انجکشن میں نے دیا ہے دوا لا کر آپ پلاتے رہیے اور نتیجہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دیجیے !

اسلم گھبرا گیا ۔ اس نے پوچھا : کیا حالت نازک ہے ؟

ڈاکٹر صاحب نے اقرار میں گردن ہلا دی ۔ اس نے پھر سوال کیا :

لیکن بیماری کیا ہے ؟

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا : ہائی بلڈ پریشر — مجھے حیرت ہے یہ اب تک بچے کیسے رہے ، بڑھاپے میں ویسے ہی اس بیماری کی روک تھام مشکل ہوتی ہے ۔ نہ کہ مرض

جب مزمن ہوجائے!

مزمن ـــ لیکن میں تو آج آپ کی زبان سے یہ لفظ سن رہا ہوں۔ مرزا صاحب نے تو کبھی شکایت نہیں کی ۔ ہاں کبھی کبھی درد سر اور خفیف سے چکّر کی شکایت کیا کرتے تھے!

یہی وارننگ بھی قدرت کی طرف سے جسے انھوں نے ناواقفیت کے سبب کوئی اہمیّت نہیں دی!

بہرحال امید ہے بچ تو جائیں گے ـــ کیا خیال ہے آپ کا؟

یہ دو تین روز کے بعد معلوم ہو سکے گا۔ اس وقت میں نے مرض کی جو رفتار دیکھی ہے اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یا دماغ کی شریان پھٹ جائے گی یا فالج ہو جائے گا۔ پہلی صورت میں موت فوری اور یقینی ہے، دوسری صورت میں کچھ دن اور گزاریں گے!

یہ سُن کر اسلم کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے پر ہتھوڑا مار دیا ہو، اُسے خود چکّر سا آگیا۔ وہ سوچنے لگا اگر خدانخواستہ مرزا صاحب زندہ نہ رہ سکے تو کیا ہوگا؟ پھر یہ مختصر سا کنبہ کیا کرے گا؟ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ ڈاکٹر صاحب سے کچھ نہیں کہا۔ ڈسپنسری سے نسخہ بندھوایا اور پھر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس وقت بھی اقبال اور سلمیٰ موجود تھے۔ پیٹھ دروازے کی طرف، مُنہ باپ کی طرف!

دروازے پر کھڑے ہو کر اسلم نے کہا: میں آتا ہوں!

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چادر اور زیادہ احتیاط کے ساتھ اوڑھ لی اور منہ ڈھانپ لیا اسلم آیا تو اس نے دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس مختصر سی مدّت، چند منٹ کے عرصے میں مرزا صاحب کی حالت بہت زیادہ زار و زبوں ہو چکی ہے۔ نیم بیہوشی کی کیفیت طاری

ہے۔ آنکھ کھولتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیوانوں کی طرح دیکھنے لگتے ہیں، بات کرنا چاہتے ہیں مگر ہکنے لگتے ہیں۔ کہنا کچھ چاہتے ہیں منہ سے کچھ نکلتا ہے۔

اسلم نے جلدی سے دوا پلائی۔ سلمیٰ اسی طرح باپ کے پاس بیٹھی رہی۔ قریب ہی دوسری کرسی پر اسلم بیٹھ گیا۔ سلمیٰ یقیناً رو رہی تھی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز تو سُننے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کے بدن کی جنبش بتا رہی تھی کہ ضبطِ گریہ کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

اسلم نے اقبال سے کہا: اپنی آپا سے کہہ دو گھبرائیں نہیں۔ خدا نے چاہا تو مرزا صاحب اچھے ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔

اقبال اسی طرح خاموش کھڑا رہا، وہ خود چکّر میں تھا کہ دفعتہً یہ کیا ہو گیا؟ کبھی اسلم کو تکنے لگتا کبھی سلمیٰ کو کبھی مرزا صاحب کو، گویا ہر ایک سے پوچھ رہا تھا یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے باپ کو جو اچھا بھلا گھر سے گیا تھا کیا ہو گیا ہے؟

ذرا دیر میں مرزا صاحب کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ سلمیٰ رونے لگی۔ اسلم کو کچھ اور نہ سوجھا دوڑا دوڑا گیا اور پھر ایک مرتبہ ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر نے پھر انجکشن دیا۔ نسخے میں کچھ تبدیلی کی۔ باہر آ کر جب اسلم نے فیس دی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

حالت ابتر ہی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں نہ اُن کا ٹھیک علاج ہو سکتا ہے نہ تیمارداری۔ میری رائے میں بہتر یہ ہے کہ جلد از جلد ہسپتال میں داخل کر دیجئے مریض کو!

ڈاکٹر صاحب فیس لے کر چلے گئے اور اسلم وہیں کھڑا رہا، اس کے پاؤں کے نیچے

زمین نکلی جارہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ مرزا صاحب موت سے قریب ہوتے جارہے تھے جو تھوڑی بہت رقم اس کے پاس تھی وہ دو مرتبہ کی فیس میں تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ اب زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ روپے اور تھے۔ یہ معلوم تھا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ گوشت تک پاؤ بھر کے بجائے آدھ پاؤ آیا۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ مرزا صاحب کو ہسپتال میں داخل کرے، لیکن گھر پر رکھ کر علاج کی استطاعت بھی نہیں تھی۔ اسپیشل وارڈ میں رکھنا طاقت سے باہر تھا۔ جنرل وارڈ میں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا۔ نہ جانے صحیح تیمار داری ہو بھی سکے گی یا نہیں؟

لیکن وقت سوچنے کا نہیں عمل کا تھا، جو کچھ کرنا تھا جلد از جلد اور فوراً کرنا تھا ورنہ اس حیص بیص میں کہیں مرزا صاحب داغِ مفارقت دے گئے تو اور بُرا ہوگا۔

لیکن ہسپتال کے جنرل وارڈ میں کسی مریض کا داخلہ آسان بھی تو نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے اور کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ تب کہیں داخلہ ملتا ہے۔

ان پریشان خیالوں کے ہجوم میں بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر کی رائے صائب ہے۔ مرزا صاحب کو فوراً ہسپتال میں داخل کردینا چاہیئے۔

وہ گھر واپس نہیں ہوا سیدھا ہسپتال کی طرف بھاگا!

(۷)

ایک نئی دُنیا

افتاں وخیزاں اسلم ہسپتال پہنچا۔ اس دُنیا کی ریت رسم سے وہ بالکل ناواقف اور اجنبی تھا۔ نہ یہ معلوم تھا کہ کس ڈاکٹر سے ملنا چاہیئے، نہ یہ پتہ تھا کہ کس وارڈ میں جانا چاہیئے۔ کون ڈاکٹر کہاں مل سکتا ہے؟ اور کون وارڈ کہاں ہے؟ اس کا بھی اسے علم نہ تھا بھاگا بھاگا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بڑی دیر تک چکّر کاٹتا رہا۔ پھر ایک ڈاکٹر سے جو سفید لباس میں ملبوس ایک کمرے سے نکل کر کسی دوسرے کمرے میں جا رہا تھا مڈبھیڑ ہوئی۔ بڑے دردانگیز پیرایہ میں اس نے مرزا صاحب کی داستانِ درد سُنائی اور یہ بھی بتا دیا کہ گھر میں خدا کے نام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نہ اب فیس دینے کی طاقت ہے نہ نسخہ خریدنے کی۔ ڈاکٹر بڑی توجّہ اور ہمدردی سے یہ باتیں سنتا رہا، پھر اس نے کہا:

جنرل وارڈ کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ہم نے بہت سے

مریضوں کے بستر پر آمدوں میں لگا رکھے ہیں۔ لیکن آپ کا کیس بھی سیریس معلوم ہوتا ہے
جائیے مریض کو لے آئیے اپنی طرف سے کوشش پوری کروں گا!
اسلم کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: جناب کا اسم گرامی؟
مرزا صاحب کو لے کر آؤں تو کہاں تلاش کروں؟
ڈاکٹر نے بتایا: میرا نام ہمایوں ہے۔ میں یہاں کا ہاؤس سرجن ہوں انکوائری
سے میرا پتا چل جائے گا۔ ویسے وہ سامنے والا کمرہ جو ہے میں وہاں ملوں گا۔
اسلم شکریہ ادا کر کے الٹے پاؤں واپس ہوا، یہاں پہنچا تو معاملہ ہی دوسرا
تھا۔ مرزا صاحب بے ہوش ہو چکے تھے، سلمیٰ روتے روتے بے حال ہو رہی تھی۔
اقبال کی بھی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔
اسلم نے بات چیت میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا تسلی اور دلدہی کے
دو الفاظ بھی نہیں کہے۔ اسے ایک ایک سکنڈ کے قیمتی ہونے کا احساس تھا۔ اس نے
سوچا تسکین اور دل دہی کی باتیں پھر ہوتی رہیں گی پہلے مرزا صاحب کی جان بچانے
کی سعی کرنی چاہیئے۔ تانگہ اپنے ساتھ لایا تھا، اقبال سے کہا:
ہم ہسپتال چل رہے ہیں تم بھی چلو۔
سلمیٰ کی آواز آئی: میں بھی چلوں گی!
اسلم نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا۔ اقبال بھی ذرا دیر میں واپس آ جائے گا۔ وہاں
کوئی نہیں رہ سکتا، شاید مجھے اجازت مل جائے۔
وہ پھر رونے لگی: اسلم نے مرزا صاحب کو دونوں ہاتھوں پر اٹھاتے ہوئے
کہا: آپ اتنی سمجھدار ہو کر ایسی باتیں کرتی ہیں! مرزا صاحب کی جان بچانی زیادہ

ضروری ہے یا آپ کا وہاں رہنا! — آؤ آؤ اقبال!

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ مرزا صاحب کو تانگے پر لے کر پہنچا۔ انھیں تانگے کا تکیہ نکال کر لٹا دیا۔ خود ان کی پائینتی بیٹھ گیا۔ اقبال کو آگے تانگے والے کے پاس بٹھا دیا، تانگہ چل پڑا۔

ذرا دیر میں ہسپتال آ گیا۔ اسلم نے اقبال سے کہا: یہیں بیٹھے رہو۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ تانگہ ایک درخت کی چھاؤں میں کھڑا تھا۔ تانگے والے نے تانگہ سے اتر کر گھوڑے کی گردن پر شفقت بھرا ایک ہاتھ مارا۔ اور کہا: صاحب ذرا جلدی آنا!

اسلم نے کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا ڈاکٹر ہمایوں کے کمرے میں پہنچا مگر کمرہ خالی تھا کوئی دربان بھی نہ تھا۔

چند منٹ تک وہ دروازہ پر کھڑا رہا کہ شاید اب ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئیں لیکن جب پندرہ منٹ گزر گئے تو تشویش ہوئی۔ انکوائری پر پہنچا تو کلرک نے جو کسی کو فون کر رہا تھا جواب دیا: جائیں گے کہاں یہیں ہوں گے کسی وارڈ میں۔ انتظار کیجئے آتے ہوں گے!

وہ پھر بھاگوں بھاگ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں پہنچا مگر وہ اب تک تشریف نہیں لائے تھے!

اب اس نے خود مختلف کمروں میں جھانکنا اور مختلف وارڈوں کے چکر لگانے شروع کئے۔ آخر ایک جگہ کچھ ڈاکٹروں کے مجمع میں وہ باتیں کرتے نظر آئے، اسلم کو دیکھتے ہی بیچارے خود لپک کر آگے بڑھے: "کیا مریض کو لے آئے آپ؟"

اسلم نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا: مریض کہاں ہے؟
اسلم نے دُور درخت کی طرف اشارہ کر دیا، وہ اسلم کے ساتھ ساتھ تانگے تک آئے
دہیں کھڑے کھڑے مرزا صاحب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسٹریچر منگوایا اور انھیں ڈاکٹر
معائنے کے کمرے میں لے گئے۔

ڈاکٹر ہمایوں خود کوئی بڑے ڈاکٹر نہیں تھے۔ ابھی دو سال ہوئے انھیں ڈگری ملی تھی۔ آدمی ذہین تھے اس لئے ہاؤس سرجن رکھ لئے گئے۔ وہ ڈاکٹر مہتہ کو بلانے چلے گئے جو اس ہسپتال میں ڈاکٹر آف میڈیسن تھے۔ ڈاکٹر مہتہ اسپیشل وارڈ کے مریضوں کو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد بہت سے ڈاکٹروں اور شاگردوں کے جلو میں مسکراتے، باتیں کرتے تشریف لائے۔ ہمایوں نے لپک کر انھیں مرزا صاحب کی طرف متوجہ کیا۔ بھلے آدمی تھے، فوراً دیکھ بھال شروع کر دی۔ اور کوئی بیس منٹ کے معائنے کے بعد مایوسی کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ہمایوں سے کہا:

بہت کم امید ہے، لیکن بہرحال داخل کر لیجئے۔

اتنا اشارہ ڈاکٹر ہمایوں کے لئے کافی تھا، انھوں نے جنرل وارڈ کے برآمدے میں ایک چارپائی مرزا صاحب کے لئے بھی بچھوا دی اور اسلم سے کہا:

اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔

اسلم نے التجا کے رنگ میں عرض کیا: اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں یہیں رہوں مریض کے پاس؟

ڈاکٹر صاحب نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا: جنرل وارڈ میں مریض کے ساتھ کسی تیماردار کو رہنے کی اجازت صرف خاص حالات ہی میں مل سکتی ہے۔ آپ کے مرزا صاحب

کی حالت واقعی تشویش ناک ہے، میں ڈاکٹر مہتہ سے پوچھ لوں!

ڈاکٹر مہتہ نے اجازت دے دی اور یہ اجازت حاصل کر کے اسلم اقبال کو لے کر واپس چلا۔

اس تمام مدت میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت اقبال کی تھی۔ وہ شوخی، چوبچال پن، شرارت، زندہ دلی کسی چیز کا پتا نہ تھا۔ کھویا کھویا سا حیران، پریشان اِدھر اُدھر تاک رہا تھا۔ کبھی آنے والے ڈاکٹر کو، کبھی جانے والی نرس کو کبھی کسی مریض کے نالۂ جگر گداز پر چونک پڑتا، کبھی حیرت سے اسلم کی طرف دیکھنے لگتا۔ اور پھر مرزا صاحب پر نظریں گاڑ دیتا۔ شاید سوچ رہا تھا اس بوڑھے اور تھکے ہوئے شخص کا انجام کیا ہوگا؟ اقبال کو لے کر اسلم گھر پہنچا۔ سلمیٰ دروازہ سے لگی راہ تک رہی تھی۔ ان دونوں کی جیسے ہی یہ داخل ہوئے سلمہ نے رقت آمیز انداز میں بہ ظاہر اقبال سے اور درحقیقت اسلم سے پوچھا:

کیا ہوا، ابّا جی کی حالت اب کیسی ہے؟

جواب دینے کے بجائے اقبال اسلم کی طرف دیکھنے لگا۔ اسلم نے تسلّی دینے والے انداز میں کہا:

ہسپتال میں بڑی مشکل سے داخلہ مل گیا ہے، اللہ کو منظور ہے تو بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔

سلمیٰ نے پھر اقبال کے پیرایہ میں اسلم سے پوچھا:

تو کیا ابّا جی وہاں اکیلے رہیں گے؟ اُن کی دیکھ بھال اور تیمارداری کون کرے گا؟

اسلم نے جواب دیا: ڈاکٹر ہیں، نرسیں ہیں، پورا ہسپتال ہے ــــ ویسے

ویسے میں وہیں رہوں گا انہی کے پاس!

اقبال نے کہا: بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کسی کو اجازت نہیں مل سکتی رہنے کی مریض کے ساتھ!

سلمیٰ نے کچھ تامل کچھ اضطراب کے ساتھ کہا: کیا میں نہیں رہ سکتی ان کے پاس؟

اسلم جھنجلایا ہوا تھا، دوپہر سے یہ وقت آ گیا تھا دوڑتے دھوپتے صرف ناشتہ کیا تھا کھانے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس نے کہا جنرل وارڈ میں بالکل اجازت نہیں ملتی۔ مجھے مل گئی ہے یہی بہت ہے!

پھر اُسے اپنے لب و لہجے کی سختی کا اور سلمیٰ کے گداز قلب کا احساس ہوا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا: آپ وہاں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گی، میں ان کی دیکھ بھال کروں گا، ڈاکٹر سے بار بار حال کہوں گا جا کر، پاخانہ پیشاب کراؤں گا۔ اس طرح کے کام وہاں آپ کیسے کر سکیں گی؟

وہ خود سمجھ رہی تھی کہ بات ایسی ہی تھی۔ لیکن جذبِ دل سے مجبور ہو کر یہ تمنا بھی انگڑائیاں لینے لگی تھی کہ کاش، وہ خود ہی جا سکے اور جتنی خدمت بھی ممکن ہو باپ کی کر سکے۔

اس کے بعد اسلم اپنا سامان ٹھیک کرنے لگا۔ سلمیٰ اندر چلی گئی۔ کپڑوں کی پوٹلی بغل میں داب کر اسلم ہسپتال جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ نظر اقبال پر جا کر رک گئی وہ کھانا لا کر میز پر رکھ رہا تھا۔

اسلم کا دل پانی ہو گیا، وہ پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا: اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی جی نہیں چاہ رہا ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں کھایا

جا سکے گا!

اقبال نے کہا: آپا نے کہا ہے کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دینا کسی طرح اسلم صاحب کو ۔۔ زیادہ نہ سہی دو لقمے کھا لیجئے ۔ دوپہر سے تو بھوکے ہیں آپ!

اسلم میز پر بیٹھ گیا ۔۔ اس سے پوچھا:

اور تم؟!

پھر اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا!

لیکن لقمہ نہ اسلم کے حلق سے نیچے اتر رہا تھا نہ اقبال کے اور بالکل یہی کیفیت اندر سلمیٰ کی تھی! اس نے تو کھانے کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائی تھی!

سب کے دل میں مرزا صاحب کے حال اور مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے سلمیٰ سوچتی تھی باپ کے مرجانے کے بعد میں کیا کروں گی کہاں جاؤں گی یا کون میرے سر پر ہاتھ رکھے گا، کون میرا کفیل ہوگا، کیا کہیں کسی گھر میں خادمہ بن کر رہنا پڑے گا؟

اقبال سوچ رہا تھا یہ دم بھر میں بیٹھے بیٹھے کیا ہوگیا؟ کیا آدمی اسی طرح دنیا سے گزر جاتے ہیں ۔ کیا ابا جی بھی اماں کی طرح مر جائیں گے ، اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے ، پھر کیا ہوگا؟

پھر کیا ہوگا؟ ۔۔ اس سے آگے اس کا ذہن کند ہو جاتا تھا ۔ اس کی قوت فیصلہ جواب دے دیتی تھی!

اسلم بھی کم پریشان نہیں تھا اُسے بھی مرزا صاحب سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا

اتنا اونچا، اتنا شریف، اتنا نیک اور پارسا آدمی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اسے مرزا صاحب سے وہی تعلقِ خاطر پیدا ہوگیا تھا جو ایک بیٹے کو باپ سے ہوتا ہے!

---

(۸)

سونے کا کنگن

ایک ہفتہ گزر گیا۔

مرزا صاحب ایک آہنی چارپائی پر دراز تھے۔ اب تک ہوش نہیں آیا تھا پورے طور پر، کبھی کبھی آنکھ کھول لیتے، کچھ بڑبڑاتے اور پھر غوطے میں چلے جاتے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص یہ تھی کہ مرزا صاحب متعدد امراض کا مجموعہ ہیں۔ ذیابیطیس بھی ہے بلڈ پریشر بھی۔ گردے بھی ناکارہ ہو چکے ہیں، جگر بھی اپنا کام چھوڑ چکا ہے۔ بار بار انجکشن دیے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر جب کبھی راؤنڈ پر آتا خاص توجہ سے دیکھتا، نرس بھی اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ ڈاکٹر ہمایوں بار بار آتے تھے۔ انھیں نہ جانے کیوں اسلم سے اور مرزا صاحب سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اسلم کے ساتھ یہ رعایت کی گئی تھی کہ مرزا صاحب کے پاس ہی ایک چوبی چوکی بچھا دی گئی تھی جس پر صرف کمر ٹک سکتی تھی۔ پاؤں باہر رہتے تھے سونے اور نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جس طرح بھی ہوتا تھا لشتم پشتم رات کچھ عالمِ

غنودگی میں، کچھ عالمِ بیداری میں گزار دیتا تھا۔ دن کا وقت زیادہ تر بیٹھے بیٹھے کٹتا تھا۔

دوسرے روز ڈاکٹر ہمایوں نے بتایا کہ ہم نے مرزا صاحب کو جنرل وارڈ میں داخل تو کر لیا ہے، عام دوائیں بھی انھیں یہیں سے مل رہی ہیں لیکن بعض خاص دوائیں آپ کو خریدنا پڑیں گی۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک نسخہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

جس وقت ڈاکٹر ہمایوں یہ بات کر رہے تھے سلمیٰ اور اقبال بھی باپ کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ ہر روز شام کو ایک گھنٹے کے لئے ہسپتال کے حسب قواعد آجایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نسخہ دے کر چلے گئے مگر اسلم سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ نہ جانے یہ نسخہ کتنے میں آئے؟ اور صرف اسی نسخے پر بس نہیں بار بار پیٹنٹ دوائیں لکھی جائیں گی۔ اور انجکشن طلب کئے جائیں گے۔ مرزا صاحب کی جان بچانا ہے تو یہ چیزیں ہر قیمت پر لانا پڑیں گی۔ لیکن روپیہ کہاں سے آئے؟ شفقت صاحب پر نظر گئی مگر مایوس پلٹی۔ دوسری اور تیسری کتاب جن لوگوں نے چھاپی تھی اب اُن پر کچھ باقی نہیں تھا۔ اشاعت گھر میں ترجمہ کا کام بھی جس دن سے مرزا صاحب علیل ہوئے تھے بند تھا۔ اور وہ لوگ معاملے کے کھرے اور اصول کے سخت تھے۔ اگر اسلم کا کچھ باقی ہوتا تو فوراً ادا کر دیتے لیکن پیشگی یا قرض کی کوئی مَد اُن کے ہاں نہیں تھی۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آرہی تھی۔

سلمیٰ نے شاید اسلم کی یہ کیفیت محسوس کر لی، محسوس کرنی بھی چاہیئے تھی۔ تمام حالات سے اچھی طرح واقف اور آشنا تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اقبال کو اسی تپائی پر جس پر اسلم رات بسر کیا کرتا تھا بٹھا لیا۔ اور اس سے کچھ دیر تک سرگوشی کرتی رہی۔ پھر اُسے کوئی چیز دی۔ اقبال بہن کے پاس سے اٹھ کر اسلم کے پاس آیا اور اس کی طرف

سونے کا ایک پتلا سا کنگن بڑھاتے ہوئے بولا :

آپا کہہ رہی ہیں اسے فروخت کر دیجئے یا رہن رکھ دیجئے اور آپا جی کے لئے دوائیں لے آئیے ۔

اسلم کی آنکھیں کنگن کو دیکھ کر ڈبڈبا آئیں۔ چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا کہ اسے لے یا واپس کر دے ؟ وہ سوچ رہا تھا یہ کنگن کتنی حسرت اور ارماں سے ماں باپ نے اسے بنا کر دیا ہوگا۔ کتنے شوق سے اس نے اسے پہنا ہوگا ۔۔۔ اور آج ۔۔۔ وہ اسے جدا کرنے پر مجبور رہے ۔

لیکن بہت ہی جلد اس نے سوچا وقت جذبات میں ضائع کرنے کا نہیں ہے سوال مرزا صاحب کی زندگی بچانے کا ہے۔ کسی ایثار سے گریز نہ کرنا چاہیئے کنگن پھر بھی بن سکتا ہے انہیں دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی !

اس نے فیصلہ کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اقبال کے ہاتھ سے باچشم پرنم کنگن لے لیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اقبال اور سلمیٰ اس کا انتظار کر کے واپس جا چکے تھے تب وہ آیا۔ فوراً دوائیں ڈاکٹر ہمایوں کی خدمت میں پیش کر دیں۔ یہ کئی قسم کے انجکشن تھے اور خاصے قیمتی تھے۔ کچھ پیٹنٹ دوائیں تھیں، انجکشنوں اور دواؤں کی قیمت پینتالیس روپے تھی، اور ابھی اس کی جیب میں ڈیڑھ سو روپے اور تھے ۔ اس نے کنگن ایک سنار کے ہاں دو سو روپے میں رہن رکھا تھا۔ پہلے تو جی چاہا فروخت کر دے ، پھر سوچا یہ سلمیٰ کی مرحوم ماں کی یادگار رہے ۔ اگر بچ جائے تو اچھا ہی ہے ۔ چنانچہ رہن رکھنے ہی کا فیصلہ کیا گیا !

ڈاکٹر ہمایوں تھوڑی دیر کے بعد آئے ، انھوں نے انجکشن لگا دیے اور نرس کو تاکید کر دی کہ یہ دوائیں دو دو گھنٹے کے فرق سے دیتی رہے ۔ پھر انھوں نے بلڈ پریشر کا چارٹ دیکھا ۔ اور کچھ حیرت ، کچھ افسوس کے تاثرات کے ساتھ زبان سے کچھ کہے بغیر کندھے اچکائے اور چلے گئے ۔ شاید وہ حیران تھے کہ دوا کا اثر کیوں نہیں ہو رہا ہے شاید انھیں افسوس تھا کہ بہترین طبی امداد بھی رائگاں جا رہی ہے ۔

ڈاکٹر ہمایوں کے جانے کے بعد اسلم نے نرس سے کہا ۔ ذرا گھر تک ہو آؤں ایک گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گا !

اس نے سر کے اشارہ سے اجازت دے دی اور ایک دوسرے مریض کا ٹمپریچر لینے لگی ۔

ہسپتال سے نکل کر اسلم سیدھا گھر پہنچا ۔ دوپہر اور شام کو کھانا کھانے تھوڑی دیر کے لئے ہر روز آجایا کرتا تھا سلمیٰ دروازے کی اوٹ سے لگی اس کا انتظار کر رہی تھی ۔ اسے آتا دیکھ کر وہ ہٹ گئی ۔ فوراً ہی اقبال برآمد ہوا ۔ اس نے کہا : دوائیں لے آئے آپ ؟

اسلم نے جواب دیا : ہاں بھیا لے آیا ۔ انجکشن تو اسی وقت دے دیے گئے دوسری دواؤں کے لئے ڈاکٹر نے نرس کو ہدایت کر دی ہے !

اقبال نے پوچھا : کھانا لے آؤں ؟

اسلم نے کہا : ہاں لے آؤ ۔ مجھے ہسپتال جلد پہنچ جانا چاہیے ۔ شاید کوئی ضرورت ہو !

پھر اس نے جیب سے پچاس روپے نکالے اور اقبال کی طرف بڑھاتے ہوئے

گویا ہُوا ؛ یہ اپنی آپا کو دے دو گھر کا خرچ چلانے کے لئے۔ مجھے تو آجکل ذرا بھی فرصت نہیں ملتی، سارا وقت ہسپتال میں صرف ہو جاتا ہے نہ جانے تمھاری آپا کس طرح کام چلا رہی ہوں گی۔

اقبال نے جواب میں کہا ؛ بریع اوڑھ کر روز میرے ساتھ مارکیٹ چلی جاتی ہیں اور تمام چیزیں لے آتی ہیں۔ کوئی چھوٹا موٹا کام ہوتا ہے وہ میں کر لیتا ہوں وہ تو کہہ رہی تھیں ــــ

اقبال چُپ ہو گیا۔ اسلم نے سوال کیا ؛ کیا کہہ رہی تھیں تم چُپ کیوں ہو گئے؟ وہ بولا ؛ وہ کہہ رہی تھیں ہماری وجہ سے اسلم صاحب بھی کس جنجال میں پڑ گئے ہیں نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ نہ کھانے کا ٹھیک نہ ناشتے کا بندوبست۔ رو بھی رہی تھیں۔

رو کیوں رہی تھیں؟

بڑی دیر تک روتی رہیں ــــ اب تو دن میں کئی کئی دفعہ روتی ہیں!

لیکن کیوں؟ کیا وجہ ہے رونے کی؟ یہ بھی تو معلوم ہو؟

اباجی کے لئے روتی رہتی ہیں۔ اور آپ کی محنت، تکلیف اور پریشانی کے لئے۔ ہسپتال سے یہاں تک روتی ہوئی آئیں ــــ جب سے آئی ہیں برابر روئے چلی جا رہی ہیں۔

خود اسلم کا بھی یہ سُن کر رونے کو جی چاہنے لگا۔ اس نے کہا ؛ لیکن رونے سے کیا فائدہ؟ کیا مرزا صاحب اچھے ہو جائیں گے؟ کیا میری محنت اور پریشانی اور تکلیف کم ہو جائے گی ــــ؟ حوصلہ قائم رکھنا چاہیئے، دعا کرنی چاہیئے۔ اگر خدا نخواستہ

وہ بیمار پڑ گئیں تو کیا ہوگا؟

وہ تو اپنے مرنے کی دعا مانگا کرتی ہیں۔

ارے یہ کیا بک رہے ہو تم اقبال؟

وہ کہتی ہیں میں کیوں پیدا ہوئی نہ ماں کے کام آسکی نہ باپ کا دُکھ بٹا سکی کاش میں مر جاؤں، کاش میری زندگی خدا ابا جی کو دے دے!

بھئی بڑا دُکھ ہوا یہ باتیں سُن کر ____ کوئی ایسی باتیں بھی کرتا ہے؟

وہ کہتی ہیں میں منحوس ہوں!

منحوس! ____ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟

ہاں وہ کہتی ہیں میں منحوس ہوں ۔ امّاں مر گئیں، ابا جی گور کنارے کھڑے ہیں ۔ میں نہ ہوتی تو جو کچھ مجھ پر صرف ہوتا ہے اقبال کی پڑھائی پر صرف ہوتا ۔ میری ہی نحوست کے باعث اسلم صاحب نے جب سے ہم سے ہمدردی شروع کی ہے خود گرد اب میں آگئے ہیں!

خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو!

میں کہاں کرتا ہوں آپا کرتی رہتی ہیں!

اور تم انھیں سمجھاتے بھی نہیں، منع بھی نہیں کرتے!

منع بھی کرتا ہوں، سمجھاتا بھی ہوں لیکن وہ میری سُنتی کب ہیں، وہ تو بس اپنی کہتی رہتی ہیں ۔ اور روتی رہتی ہیں! ____ کل سے کھانا بھی نہیں کھایا!

(حد درجہ پریشان ہو کر) کل سے کھانا بھی نہیں کھایا؟

جی ____ چائے تک نہیں پی!

ارے! یہ کیوں؟

میں اور وہ ساتھ ساتھ کھانے کو بیٹھے، تھوڑا سا کھا چکنے کے بعد میں نے دیکھا وہ تو ایسے ہی بیٹھی ہیں، نظر اٹھائی تو آنسو گر رہے تھے۔ میں نے کہا آپا یہ کیا پلیٹ کھسکا دی اور سر چارپائی پر رکھ کر سسکیاں لینے لگیں ۔۔ پھر میں نے بھی نہیں کھایا۔

تو تم بھی فاقے سے ہو؟

نہیں ۔۔ بڑی دیر تک رو چکنے کے بعد آپا نے زبردستی کر کے مجھے کھلا دیا تھا۔ ایسا ہی چائے کے وقت ہوا۔ اپنی اور میری چائے بنائی، پھر رونے لگیں۔ اور پیالی الگ ہٹا دی!

تو اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یوں تو وہ جان دے دیں گی!

وہ تو یہی کہتی ہیں، زندہ رہنے کا مجھے کوئی حق نہیں!

یہ بہت بُری اور خطرناک باتیں ہیں!

مگر وہ سنتی کب ہیں کسی کی؟

اسلم خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا: یہ ایک نئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔ باپ کے لئے سلمیٰ کا غم اور صدمہ بالکل درست اور بجا ہے۔ لیکن کہیں اس طرح!

اسی اثنا میں اقبال اندر چلا گیا۔ اور ذرا دیر میں کھانا لے کر آ گیا۔ آلو کے قتلے، ارہر کی دال اور تین روٹیاں!

کھانا رکھ کر پھر اندر چلا گیا۔ اور ٹھنڈے پانی کی صراحی اور گلاس لے کر آ گیا۔ اسلم اسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ کھانا سامنے رکھا تھا۔ اقبال کچھ دیر تک تو

چُپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا کھا لیجئے۔ ہسپتال بھی تو جانا ہے آپ کو!
اسلم نے کہا: ہسپتال جا رہا ہوں، کھانا لے جاؤ میں نہیں کھاؤں گا!
اقبال حیرت سے اسلم کی طرف دیکھنے لگا، پھر پوچھا: کیوں نہیں کھائیں گے؟ ۔۔ کیا بھوک نہیں؟
اسلم نے جواب دیا: بھوک تو بہت ہے لیکن جب تمھاری آپا نہیں کھائیں تو مجھے لقمہ توڑتے شرم آتی ہے، اقبال میاں یہ برتن لے جاؤ!
اقبال نے اسلم سے تو کچھ نہ کہا لیکن بھاگا بھاگا اندر پہنچا اور پھر واپس آیا۔
اس نے کہا: آپا کہہ رہی ہیں کھا لیجئے!
اسلم نے کہا: جب تک وہ نہیں کھائیں گی مجھ پر بھی حرام ہے۔ ہرگز نہیں کھاؤں گا۔
سلمیٰ دروازہ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اشارہ سے اقبال کو اپنے پاس بُلا لیا: اب وہ اس کا ترجمان بن کر باتیں کرنے لگا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد اقبال کے سامنے سلمیٰ نے چند لقمے کھائے اور جب اقبال نے قسم کھا کر اُسے یقین دلا دیا تب اس نے بھی کھا لیا۔ پھر اس نے کہا اپنی آپا سے کہو ذرا دروازہ پر آ کر کھڑی ہو جائیں اور جو کچھ میں کہوں ان سے کہہ دو!
سلمیٰ آ کر دروازہ پر کھڑی ہو گئی۔ اقبال کے توسط سے اسلم بڑی دیر تک بڑی دلسوزی کے انداز میں اسے سمجھاتا رہا۔ اس نے کہا:
ایک لڑکی کی حیثیت سے جو محبّت مرزا صاحب سے آپ کو ہے اور ایک بہن کی حیثیت سے جو محبّت اقبال سے ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ حوصلہ قائم رکھئے

اگر آپ نے بھی حوصلہ ہار دیا تو سوچیئے تو سہی اس چھوٹے سے کنبے کی کیا حالت ہوگی
آپ کو اپنے لئے نہیں اپنے باپ بھائی کے لئے حوصلہ قائم رکھنا چاہیئے۔ اگر آپ
نے ہمت ہار دی تو نہ مرزا صاحب کی خیر ہے نہ اقبال کی!

یہ باتیں کر کے وہ ہسپتال روانہ ہوگیا۔ لیکن راستے بھر طبیعت بے کیف رہی
مرزا صاحب کی بیماری سلمیٰ کی پریشانی، اقبال کا اضطراب، خاموش۔ یہ چیزیں بار
بار یاد آتی تھیں اور اس کی دنیائے دل میں ہلچل پیدا کر دیتی تھیں، بار بار ان خیالات
کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرتا تھا لیکن یہ خیال اس درجہ مسلط تھا کہ کسی طرح اس
سے پیچھا چھڑانا ممکن ہی نہ ہوسکا!

وہ بار بار اس خیال کو جھٹکتا تھا لیکن وہ ساتھ چھوڑنے کو کسی طرح تیار نہ تھا
وہ سوچ رہا تھا مرزا صاحب کی کائناتِ حیات اب کسی انسان کے بجائے نہیں بچ سکتی
وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

میری قسمت میں غم جب اتنے تھے دل بھی یارب کئی دیے ہوتے!

وہ دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا اگر تو نے مرزا صاحب کو واپس بلانے کا فیصلہ
کر لیا ہے تو پھر ان کی محبت بھی دلوں سے نکال دے!

پھر اس کی نگاہِ تصور کے سامنے وہ برقع پوش لڑکی۔ سلمیٰ۔ آگئی جو ہر طرح
کے ناخوش گوار اور نامساعد حالات میں خوش رہا کرتی تھی جو غربت میں بھی حوصلہ
قائم رکھے ہوئے تھی، جو ہر وقت اپنے چھوٹے بھائی کو چھیڑ چھیڑ کر غم دنیا کی یاد فراموش
کر دیا کرتی تھی دل سے۔ لیکن جب سے مرزا صاحب پڑے ہیں اسے نہ شوخی یاد ہے نہ
بذلہ سنجی! نہ اقبال سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے نہ اسے ستاتی اور شرارت کرتی ہے جب

اس کے کانوں میں مرزا صاحب کی خبر مرگ پہنچے گی تب وہ کیا کرے گی، کیا حال ہوگا اس کا، اس کا غم کون بٹائے گا؟ اس کے گریۂ حسرت کو بھلا روک سکے گا کوئی!

یہی سوچتے سوچتے اسی خیال میں وہ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں پہنچ گیا! اور یہاں پہنچتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے پیدا ہونے لگے!

جنرل وارڈ کی طرف بڑھتے ہوئے قدم خود بخود جھجک محسوس کر رہے تھے!

نہ معلوم مرزا صاحب زندہ ہیں یا نہیں؟

(۹)

آخری حسرت!

ذہنی کرب و اذیت کے کئی دن اور اسی طرح گزر گئے!

مرزا صاحب باقاعدہ فالج میں مبتلا تھے۔ داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں جنبش سے معذور تھا، بات کرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی، لیکن کسی نہ کسی طرح مطلب ادا کر لیتے تھے۔ مگر اصل مرحلہ یہ تھا کہ بیہوشی کے طویل دورے بار بار پڑ رہے تھے۔

علاج اور تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

ایک روز اسلم حسبِ معمول مرزا صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور ان پر نیم بیہوشی اور نیم غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ دفعتہً مرزا صاحب نے آنکھیں کھولیں اور اسلم کی طرف دیکھنے لگے۔ ان آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بیقراری کے ساتھ اسلم اٹھ کر اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا:

کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟

مرزا صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا :

مجھے گھر لے چلو!

اسلم نے کہا : ابھی گھر کیسے جا سکتے ہیں آپ جب تک علاج مکمل نہ ہو جائے ہم دونوں یہیں رہیں گے!

مرزا صاحب نے انکار میں گردن ہلائی۔ اور بچّوں کی طرح رونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر اسلم گھبرا گیا۔ اس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا : آپ ہراساں نہ ہوں انشاء اللہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ بس چند روز میں!

مرزا صاحب نے پھر انکار میں گردن ہلائی اور اسی طرح روتے ہوئے پھر بڑی مشکل سے اپنے سیلِ گریہ پر قابو پاتے ہوئے بولے :

بیٹے! مجھے یہاں سے لے چلو، میں یہاں نہیں مرنا چاہتا!

آج کچھ عجیب طرح کی باتیں کر رہے تھے مرزا صاحب۔ اس نے کہا : آپ زندہ رہیں گے۔ دیکھئے آج آپ پہلے سے اچھی حالت میں ہیں!

مرزا صاحب خاموش ہو گئے لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے بدستور ٹپک رہے تھے۔

اتنے میں انچارج ڈاکٹر آیا، اس کے ساتھ ڈاکٹر ہمایوں بھی بطور اسسٹنٹ موجود تھے، اس نے حسب معمول چارٹ دیکھا۔ بلڈ پریشر لیا۔ نبض ٹٹولی، نرس سے کچھ باتیں دریافت کیں، پھر سینہ ٹھونک کر دیکھا، اس کے بعد کچھ سوچتا رہا اور راؤنڈ کرتا ہوا ہمایوں کے ساتھ چلا گیا۔ ذرا دیر کے بعد ڈاکٹر ہمایوں پھر واپس آئے،

انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسلم کو بُلایا، وہ فوراً اٹھ کر ان کے پاس پہنچا۔

ڈاکٹر صاحب نے افسوس اور ہمدردی کے لہجے میں کہا:

مرزا صاحب اب وہ اعلاج کی حد سے گزر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے یہ دو تین گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ بہتر ہو کہ انھیں گھر لے جائیے کہ وہاں یہ مدّت سکونِ قلب سے گزار لیں —— ممکن ہے کچھ وصیت بھی کریں ہسپتال میں مرنے سے گھر پر بیوی بچّوں کے سامنے مرنا بہتر ہے، ویسے اگر آپ نہ لے جانا چاہیں تو میں اصرار بھی نہیں کرتا!

اتنے میں کسی رفیق نے آواز دی: ہمایوں!

ڈاکٹر ہمایوں ادھر چلے گئے اور اسلم وہیں کھڑا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آخر مرزا صاحب نے اس دُنیا سے رخصت ہونے کی ٹھان ہی لی۔ گھر جانے کا تقاضا اُن کے اندر کی آواز کر رہی تھی۔ چھٹی حس نے انھیں بتا دیا ہے کہ اب وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور یہ چند ساعتیں جو انھیں میسّر ہیں اپنی بدقسمت لڑکی اور بدقسمت لڑکے کے پاس گزارنا چاہتے ہیں۔ میں نے کتنا ظلم کیا کہ انھیں یہاں رہنے پہ آمادہ کرتا رہا۔ آہ ان کے آنسو، ہائے ان کی مایوسی! — میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اب وہ چُپ ہیں، لیکن اس خاموشی میں کتنی حسرت ناک اور الم انگیز گویائیاں پنہاں ہیں! اب مجھے مزید ظلم نہیں کرنا چاہیئے!

یہ سوچ کر وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مرزا صاحب کے پاس پہنچا۔ بیساختہ جن آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے بدستور ٹپک رہے تھے وہ آنسو بھری آنکھیں اسلم کی طرف اٹھ گئیں۔ ان آنکھوں میں امید بھی تھی، حسرت بھی، التجا

بھی، اصرار بھی!

وہ آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: واقعی آپ گھر واپس چلنا چاہتے ہیں؟

ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے پیار بھری نظروں سے اسلم کی طرف دیکھا۔ اور پیار بھرے لہجے میں کہا: ہاں میرے بیٹے یہ میری آخری آرزو اور حسرت پوری کر دو، مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ تم سے بھی سلمیٰ سے بھی اور اقبال سے بھی اور پھر اس دُنیا سے گزر جانا ہے۔ رخصت ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے جلدی کرو!

اسلم خاموشی سے اٹھا اور نیچے چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک تانگے کا انتظام کیا۔ تانگے کا بیچ کا تکیہ ہٹا کر بستر سا کر دیا، پھر اسٹریچر پر اٹھا کر تانگے تک لایا۔ چند لوگوں کی مدد سے تانگے پر لٹایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

تانگہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، اسلم نے ایسی ہی تاکید کر رکھی تھی۔ کوئی بیس منٹ میں گھر آگیا، سلمیٰ بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اقبال اس کے گھٹنے سے لگا کچھ پرانی تصویریں ایک رسالہ کی دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں اسلم نے آواز دی، اقبال ہڑبڑا کر باہر پہنچا۔ اسلم نے کہا: مرزا صاحب کو ہسپتال سے لے آیا ہوں ان کا بستر ٹھیک کر و جلدی سے، میں انھیں لے کر آرہا ہوں۔ اقبال نے یہ خبر سلمیٰ کو پہنچائی۔ آن کی آن میں بستر تیار ہو گیا اتنے میں اسلم تانگے والے کی مدد لیے انھیں لے کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے تانگے والے کو پانچ روپے دیے، وہ خوش خوش دعائے ترقی و اقبال و درازیِ عمر دیتا چلا گیا۔ مرزا صاحب

کو بستر پر لٹا کر اسلم باہر کے حصے میں جہاں وہ رہتا تھا چلا آیا۔ ذرا دیر میں اقبال آیا۔ اس نے کہا: آباجی بلا رہے ہیں آپ کو!

وہ بہت تھک گیا تھا، بدن چور چور ہو رہا تھا۔ آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ آج کئی دن کے بعد بستر پر کمر ٹیکنے کا موقع ملا تھا، لیکن طلبی کا فرمان سنتے ہی جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کمرے میں پہنچا جہاں مرزا صاحب بستر مرگ پر دراز تھے۔ سلمیٰ زمین پر اُن کی پٹی سے لگی ہوئی بیٹھی تھی!

اسلم کو دیکھ کر مرزا صاحب نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا: آؤ بیٹا، بیٹھ جاؤ یہاں، میرے پاس!

وہ خاموشی سے آکر ان کی پائینتی بیٹھ گیا!

کمرے پر اس وقت ایک عجیب قسم کا مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مرزا صاحب سلمیٰ، اقبال، اسلم سب زندہ تھے، سب کا دماغ کام کر رہا تھا۔ لیکن ہوش اور شعور سے بہرہ ور ہونے کے باوجود سب پر ایک عجیب طرح کی مدہوشی طاری تھی۔ سب خاموش تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ سمندر میں جب طوفان آتا ہے تو اس سے کچھ دیر پہلے سناٹا چھا جاتا ہے۔

مرزا صاحب نے کہا: میں اب زندہ نہیں رہوں گا!

اسلم اس قول کی صداقت محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا: یوں نہ کہیے آج آپ پہلے سے اچھے ہیں!

مرزا صاحب نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر فرمایا: مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو بیٹے! موت میرے سامنے کھڑی ہے، جس طرح میں اس کمرے کی دیواروں کو دیکھ

رہا ہوں اسی طرح موت کو بھی دیکھ رہا ہوں لیکن میرے دل میں کوئی خوف نہیں ہے یہ جانتے ہوئے کہ مر رہا ہوں میرا دل امیدوں سے معمور ہے۔ میں چنگیز اور ہلاکو کے دربار میں نہیں جا رہا ہوں۔ رب العالمین اور ارحم الراحمین کے حضور میں جا رہا ہوں۔ پھر ڈروں کیوں؟

اسلم نے قطع کلام کرتے ہوئے سلمیٰ کی سسکیوں کے ہجوم میں کہا: ایک مومن کی یہی شان ہونی چاہیئے، آپ سے بڑھ کر کوئی مردِ مومن میری نظر سے نہیں گزرا، آپ نے کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ آپ نے اس بڑھاپے اور کمزوری کے عالم میں بھی حق حلال کی روٹی کھائی۔ آپ نے انسانوں کے حقوق ادا کئے، آپ نے خدا کا حق ادا کیا۔ آپ کی تہجد کبھی قضا نہیں ہوئی، آپ نے ایک ایک روزہ رکھا، آپ نے پابندی کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ نے حاجت مندوں اور پریشان حالوں کی جب کبھی آپ کی جیب نے یاری کی، دستگیری کی۔ آپ سے بڑھ کر رب العالمین اور ارحم الراحمین کے رحم اور ربوبیت سے فائدہ اٹھانے کا حق دار کون ہے؟ لیکن اس سے آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ کیا وہ آپ کو تندرست نہیں کر سکتا صحت نہیں دے سکتا؟

مرزا صاحب خاموشی سے اسلم کی باتیں سنتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنے اکھڑے ہوئے سانس اور مشکل سے مڑنے والی زبان پر قابو پاتے ہوئے کہا: خدا سے مایوس ہو کر آس کہاں مل سکتی ہے؟ لیکن بیٹے اس کے قانون اٹل ہیں۔ موت کا وقت جب آجاتا ہے ٹلتا نہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ وقت آ گیا ہے اور میں خوشی سے دعوتِ مرگ پر لبیک کہہ رہا ہوں لیکن بیٹے کیا مرنے والے کی آخری آرزو اور حسرت پوری کر دو گے!

اسلم سوالیہ نظروں سے مرزا صاحب کی طرف دیکھنے لگا، پھر اس نے کہا: آپ کی خوشی کے لئے آپ کو خوش دیکھنے کے لئے میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ جان تک دے سکتا ہوں بتائیے، فرمائیے! کیا چاہتے ہیں آپ؟ کیا خواہش ہے آپ کی؟

مرزا صاحب نے کہا: میرے بعد دنیا میں سلمیٰ کس کے سہارے زندہ رہے گی؟ مجھے اقبال کی فکر نہیں ہے، وہ لڑکا ہے، کہیں نوکری کر لے گا، مزدوری کرے گا بھیک مانگ لے گا، مرد سب کچھ کرسکتا ہے۔ لیکن سلمیٰ ـــ میری سلمیٰ کیا کرے گی؟ میں نے اسے پھول کی طرح پالا ہے۔ غربت، پریشانی، افلاس ہر دور میں اسے میں نے شہزادی بنا کر رکھا۔ اب وہ کیا کرے گی؟ کہاں اسے پناہ ملے گی؟

اسلم نے کہا: جب تک میں زندہ ہوں آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ اقبال میرا بھائی ہے۔ سلمیٰ میری بہن ہے، یہ دونوں کھالیں گے تب میرے منہ میں لقمہ پہنچے گا۔ میں مزدوری کروں گا، نوکری کروں گا، بھیک مانگوں گا مگر ان دونوں کو تکلیف نہیں ہونے دوں گا!

یہ کہتے کہتے اسلم کی آواز بھرا گئی۔ سلمیٰ کی سسکیوں کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اقبال کی آنکھوں میں آج آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے تیرنے لگے۔ مرزا صاحب کا سانس پھر تیز تیز چلنے لگا، انھوں نے کہا:

بیٹے! تم نے جو کچھ کہا سچ ہے۔ مجھے یقین ہے تم ایسا ہی کرو گے ـــ لیکن اس دنیا کا تجربہ مجھے ہے تم کو نہیں۔ تم سلمیٰ کو بہن بنا کر رکھو گے لیکن لوگ اس پر بھی انگلیاں اٹھائیں گے، تمھیں بھی بدنام کریں گے، تمھارے خلوص کا لوگ مذاق اڑائیں گے۔ تم محبت کرو گے وہ اسے ہوس کا ایک تماشا سمجھیں گے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم اس سے

شادی کرلو ۔۔۔؟

اسلم کے منہ سے بے ساختہ نکلا شادی ۔۔۔ !

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔ مرزا صاحب نے کہا : ہاں شادی ! اگر تمھاری شادی ہوچکی ہے تو سلمیٰ تمھاری بیوی کی چاکری کرے گی ۔ اگر کہیں تمھاری نسبت ہوچکی ہے تو اس جگہ شادی کرنے میں سلمیٰ ہرگز مزاحم نہیں ہوگی ۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دیتا جاؤں ، اسے تمھیں سونپ دوں ۔ اور اطمینان سے کہہ سکوں ۔۔۔ سپردم بتو مایۂ خویش را ۔۔۔ پھر میرا دل مطمئن ہوجائے گا ! پھر میں سکون سے مروں گا !

سلمیٰ کی سسکیوں میں اضافہ ہوگیا ۔ اس نے باپ کی پٹی پر سر دے مارا ، اور گلوگیر آواز میں " اباجی " کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ مرزا صاحب نے اس کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا : تیرے دکھ کو مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے ؟ تیرے سکھ کی مجھ سے زیادہ پروا کسے ہوسکتی ہے ۔ صرف اسلم کے منہ سے ہاں کا لفظ سننے کے لئے میرا دم اٹکا ہوا ہے ۔۔۔ اسلم ! میں تمھارا جواب سننا چاہتا ہوں ۔ یہ بھی حالات کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کے لئے خود خواستگاری کر رہا ہے ۔ ہمارے ہاں یہ بڑی غیرت کی بات ہے ۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا ، لیکن تمھاری محبت ، تمھاری چاہت ، تمھاری انسانیت اور شرافت نے مجھے بے غیرت بھی بنا دیا ہے ۔ تم سے بیٹی کو بھیک میں مانگتے ہوئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ۔۔۔ ذرا شرم نہیں آتی !

یہ الفاظ اٹک اٹک کر بڑی دیر میں اور بڑی مشکل سے مرزا صاحب ادا کر سکے ۔

اسلم نے کہا، اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کچھ عذر نہیں ہے۔

یہ سنتے ہی مرزا صاحب پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکے۔ اقبال نے گاؤ تکیہ لاکر رکھ دیا۔ اسلم نے انھیں سہارا دے کر اس سے ٹکا دیا۔ اس وقت مرزا صاحب کے چہرے پر عجیب طرح کی چمک موجود تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں پھر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہو گئی ہے۔

انھوں نے اسلم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، پھر سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور ان دونوں ہاتھوں کو ملا دیا، پھر اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انھوں نے کہا: اپنی سب سے قیمتی پونجی تمھیں سونپتا ہوں اس کا خیال رکھنا۔ اس کا دل ٹوٹا ہوا ہے، اس کی زندگی کا بڑا حصّہ دُکھ میں بسر ہوا ہے۔ یہ ایک نازک آبگینہ ہے، دیکھنا ٹوٹ نہ جائے!

اسلم نے سلمیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے لیتے کہا۔ یقین کیجیے میری زندگی کا مقصد آج سے صرف ایک ہی ہوگا۔ سلمیٰ کو اور اقبال کو سکھ پہنچانا!

مرزا صاحب مطمئن ہو گئے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے انھوں نے کہا: سلمیٰ کو میں نے تمھیں دے دیا وہ تمھاری ہو گئی۔ خدا کے ہاں یہ عہدنامہ درج رجسٹر ہو گیا۔ لیکن دنیا کی نظر میں؟ دنیا کی نظر میں تم اب تک غیر ہو۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے یہ پردہ بھی ہٹ جائے!

اسلم نے مرزا صاحب کا مدّعا سمجھ لیا۔ اس نے کہا: پاس کی مسجد میں جہاں آپ نماز پڑھا کرتے ہیں جاتا ہوں۔ وہاں کے مُلّا جی آپ کو جانتے اور پہچانتے ہیں انھیں لے آتا ہوں۔ آپ کے سامنے وہ ایجاب وقبول کرا دیں گے — کیا جاؤں؟

مرزا صاحب نے خوش ہو کر تائید میں گردن ہلا دی۔

اسلم چلا گیا!

لیکن اس کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔ اس کا عہد ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے شادی نہ کرنے کا عہد کیا تھا، اس کے سر پر ذمہ داریوں کا کوہ گراں رکھا جا رہا تھا، کیا اس بوجھ کو وہ اٹھا سکے گا؟ اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے نہ جانے کیسا؟— خوش گوار یا المناک! کیا اس نئے دور کا وہ اہل ثابت ہو سکے گا؟

اتنے میں اس کے پاؤں کو ٹھوکر لگی — یہ مسجد کی دہلیز تھی، ملا صاحب صحنِ مسجد میں تسبیح ہاتھ میں لئے ٹہل رہے تھے!

(۱۰)

ایک جھلک!

اسلم کو دولھا اور سلمیٰ کو دولہن بنے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مرزا صاحب اس جہانِ فانی سے چل بسے!

نہ منگنی نہ کورٹ شپ، نہ پیام سلام، نہ سعی و کوشش۔ باتوں باتوں میں فیصلہ ہوا اور زندگی کا سب سے بڑا انقلاب رونما ہو گیا!

صورت تو صورت اسلم اب تک کہ شادی کو دس بارہ دن گزر گئے تھے سلمیٰ کے لئے اجنبی ہی تھا۔ اس کی سلیقہ مندی اور فرض شناسی کا تو وہ تجربہ کر چکا تھا، لیکن سلیقہ مندی اور فرض شناسی کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جو شوہر بیوی میں چاہتا ہے۔ سیرت، کردار، اوضاع و اطوار، مزاج، فطرت، جبلت، تحمل، برداشت بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن کا انسان جویا ہوتا ہے!

اور ان سب چیزوں سے بھی بڑھ کر جو چیز درکار ہوتی ہے وہ ہے باہمی شناسائی

ربط و تعلق اور یہی چیز ناپید تھی، وہ سلمیٰ کے لئے بالکل اجنبی تھا اور سلمیٰ اس کے لئے، دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے ناواقف۔ دونوں اتنے عرصے سے ایک گھر میں رہ رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہمدردی بھی رکھتے تھے لیکن کسی کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ حالات و اتفاق دفعتہً انھیں ایک دوسرے کا رفیق زندگی بنا دیں گے۔ یہ انسانی ہمدردی دونوں کو ایسے رشتے میں منسلک کر دے گی جو زندگی بھر کا عہد وفا بن جائے گا!

مرزا صاحب کے انتقال پر کہرام مچ گیا۔ سلمیٰ روتے روتے کئی مرتبہ بے ہوش ہوئی۔ اس کے دانت بیٹھ بیٹھ گئے۔ اقبال بھی دھاڑیں مار کر رو یا اور روتا رہا۔ خود اسلم کا یہ حال تھا کہ آنسو کسی طرح رکنے میں نہیں آتے تھے لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے طوفانِ اشک و آہ کے ہجوم میں مرزا صاحب اپنی آخری منزل تک پہنچا دیے گئے۔ اور اس تکلیف دہ فرض سے سبک دوش ہونے کے بعد اسلم جب قیام گاہ پر واپس آیا تو رہ رہ کر دل میں یہی سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا!؟

اسے سسرت سے محبت تھی۔ بے وفائی اور کج ادائی کے باوجود اب تک اپنے دل سے اس کی محبت کھرچ نہیں سکا تھا۔ وہ اب بھی اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی تصور کی نگاہیں اب بھی ہمہ وقت اس کا جلوہ دیکھا کرتی تھیں وہ شب و روز اب یاد آتے تھے جو کبھی اس کے ساتھ گزرے تھے۔ وہ ساعتیں اب بھی ناقابلِ فراموش تھیں، جو اس کی معیت میں بسر ہوئی تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سسرت کی بے وفائی اور کج ادائی کی سزا اسے نہیں اپنے آپ کو

دے گا یعنی اب زندگی بھر شادی نہیں کرے گا ہمیشہ مجرد رہے گا!

لیکن کیا وہ اس سزا کو عمل میں لا سکا!

اُسے شادی کرلینا پڑی۔ قدرت نے ایک رفیقۂ حیات اس کے سر منڈھ دی تھی!

اب سوال یہ تھا کہ جوش میں آکر، جذبات سے متاثر ہو کر، ہمدردی کے جذبے سے بے قابو ہو کر جو غلطی وہ کر بیٹھا ہے کیا اُسے نباہ سکے گا؟ کیا وہ سلمیٰ کو خوش رکھ سکے گا؟ کیا اس کے حقوق ادا کر سکے گا؟

یہ بڑا اہم سوال تھا۔ اور اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

پھر ایک اور مشکل بھی راستہ روکے کھڑی تھی۔

اب تک وہ تنہا تھا، جس طرح بھی بنتا زندگی گزارے جا سکتا تھا لیکن اب وہ تنہا نہیں تھا۔ اب اس پر ایک بیوی کا اور اس کے خورد سال بھائی کا بوجھ تھا اور یہ بوجھ اسے بہر حال اٹھانا تھا۔ انجمن کی فکر ضرور تھی لیکن کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اس کی شادی ہو چکی تھی وہ اپنی سسرال میں تھی۔ شوہر اس کا کفیل تھا۔ اگر وہ اسے کچھ بھیج سکتا، اسے کچھ دے سکتا تو یہ اچھی بات تھی لیکن اگر ایسا نہ کر سکتا تو کوئی خاص پریشانی کی بات بھی نہ تھی۔ روٹی کپڑا تو اسے بہر حال مل ہی رہا تھا۔ لیکن سلمیٰ کے مصارف تمام و کمال اسے برداشت کرنا تھے۔ یہ بوجھ کسی اور پر نہیں لادا جا سکتا۔ اور حالت یہ تھی کہ جیب خالی، روزگار ناپید، دُور دُور نزدیک کہیں سے کسی آمدنی کی توقع نہیں۔ پھر؟

اور سوال صرف یہی نہیں تھا کہ آئندہ زندگی کسی طرح بسر کر سکے، سوال یہ بھی

تھا کہ جو زندگی بسر کی جا چکی ہے اس کی قیمت کس طرح ادا کی جائے؟ اس عرصے میں ارجمند خاں کی کافی رقم چڑھ چکی تھی۔ بازار میں بھی کئی لوگوں سے جنس کی صورت میں قرض لیا جا چکا تھا۔ دودھ والے کے بائیس روپے باقی تھے۔ گھی بھی ادھار آیا تھا۔ تیس روپے اس کے چڑھ چکے تھے۔ راشن والے نے اپنے اصول کے خلاف کئی مرتبہ رقم لئے بغیر سامان دے دیا۔ اسے چالیس روپے دینا تھے، سلمیٰ نے جو سونے کا کنگن دیا تھا وہ دوسو میں رہن کر دیا تھا۔ لیکن یہ رقم دو ہی دن میں چٹ پٹ ہو گئی مرزا صاحب کے انتقالِ پُرملال نے مصارف کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ یہ انتقال اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وقت کے وقت قرض کا بندوبست کسی طرح بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مجبوراً وہ کنگن فروخت کر دیا گیا اس طرح دوسو روپے اور مل گئے لیکن ان دوسو نے ختم ہونے میں دو دن کی مدت بھی نہ لی تجہیز تکفین اور دوسرے مصارف میں ڈیڑھ سو تو فوراً ہی ختم ہو گئے۔ اس کے بعد معلوم ہوا گھر میں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ اور اب کوئی ادھار دینے کو بھی تیار نہیں ہے باقی پچاس روپے میں بے حد ضروری چیزیں نقد خرید لی گئیں لیکن اس طرح کتنے دن کام چل سکتا تھا!؟

گو اسلم اور سلمیٰ ایک دوسرے کے رفیقِ زندگی بن چکے تھے لیکن اب تک دونوں میں اجنبیت کی دیوار حائل تھی۔ باپ کے غم نے سلمیٰ کو اتنا افسردہ خاطر اور دل گرفتہ کر دیا تھا کہ نہ کسی طرح آنسو تھمتے میں آتے تھے نہ آہ و فغاں کا سلسلہ رکتا تھا اقبال تو غیر جانب دار ہو کر اس کی یہ کیفیت الگ بیٹھا چپ چاپ دیکھا کرتا۔ اسلم زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزا الفاظ میں تلقینِ صبر کرتا۔ مگر:

کھتے کھتے کھتیں گے آنسو

رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے!

آنسوؤں کے خشک ہونے اور رکنے میں بہرحال دیر لگتی ہے۔ دل کا زخم الفاظ کے مرہم سے مندمل نہیں ہوتا۔ اسے وقت اور زمانے کا مرہم مندمل کرتا ہے!

انہی پریشانیوں میں رات کو وہ دیر سے سویا۔ بیچ بیچ میں بھی کئی مرتبہ آنکھ کھل کھل گئی۔ اور صبح بھی جلد ہی اٹھ بیٹھا۔ روز کا معمول تھا۔ اور اس معمول کو ہجومِ غم و الم میں بھی پوری پابندی سے سلمیٰ نے قائم رکھا تھا کہ جیسے ہی وہ بیدار ہوتا ایک پیالی چائے کی آجاتی۔ اور جب نہا دھو کر فارغ ہو جاتا تو ناشتہ میز پہ موجود ہوتا۔ شادی کے بعد سے زبردستی ناشتے اور کھانے میں اپنے ساتھ وہ اقبال اور سلمیٰ کو بھی شریک کرنے لگا تھا۔ اس طرح دو چار لقمے اس کے منہ میں پہنچ جاتے، ورنہ اگر اس کے حال پر اُسے چھوڑ دیا تو شاید فاقے کرتے کرتے ہی وہ ہلاک ہو گئی ہوتی!

لیکن آج اس معمول میں فرق آگیا تھا!

وہ بیدار ہوا لیکن آج چائے نہیں آئی، نہا دھو کر ناشتے کی میز پر آبیٹھا لیکن ناشتے کا بھی پتا نہیں تھا!

کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا لیکن جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو وہ باہر نکلا کہ دیکھے بات کیا ہے؟ باورچی خانہ کے قریب پہنچا تو کانوں میں اقبال کی آواز گونجی۔

جب اتنا تیز بخار ہے تو کیوں پکار رہی ہو۔ تم لیٹو۔ میں ہوٹل سے جا کر چائے

لے آتا ہوں!

یہ سن کر اسلم وہیں ٹھٹک گیا۔ سلمیٰ نے اقبال کو جواب دیا۔ اچھا چائے لے آؤ گے مگر کھانے کا کیا ہو گا؟

اس نے کہا: کھانا بھی ہوٹل سے لے آؤں گا!

سلمیٰ نے پوچھا: اور اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟

اقبال نے فوراً جواب دیا: بھائی جان سے لے لوں گا!

وہ جل کر بولی: ایک ہی دن بھائی جان کو مار نہ ڈالو۔ یوں سسکا سسکا کر بیچارے کی جان لینے سے کیا حاصل؟

وہ بھی بگڑ گیا۔ اس نے برہم لہجے میں کہا: بھائی جان کو مار ڈالوں ـــــ اتنی تو محبت کرتے ہیں ہم لوگوں سے!

وہ طنز بھرے انداز میں بولی: اتنی تو محبت کرتے ہیں اسی لئے تو ان کی جان کے لاگو ہو گئے ہو!

وہ پھر بگڑ گیا: کیوں بار بار یہی بات کہے جا رہی ہو؟ ـــــ اتنا تو میں اُن کو چاہتا ہوں، میں کس طرح ان کی جان کا لاگو ہو سکتا ہوں!

وہ گویا ہوئی: پھر آنکھیں کیوں بند کر لی ہیں؟ پھوٹی آنکھوں سے دیکھ نہیں رہے ہو کہ خود ان پر کیا بیت رہی ہے! نہ کوئی روزگار ہے نہ آمدنی، محنت کرتے ہیں اس کا پھل بھی نہیں ملتا۔ کام کرتے ہیں اسے بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ بال بال قرض میں بندھا ہوا ہے۔ دودھ والا تقاضا کر رہا ہے، گھی والا ابھی رات ہی تو آیا تھا، اور بھی نہ جانے کس کس کا دینا آتا ہے۔ صورت نہیں دیکھتے کتنی اتر گئی ہے

معلوم ہوتا ہے کئی دن کے بیمار ہیں، مجھے تو دیکھ دیکھ کر ہول ہوتا ہے لیکن خدانخواستہ دشمنوں کے کان بہرے، اگر بیمار پڑ گئے تو کیا ہوگا؟ دیکھ لینا اسی دن زہر کھا لوں گی، اب صدمے جھیلنے اور غم اٹھانے کی مجھ میں ذرا بھی سکت نہیں رہ گئی ہے!

اقبال نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا: لو، پھر رونے لگیں ـــ میں نے تو اس لئے کہا تھا، کہیں بخار بڑھ نہ جائے کام کرنے سے۔ تم اگر بیمار پڑ گئیں تو کیا ہوگا؟

ہوتا کیا؟ ہر روز نہ جانے کتنے کیڑے مکوڑے بیمار پڑتے اور مرتے رہتے ہیں ان کے بیمار پڑنے یا مر جانے سے کچھ اثر ہوتا ہے یا کچھ بگڑ جاتا ہے دنیا کا!

اونہہ! ـــ پھر میں کہتا ہوں بھائی جان کے لئے کھانا کون بنائے گا؟ بستر کون ٹھیک کرے گا؟ اُن کے آرام کا بندوبست کون کرے گا؟

جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں میں کروں گی ـــ اور اس کے بعد اللہ مالک ہے پھر شوق سے ہوٹل بازی کیا کرنا!

تم تو ہر وقت مجھی کو جلی کٹی سنایا کرتی ہو، نہ جانے میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، کوئی بات محبت میں کہوں وہ بھی بُری لگتی ہے ـــ اب میں تم سے بات نہیں کیا کروں گا!

(پیار بھرے انداز میں) خفا ہو گیا بھیّا!

ہاں خفا ہو گیا۔

اقبال! تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں، مجھ سے کبھی خفا نہ ہونا ورنہ میرے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ اور یاد رکھو مجھ جیسی بہن کہیں نہیں ملے گی۔ زندگی بھر روؤ گے مجھے یاد کر کر کے!

یہ تو میں بھی جانتا ہوں، اسی لئے تو اتنا خیال کرتا ہوں تمھارا! لیکن تمھیں تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ بس اسی طرح کی باتیں کرتی رہتی ہو؟

اچھا اب نہیں کروں گی ـــ لیکن ذرا یہ پھنکنی لو، آگ جلادو اچھی طرح، سر پھٹا جارہا ہے درد سے!

اسلم کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا، پھر دفعتہً اندر داخل ہو گیا، اقبال پھنکنی کی مدد سے پورا زور لگا کر، گال پھلا پھلا کر، کجلائے ہوئے کوئلوں کو پھر سے جلانے کی لگاتار کوشش کر رہا تھا۔ سلمیٰ دیوار سے ٹیک لگائے پیڑھی پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔

اسلم کو دیکھ کر دونوں حیرت زدہ ہو گئے۔ اقبال پھنکنی ہاتھ میں لئے لئے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا: ضبط نہ ہو سکا بھائی جان سے آگئے یہاں! ـــ چلئے، ابھی ذرا دیر میں ناشتہ لے کر وہیں آتا ہوں!

سلمیٰ نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا: آپ کیوں آگئے؟

اسلم نے جواب دیا: کتنی دیر سے پکار رہا ہوں تمھیں!

وہ بولی: مجھے پکار رہے تھے؟ میں نے تو آپ کی آواز نہیں سنی!

پھر سلمیٰ نے پوچھا: کیا کوئی کام تھا؟

وہ بولا: کام نہ ہوتا تو اتنا حلق پھاڑ پھاڑ کر کیوں چیختا! مگر یہاں تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی! ـــ بہر حال آؤ، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

وہ ذرا کسمسائی بولی: ابھی آتی ہوں، چند منٹ میں آپ چلئے!

اسلم نے سنجیدگی کے ساتھ کہا: لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا۔ ناشتہ دس بیس منٹ کے بعد بھی ہو سکتا ہے! نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں، لیکن وہ بات نہیں ٹل سکتی

ابھی اور اسی وقت کہنی ہے۔

اقبال نے کوئلوں پر مشق تنفس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بہن کو مشورہ دیا:

جاؤ سُن آؤ، جب تک میں آگ جلاتا ہوں!

کوئی چارہ نہ دیکھ کر سلمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی، تو چلئے پھر!

اسلم سلمیٰ کو اپنے کمرے میں لے کر آیا۔ اس نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: بیٹھ جاؤ!

وہ بیٹھ گئی اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، وہ گویا ہوا:

لیٹ جاؤ!

اس لب و لہجے میں چاؤ نہیں تھا، پیار نہیں تھا۔ بے تکلفی نہیں تھی، اپنایت نہیں تھی۔ اور ان چیزوں سے اب تک وہ آشنا بھی نہیں ہو سکی تھی۔ ان الفاظ میں تحکّم تھا، سنجیدگی تھی اور یہ چیزیں بھی اس کے لئے بالکل نئی تھیں، کچھ حیرت، کچھ تعجب کے ساتھ وہ اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔ لیکن اس کے رویّے اور طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے اور زیادہ زور دے کر کہا: میں کہتا ہوں لیٹ جاؤ ـــ کیا میرے الفاظ تم نے نہیں سُنے؟

وہ بولی: سُن تو لئے ـــ لیکن کیوں لیٹ جاؤں؟

وہ کہنے لگا: اس لئے کہ میں کہہ رہا ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟

وہ تکیے پر سر رکھ کر سہمی سہمی سی لیٹ گئی اور بولی: لیجئے آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی!

اسلم نے اسی سنجیدگی کے عالم میں کہا: میں ابھی آتا ہوں اور جب تک آ نہ جاؤں

اسی طرح لیٹی رہو ۔۔ خبردار جنبش بھی نہ کرنا ۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا ۔ چادر بھی اوڑھ لو!

اس نے چادر بھی اوڑھ لی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی ۔ اسلم آہستہ قدموں سے باہر نکلا ۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر لیا ۔ سلمیٰ کے کان میں کنڈی بند کرنے کی آواز آئی ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کنڈی لگا گیا ہے ۔ اب اگر وہ کوشش کرے تب بھی باہر نہیں نکل سکتی ۔ اور سوچنے لگی : قید مجھے کس جرم میں کیا گیا ہے ؟

لیکن اس سوال کا جواب کون دیتا !

اسلم کنڈی لگا کر سیدھا باورچی خانہ میں پہنچا ۔ اقبال کی لگاتار محنت رنگ لا چکی تھی ، یعنی آگ سلگ چکی تھی ۔ اسلم نے جلدی سے کیتلی میں پانی بھرا ۔ اور چولھے پر رکھ دیا ۔ پھر سلائس سینکنا شروع کر دیے ، اس کام سے فارغ ہوا تو پانی کھولنے لگا اس میں چائے ڈال کر دم پر رکھ دی ۔ اور سینکے ہوئے سلائس میں مکھن لگانے لگا ۔ اتنے میں چائے دم ہو گئی !

اقبال دم بخود یہ منظر دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا ۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا کہو دوست کام بن گیا ؟

وہ ہنستا ہوا بولا : لیکن آپ کو یہ کیا سوجھی !

اسلم نے سوال کیا : تمھاری آپا کو بخار جو ہے ۔ کیا اس حالت میں بھی انھیں چولھے کے پاس بیٹھنے دیتا ؟ ۔۔۔ انڈے کہاں ہیں ؟

اقبال نے دو انڈے لا کر سامنے رکھ دیے ۔ اسلم نے اسے پیسے دیتے ہوئے کہا : دو اور لے آؤ دوڑ کر ۔

وہ دوڑ کر دو اور انڈے پلک جھپکتے میں لے آیا۔ ان چار انڈوں کا اسلم نے بڑی پھرتی سے آملیٹ تیار کیا۔ پودینہ، نمک، مرچ، تمام ضروری چیزیں اس کے آنے سے پہلے تیار کر لی تھیں۔ اقبال نے کہا: آپ تو جانتے ہیں!"

وہ مسکراتا ہوا بولا: ہمیں کیا نہیں آتا استاد!"

اقبال نے سوال کیا: آپ نے تو پوری روٹی کے سلائس بنا ڈالے، آپا تو اسے دو دن چلاتی ہیں!

وہ گویا ہوا: آج دوپہر کا کھانا غائب، چار انڈوں کا یہ بہت سارا آملیٹ، اور اتنے بہت سے سلائس، پھر دو دو پیالیاں چائے کی، اس کے بعد دوپہر کو بھوک لگ ہی نہیں سکتی۔ اس طرح تمھاری آپا کو ستانے اور آرام کرنے کا اور موقع مل جائے گا۔ شام کو اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو خیر، ورنہ میں آٹا گوندھ دوں گا۔ تم روٹی لگوا لانا تندور سے۔ دال پکانا بھی مجھے آتا ہے۔ اتنے مزے کی پکاؤں گا کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے!

ان ساری تجویزوں سے اقبال کو اتفاق تھا۔ اس لئے مسکراتے ہوئے کہا: لیکن آپا کو کہاں چھوڑ آئے آپ؟

وہ مسکراتا ہوا بولا: وہیں چلتے ہیں آؤ!

ایک ٹرے میں دودھ، چائے، آملیٹ، سلائس وغیرہ یہ سب چیزیں رکھ دی گئیں۔ اقبال ٹرے اٹھانے کے لئے بڑھا، اسلم نے روک دیا: اتنا بوجھ تم سے نہیں اٹھ سکے گا، گرا دو گے، میں لے چلتا ہوں!

دونوں ہاتھوں سے اسلم نے ٹرے سنبھال لی، اقبال ساتھ ساتھ دروازے کے

پاس پہنچ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا: آپا تو یہاں بھی نہیں ہیں دیکھئے! باہر سے کنڈی لگی ہے۔

اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا: کھولو تو سہی، ممکن ہے اندر لیٹی ہوں!

اقبال نے بے یقینی کے ساتھ کنڈی کھولی، سلمیٰ چادر اوڑھے بستر پر افسردہ اور مضمحل لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی اسلم کے اس نئے اور حد درجہ حیرت انگیز طرز عمل کا راز کیا ہے؟ وہ مجھے اندر سے بند کر کے کیوں چلا گیا؟

لیکن اسلم کو ٹرے ہاتھ میں آتا لئے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ـــ ارے!

اقبال چلّایا: آپا یہ دیکھو بھائی جان نے چائے بنالی اور آملیٹ تو ایسے مزے کا بنایا ہے کہ واہ!

اسلم نے ٹوکا: بغیر چکھے ہوئے تعریف شروع کر دی!

وہ جھینپ کر خاموش ہوگیا!

(۱۱)

رازونیاز!

ساری صورتِ احوال سلمیٰ کی سمجھ میں آگئی، وہ تیوری چڑھا کر بولی: یہ کیا کیا آپ نے؟

اسلم نے اطمینان سے میز پر ساری چیزیں سجاتے ہوئے جواب دیا: ناشتہ لایا ہوں تمھارے لئے تیار کر کے!

وہ بولی: یہ تو میرا کام تھا آپ نے کیوں کیا؟

اس نے جواب دیا: اس سے کیا ہوتا ہے؟ کبھی ضرورت پڑے تو میرا کام تم کر لینا۔

وہ کہنے لگی: لیکن آخر اس تکلف اور تکلیف کی کیا ضرورت تھی آپ کو؟

وہ بولا: اس لئے کہ تمھیں بخار تھا — اور بخار میں ایسے کام نہیں کرنا چاہئیں تھیں، پھر تم پڑ جاتیں اور یہ شاک میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا،

میں نے بھی بہت غم سہے ہیں اور غم سہنے سہتے تھک گیا ہوں! تم بیوی ہی کی حیثیت سے نہیں ایک انسان کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہو اور بہت زیادہ قابل قدر ہو۔ تم پر یہ ظلم میں نہیں گوارا کر سکتا۔ بخار میں تو اور چولھے کے سامنے بیٹھ کر جلو۔ تمھیں آرام کرنا چاہیے تھا۔ ایک دن ناشتہ نہ کر کے یا فاقہ کر کے نہ میں مر جاتا نہ بیمار پڑ جاتا لیکن بخار کی تکلیف میں کام کر کے ایک دن کے لئے نہیں بہت دنوں کے لئے تم بیمار پڑ جاتیں

آج پہلی مرتبہ سلمیٰ کو احساس ہوا کہ اسلم کے تاثرات اس کے بارے میں کیا ہیں؟

ان الفاظ میں کتنی چاہت تھی، کتنا پیار تھا، کتنی اپنایت تھی!

وہ اپنے باپ کی فرمائش میں اس کی بیوی بن گئی تھی اور جہاں تک خود اس کی ذات کا تعلق تھا، یہ فرمائش اس کے دل کی آرزو تھی حسرت تھی!

یہ پیکر جو اسلم کی صورت میں پہلے پہل اس کے سامنے آیا تھا پہلے ہی دن سے کتنا دلآویز، کتنا دل کش، کتنا سحر طراز تھا!

اور پھر یہ انسان بھی کتنا اچھا تھا!

کیا یہی نہ تھا جس نے بغیر کسی سابقہ شناسائی کے، بغیر کسی ربط و تعلق کے، بغیر دوستی اور رشتہ داری کے محض جذبۂ انسانیت سے سرشار ہو کر کیا نہیں کیا اس کے بوڑھے باپ کے لئے، اس کے خورد سال بھائی کے لئے اور خود اس کے لئے۔

اگر محبت واقعی کوئی چیز ہے تو کیا ایسے آدمی کے علاوہ کسی اور سے بھی کی جا سکتی ہے؟

اور پھر اس نے اپنے سینے میں ایک عجیب طرح کی لہریں اٹھتی محسوس کیں۔ اپنے دل میں ایک عجیب طرح کا طوفان برپا دیکھا، اپنے اندر کی دنیا میں ایک عجیب

طرح کا تہلکہ سا نظر آیا اسے ۔۔ کیا یہی محبت تھی ؟ ۔۔ کیا یہ محبت نہ تھی ؟

وہ اس بُت کو پوجنے لگی ۔ دل کے صنم خانے میں یہ مورت نہ جانے کیسے خود بخود دبے پاؤں کہاں سے آ گئی تھی ! وہ پھر سر جھکانے کے سوا کچھ نہ کر سکی !

ساری دُنیا سے چھپ کر وہ اس کی پوجا کرتی رہی ، آنکھوں میں اسی کا جلوہ سمایا ہوا تھا ، دل میں یہی صورت بسی ہوئی تھی !

اور آخر ایک دن ایسا آ گیا کہ دل جسے چاہتا تھا اسے پالینے میں کامیاب ہو گیا

دل اسے پالینے میں کامیاب ہو گیا ، لیکن سوال یہ تھا کہ جسے پایا ہے خود اس نے بھی کچھ پایا یا نہیں ! جسے چاہا ہے خود وہ بھی چاہتا ہے کہ نہیں ؟ جسے پوجا ہے خود وہ بھی کچھ خیالِ خاطرِ ناشاد رکھتا ہے ؟

اس سوال کا جواب کبھی نہ ملا ۔۔ شادی کے بعد بھی نہیں ، لیکن آج مل گیا ۔۔ جس طرح پہلی نعمت بے سان گمان مل گئی تھی ، اسی طرح قدرت کا یہ دوسرا عطیہ بھی یک بیک مل گیا ۔

دل میں خوشی کا طوفان اٹھنے لگا ، سر کا درد کافور ہو گیا ۔ بخار کی شدت خود بخود کم ہوتی محسوس ہونے لگی ۔ اس نے ایک انداز خاص سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا : اسی لئے آپ مجھے قید کر گئے تھے یہاں ؟

اقبال نے مکھن لگا سلائس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا : ہاں اور کس لئے ! تم کیا سمجھی تھیں ؟

وہ بولی : کچھ سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا ۔ آپ تو اتنے سنجیدہ نظر آرہے تھے کہ میں سمجھی خفا ہیں !

اس نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اتارا، اور بولا: تم سے کون خفا ہو سکتا ہے بھلا! جس شخص کے ہوش و حواس سالم ہیں وہ تو خفا نہیں ہو سکتا!

آپ ہی ہو گئے تھے اس وقت!

جھوٹ موٹ — ورنہ تم قابو میں نہ آتیں۔ اور کام کر کے رہتیں!

آپ نہیں جانتے — شاید جان بھی نہیں سکتے۔

کیا نہیں جان سکتا!؟

آپ کا کام کر کے مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے، کتنی راحت ہوتی ہے

جانتا ہوں — دل کی تار برقی زبان کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کا پیام خود بخود پہنچتا رہتا ہے لیکن سلمیٰ میرا کام کرنے سے جو خوشی اور راحت تمہیں حاصل ہوتی ہے اس کا یہ تقاضا تو نہیں کہ خودکشی پر تیار ہو جاؤ۔

(مسکراتے ہوئے) اچھا یہ بتائیے آپ کو کیسے پتا چلا مجھے بخار کی شکایت ہے؟

پہلے یہ بتاؤ آملیٹ کیسا ہے — مروّت نہیں؟

سچ — بڑا اچھا ہے!

سلائس کیسے سنکے ہیں؟

وہ بہت اچھے ہیں۔

چائے کیسی ہے؟

اقبال بیچ میں بول پڑا! اتنی اچھی چائے تو آپا بھی نہیں بنا سکتیں۔ بھائی جان روز بنایا کیجئے!

اسلم ہنسنے لگا: سلمیٰ نے اسے ایک دھول لگاتے ہوئے کہا: واہ رے لڑکے!

ان کے لئے بھائی جان روز چائے بنایا کریں گے! بڑے کہیں کے آئے طرم باز بن کر!

_ لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا!

یہی کہ مجھے تمھارے بخار کا علم کس طرح ہوا؟

جی ۔ بتائیے تو سہی!

صبح بیڈ ٹی نہیں ملی، یہ خلاف معمول بات تھی، پھر ناشتے میں دیر ہوئی ۔ یہ دوسری خلاف معمول بات تھی ۔ دل میں خیال ہوا ضرور کچھ دال میں کالا ہے ۔ چنانچہ باہر نکلا واقعہ معلوم کروں، باورچی خانہ کے دروازے پر پہنچا تو تم میں اور اقبال میں لڑائی ہو رہی تھی ۔ میں نے ایک ایک لفظ سن لیا کھڑے ہو کر!

کسی کی پرائیویٹ باتیں سننا کس قاعدہ سے جائز ہے؟

لیکن اگر پرائیویٹ باتیں لڑ لڑ کر کی جائیں تو جو چاہے سن سکتا ہے ۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے!

اقبال نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: آپا مجھ سے ہر وقت لڑا کرتی ہیں!

وہ بولی: تو کون سا کم لڑاکا ہے!

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا: مسافر خانے کے کمرے میں اور یہاں اس نئے گھر میں تم دونوں کی نوک جھونک، طنز تعریض، لڑائی جھگڑا، دنگا فساد، خوشامد، یہ ساری باتیں برابر میں سنا کرتا تھا!

ہائے اللہ ـــ آپ سن لیتے تھے، کیا دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر؟

نہیں ـــ اس وقت تک تم پر میرا کوئی حق نہ تھا، دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہونا جرم تھا ۔ لیکن پہلے تو تم دونوں میں آہستہ آہستہ چلتی تھی ۔ پھر اقبال کی سرکشی

ترکی بہ ترکی جواب سے برانگیختہ ہو کر بھاری سرگوشی بھی بلند لہجہ اختیار کر لیتی تھی اور بستر پر لیٹے لیٹے آرام سے سب کچھ سنتا رہتا تھا!

بڑے وہ ہیں آپ — کیوں سنتے تھے ہماری باتیں؟ دوسروں کی باتیں سُننا گناہ ہوتا ہے!

بالکل گناہ نہیں ہوتا!

ہوتا ہے — میں نے خود کتابوں میں پڑھا ہے!

کتابوں میں تو نہ جانے کیا کیا لکھ دیتے ہیں لوگ؟

اقبال نے بہن کی پشت پناہی کرتے ہوئے کہا: میں نے بھی پڑھا ہے بھائی جان!

اسلم نے بے پروائی سے کہا: تم نے بھی کتاب ہی میں پڑھا ہوگا!

سلمیٰ ہنسنے لگی: کتاب میں نہ پڑھتا تو کہاں پڑھتا؟

بتاؤ اب سر کا درد کیسا ہے؟

اب تو نہیں ہے — سچ بالکل نہیں ہے!

اور بخار؟

(ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) دیکھ لیجئے میرے خیال میں تو اب صرف حرارت رہ گئی ہے۔ شام تک خدا نے چاہا تو وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی!

(نبض ٹٹولتے ہوئے) نہیں بھئی ابھی ہے، بالکل آرام کرو۔

(ہاتھ چھڑاتے ہوئے) آپ حکیم کب سے ہو گئے؟

اقبال نے کہا: تھرمامیٹر لاؤں — رکھا ہے!

سلمیٰ نے ڈانٹا: خبردار — کوئی ضرورت نہیں؟ کے مرتبہ تم سے کہا ہے

ہر معاملے میں ٹانگ نہ اڑایا کرو!

وہ برہمی کے ساتھ بولا: بخار اترا نہیں اور پھر لڑنے لگیں تم!

سلمیٰ مسکرانے لگی۔ اسلم ہنس پڑا۔

اقبال نے جل کر کہا: آپ لوگ تو ہر وقت میرا مذاق اڑایا کرتے ہیں۔

سلمیٰ اسے بناتی ہوئی بولی: اے حضور نواب صاحب کا مذاق اڑایا جاتا ہے کیا کہنا ہے بڑے آدمی جو ٹھیرے، توہین سے برہم ہو جاتے ہیں!

وہ بولا: اور نہیں تو کیا!

اسلم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: ہمارا اقبال ایک دن ضرور بڑا آدمی بنے گا۔ اچھا میاں اقبال یہ تو بتاؤ تم کیا بننا چاہتے ہو؟

وہ بولا: ڈاکٹر ہوں گا میں تو!

سلمیٰ ہنسنے لگی۔ اقبال نے جھلا کر کہا: ہنس کیوں رہی ہو؟

وہ بولی: ان بیوقوں پر جو علاج کرانے تمھارے پاس آیا کریں گے۔ ان خوش قسمت گورکنوں پر جن کی روزی تمھارے دم سے بڑھ جائے گی اور قبرستان میں وہ چہل پہل رہے گی کہ واہ — تو ڈاکٹر بنے گا تو؟ ذرا آئینے میں اپنی صورت تو دیکھ، ایسے ہی ہوتے ہیں ڈاکٹر؟!

اقبال نے لاجواب ہوتے ہوئے پوچھا: اور کیسے ہوتے ہیں۔ کیا تمھاری طرح؟

وہ بولی نہ میری طرح نہ تمھاری طرح، ڈاکٹروں کی طرح!

اسلم ہنسنے لگا: واہ بھئی کیا بات کہی ہے — اقبال میاں تم ڈاکٹر بنو گے اور دُور دُور سے لوگ تمھارے پاس آیا کریں گے۔

سلمیٰ بولی: موت گھسیٹ کر لایا کرے گی انھیں!

اقبال نے کہا: اچھا تم علاج نہ کرنا ہمارا کبھی، — کبھی بیمار پڑیں تو ہرگز علاج نہیں کرنے کا۔ خوشامد کرو گی جب بھی نہیں!

سلمیٰ بیٹھے بیٹھے لیٹ گئی۔ تو یہ بے پھر درد ہونے لگا سر میں اس لڑکے کی بکواس سے!

(۱۲)

نئی الجھنیں

مرزا صاحب کے انتقال کے بعد سے آج پہلی مرتبہ یہ دن بہت اچھا گزرا۔ سلمیٰ کے لئے بھی، اقبال کے لئے بھی اور اسلم کیلئے بھی سلمیٰ کیلئے بھی یوں کہ اُسے محبت مل گئی۔ اقبال کے لئے ایسے کہ گھر کی گھٹی گھٹی فضاؤں میں رونق آگئی۔ اور اسلم کے لئے اس طرح کہ اس نے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ دیا!

سارا دن اسلم باہر نہیں گیا، گھر ہی میں رہا۔ اور مزے مزے کی باتیں کر کے اُن غمزدہ بھائی بہن کا جی بہلاتا رہا۔ صبح ناشتہ اتنا کر لیا تھا کہ دوپہر کو واقعی کھانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اقبال ذرا کلبلائے، انھیں گھی شکر کے ساتھ دو بچے ہوئے سلائس دے کر ٹال دیا گیا۔ شام تک سلمیٰ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اسلم نے تجویز پیش کی کہ اس وقت کھچڑی پکنی چاہیئے۔ اس تجویز پر اقبال نے بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ صاد کیا۔ مونگ کی پھریری کھچڑی پک کر تیار ہو گئی۔ چٹنی کے ساتھ مزا دے گئی۔ روز کے

مقابلے میں سب ہی زیادہ کھا گئے۔

کھانے کے بعد پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بحث رنگ پر چھڑ گئی۔

اقبال نے اسلم سے پوچھا: بتائیے میں زیادہ گورا ہوں یا آپا!

اسلم نے کہا: بھئی اپنی آپا کے پاس جب بیٹھتے ہو تو نظر ہی نہیں آتے!

سلمیٰ ہنسنے لگی اور اُس سے چڑاتی ہوئی بولی: اتنے کالے ہو تم!

وہ بگڑ گیا۔ کہنے لگا: آپ بھی تو مجھے اس وقت نظر نہیں آتے ہیں!

اسلم نے کہا: ٹھیک کہتے ہو ۔۔۔ یہ عجیب مصیبت ہے۔ نہ جانے تمھاری آپا اتنی گوری کیوں ہیں؟ ۔۔۔ کیوں نہ سوتے میں ان کے مُنہ پر سیاہی پھیر دو!

۔ وہ بولی۔ زیادہ شہ نہ دیجئے وہ بگلا کر بھی گزرے گا! ۔۔۔ دیکھو اقبال اگر کبھی تم نے حد سے باہر قدم نکالا تو اچھا نہ ہوگا! جانتے ہو میں کتنی بری ہوں

اقبال نے جیسے اس کی یہ تنبیہہ سنی ہی نہیں، کہنے لگا: بھائی جان آپ نے بڑی اچھی تدبیر بتائی ہے ۔۔۔ ابھی لگا دوں!؟

اسلم نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے جواب دیا: یہ تو ہمت کا کام ہے اگر ہمت رکھتے ہو تو پوچھنا کیسا؟ جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو!

وہ اٹھا اور بلیو بلیک انک کی دوات لے آیا۔ سلمیٰ نے اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور کہنے لگی: کیوں شامت آئی ہے چُپ چاپ بیٹھو!

وہ گویا ہوا: پھر اب تو مجھے کالا کلوٹا نہیں کہا کرو گی!

وہ بھی ضِد پر مائل نہ تھی، تو کیا میں اکیلی کہتی ہوں؟ ساری دُنیا کہتی ہے!

ابھی اس دن کوئی دروازے پر کھڑا پوچھ رہا تھا، وہ کالا سا لڑکا کہاں گیا؟۔ دو تین

دن ہوئے تم باہر کسی کام سے گئے تھے ایک محلے کا لڑکا تمھارے پاس سے گزرا،
جب تم آگے بڑھ گئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا: کیسا کالا بھجنگ ہے یہ لڑکا؟
کس کس کے منہ میں سیاہی لگاؤ گے! — لیکن ایسا کیوں نہیں کرتے کہ گورے ہو جاؤ!
وہ بولا: گورا کس طرح ہو جاؤں؟
سلمیٰ نے بتایا: بڑی آسان ترکیب ہے، روز سوتے وقت اور صبح اٹھ کر دودھ
سے منہ دھو لیا کرو۔ اور ہفتے میں ایک دفعہ دودھ سے غسل کر لیا کرو۔
بڑی معصومیت کے ساتھ اقبال نے پوچھا: لیکن اتنا بہت سارا دودھ کہاں
سے آئے گا!
سلمیٰ نے کہا: یہ کون سا مشکل کام ہے، دودھ والا دودھ لے کر آتا ہے۔
آنکھ بچا کر ایک بالٹی پار کر دیا کرو!
اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی، اقبال دیکھنے گیا اور آ کر کہنے لگا:
کوئی سمندر خاں آیا ہے۔ اسلم نے اسے اندر بلوا لیا۔ سمندر خاں نے کہا: ارجمند خاں
نے آپ کو سلام بولا ہے! اسلم سلام کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے کہا: کہہ دینا دو تین دن
کے بعد میں خود آؤں گا مطمئن رہیں!
سمندر خاں یہ جواب لے کر چلا گیا تو اقبال نے کہا: آج دودھ والا پھر آیا تھا
اسلم نے پوچھا: پھر تم نے کیا کہا اس سے؟
اس نے بتایا: میں نے دس دن کو کہہ دیا ہے!
اسلم ہنسنے لگا: بڑے تیز معلوم ہوتے ہو، خواہ مخواہ سلمیٰ نے تمھیں بھوندو مشہور
کر رکھا ہے، بہت اچھا جواب دیا۔

سلمیٰ کو بھی ایک بھولی بسری بات یاد آگئی، اس نے کہا: آپ کو بتانا یاد ہی نہ رہا سیٹھ صاحب کا آدمی کرایہ کے لئے کئی دفعہ آچکا ہے!

اسلم خاموش ہوگیا، ارجمند خاں، دودھ والا سیٹھ صاحب، یہ لوگ تو باقاعدہ تقاضا کر رہے تھے کچھ ایسے بھی تھے جو خاموش تھے، لیکن دو چار دن میں وہ بھی دروازے پر دستک دیں گے آکر۔ آخر ان سب کی زبان کس طرح بند کی جائے؟

اسلم کا موڈ بگڑ گیا اور وہ خاموش ہوگیا سلمیٰ نے اس کی کیفیت بھانپ لی، اور کہنے لگی: ان تقاضا کرنے والوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے، یہ بھی نہیں دیکھتے کہ آدمی کس پریشانی میں ہے، کچھ ان کے روپے لے کر ہم بھاگ تو نہیں جائیں گے کہیں؟ — کہہ دیجیے جب روزگار کا بندوبست ہوجائے گا تب ادائگی ہوگی اس سے پہلے نہیں!

اسلم ہنسنے لگا: کیا پٹوانا چاہتی ہو؟

وہ بولی: کس کی مجال ہے جو آپ پر ہاتھ اٹھا سکے!

کیوں کیا مجھے گاما پہلوان سمجھ رکھا ہے — نہیں سلمیٰ قرض خواہوں کے سامنے سینہ تان کر بات نہیں کی جاسکتی۔ ان کے سامنے خود بخود سر جھک جاتا ہے بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا، یوں بیٹھے بیٹھے کام نہیں چل سکتا!

اقبال نے مشورہ دیا: نوکری کر لیجیے۔

اسلم نے مسکرا کر کہا: تم رکھ لوگے مجھے نوکر؟

سلمیٰ بولی: اتنے تو قابل ہیں آپ، آپ کو بھی نوکری نہیں مل سکتی؟

وہ کہنے لگا: یہ تم نے کیسے جانا کہ قابل ہوں، مجھ سے کہیں زیادہ قابل آدمی ٹھوکریں کھا رہے ہیں! — مگر نوکری نہیں ملتی۔

وہ مایوسی کے عالم میں گویا ہوئی، تو کیا ہوگا پھر؟ گھر کس طرح چلے گا؟ — کوئی نہ کوئی صورت تو نکلنی ہی چاہیئے۔ واقعی سچ ہی کہتے ہیں آپ، دو چار مرتبہ کے بعد یہ لوگ بدتمیزی پر اتر آئیں گے۔ انھیں تو اپنا روپیہ چاہیئے!

اسلم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ہاں یعنی — ایک طرف تو یہ ہجوم ہے قرض خواہوں کا، دوسری طرف یہ حالت ہے کہ اب میری جیب میں صرف ستائیس روپے رہ گئے ہیں، یہ بھی کل تک خرچ ہو جائیں گے، سوچتا ہوں پھر کیا ہوگا؟ قرض خواہ تو رہے ایک طرف روز کا خرچ کیسے پورا ہوگا؟ تمھاری پونجی بھی میرے اندازے کے مطابق دو تین روپے سے زیادہ نہیں!

وہ افسردگی اور پریشانی کے عالم میں بولی: ہاں اتنے ہی ہوں گے، شاید اس سے بھی کم!

اسلم پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا: وہ بولی: آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے!؟

اسلم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کہا: میرے پاس یہ سونے کی چار چوڑیاں اور ہیں —

اسلم نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا: ان کا کیا کروں؟

وہ سادگی کے ساتھ بولی: کہیں رہن رکھ دیجیے یا فروخت کر دیجیے۔ کم از کم قرض تو ادا ہو جائے۔ اتنے میں اللہ میاں کہیں کام کا بندوبست کر دے گا!

اسلم نے تیکھے انداز میں کہا : شکریہ ! — یہ چار جوڑیاں رہ گئی ہیں آج انھیں فروخت کر دوں، کل دو چار اچھے جوڑے کپڑے کے ہوں گے انھیں بیچ آؤں ۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے ؟

وہ کہنے لگی : آخر یہ سب کچھ ، جو کچھ بھی ہے آپ ہی کا تو ہے ۔ ہمیشہ تو یہ وقت نہیں رہے گا ، کبھی تو دن پھریں گے اطمینان سے بنا دیجئے گا ! اس سے زیادہ چیزیں لڑ لڑ کر آپ سے بنوا لوں گی !

اقبال نے بہن کی تائید کرتے ہوئے کہا : ہاں بھائی جان لے لیجئے ، دودھ والا تو بڑی بدتمیزی سے تقاضا کرتا ہے !

اسلم نے فیصلہ کن انداز میں کہا : یہ نہیں ہو سکتا !

پھر سلمیٰ کے افسردہ اور مضمحل چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا : خدا پر بھروسا رکھو ، سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ ! بارہ برس کے بعد گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں ... اتنے دن ہو گئے تکلیفیں اٹھاتے اور مصیبتیں برداشت کرتے آخر کب تک اللہ میاں رحم نہیں کریں گے اور جب کہ میں اب تنہا نہیں ہوں میری شریکِ قسمت تم جیسی اللہ کی نہایت نیک بندی اور اقبال جیسا طفلِ معصوم بھی ہے !

سلمیٰ یہ باتیں سن رہی تھی اور اس کے چہرے کی سرخی دفورِ تاثر کے سبب بڑھتی جا رہی تھی ، پھر اس نے بڑے فخر اور ناز کے ساتھ کہا :

کیا اس دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی نیک ہے ؟

---

(۱۳)

اپنا سودا

دوسرے دن صبح ہی صبح کھی والے سے مڈبھیڑ ہوگئی اور اس نے کافی سخت سُست باتیں کہیں، آدمی غنڈہ قسم کا تھا۔ اسلم نے بڑی ملائمت سے اسے رام کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا: صاحب! اگر کل تک ہمارے پیسے نہ ملے تو پھر شکایت نہ کیجیے گا!

اس گفتگو نے اُسے اور چوکنّا کر دیا، ارجمند خاں سے بھی آج ہی ملاقات کا وعدہ تھا، زیادہ سے زیادہ دو چار دن کی مہلت دیں گے، اس سے زیادہ کی رعایت وہ بھی نہیں کر سکتے!

یہی باتیں سوچتا ہوا وہ سیدھا اشاعت گھر پہنچا کہ یہیں کچھ کام شروع کر دے، لیکن یہاں کی فضا بالکل دوسری نظر آئی۔ پروپرائٹر صاحب نے فرمایا: اتنے دن تک آپ نے غوطہ لگائے رکھا۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکے، وہ کام تو ایک دوسرے صاحب

کو دے دیا گیا!

یہ سن کر رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی ۔ دو ڈھائی صفحے روز کا بھی اگر کام مل جاتا تو گاڑی کچھ آگے چلتی ۔ قرض خواہوں سے تو جس طرح بھی ہوتا بھگت لیا جاتا لیکن روزانہ کے مصارف تو چلتے رہتے ۔ اس نے لاکھ لاکھ اپنی مجبوریاں بیان کیں، اپنی پریشانیوں کا نقشہ کھینچا ۔ مرزا صاحب کی علالت سے لے کر وفات تک کی ساری دلخراش داستان بیان کر دی مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی ۔ بڑی رد وکد کے بعد اتنا وعدہ فرمایا کہ اگر کوئی اور کام نکلا تو اطلاع دے دی جائے گی ۔ پتا کلرک کو لوٹ کرا دیجیے ۔

پتا لوٹ کرا کے ارجمند خاں کے ہاں پہنچا ۔ ارجمند خاں سے ملنا بھی بے حد ضروری تھا ۔ اسے دیکھتے ہی خاں صاحب نے سمندر خاں کو ایک موٹی سی گالی دی اور اس کا بیان سنے بغیر دھڑ سے ایک چانٹا بھی رسید کر دیا ۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مزاج برہم ہے زیادہ رو رعایت اور مروّت کی توقع نہ رکھی جائے ۔

سمندر خاں سے نمٹ کر خان صاحب نے اسلم صاحب کی طرف توجّہ کی اور بے رخی کے ساتھ فرمایا :

پیسے لایا بھئی ۔ بہت دن ہو گیا تم بہت پریشان کرنے لگا ہے ہم کو قرض دینا ہمارا دھندا تو نہیں ہے ۔

ان الفاظ میں مزید تشدد کے عزم محکم اور یقین بہیم کی جھلک موجود تھی، اس نے کہا : خان صاحب آپ بڑے اچھے آدمی ہیں، بڑے نازک موقعوں پر آپ نے ساتھ دیا، واقعی کافی دیر ہو گئی ہے ۔ لیکن جہاں اتنا انتظار کیا چند دن اور ٹھہر جائیے

انشاء اللہ سارا حساب بیباق کر دوں گا!

دل سے نکلے ہوئے یہ الفاظ رائیگاں گئے۔ خان صاحب ذرا بھی متاثر نہ ہوئے فرمایا۔ تم ہمیشہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہے۔ ہم کو پیسے کی ضرورت ہے تم شکریہ ادا کرتا ہے۔ بابا شکریہ نہیں ادا کر دپیسہ دو پیسہ!

اسلم نے ایک مرتبہ پھر یقین دلایا۔ مل جائیں گے خان صاحب، مل جائیں گے! کیا کبھی آپ کا کچھ باقی رہا۔؟

یہ سنتے ہی خان صاحب تو ہتے سے اکھڑ گئے، فرمایا: باقی رہتا تو ہم تمہیں زندہ بھی چھوڑ دیتا!۔۔۔ ہمارا پیسہ کوئی نہیں مار سکتا!

بات الٹی ہو گئی ۔۔۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں!

خان صاحب کافی حد تک جھنجلا چکے تھے۔ کہنے لگے: تم اُردو بہت اچھا جانتا ہے ہم نہیں جانتا، تم جیسا الفاظ ہم نہیں بول سکتا، ہم تو ایک ہی بات بولتا ہے ۔ پیسہ!۔۔۔ یہ کہہ کر خان صاحب نے اس طرح ہاتھ پھیلا دیا جیسے رقم ابھی مل جائے گی!

اسلم کو جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ وہ بولا: اگر میرے پاس ہوتا تو فوراً دے دیتا۔ کوشش کر رہا ہوں جیسے ہی کامیابی ہوئی فوراً ۔۔۔

کوشش تو تم بہت دنوں سے کر رہا ہے ۔۔۔ آخر کہیں نوکری کیوں نہیں دیتا!

لائیے دلائیے نوکری ۔۔۔ ابھی کر لوں گا۔۔۔ اسی وقت سے!

ہمارے پاس نوکری کہاں سے آیا۔۔۔ کیا تم گراہکوں کو چائے پلائے گا۔۔۔

ہاتھ میں ڈے لے کر؟ دوسری جگہوں پر جاتے ہوئے جائیے گا ۔ نہیں تم شریف لوگ ایسا نہیں کر سکتا، کسی دفتر میں بابو بن جاؤ!"

اسلم نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا لیکن خان صاحب کے پاس زیادہ وقت نہ تھا انھوں نے عاجز آتے ہوئے کہا: اچھا بابا اب جاؤ دو تین دن کے بعد آجانا پیسے لے کر!

اسلم چُپ چاپ نکل آیا اور سوچنے لگا: اب کہاں جائے، اب کیا کرے؟

حالات نے پلٹا کھایا تھا اور ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ نہ صرف بے عزّتی کا خطرہ تھا بلکہ پٹائی بھی یقینی ہوتی جا رہی تھی ۔ خان صاحب سے کچھ بعید نہ تھا کسی دن تاؤ میں آکر ہاتھ چھوڑ دیں، گھی والے کے تیور بھی یہی کہہ رہے تھے، دودھ والا بھی لاکھ شریف ہو لیکن وہ بھی کسی دن غازی بننے کے شوق میں دھاوا بولتا ہوا آگیا تو محلے والے صرف تماشا دیکھتے رہ جائیں گے! اور یہاں جان پر بن جائے گی ۔

پھر ۔۔۔؟

اسے ان گرہ کٹوں اور چوروں پر رشک آرہا تھا جو چند لمحوں میں لوگوں کی جیبیں کاٹ کر اپنی جیب بھر لیتے ہیں اور اللّے تللّے کرتے ہیں ۔ جو رات کی تاریکی میں یا روز روشن کے سناٹے میں کہیں نقب لگاتے ہیں اور جتنا مال چاہتے ہیں اڑا لاتے ہیں اور پھر مزے کرتے ہیں!

اسے اپنی محرومی اور بدقسمتی پر رشک آرہا تھا!

وہ سوچ رہا تھا کاش میں گرہ کٹ ہوتا، کسی کی جیب کاٹ کر سارا قرض ادا کردیتا کاش میں چور ہوتا اور چوری کرکے اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کردیتا ۔

لیکن گرہ کٹی بھی تو ایک فن ہے مجھ جیسا اناڑی تو فوراً پکڑا جائے گا ۔ چوری

کے لئے بھی تو حوصلہ چاہیئے۔ مجھ جیسا کم ہمت کیا چوری کرے گا؟
ارجمند خاں کے ہوٹل سے باہر نکل کر ایک درخت کے سائے میں کھڑا بڑی دیر تک یہی باتیں سوچتا رہا۔ ہر طرف راہِ عمل مسدود نظر آرہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہاں جائے کیا کرے؟

آخر بے سمجھے بوجھے یہ جانے بغیر کہ کدھر جا رہا ہے وہ چلنے لگا۔ چلتے چلتے تھوڑی دور کے بعد ایک سائن بورڈ نظر آیا۔

دفتر روزنامہ "قوم"!

(ملّتِ اسلامیہ کا بیباک نقیب، جذباتِ اسلامی کا نڈر ترجمان)

اس دفتر میں وہ کافی عرصے تک کام کر چکا تھا۔ اس اخبار کی حقیقت اور حیثیت سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا یہ اخبار ملتِ اسلامیہ کا بیباک نقیب نہیں ذاتی اغراض کا نقیب ہے۔ یہ جذباتِ اسلامی کا نڈر ترجمان نہیں ذاتی مفاد کا ترجمان ہے، اسے نہ اسلام سے کوئی دلچسپی ہے نہ جذباتِ اسلامی سے۔ یہ انگریزوں کی ملت کش سیاسیات کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ یہ ہندوؤں کے سامراجی مقاصد کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ یہ شریفوں کی پگڑیاں اچھالتا ہے۔۔۔ یہ قوم فروشوں اور غداروں کو جھنڈے پر چڑھاتا ہے۔ اس کے نزدیک ذاتی مقاصد اور مکاری کے علاوہ ہر چیز بیکار ہے!

ماتھے پر لعنت، حقارت اور کراہت کی شکنیں ابھر آئیں، بس میں ہوتا تو پٹرول چھڑک کر اس سائن بورڈ ہی کو نہیں اس عمارت کو آگ لگا دیتا۔ یہاں مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے، غریبوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ دن رات کام کرنے والے

کارکنوں کی کئی کئی مہینے تک تنخواہ نہیں دی جاتی، خون پانی ایک کرنے والے محنتی ورکرز کو اجرت اس طرح ملتی ہے ــــ اہلِ ثروت جس طرح دیتے ہیں غیر دلی کو زکوٰۃ!

ایسے اخبارات اس قابل نہیں کہ ایک پل بھی انھیں زندہ رہنے دیا جائے یہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے دروازوں پر تالا ڈال دیا جائے۔ ان کے مالک مدیر عمر بھر کے لئے نذرِ زندان کر دئے جائیں!

نفرت، حقارت اور کراہت کی شکنیں اب تک اس کی پیشانی پر نمایاں تھیں۔ ذرا دیر تک کھڑا وہ اس چھوڑی ہوئی منزل کو ــــ کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو ــــ دیکھتا رہا، پھر آگے بڑھ گیا۔ لیکن مشکل سے تیس چالیس قدم گیا ہوگا کہ پھر پلٹا اور پھر وہیں آکر کھڑا ہو گیا، جہاں سے غم واندوہ اور حسرت والم کا اتھوہ لے کر گیا تھا!

وہ دروازے پر کھڑا بورڈ کو تک رہا تھا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے اتنے میں دفتر کا ایک کلرک شاید چائے پینے کے لئے نکلا وہ اسلم کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ارے اسلم صاحب آپ؟

اسلم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ہاں بھئی میں ــــ لیکن اتنا تعجب کیوں ہو رہا ہے۔؟

وہ بولا: تعجب تو نہیں خوشی ہو رہی ہے اتنے عرصۂ دراز کے بعد آپ کو دیکھ کر ــــ آئیے چائے پی آئیں!

وہ کہنے لگا: نہیں بھئی چائے کو جی نہیں چاہتا!

تو پھر کوئی ٹھنڈی چیز سہی !

نہیں، وہ بھی نہیں !

تو کیا آپ یہیں یونہی، یہیں کھڑے رہیں گے؟ — یا اندر جانا ہے، کسی سے ملنا ہے ؟

کیا منشی سجاد حسین ہیں اندر؟

کس منحوس کا نام لے دیا آپ نے بھی ؟ — ہاں صاحب ہیں !

کیا کر رہے ہیں ؟

کریں گے کیا ؟ ننانوے کے پھیر میں پڑے ہیں، یہی سوچ رہے ہوں گے کس پارٹی سے کتنے روپے وصول کئے جا سکتے ہیں ؟ کس شخص کی پگڑی اچھالی جائے کہ وہ سر کے بل خود نوٹوں کی گڈیاں لے کر حاضر ہو — اسلم صاحب نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے یہ شخص سجاد حسین بھی۔ نہ دوستی کرتے دیر نہ دشمنی کرتے دیر، نہ دشمنی مول لینے میں تامل، دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنانے میں ملکہ حاصل ہے اسے — خان صاحب میاں باقر علی سے کتنا یارانہ تھا۔ ہم نوالہ ہم پیالہ ہر وقت اٹھنا بیٹھنا، اگر خان صاحب کو چھینک بھی آجائے تو منشی صاحب کو اختلاج قلب کی شکایت ہو جائے ! بیچارے خان صاحب سے مسلم لیگ کی حمایت کے جرم میں انگریز ڈپٹی کمشنر خفا ہو گیا۔ سلام بند کر دیا، بس پھر کیا تھا ہمارے منشی صاحب نے خان صاحب کی وہ پگڑی اچھالی ہے ایسی ایسی شرمناک باتیں لکھی ہیں کہ کیا کہوں ! لیکن ماننا پڑے گا خان صاحب بڑے شریف آدمی ہیں۔ اس کردار کا آدمی میری نظر سے اب تک کوئی نہیں گزرا۔ کیا مجال ہے جو انھوں نے منشی

صاحب کے خلاف لب کشائی کی ہو، حالانکہ وہ اس شخص کی ایسی کمزوریاں جانتے ہیں کہ اگر افشا کر دیں تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہنے دیں۔ متعدد نازک مواقع پر اس احسان فراموش کی گراں قدر مالی مدد بھی کر چکے ہیں۔ بعض حریف اخبارات کے نمائندے ان کے پاس انٹرویو لینے کے لئے پہنچے۔ خان صاحب نے یہ کہہ کر سب کو رخصت کر دیا: "منشی صاحب نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے شاید قدیم دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے کم لکھا ہے ورنہ میری کمزوریاں اس سے کہیں زائد ہیں جتنی بیان کی گئی ہیں۔" دیکھا آپ نے اسلم صاحب اونچے اور شریف آدمی ایسے ہوتے ہیں!

اسلم صرف سنتا رہا کچھ بولا نہیں پھر کلرک نے مزید معلومات بکھیرتے ہوئے کہا: آجکل ہمارے منشی صاحب علی بھائی پر مہربان ہیں، ان کی تعریف میں قصیدے شائع ہو رہے ہیں۔ زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔

اسلم نے پوچھا: علی بھائی! یہ کون بزرگ ہیں؟

کلرک نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: کوئی ٹھیکیدار ہے۔ کئی مرتبہ پانچ پانچ سو روپے بطور عطیہ دے چکا ہے۔ خان بہادری کے خطاب کا امیدوار ہے۔ ٹوڈی، ــــــ انگریزوں کا پٹھو! ارے صاحب حد یہ ہے کہ رائے بہادر یتواری تک کی تعریفیں ہو رہی ہیں قوم میں، حالانکہ اس شخص سے بڑا مہا سبھائی مسلم آزار اور متعصب شخص سارے شہر میں کوئی نہیں محض اس لئے کہ رائے بہادر اگر مہربان ہوئے تو میونسپلٹی کے اشتہارات مل جائیں گے کیونکہ آج بھی چیئرمین وہی ہیں حالانکہ یہ وہ شخص ہے جو ہمیشہ فساد کراتا اور ہندو مسلمانوں میں سر پھٹول کراتا رہتا ہے

شاید کلرک کی معلومات افزا تقریر ابھی اور جاری رہتی کہ اسلم نے کہا: آپ جائیے
پی آئیے میں ذرا منشی صاحب سے مل لوں!

کلرک کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اسلم کو دیکھا۔
پھر پوچھا: منشی صاحب سے ملیں گے آپ؟

اسلم نے جواب دیا: ہاں تو کیا ہوا؟ — کیا نہ ملنا چاہیئے مجھے؟ آپ اتنے بُرے
آدمی کی ملازمت کر سکتے ہیں، میں اس سے مل بھی نہیں سکتا!

یہ عجیب وغریب باتیں سن کر وہ ہوٹل کی طرف چلا گیا اور اسلم سیدھا منشی سجاد حسین
کے کمرۂ ادارت میں پہنچا۔ وہ ایک آرام کرسی پر دراز حقّہ پی رہے تھے اور اخبار
پڑھ رہے تھے۔ آہٹ سن کر پوچھا: کون؟

پھر نظر اٹھا کر دیکھا تو اسلم کو سامنے موجود پایا۔ اخبار کو ایک طرف پھینک کر پلتھی
مار کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے — اور مسکراتے ہوئے فرمایا: کہاں بھول پڑے اسلم
صاحب؟

اسلم نے کہا: ایک کام سے آیا ہوں!

منشی صاحب کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ انھوں نے خیال کیا یہ گڑے مُردے
اکھاڑنے یعنی پرانی رقم کا تقاضا کرنے آیا ہے۔ بے دلی کے ساتھ فرمایا: کہیئے —
کیا کام ہے؟

اسلم نے بغیر کسی تمہید کے کہا: نوکری کرنا چاہتا ہوں!

یہ سن کر منشی صاحب اچھل پڑے!

اسلم نوکری کرنے آیا ہے جس کے زورِ قلم نے اخبار کا مرتبہ بڑھا دیا تھا جس کی

لگاتار محنت نے انھیں ہر کام سے بے نیاز کر دیا تھا۔ جس نے اخبار کا سارا بوجھ اپنے دوشِ ناتواں پر رکھ لیا تھا۔ جو نیک تھا، ایمان دار تھا، فرض شناس تھا! — اور جو عین اس وقت آیا ہے جب "سالنامہ" کے طویل و ضخیم نمبر کا اعلان ہو چکا ہے — اور اشاعت کی تاریخ سر پر کھڑی ہے یعنی صرف پندرہ دن باقی رہ گئے ہیں۔ جب کہ نمبر کے لئے اشتہارات دھڑا دھڑ آ رہے ہیں اور مضمون ایک بھی نہیں ہے — اسے کہتے ہیں "غیبی امداد"! یہ خود نہیں آیا ہے خدا نے اسے بھیجا ہے۔ دفعتہً منشی صاحب کا لب و لہجہ بدل گیا: تو بھئی کھڑے کیوں ہو بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟ وہی تکلف۔ میاں اسلم سچ کہنا، کیا میں نے ہمیشہ تمھیں اپنا عزیز قریب نہیں سمجھا؟ اسلم نے جیسے یہ باتیں نہیں سنیں اس نے پوچھا: کیا آپ مجھے ملازم رکھ لیں گے؟

منشی صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور سنجیدہ بن کر کہا: نہیں رکھوں گا، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے اور فرمایا: یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میں تمھارا، اخبار تمھارا جیب جا ہو آغوشِ شوق کی طرح یہاں کے دروازے کھلے ملیں گے — تو پھر کب سے شروع کر رہے ہو؟

اسلم سخت ذہنی کشمکش میں تھا، نوکری ملنے کی خوشی اور خودی بیچنے کا غم! اس نے کہا: جب سے کہئے!

منشی صاحب نے فرمایا: آج ہی سے آجاؤ۔ آج پہلی تاریخ بھی ہے حساب بھی ٹھیک رہے گا — مگر تنخواہ؟ — یہ بھی طے ہو جانا چاہیئے!

اسلم نے رکتے رکتے کہا: اب میں تنہا نہیں ہوں، ایک پورا کنبہ میرے ساتھ ہے میری شادی ہو گئی ہے!

منشی صاحب تو گویا خوشی سے بے خود ہو گئے ۔ شادی ہو گئی اور ہمیں پوچھا بھی نہیں ۔ ہماری مٹھائی ؟ ۔ وہ تو کھلانا پڑے گی !

کھا لیجئے گا ، پہلی تنخواہ ملنے کے بعد سب سے پہلے آپ کے لئے مٹھائی لاؤں گا
(گرم جوشی کے ساتھ) ۔ اچھا ہاں بھئی تو تنخواہ کا کیا رہا ؟

فی الحال دو سو لو ۔ تین مہینے بعد ڈھائی سو ۔ پھر تین مہینے کے بعد تین سو ! پھر ۲۵ روپے سالانہ پانچسو تک ، میں چاہتا ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو ، آرام سے رہو آرام سے زندگی بسر کرو !

لیکن دو سو میں کام نہیں چل سکتا منشی صاحب !

پھر ۔ ؟

تین سو سے شروع کیجئے پھر ۲۵ روپے سالانہ ! ۔ یہ بھی تو دیکھئے کتنی محنت کرتا ہوں ، کس طرح شب و روز کام میں لگا رہتا ہوں ! ستمبر میں صرف پندرہ روز باقی ہیں اور ایک مضمون بھی آپ کے پاس نہ ہوگا ۔ یہ مہینوں کا کام دنوں میں کرنا پڑے گا مجھے !

(ہنستے ہوئے) اچھا بھئی تم سے جھگڑا نہیں کر سکتے چلو تین سو سہی ! ۔ لیکن تمھاری صورت کہے دے رہی ہے پیشگی ضرور مانگو گے اور مجھے پیشگی سے چڑ ہے اس سے سارا حساب بگڑ جاتا ہے !

مجھے بھی چڑ ہے ۔ پیشگی مانگنے کی مجھے ضرورت بھی کیا ہے جب کہ پچھلے حساب میں ساڑھے چار سو روپے سے زائد آپ کے اوپر باقی چلے آ رہے ہیں ۔ وہ دے دیجئے ۔ حساب صاف ہو جائے گا ! پھر نیا دانہ نیا پانی !

ایک لمحے کے لئے منشی صاحب کا روشن چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ ننگی ہوئی رقم کا اگلنا ان جیسے شخص کے لئے آسان نہیں تھا۔ لیکن اسلم کو دیکھنے کے بعد سے وہ اس کی ضرورت حد سے زیادہ محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے یہ ضرورت مند شخص اگر یہاں سے مایوس ہو کر کسی حریف اخبار کے دفتر میں چلا گیا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، ممکن ہے تنخواہ بھی زیادہ مل جائے۔ اس وقت یہ ڈوبی ہوئی رقم دے کر کیوں نہ اس پر سکہ بٹھا دیا جائے۔ بعد میں حسب موقع پھر رفتہ رفتہ کر کے اس سے زیادہ رقم دبائی جا سکتی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے چہرے کی سیاہی دور ہو گئی، وہ پھر روشن ہو گیا انھوں نے کہا مجھے تو یاد نہیں لیکن تم کہتے ہو تو ہو گی ــــ کیا دے دوں اس میں سے؟

اسلم نے بھی منشی صاحب کی ضرورت محسوس کر لی تھی اور فیصلہ کر لیا تھا، جب کہ نوکری کرنی ہے تو من مانے شرائط پر کرنی ہے۔ اس نے کہا: پانچسو دے دیجئے تو حساب بھی صاف ہو جائے گا اور سارا قرض بھی ادا ہو جائے گا۔ پھر میں یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ کام کر سکوں گا!

منشی صاحب نے تجوری کھولی۔ دو پانچسو نقد اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

لیکن میاں صاحبزادے ایک بات طے ہو جانی چاہئے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ ہو ــ اخبار کی پالیسی تو جانتے ہی ہو تم!

بے ساختہ اسلم کے منہ سے نکلا: جب آپ کو جانتا ہوں تو اخبار کی پالیسی کو بھی جانتا ہوں!

اس دلیل جو اب پر منشی صاحب کا موڈ اور بھی زیادہ بگڑ گیا اور بغیر توجہ نہ کر سکا۔ انھوں نے کہا: خبریں بنانا پڑیں گی، تائید اس کی ہوگی جو ہماری وہائٹ لسٹ پر ہو، خواہ تمھاری رائے اس کے بارے میں کچھ ہو اس کی ضرور مخالفت کی جائے گی۔ جو ہماری بلیک لسٹ پر ہو۔ خواہ تم اسے فرشتہ کیوں نہ سمجھتے ہو!

اسلم نے بے پروائی سے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا، اخبار آپ کا ہے آپ کو حق ہے جو چاہیں لکھیں کس کی مجال ہے جو آپ کا قلم پکڑ سکے؟

دفتر میں اسلم کی ادارت کا اعلان ہو گیا، اسلم اپنا سودا کر کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس چلا گیا!

وہ پریشان حال تھا، آشفتہ روزگار تھا، ضرورت مند تھا، محتاج تھا، وہ زندہ رہنا چاہتا تھا، اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے! لیکن جس طرح ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے زندگی بھی اپنی قیمت مانگتی ہے اور وہ قیمت آج اس نے ادا کر دی تھی!

لیکن کتنی بڑی قیمت تھی یہ!

اسے اپنے اوپر ناز تھا کہ نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی اس نے ضمیر فروشی نہیں کی، رائے نہیں بیچی، فکر کا سودا نہیں کیا، فاقے کر لئے تکلیفیں اٹھالیں دکھ جھیل لئے، مگر سر نہیں جھکایا کسی فرعون کے سامنے۔ نوکری چھوڑ دی مگر نقوی صاحب کے سنگ آستاں کا رخ کرنا گوارا نہ کیا!

لیکن آج یہ فخر چھن گیا ــــ آج وہ اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا!

آج سے اس نے اپنا قلم، اپنی رائے، اپنی فکر، ہر چیز بیچ دی تھی!

اب وہ خبریں بنائے گا، اب وہ ان لوگوں کو برا بھلا لکھے گا جنھیں اچھا سمجھتا ہے!

اوران لوگوں کو اچھا لکھے گا، جن سے نفرت کرتا ہے، جنھیں غدار ملک و وطن سمجھتا ہے

لیکن کیا وہ ایسا کر سکے گا؟

کیا اس کا قلم چل سکے گا، اپنی روانی بھول تو نہ جائے گا!

اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں جیسے دل کی آواز، ضمیر کی صدا، اب اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی، لیکن یہ آواز لگاتار پردہ گوش سے ٹکرا رہی تھی ۔ یہ صدا مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہی تھی!

دردِ زندگی

آخر کوئی کنارا اس سیلِ بے کراں کا؟

آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا؟

کیا روپ دوستی کا، کیا رنگ دشمنی کا!
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا!
اک تنکا آشیانہ۔ اک راگنی اثاثہ!
اک موسمِ بہاراں مہمان دو گھڑی کا!
میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی افق پر تارا کا سا روشنی کا
اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا
او مسکرانے تارو او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا!

(۱)

طوفان!

قوم کے دفتر سے اسلم اس طرح گھر واپس آیا جیسے ریس کا کھلاڑی سب کچھ ہار کر منہ لٹکائے ہوئے واپس آتا ہے، اسے نوکری مل گئی تھی لیکن کتنا مہنگا سودا کرنے کے بعد، اس کی بیروزگاری دور ہو گئی تھی لیکن اپنے آپ کو بیچ کر اس کے قرض کی مشکل بڑی حد تک حل ہو گئی تھی لیکن اپنے تئیں گروی رکھ کر، اس کے روزمرّہ کے مصارف کا بندوبست ہو گیا تھا لیکن خود اپنی نظروں میں حقیر و ذلیل ہو کر۔ اس نے اپنے زندہ رہنے کی قیمت مر کر ادا کی تھی!

منشی سجاد حسین نے جو رقم مرحمت فرمائی تھی وہ اب تک جیب میں رکھی تھی۔ یہی رقم اگر اسے شفقت صاحب سے ملی ہوتی۔ یا کسی اور ناشر سے دستیاب ہوئی ہوتی۔ یعنی حق حلال کے ذریعے جیب میں پہنچتی تو وہ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اپنے قرض خواہوں کے پاس پہنچتا، جیب خالی کر کے واپس آتا، بلکہ ہشاش بشاش

مسرور اور متبسم لیکن یہ رقم اس طرح جیب میں پڑی تھی جیسے کسی کی امانت ہو۔ جیسے اس میں ہاتھ لگانے کا اور اسے صرف کرنے کا اسے حق نہ ہو، اس نے کسی کا قرض ادا نہیں کیا، چپ چاپ گھر آگیا۔

سلمیٰ نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو پریشان ہوگئی، لپک کر قریب پہنچی اور کہنے لگی: آپ اتنے افسردہ کیوں ہیں۔ خدا نخواستہ کچھ طبیعت تو خراب نہیں؟

اسلم نے مغموم انداز میں کہا: سلمیٰ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم جیسے بے غیرتوں کو نہ بیماری پوچھتی ہے نہ موت!

وہ اور زیادہ پریشان ہوگئی: کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ شاید کوئی بند و بست نہیں ہو سکا۔ نہ رقم کا نہ ملازمت کا! تو کیا ہے؟ انشاء اللہ یہ ساری مشکلیں ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ جی ہلکان کرنے سے کیا فائدہ؟

اسلم نے کوٹ اتارا اور اضمحلال کے عالم میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلمیٰ اتنی دیر میں چائے تیار کر لائی۔ اسلم نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے اقبال سے کہا:

ذرا سگریٹ کا ایک پیکٹ تو لا دو اقبال میاں! ــــ جیب میں سے پیسے نکال لو!

اقبال جیب سے پیسے نکالتے نکالتے جوشِ مسرت سے بے قابو ہو کر چیخا۔ ارے! اتنے سارے روپے؟ ـــــ دیکھنا آپا!

سلمیٰ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس میں کئی سو سو روپے کے کئی نوٹ نظر آئے

اقبال نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا : بھائی جان آپ اتنے پریشاں کیوں ہیں ؟ ـــ اس میں تو سب کا قرض ادا ہو جائے گا !

اسلم نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا : ہاں اس رقم سے سب کا قرض ادا ہو جائے گا ممکن ہے کچھ بچ بھی جائے ۔ اور اب مجھے ایک مستقل ملازمت بھی مل گئی ہے ۔ ہر مہینے ایک خاص رقم مل جایا کرے گی !

اقبال اچھلنے کودنے لگا : پھر تو بھائی جان مٹھائی کھلانی پڑے گی آپ کو ! ـــ

اسلم نے ویسے ہی نیم دراز ، ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا : لیتے آؤ ۔ دو روپے اور نکال لو !

اقبال نے جھٹ جیب میں ہاتھ ڈالا اور اعلان کیا : امرتیاں لاؤں گا ، میں تو !

اسلم نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا : قلاقند بھی لانا ـــ سلمیٰ کو بہت پسند ہے !

وہ دو روپے لے کر کودتا پھاندتا چلا گیا لیکن سلمیٰ اس کشمکش میں خاموش بیٹھی تھی ۔ اسلم کے پاس خاصی نقد رقم موجود ہے جس سے واقعی سارا قرض ادا ہو سکتا ہے ، ملازمت بھی مل گئی ، یہ دھڑکا گیا کہ صبح کیا ہوگا اور شام کو کیسے کٹے گی ۔ پھر بھی یہ افسردگی ، اضمحلال اور یہ پریشانی کیوں ؟ جی چاہا کہ پوچھے لیکن نہ جانے کیوں خاموش بیٹھی رہی ۔ کبھی اسے تکنے لگتی ، کبھی چھت کی طرف دیکھنے لگتی ، کبھی عریاں دیواروں کا نظارہ کرنے لگتی جن پر نہ کوئی تقریب تھی نہ فوٹو نہ نقشہ

ہ کیلنڈر، اتنے میں اقبال ایک ہاتھ میں شربت، دوسرے میں مٹھائی کا دونا ے کر آموجود ہوا۔ سگریٹ لاکر اسلم کے سامنے رکھ دی۔ پھر ایک پلیٹ میں مٹھائی کھ کر لے آیا ۔۔۔ آپا دیکھو قلاقند کتنے مزے کا ہے ۔۔ بالکل تازہ ہے ۔۔ مرتیاں میری ہیں، ان میں کوئی صاحب یا صاحبہ ہاتھ نہ لگائیں!

اسلم نے اقبال سے کہا: ایک دوسری پلیٹ لاؤ، اپنی ساری امرتیاں لے اؤ، قلاقند سلمی کے لئے چھوڑ جاؤ۔ اس تجویز کے ماننے میں اسے کیا تامل ہو سکتا تھا، فوراً تعمیل پر آمادہ ہو گیا۔ وہ جب اپنی امرتیاں لے کر جا چکا تو سلمی سے اسلم ے کہا: لو چکھو!

وہ پلیٹ کی طرف دیکھے بغیر بولی: اس وقت نہیں کھانے کے بعد دیکھا جائے ! ۔۔

اسلم نے اصرار نہیں کیا، خاموش ہو گیا۔ لیکن سلمی بولی۔ یہ تو بتائیے پ اتنے چپ چپ کیوں ہیں؟

اس نے ایک نظر سلمی پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے کہا: پریشان ہو گئیں مجھے پ چپ دیکھ کر!

وہ بولی: کیا میرے لئے یہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ ہی اگر خوش یں ہیں تو مجھے کون چیز خوش کر سکتی ہے؟ آپ اگر ملول اور پریشان ہیں تو قدرتاً ں کا اثر مجھ پر ضرور پڑے گا!

اسلم نے کہا: لیکن ایک چیز کیوں بھول جاتی ہو، تمھیں راحت و آرام چانا اور خوش رکھنا میرا فرض ہے۔ اور چونکہ میرے وسائل محدود ہیں۔

آج اس فرض کو ادا کرنے میں پریشانیوں سے سابقہ پڑنا لازمی ہے!

وہ کہنے لگی: میں نہیں مانتی اس بات کو!

اسلم نے پوچھا: کیوں؟ — ضد کی اور بات ہے، ورنہ بات تو ایسی نہیں کہ ماننے سے انکار کیا جائے!

وہ گویا ہوئی: اب میں اور آپ دو جدا گانہ وجود نہیں ہیں۔ اب اسلم اور سلمیٰ ایک ہی وجود کا نام ہے۔ آپ کی خوشی مجھے خود بخود خوش کر دے گی۔ آپ کی پریشانی سے لاکھ دور رہنا چاہوں تو بھی نہیں رکھ سکتی!

اسلم نے کہا: یہ تو خواہ مخواہ کی ذمہ داری تم نے اپنے سر لے لی ہے۔ ورنہ دنیا میں عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ بیویاں گھر میں گلچھرّے اڑایا کرتی ہیں اور شوہر غمِ روزگار کی کٹھنائیاں جھیلا کرتے ہیں۔

وہ ایک ادائے خاص کے ساتھ بولی: ہم ایسی بیوی نہیں ہیں، وہ کوئی اور ہوتی ہوں گی۔ ہم تو ساتھ ڈوبنے اور ساتھ تیرنے کے قائل ہیں۔

اسلم نے جیسے امتحان لیتے ہوئے سوال کیا: قائم رہو گی اپنے اس قول پر؟

وہ بولی: کیوں نہیں رہوں گی، امتحان کر لیجئے!

اسلم نے کہا: تو پھر یہ رقم جو میری جیب میں ہے واپس کرنی پڑے گی — نوکری جو ملی ہے چھوڑ دینی پڑے گی۔ قرض خواہوں کی گالیاں کھانا پڑیں گی — فاقے کرنا پڑیں گے — کیا اتنے بھیانک کام کے لئے تیار ہو؟

وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی: بالکل — لیکن بات کیا ہے یہ بھی تو معلوم ہونا چاہئے!؟

اسلم نے امی منشی سجاد حسین کی ساری رام کہانی سنادی ازاول تا آخر پہلے دن سے لے کر آج تک کی بپتا ۔۔ پھر پوچھا : بتاؤ اب کیا کہتی ہو؟

وہ ایک عزم کے ساتھ گویا ہوئی : کہنا کیا ہے ؟ واپس کر آئیے جاکر اور نوکری بھی نہ کیجئے ۔ خدا رزاق ہے !

اسلم نے بے بسی کے ساتھ کہا : نہیں سلمی یہ نہیں ہوسکتا ۔

اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں ۔ اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور اٹھ کر ٹہلنے لگا ۔ سلمی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ۔ اسلم نے یہ دیکھا تو پوچھا : یہ کیا ؟ ۔۔ تم کیوں رو رہی ہو ؟

وہ بولی : اپنی بدقسمتی پر ۔۔ میری وجہ سے ، میرے لئے آپ اپنا ضمیر تک بیچنے کے لئے تیار ہو جائیں گے ۔ یہ آپ کی شرافت کی انتہا ہے ، لیکن میں اتنی تنگ انسانیت نہیں ہوں کہ اسے گوارا کرلوں !

اسلم نے سوال کیا : تو کیا کروگی پھر ؟

وہ پیکر عزم و استقامت بن کر کہنے لگی : مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر آگ لگالوں گی ۔ ایسی زندگی سے موت اچھی ہے میری وجہ سے کتنی موتیں ہو چکی ہیں ۔ اماں جی میرے ہی غم میں مریں ، ابا جی کی جان میری ہی فکر نے لی ۔ میرے لئے آپ نے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹا ۔ آخر کب تک اپنے وجود کے لئے دوسروں کی قربانیاں دیکھتی رہی ہوں ، خود مجھے بھی تو قربانی کرنی چاہئے ۔ اور جس چیز کی قربانی کرسکتی ہوں وہ میرا وجود میری ہی زندگی ہے ! پھر یہ سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے ، پھر آپ کو اپنے ضمیر کا گلا نہیں گھونٹنا پڑے گا ، پھر آپ سینہ تان کر ہر موقع پرست ، ہر خود غرض ، ہر

لالچی اور سفاک شخص کا مقابلہ کر سکیں گے۔ پھر آپ کی شخصیت اپنے اصلی روپ میں ابھر سکے گی۔ یہ گرد و غبار جو میری وجہ سے چھا گیا ہے اس پر خود بخود رفع ہو جائے گا!

اسلم غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نرم اور ملائم لہجے میں کہا: تم ایسا نہیں کر سکتیں، اور اگر تم نے ایسا کیا تو یقین رکھو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا!

سلمیٰ سہم گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا: آپ بھی زندہ نہیں رہیں گے۔؟

وہ بولا: ہاں خودکشی کر لوں گا!

سلمیٰ نے سوال کیا: لیکن کیوں؟ میرے ساتھ آپ کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ محض ہمدردی کی بنا پر ہے۔ اعلیٰ ظرفی کی بنا پر، اس کی بنیاد محبّت تو نہیں ہے اور کبھی یہی سوچ کر میں اپنے اوپر لعنت کرنے لگتی ہوں کہ آپ کی انسانیت دوستی، شرافت اور اعلیٰ ظرفی کے باعث میں نے آپ کی محبّت تک چھین لی۔؟

اسلم چونک پڑا، وہ کچھ سوچنے لگا، پھر بولا: یہ خیال کیسے آ گیا تمھارے دل میں؟

وہ بولی: جب کبھی آپ کو گم صم دیکھتی ہوں، دیوانہ وار ادھر اُدھر تکتے پاتی ہوں، عالمِ خیال میں کھویا ہوا دیکھتی ہوں، تپاک، گرم جوشی، خوشی اور اپنایت کے ساتھ اپنے لئے کچھ سرد مہری سی محسوس کرتی ہوں، کچھ کھچی سی پاتی ہوں تو یہ خیال بری طرح میرے دل پر مسلّط ہو جاتا ہے، پھر مجھے یاد آ جاتا ہے ابّاجی نے کتنے نازک اور

نفسیاتی موقع پر آپ کا دامن پکڑ لیا تھا۔ مجھے یاد آجاتا ہے آپ نے پہلو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن مرنے والے کی ضد کے سامنے بالآخر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اگر آپ کسی اور سے محبت نہیں کرتے تھے تو فوراً کیوں نہیں تیار ہو گئے تھے آپ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کیوں نہیں کرنے لگے تھے جیسے ــــ

سلمیٰ کی روانئ کلام کو ایک دم بریک لگ گیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ شاید وہ کہنا چاہتی تھی: جیسے میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی، لیکن کہہ نہ سکی مگر اسلم نے بات قبلوا لی۔ اس نے پوچھا:

کیا تم مجھ سے محبت کرنے لگی تھیں؟

وہ کچھ لجاتی ہوئی بولی: کیا آپ محسوس نہیں کر سکے اب تک؟

وہ بولا: محسوس تو کرتا ہوں اور شاید بہت دن سے کرتا ہوں ــ مگر کیا شادی کے بعد سے تم میرے برتاؤ میں محبت نہیں دیکھتیں!؟

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی: نہیں ــــ اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

اسلم پر سخت شرمندگی اور ندامت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے کہا: یہ بڑا ظالمانہ جواب ہے۔

وہ بولی: آپ کو تو صرف اس لئے ٹھیس پہنچی کہ ظاہرداری کا پردہ ذرا سا ہٹ گیا۔ لیکن اس کے دل سے پوچھئے جس کی دیوانہ وار محبت کا یہ جواب ہو، اگر یہ جواب ظالمانہ ہے تو میرے لئے نہ کہ آپ کے لئے!

جس چوری کو بڑی فن کاری کے ساتھ سلمیٰ سے چھپاتا آیا تھا وہ یوں چشم زدن میں دن دہاڑے پکڑی جائے گی۔ اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ سلمیٰ بڑی نیک اور

خاموش لڑکی تھی۔ وہ جب بولنے پر آئے گی تو یوں گل افشانیٔ گفتار کے جوہر دکھائے گی۔ یہ بات تو ذہن ودماغ کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھی، ان باتوں سے وہ نڈھال ہو گیا۔ اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا: یہ کیا کہہ رہی ہو سلمیٰ!

وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی: سچ!!

پہلے سے زیادہ بے بسی کے ساتھ گویا ہوا: آج معلوم ہوا سچ کتنا کڑوا ہوتا ہے!

اور پھر اس پر ایک جذبہ ساطاری ہو گیا۔ ایک مجنونانہ کیفیت، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں، اس کے کانوں کی لویں تمتما نے لگیں۔ اس نے بڑے جوش کے ساتھ سلمیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اُسے دبایا اور کہا: بات چھڑ گئی ہے تو صاف ہی ہو جانی چاہیے!

سلمیٰ نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا اسی طرح بیٹھی رہی، بالکل بے حس وحرکت، ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور فوراً ہی جھکالی!

اسلم نے اسی جوش وخروش کے عالم میں کہا: ہاں سلمیٰ تم نے ٹھیک کہا! میں اپنی چچازاد بہن مسرت سے محبت کرتا تھا۔ میری محبت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس کی محبت جنون کی حد سے بھی آگے نکل چکی تھی۔

تو کیا ہوا اسے ـــــ کیا خدانخواستہ وہ ـــ

نہیں وہ مری نہیں زندہ ہے!

تو اب کر لیجئے ـــــ میری پروانہ کیجئے، میری محبت غیر مشروط ہے۔ میں کبھی بھی آپ کے اور مسرت کے راستے میں حائل ہونے کی سعی نہیں کروں گی!

شکریہ ـــ لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے، میں اس سے شادی نہیں کر سکتا!

کیوں نہیں کرسکتے ؟ ۔۔ میں کہتی ہوں کر لیجئے !

سلمیٰ ! ۔۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اس نے اپنے تمام خطوط جو وقتاً فوقتاً مجھے لکھے تھے اور جن کا ایک ایک لفظ عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویر تھا واپس لے لئے اس نے میری وہ تصویریں جو مختلف پوزوں میں خود اس نے اپنی فرمائش سے کھچوائی تھیں اور اپنے کمرے کی زینت بنائی تھیں مجھے واپس کر دیں۔ اس نے وہ تمام مکاتیب جو میں نے اسے کبھی لکھے تھے میرے منہ پر مار دیے !

ہائے اللہ! لیکن کیوں ؟ کس لئے ؟

اس لئے کہ وہ امیر تھی ، میں غریب تھا ، اسے ایک دولت مند شوہر مل گیا ، وہ ایک غریب عاشق کا ساتھ نہ دے سکی !

لیکن میں پوچھتی ہوں کیا محبت اس طرح کی بھی ہوتی ہے ؟ آخر یہ کیسی محبت تھی ؟

میں نہیں جانتا یہ کس قسم کی محبت تھی ! کبھی ملاقات ہو تو پوچھ لینا !

کیا محبت بدل بھی سکتی ہے ؟ منتقل بھی ہو سکتی ہے ؟ مر بھی سکتی ہے ؟

مسرت سے پوچھ لو تو وہ کہے گی ہاں ! مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا نہیں !

کیا اب بھی آپ مسرت سے محبت کرتے ہیں ؟

ہاں سلمیٰ مجھے اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں !

لیکن مجھے آپ سے کوئی گلا نہیں ! ۔۔ یہ جواب سن کر تو میرے دل میں آپ کی محبت اور زیادہ بڑھ گئی ! کتنے اونچے آدمی ہیں آپ ؟

یہ جان کر بھی کہ میں مسرت سے اب تک محبت کرتا ہوں تمہیں مجھ سے گلا نہیں ۔ یہ الفاظ میں ایک عورت کے منہ سے سن رہا ہوں ۔ کتنی انہونی بات ، کیسی ناقابلِ یقین

بات ، لیکن جانتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بولتیں ۔ تم منافق نہیں ، تم میں ظاہرداری نہیں ـــ تو جس عورت کے منہ سے یہ الفاظ میں نے سنے ہیں ، کیا اس سے اونچا انسان بھی کوئی ہو سکتا ہے ؟

رہنے دیجیے !

کیسے رہنے دوں ؟ تمھارے اس جواب نے مجھے میری نظر میں ذلیل کر دیا !

یہ لیجیے ۔ کیوں ذلیل کر دیا ؟

اس لیے کہ میں اس اخلاقی جرأت سے محروم تھا جو تمھارے اندر ہے ، مجھ میں وہ حوصلہ نہ تھا جو تم میں ہے ، جس جرأت کا تم نے ثبوت دیا ہے وہ صرف تمھارا حصّہ ہے ۔ میں نے تمھیں دھوکا دیا ۔ تمھارے مرنے والے شریف ، بزرگ ، اور نیک باپ کو دھوکا دیا ـــ

یہ نہ کہیے محبت کر کے بھی جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا اور کر رہے ہیں ۔ وہ تو ایک عاشقِ صادق بھی نہیں کر سکتا ـــ مجھے ہمدردی ہے آپ سے ، میری محبت ، مسرت کا بدل تو نہیں بن سکتی ۔ لیکن محبت تو جانوروں کی بھی قبول کر لی جاتی ہے میرے لیے یہی بہت ہے کہ آپ نے میری محبت قبول کر لی !

جتنے بھگو بھگو کر جوتے مار سکتی ہو مار لو !

خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے ۔ اگر مجھے واقعی محبت ہے ، تو نہ آپ کا دل دکھا سکتی ہوں ، نہ صدمہ پہنچا سکتی ہوں نہ توہین کر سکتی ہوں آپ کی !

میں تمھاری محبت کو تسلیم کرتا ہوں !

یہ میری سب سے بڑی سوغات ، سب سے بڑا تحفہ ہے !

لیکن ان باتوں میں وہ اصل بات جو کہنا چاہتا وہ نہ کہہ سکا!

بیٹھی تو ہوں جو کچھ کہیں گے سنوں گی!

بے شک میں نے مسرت سے محبت کی، بلا شبہ اب بھی میرے دل میں اُس کی محبت ہے، لیکن سلمٰی کیا یقین کرو گی کہ میرے دل میں تمھارا مقام مسرت سے بہت زیادہ اونچا ہے!

کیا اس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے؟

مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔

میں نہیں سمجھی، بالکل نہیں سمجھ سکی!

مسرت نے میری محبت ٹھکرادی، اس نے ایک دوسرے شخص سے شادی کرلی وہ میرا نام بھی سننا نہیں چاہتی، اس نے میری عزت کا مذاق اُڑایا — لیکن تم نے کیا کیا؟

میں نے کیا کیا — کچھ بھی نہیں!

واہ — تم نے مجھ سے محبت کی، محبت کا جواب نہ پاکر بھی محبت کی اور اس طرح کی کہ اپنے وجود کو میرے وجود میں ضم کر دیا، میری خوشی تمھاری خوشی بن گئی۔ میرا غم تمھارا غم بن گیا!

ہاں یہ تو ہے، اس سے تو انکار نہیں کرسکتی!

تم نے مجھ سے محبت کی، میری عزت سے محبت کی!

میں خود بھی تو غریب ہی تھی!

ٹھیک کہتی ہو — لیکن وہ کون غریب سے غریب عورت ہے جو اونچے محلوں

کے خواب نہیں دیکھتی۔ تم نے میری وجہ سے یہ خواب نہیں دیکھے یا دیکھ کر چھوڑ دیئے
وہ کون عورت ہے جو غریب سے غریب شوہر کے ہاں کچھ مطالبات نہیں رکھتی
زیور کے، کپڑے کے، کھانے کے مگر تم ہر مطالبے سے دست بردار ہوگئیں،
بلکہ تم نے اپنے وہ زیور بھی جو ایک یادگار کی حیثیت رکھتے تھے بلا تامل میرے
حوالے کر دیے کہ انھیں بیچ کر کام چلا لوں۔ ہر عورت جب اسے تکلیف
پہنچتی ہے جب اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تب وہ اپنے آپ کو
بالکل بے بس دیکھتی ہے ضرور اپنے شوہر سے لڑتی ہے، رات بھر لڑتی ہے
کئی کئی دن لڑتی ہے، مگر تمھاری پیشانی پر میں نے آج تک شکن نہیں دیکھی۔
ہر عورت اپنے شوہر کی زندگی چاہتی ہے تاکہ اسے سکھ سے رکھ سکے۔ تم اپنے
شوہر کی زندگی ہر حالت میں چاہتی ہو خواہ فاقے ہی کیوں نہ کرنا پڑیں۔ سلمیٰ
مجھے مسرت سے صرف محبت ہے لیکن میرا دل تمھاری عظمت سے مسحور ہے۔
اور عظمت محبت سے بہت اونچی چیز ہے۔

ہو گی ـــــ یہ تو فلسفے کی باتیں شروع کر دیں آپ نے!

نہیں سلمیٰ ـــــ یہ فلسفہ نہیں۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقت ہے جسے جھٹلایا
نہیں جاسکتا! جس کی تردید نہیں کی جا سکتی!

اچھا، یہی سہی۔

اور یاد رکھو عظمت اور محبت میں جب ٹکر ہو گی عظمت جیت جائے گی،
عظمت کے سامنے ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتی!

یہ تو بالکل نئی اور عجیب بات سن رہی ہوں!

لیکن کیا اس پر یقین نہیں کرتیں ؟

آپ کے منہ سے نکلی ہوئی کسی بات پر یقین نہ کروں ، یہ کسی طرح بھی میرے لیے ممکن نہیں ۔

اسلم کے چہرے پر اطمینان اور سکون کی کیفیت پیدا ہو گئی اور یہ کیفیت دیکھ کر سلمیٰ کے چہرے پر بھی رونق آ گئی ۔ اسلم نے ایک سگریٹ نکالا اور اس کا دھواں چھلّے بنا بنا کر اڑانے لگا ۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا :

اچھا بھئی یہ باتیں تو ہولیں جن کا یہ کوئی خاص موقع نہ تھا ۔

سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا : لیکن آپ ہی آ گئے تھے جوش میں اور پھر جو طوفانِ تکلم شروع ہوا آپ کا تو لطف آ گیا !

اسلم نے کہا : اچھا یہی سہی ۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس نوکری اور روپے کا کیا کیا جائے ؟

وہ بے پروائی سے بولی : نوکری سے استعفیٰ دے دیجئے اور روپے واپس کر دیجئے لیکن روپیہ کیوں واپس کیجئے وہ تو آپ کا ہے ہی ـــ ہاں نوکری بے شک نہ کیجئے ۔

وہ گویا ہوا : بات تو ٹھیک کہتی ہو ۔ لیکن اصولاً یہ بات مناسب نہیں ۔ روپیہ رکھ کر استعفیٰ دینے کے معنی یہ ہیں کہ میں نے منشی صاحب کو دھوکا دیا ۔ دھوکا دے کر روپیہ لے لیا ۔ اور دھتا بتادی یہ شیوۂ انسانیت اور اصولِ شرافت کے خلاف بات ہوگی ۔

پھر کیا کریں گے آپ ؟

استعفا دوں گا تو روپیہ بھی واپس کر دوں گا ۔

چلیے یہی سہی دونوں سے ہاتھ اٹھا لیجیے ۔

لیکن سلمیٰ زندگی کا بسر کرنا بہت مشکل اور ٹیڑھا کام ہے ۔ نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں زندہ رہنے کے لیے، زندگی کو قائم رکھنے کے لئے !

وہ استقامت کے ساتھ بولی : پاپڑ بیلنے کے بجائے ہم کو دکھ جھیلنا منظور ہیں ! —

بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اقبال آ گیا ۔ اس نے کہا دودھ والا آیا کھڑا ہے — آج تو بہت غصے میں ہے ۔ اور میں نے دیکھا سمندر خاں بھی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے ۔ اب وہ بھی پہنچ چکا ہو گا !

اسلم نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور اقبال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا : جاؤ اس کا حساب تو صاف کر دو ۔ سمندر خاں آیا ہو تو کہہ دینا شام کو میں خود آؤں گا ! اور ارجمند خاں سے مل کر حساب پاک کر دوں گا !

اقبال چلا گیا، ذرا دیر میں پھر واپس آیا ۔ اور کہنے لگا، یہ باقی روپے ! پھر بولا : سمندر خاں کو تو میں نے رخصت کر دیا ۔ وہ چلا گیا — مگر —

مگر کیا ؟ — کیا گھی والا بھی آ گیا ؟ اسلم نے پوچھا ۔

وہ مسکراتا ہوا گویا ہوا : جی ہاں — لیکن بہت خوش ہے — اقبال نے کہا ۔

لیکن خوش کس بات پر ہے ؟

دودھ والا اس کے سامنے روپے گنتا ہوا آگیا ہے!

اسلم اور سلمیٰ دونوں کو ہنسی آ گئی وہ بولی بڑا اشریر ہے!

پھر اس نے اسلم سے کہا: آپ نے تو یہ روپے خرچ کرنے بھی شروع کر دیے، اب کیا کریں گے؟

اسلم نے جواب دیا: حالات ایسے ہیں کہ جب تک ہو سکے گا اس گاڑی کو کھینچوں گا۔ جب بالکل ناقابلِ برداشت ہو جائیں گے علیحدگی اختیار کر لوں گا!

وہ نہ سمجھتی ہوئی بولی: اس سے کیا فائدہ؟

اسلم نے سمجھاتے ہوئے کہا: اس طرح جو روپے آج قرض لئے ہیں ادا ادا کرنے والا ہوں حلال ہو جائیں گے! کام شروع کرنے کے بعد کسی بات سے متاثر ہو کر علیحدگی اختیار کروں یہ دوسری بات ہے اور کام شروع کئے بغیر اپنی سابقہ رقم جیب میں رکھ کر کہہ دوں کہ جو باتیں طے ہوئی تھیں میں ان پر عمل نہیں کرتا یہ دھوکا ہے!

وہ معاملے کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتی ہوئی گویا ہوئی لیکن ایسی بات جس سے آپ متاثر ہوں کسی دن بھی پیش آ سکتی ہے، پھر اس کھیل سے فائدہ کیا؟

اسلم کے ہاتھ میں اب تک اس کا ہاتھ تھا اس نے پیار سے دباتے ہوئے کہا: اسے مجھ پر چھوڑ دو۔

پھر اٹھتا ہوا کہنے لگا: چلو آج تمھیں بھی شہر کی سیر کرا لائیں۔ ارجمند خاں

کے روپے بھی ادا کر دیں گے ۔ اور اپنی پسند کی کوئی چیز بھی لیتی آنا !

وہ ممنون نظروں سے اس کو دیکھتی ہوئی بولی : مجھے سیر کا چسکا نہیں ہے نہ اپنی پسند کی کوئی چیز لانی ہے !

یہ کیوں ___ ؟ اتنی مُردہ دلی بھی اچھی نہیں ہوتی !

(ہنستے ہوئے) واہ یہ بھی اچھی رہی ۔ یہ موقع گلچھرے اڑانے کا نہیں ہے قرض ادا ہولے ، ضروری چیزیں گھر کی آجائیں ۔ سیر اگلے مہینے کی تنخواہ پر بھی ہوسکتی ہے ، پسند کی چیز اس وقت بھی لائی جاسکتی ہے !

اچھا تو چلو سینما ہو آئیں مل کر ، اس سے تو اختلاف نہیں !؟

ابھی سے ___ (زور سے) اقبال تو نہیں مانے گا ؟ امرتیاں کھا چکا اب قلاقند سے تیرا کیا تعلق ؟ ___ خبردار جو ہاتھ لگایا !؟!

(وہیں سے) لیکن آپا مجھے امرتیوں سے نفرت ہے ، میں تو قلاقند پسند کرتا ہوں !

(مسکراتے ہوئے) کب سے چمار ؟

بہت دنوں سے ۔

پھر ٹھونسی کیوں نہیں ؟

بھائی جان کا اصرار تھا ___ کیوں بھائی جان ابھی آپ آپا سے کہاں چلنے کو کہہ رہے تھے ؟ میں بھی ساتھ چلوں گا !

اسلم نے کہا : سینما کا ارادہ تھا ، لیکن تمھاری آپا کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتیں !

اقبال آ کر بہن کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ میری آپا — اچھی آپا!

وہ بے بسی کے ساتھ اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: اچھی بلا کو آپ نے میرے پیچھے لگا دیا!

اسلم نے کوٹ پہن کر جواب دیا: اسی بلا سے تو ٹھیک رہتی ہو اور رحم پر بس کس کا چلتا ہے؟!

(۲)

اور ایک دن اچانک...

کوئی گیارہ بجے رات کو اسلم سینما سے واپس آیا۔ فلم بڑی دلچسپ تھی۔ اتنے دنوں کے بعد سلمیٰ کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ ورنہ ماں اور باپ کے مرنے کے بعد سے وہ ہنسنا کیا مسکرانا تک بھول گئی تھی۔ اس تبدیلی پر اسلم بھی بہت خوش تھا۔ درحقیقت وہ سلمیٰ کو اسی لئے گیا تھا کہ ذرا ماحول بدلے۔ اور یہ جو ہر وقت اس پر غم کی بدلیاں چھائی رہتی ہیں یہ دور ہوں کسی طرح سلمیٰ کو خوش اور مسرور دیکھ کر آج وہ بھی بے انتہا خوش تھا۔ اور اقبال صاحب تو ہنسی کے مارے لوٹن کبوتر بنے جا رہے تھے۔ بھلا ایسا دلچسپ تماشا کاہے کو انھوں نے دیکھا ہوگا کبھی! آگے آگے اقبال، اس کے پیچھے سلمیٰ، اس کے عقب میں اسلم اس طرح یہ قافلہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ اقبال نے بہن کو مخاطب کر کے کہا: آپا! وہ گوپ —

اور پھر وہ ہنسنے لگا۔ سلمیٰ نے پیچھے سے ٹوکا: کچھ دیوانہ ہوا ہے۔ دیکھ نہیں ٹھوکر نہ کھا جانا جو میرے ہی اوپر آ رہو!

لیکن اقبال کی ہنسی ختم ہو چکی تھی۔ وہ آخری زینہ طے کر کے پہنچ چکا تھا دروازے پر، اور یہاں ایک مختصر سا ڈپٹی رکھا تھا اور ایک سوٹڈ بوٹڈ فیشن ایبل شخص ٹہل رہا تھا۔ اس نووارد اجنبی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اتنے میں سلمیٰ بھی پہونچ گئی تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس اجنبی کو دیکھ کر اس نے نقاب ڈال لی۔ اور اقبال کی کمر میں ٹہوکا لگاتے ہوئے کہا: پوچھ کون صاحب ہیں! وہ سوال کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسلم پہنچ گیا۔ یہاں کافی تاریکی تھی اس نے بھی دیکھا ایک فیشن ایبل شخص کھڑا ہے۔ اقبال اور سلمیٰ متحیر اور پریشان اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے رک کر پوچھا: کون صاحب ہیں؟

آواز آئی: پہچاننے کی کوشش کیجیے۔

یہ آواز شناسا تھی۔ اسلم لپک کر آگے بڑھا اور پھر اس شخص سے بغل گیر ہو گیا۔ اشفاق ــــــ کب آئے تم؟

اشفاق نے جواب دیا: صرف تین گھنٹے ہوئے ہیں!

اسلم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے کہا: ہاں بھئی آج ہی یہ حماقت ہوئی تھی کہ سینما چلے گئے ہم لوگ۔ اور تمھیں اتنی زحمت سے دوچار ہونا پڑا۔

اتنے میں گھر کا دروازہ کھل چکا تھا، بجلی کی روشنی پھیل چکی تھی۔ اسلم اسے لے کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ اقبال سے کہا جاؤ اپنی آپا کو بلا لاؤ۔ وہ حکم سنتے ہی آ موجود ہوئی۔ اسلم نے تعارف کراتے ہوئے کہا: یہ ہیں سلمیٰ۔ تمھاری بھابی!

پھر سلمیٰ سے کہا : یہ ہے اشفاق، میرا ماموں زاد بھائی ــ انجمن کا شوہر! ساری اجنبیّت پل بھر میں دُور ہوگئی سلمیٰ تپاک اور گرم جوشی سے ملی، کہنے لگی : اکثر آپ کا ذکر ہوتا رہتا تھا، اسلم صاحب تو جیسے آپ پر عاشق ہیں!

لیکن اشفاق کے لب سے تبسّم آشنا نہ ہوئے ـ اس نے کہا جی ہاں کیوں نہیں ــ اسی لئے تو آج تک نہ خط لکھنے کی توفیق ہوئی نہ اہم سے اہم خط کا جواب دینے کی ـ

ان الفاظ میں طنز بھی تھا شکایت بھی، اپنایت بھی، اجنبیت بھی بیزاری بھی اور کسی حد تک حقارت بھی!

سلمیٰ حیرت سے اسلم کی طرف دیکھنے لگی ـ اسلم تڑپ گیا اس نے کہا : یہ تو سچ ہے کہ اپنی پریشانیوں میں خط نہ لکھ سکا لیکن تمھارا ابھی کوئی خط آج تک مجھے نہیں ملا ـ نہ انجمن کا نہ کسی اور کا!

اشفاق نے اسی طرح بیگانگی کے عالم میں بیٹھے بیٹھے کہا ـ نئی مصروفیتوں اور دلچسپیوں نے اگر آپ کو دنیا و مافیہا سے اتنا بے خبر کر دیا ہے تو دوسری بات ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ انجمن نے ڈھیروں خط لکھے ـ میں ہمیشہ سے خط لکھنے کا چور ہوں ـ مگر اس پر بھی ایک درجن سے کیا کم لکھے ہوں گے، حد یہ ہے کہ فرزانہ آپا نے اور تسنیم میاں نے لکھے مگر کسی کا جواب نہ ملا ـ انجمن کا خیال تھا آپ بے حد پریشان ہیں اس لیے خط نہیں لکھتے، خط کا جواب نہیں دیتے ـ میں بھی اس کی تائید کرتا تھا ـ اماں جی کہتی تھیں اس نے ضرور جورو کر لی ہے اور اس کے عشق میں سب کو بھول بیٹھا ہے ـ میں ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا، انجمن تردید کیا کرتی تھی ـ آپا اور

بھائی صاحب بھی انھیں چھیڑا کرتے تھے، لیکن واقعی بزرگوں کی بات سچی ہوتی ہے انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک ایک حرف صحیح اور درست پایا، بہرحال اس نئی اور پرمسرت زندگی پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں ــــ کہئے قلم کیسی تھی؟

ایسی باتیں بھلا اسلم نے کاہے کو کبھی اشفاق کے منہ سے سنی ہوں گی۔ بے انتہا غصہ آیا، لیکن ضبط کر گیا، اس نے کہا:

اشفاق نا سمجھی کی باتیں نہ کرو۔ میری شادی پر طنز کرنے سے پہلے تم نے یہ بھی تو معلوم نہیں کیا کہ کن حالات میں ہوئی ہے یہ شادی! دو بدقسمت، تباہ حال اور آشفتہ روزگار ہستیوں کے سنگم کا تم مذاق اڑا رہے ہو، طنز کر رہے ہو کتنی بیدردی کے ساتھ۔ اشفاق سلمیٰ نہ ہوتی تو اسلم مر گیا ہوتا، اسلم نہ ہوتا تو سلمیٰ اس جہان سے گزر گئی ہوتی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو زندہ رکھا، ایک دوسرے کو سہارا دیا۔ بھوکے رہ کر، تکلیفیں اٹھا کر، قرض خواہوں کی گالیاں سن کر، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر، در در کا چکر لگا کر، ٹوٹے ہوئے جوتے پہن کر، پیدل چل کر سلمیٰ کی ماں مری تو کفن قرض آیا۔ اس کا شریف، نیک اور بزرگ باپ مرا تو گھر میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ مجھے نوکری سے جواب ملا تو قرض کے بوجھ سے کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے کتابیں لکھیں دن رات محنت کر کے، کھانا نہ کھا کر، ناشتہ نہ کر کے آرام نہ کر کے۔ یہ کتابیں پسند کی گئیں۔ لیکن ان کا پورا معاوضہ اب تک مجھے نہیں مل سکا ــــ اور تم مجھے مبارکباد دے رہے ہو میری پُرمسرت اور کامیاب زندگی پر؟ کم از کم تم سے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ ہر روز ارادہ کرتا تھا کہ خط لکھوں، لیکن سوچتا تھا کیا لکھوں؟ کیا اپنی داستانِ درد خود رونا تو ٹھیک ہے لیکن

اپنے لئے دوسروں کو رُلانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی حسرت ہی رہی کہ حالات ساز گار ہوتے اور میں کوئی مسرت بخش خط لکھ سکتا۔ انجمن کو ــــ تمھیں!

لیکن یہ ساری پُرجوش اور اثر انگیز باتیں چکنے گھڑے پر پانی کی بوند ثابت ہوئیں اشفاق ذرا بھی متاثر نہیں ہُوا۔ وہ سلمیٰ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے یہ کوئی بدچلن آوارہ عورت ہے جس نے اسلم کا اغوا کرلیا ہے وہ اقبال کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے یہ ایک زبردست بوجھ ہے جسے خواہ مخواہ اسلم نے اپنے کندھے پر اٹھالیا ہے وہ اسلم کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے یہ بے وفا، سنگ دل اور خود پرست شخص صرف اپنے عیش کے لئے زندہ ہے، اُسے بہن کی فکر نہیں اس سے واسطہ نہیں عزیزوں اور رشتہ داروں سے تعلق نہیں۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: خود سے خط نہ لکھ سکے مگر کیا خط کا جواب دینا بھی گناہ تھا؟!

اسلم نے تقریباً سر پیٹتے ہوئے کہا: مجھے کوئی خط کسی کا نہیں ملا ــ کس پتے سے خط لکھے تھے؟

قوم کے پتے سے!

یہ منشی صاحب کی خباثت نفس ہے۔ انھوں نے کوئی خط مجھے نہیں بھیجا۔ حالانکہ میرا پتا انھیں معلوم تھا۔

آدمی تو بہت معقول معلوم ہوتے ہیں۔ میں سیدھا وہیں گیا تھا۔ فوراً آدمی ساتھ کر دیا۔

اس لئے کہ آج سے پھر میں نے ان کی ملازمت اختیار کرلی ہے۔ ورنہ جس طرح انھوں نے سارے خط پھاڑ کر پھینک دئے اسی طرح تمھیں بھی ٹرخا دیتے۔

خیر۔ آپ جانیں اور وہ جانیں۔ انجمن کو اس کا صدمہ ضرور ہے کہ آپ نے اس کی بات نہیں پوچھی اسے امید تھی کہ آپ پہلا خط پاتے ہی آئیں گے۔ اس کی عیادت کریں گے، تیمارداری کریں گے۔

اس سے زیادہ وہ نہ سن سکا۔ اس نے بیقرار ہو کر پوچھا۔ کیا کہا میں اس کی عیادت کروں گا۔ تیمار داری کروں گا۔ کیا وہ بیمار ہے؟

اشفاق نے اسی سرد مہری کے ساتھ جواب دیا: جی ہاں، کئی ماہ سے بعض دفعہ تو حالت مایوس کن ہو گئی۔ اب بھی وہ کون سی اچھی ہے، میں تو اسے لب گور ہی سمجھتا ہوں۔

اسلم بولا: اشفاق بھلا تم نے مجھے تار کیوں نہ دیا؟

وہ بولا: دیا تو تھا!

اسلم نے کہا: دیا تھا؟! — وہیں قوم کے پتے سے، اچھا چلو پہلے میں منشی صاحب کا گلا دباتا ہوں پھر بشارت گنج چلتا ہوں!

سلمیٰ بول پڑی: بس آ کر لڑ لیجئے گا۔ یہ کون سا موقع لڑائی کا ہے۔ چلئے میں بھی چلتی ہوں!

اشفاق دوسرے کونے میں اپنا بستر کھول رہا تھا۔ اسلم نے کہا: تمہارا چلنا مناسب نہیں۔ یہ تمہاری توہین ہے، میں تمہاری توہین کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ اشفاق کا برتاؤ دیکھ چکی ہو، اس کی ماں کا برتاؤ اس سے بھی زیادہ بُرا ہوگا۔ تم یہیں رہو میں دو دن میں واپس آجاؤں گا۔ اگر وہ اچھی ہوئی تو اسے دیکھ کر اور اگر بیمار ہوئی تو اپنے ساتھ لے کر!

پھر اس نے اشفاق سے کہا: بستر کیوں کھول رہے ہو چلو!

اس نے بستر کھولتے کھولتے جواب دیا: کپڑے بدلنا ہیں، سوٹ تکلیف دے رہا ہے، معلوم ہوتا ہے سارا بدن جکڑا ہوا ہے۔ چلنا تو بہرحال صبح ہی کو ہوگا۔ گاڑی سات بجے صبح جاتی ہے!

اشفاق کی باتوں سے اور اس کے غیر ہمدردانہ رویّے سے سلمیٰ کو بڑا دُکھ پہنچا تھا! یہ بات وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس خاندان کا ایک فرد اسلم ہے اس میں اشفاق جیسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں بہرحال مہمانداری اس پر فرض تھی اور آج منّی بھی گرم تھی۔ فلاقند آیا ہوا رکھا تھا۔ انڈے کا خاگینہ اس نے جلدی سے تیار کر لیا۔ گھر میں جو کچھ پکا ہوا تھا وہ جلدی سے نکالا۔ اور سب چیزیں ایک ٹرے میں جما کر لپ جھپ لے آئی۔ اتنے میں اشفاق کپڑے بدل چکا تھا اور اسلم کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ سلمیٰ نے کہا: کھانا کھا لیجیے، ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا!

اشفاق سنبھل کر کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔

اسلم نے پوچھا: انجمن اب کیسی ہے؟

وہ لقمہ توڑتا ہوا بولا: ویسی ہی ہے، میرا تو اس نے اٹھنا بیٹھنا مشکل کر دیا ہے کہ بھائی جان کو لاؤ جا کر کسی طرح!

اسلم سے پھر نہ رہا گیا۔ پوچھا: لیکن زیادہ بیمار تو نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے، کہ حالت خطرناک تو نہیں ہے؟

اشفاق نے جواب دیا: دونوں باتیں ہیں۔ حالت بھی خطرناک ہے اور بیمار بھی زیادہ ہے!

سلمیٰ بول پڑی : علاج کس کا ہے، ڈاکٹر کا یا حکیم کا؟
اشفاق نے جواب دیا: حسب ضرورت ہر کسی کا!

(۳)

گردش

—

اشفاق جب تک بھی بیٹھا کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ پھر وہ سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اقبال بڑی دیر کا سو چکا تھا۔ سلمیٰ نے ایک دفعہ پھر کہا: کتنا اچھا ہوتا اگر آپ مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ شاید میں کچھ کام آسکتی!

اسلم نے جواب دیا: مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا، لیکن ایک ایسی جگہ لے جانا جہاں کوئی بھی خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم نہ کرے میں پسند نہیں کرتا۔ میں تو اشفاق کو بڑا اچھا آدمی سمجھا کرتا تھا لیکن اب تو وہ بھی مجھے کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا ہے! — آخر شادی کرکے میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے۔ اور یہ کون ہوتے ہیں میری شادی پر اعتراض کرنے والے؟

وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی: ممکن ہے انجمن بھی کرے!

بڑے تیقّن کے لہجے میں اسلم نے کہا: ناممکن — وہ میری پسند کو کبھی ناپسند

نہیں کر سکتی، دیکھ لینا مجھ سے زیادہ تمھاری قدر و منزلت کرے گی ۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ روز کے لئے اپنے ساتھ لیتا آؤں گا!

جوش و خروش کے ساتھ تائید کرتی ہوئی وہ بولی: ہاں ضرور!

اسلم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: لیکن اب اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ منشی صاحب سے رخصت لے سکوں، صبح سات بجے گاڑی چھوٹ جاتی ہے اور وہ نو بجے کے بعد سو کر اٹھتے ہیں۔

وہ بولی خط لکھ دیجئے اقبال کے ہاتھ بھیج دوں گی۔ وہ دے آئے گا جا کر!

وہ کہنے لگا: بات تو ٹھیک ہے یہی کر دوں گا۔ مگر منشی صاحب بہت خفا ہوں گے کہ نوکری کرتے دیر نہیں اور چھٹی مانگتے دیر نہیں، لیکن معاملہ ایسا ہے کہ اس کے سوا چارہ بھی نظر نہیں آتا۔

فیصلہ کن لہجے میں بولی: ظاہر ہے!

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اسلم نے منشی صاحب کے نام کچھ لکھ کر ایک ہفتے کی رخصت طلب کی اور لفافے میں بند کر کے سلمیٰ کو دے دیا۔ وہ خط لیتی ہوئی بولی: لیکن کرایہ کے علاوہ بھی تو روپے کی ضرورت پڑے گی وہاں اتنے دنوں کے بعد جا رہے ہیں، پھر انجمن کو ساتھ بھی لانا ہے۔ روپیوں کا کیا ہوگا؟ ۔۔ کم از کم سو روپے تو ہونا چاہئیں آپ کے پاس!

اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا: میری جیب کافی بھاری ہے ۔۔ ارجمند خاں سے ملاقات نہیں ہوئی ان کی ساری رقم یوں ہی رکی ہوئی ہے وہ کام آئے گی۔

وہ سہمگیں انداز میں کہنے لگی: ہاں یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن سمندر خاں اگر

باربار تقاضا کرنے لگا تو کیا ہوگا؟ ــــ ایسا کیجئے ــــ بتائیے کتنے روپے ہیں۔ آپ کے پاس؟

اسلم نے جیب الٹ دی، دیکھ لو!

سلمٰی نے اس میں سے سو روپے کا ایک نوٹ لے لیا۔ اور بولی: ایسا کیجئے ارجمند خاں کے نام بھی ایک خط لکھ دیجئے معذرت کا، اس میں یہ سَو والا نوٹ رکھ دیجئے کہ اس وقت یہ قبول کرلے باقی کا واپس آکر بندوبست کر دیا جائے گا!

کچھ سوچتا ہوا بولا: بڑی عقل مند ہو۔ کیا راہ سجھائی ہے، ٹھیک ہے۔ ابھی خط لکھے دیتا ہوں!

پھر باقی روپے اٹھاتے ہوئے اس نے تیس روپے سلمٰی کو دے دیئے۔ یہ تم احتیاطاً اپنے پاس رکھ لو!

وہ تکلف کرتے ہوئے بولی: اس وقت رہنے دیجئے۔ میں تو یہ سو روپے ارجمند خاں کے بھی نہ لیتی، لیکن کیا کروں، وہ ٹھہرا ایک ہی وحشی، اس سے آپ کے پیچھے کون بھگتے گا!

اسلم نے وہ تیس روپے نہیں اٹھائے: انھیں اپنے پاس رہنے دو اب بھی میرے پاس سو روپے سے زیادہ ہیں اور یہ کافی ہیں۔

سلمٰی نے کہا: عشا کی نماز تو رہ ہی گئی۔ میں نماز کی تیاری کرتی ہوں آپ سو رہیئے صبح جلدی اٹھنا ہے!

اسلم بستر پر چادر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ سلمٰی نے سوال کیا: یہ تو بتائیے آپ

کب پہنچیں گے بشارت گنج ؟

وہ بولا : دو بجے ۔۔۔ کیوں ؟

وہ کہنے لگی : تو کھانا پکا کر ساتھ کر دوں گی ۔ راستے کا کھانا اچھا نہیں ہوتا !

مگر یہ تجویز اس نے نہیں مانی ، کہنے لگا : کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ دو بجے ہم گھر پہنچ جائیں گے ، وہیں کھائیں گے تم بس ناشتہ کرا دینا !

سلمیٰ وضو کرنے لگی اور وہ ذرا دیر میں سو گیا ۔

صبح ۵ بجے وہ اٹھ بیٹھی ۔ جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا ۔ اس اثناء میں نماز بھی پڑھ لی ۔ پھر اس نے اسلم کو اٹھایا ، بس سو چکے اٹھئے اب !

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا سلمیٰ بولی انھیں (اشفاق کو) بھی اٹھا دیجئے ! پونے چھ بجے ہیں ، آپ لوگوں کو منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے یہاں سے چھ سوا چھ بجے روانہ ہو جانا چاہیئے !

اسلم نے اشفاق کو بھی اٹھایا ۔ اور یہ لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھیک سوا چھ بجے گھر سے چل پڑے ، وقت اگرچہ بہت کم تھا لیکن اتنی مختصر سی مدت میں سلمیٰ نے ناشتے کے لئے کئی چیزیں تیار کر لی تھیں تاکہ دو بجے تک کسی کو بھی بھوک نہ ستائے ۔ اقبال انھیں اسٹیشن تک پہنچانے جانے کے لئے بضد تھا لیکن اس کی چلی نہیں ۔ نہ اس کی یہ بات سلمیٰ نے مانی نہ اسلم نے !

کوئی ۹ بجے کے قریب سلمیٰ اقبال کو لے کر لفافے دینے کے لئے تانگے میں بیٹھ کر دفتر چلی ۔ دفتر کے قریب اس نے تانگہ رکوا دیا ۔ اور لفافہ اقبال

کے ہاتھ میں دے کر کہا: جاؤ منشی سجاد حسین کا نام پوچھ لینا، انھیں یہ دے آؤ ـــــ ذرا جلدی آجانا!

وہ لفافہ لے کر قوم کے دفتر میں پہنچا اسے فوراً ہی منشی صاحب کے حضور میں بھیجا دیا گیا۔ منشی صاحب نے ایک نظر اس کے سراپا پر ڈالی اور ذرا گھورتے ہوئے سوال کیا: کون ہو تم؟

اس نے اپنا نام بتا دیا۔ اور ساتھ ہی لفافہ سامنے رکھ دیا۔ لفافے پر اپنا پتا پڑھ کر پوچھا: کس کا خط ہے یہ؟

اقبال نے بتایا: بھائی جان کا ـــــ وہ بشارت گنج گئے ہیں!

منشی صاحب خط پڑھے بغیر سب کچھ اقبال ہی سے معلوم کر لینے پر تُلے ہوئے تھے۔ بشارت گنج؟ بھائی جان کون ہے؟ ارے تم کس کا خط لے کر آئے ہو بھائی؟

بھائی جان کا نام لیتے ہوئے وہ اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ یہ بدتمیزی تھی۔ اس نے رکتے رکتے کہا: پڑھ لیجئے!

منشی صاحب نے لفافہ چاک کیا، پڑھا اور بُرا سا منہ بنا کر سوال کیا تشریف لے گئے؟

اقبال نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا: جی ہاں صبح سات بجے کی گاڑی سے گئے ہیں۔

منشی صاحب نے گھنٹی بجائی۔ منیجر صاحب تشریف لائے۔ ان کی طرف اسلم کا خط پھینکتے ہوئے کہا: ملاحظہ فرمائیے اپنا کارنامہ!

منیجر صاحب نے خط پڑھا، پھر فرمایا: حضور اس میں غلام کی خطا؟

منشی صاحب نے بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ فرمایا: جب تک اسلم اس دفتر میں دوبارہ ملازم نہیں ہوا تھا اس کا ہر خط ہر بار پھاڑ پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے رہے۔ جب ملازم ہوا تو جو آدمی اس سے ملنے آیا تھا ازراہِ اخلاق و کرم گستری فوراً دردولت تک پہنچا دیا۔ کیا آپ اس سے نہیں کہہ سکتے تھے ہم کیا جانیں اسلم صاحب کہاں رہتے ہیں؟ میرا تو اسے دیکھتے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ خدا خیر کرے، چنانچہ دیکھ لیجیے وہی ہوا جس کا ڈر تھا ـــ سالنامہ آپ مرتب کریں گے یا میں؟ ـــ جائیے تشریف لے جائیے!

منیجر صاحب منہ لٹکائے ہوئے تشریف لے گئے۔ اتنے غصے میں تھے کہ اگر بس چلتا اور بس تو چل سکتا تھا۔ اگر روزگار کا سوال نہ ہوتا تو مزاج درست کر دیتے آقائے ولی نعمت کا! ان کے جانے کے بعد منشی صاحب کو احساس ہوا ارے یہ جاسوس چھوکرا تو یہیں کھڑا ہے اور یقیناً جاکر پوری رپورٹ دے گا لیکن تیر نکل چکا تھا، اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہت جھلائے ہوئے انداز میں فرمایا۔

عجیب لڑکے ہو ـــ جاتے کیوں نہیں؟

اقبال چلا آیا۔ سلمیٰ کے پاس پہنچا، اس نے خبر لی کیا سو گئے تھے؟ اس نے ساری روداد سنا دی، وہ ہنسنے لگی۔ تانگہ پھر آگے چلا اور ارجمند خاں کے ہوٹل کے سامنے جاکر رک گیا۔ ارجمند خاں دروازے پر کھڑے سمندر خاں کا انتظار کر رہے تھے۔ جسے نہایت غصے میں انھوں نے اسلم کے پاس بھیجا تھا۔ ادھر تانگہ ذرا ہٹ کر فٹ پاتھ کے پاس رکا، ادھر سمندر خاں اچھلتا کودتا واپس آیا۔

اور اس نے اطلاع دی:

گھر میں تالا لگا ہے، کوئی نہیں ہے۔

ارجمند خاں کے حواس جاتے رہے: اندھا کہیں کا! کس کے گھر پہ چلا گیا تھا؟ اسلم کے گھر پہ تالا کیسے لگ سکتا ہے، اس کا بیوی بھی تو ہے!

اتنے میں سمندر خاں کی نظر تانگے پر اور اس طرف آتے ہوئے اقبال پر پڑی۔ اس نے چپکے سے سلمیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ اسلم کا بیوی ہے۔ پھر اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے: یہ اس کا بیوی کا بھائی ہوتا ہے؟

ارجمند خاں حیران و پریشان تانگے میں بیٹھے ہوئے "اسلم کا بیوی" کو اور اپنی طرف آتے ہوئے "اس کا" بھائی کو دیکھنے لگے۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اتنے میں اقبال آگیا۔ اس نے لفافہ ارجمند خاں کی طرف بڑھایا۔ ارجمند خاں نے جھپٹ کر لفافہ لیا اور اسے کھول کر دیکھا تو معذرت نامہ اور سو روپے کا نوٹ! سمندر خاں کو خوفناک نظروں سے دیکھ کر فرمایا: گدھے کا بچہ کھڑا کیا دیکھ رہا ہے۔ اس کا بیوی کے لئے چائے لے جاؤ! ساتھ بسکٹ بھی!

پھر اقبال سے کہا: اپنا آپا سے بولو (سو روپے کا نوٹ واپس کرتے ہوئے) اسے خرچ کر لو۔ جب اسلم آئے گا ہم لے لے گا!

اقبال نوٹ واپس لے کر واپس گیا اور فوراً ہی واپس آیا۔ اس نے کہا آپا سلام کہتی ہیں اور کہتی ہیں آپ کی مہربانی کا شکریہ! اگر ضرورت ہوئی تو آپ سے پھر منگا لیں گے۔ آپ تو ہمارے بھائی ہیں!

منیجر صاحب ن عرشِ معلیٰ پر پہنچ گیا۔ ہاں بھائی ہے۔ منگا لینا،

منشی صا

اس دفتر... واپس گیا اور تانگہ میں بیٹھ کر بہن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ارجمند خاں
کی ڈلہن کے جوش میں اتنے بہکے کہ یاد ہی نہ رہا چائے کے لئے سمند رخاں سے
ہے ہیں وہ ٹھیک اس وقت ایک ٹرے چائے اور سامانِ متعلقہ سے سجی
ی لے کر باہر نکلا جب تانگہ نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ارجمند خاں نے اس کی
ھ کر رسیا کس کر گھوت لگایا کہ سمند رخاں اور ٹرے کی ٹوٹی ہوئی اور بکھری
ئی چیزوں کے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔

---

(۴)

وہی کہانی غم کی!

راستے بھر دونوں میں کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی، کئی بار اسلم کا جی چاہا کہ اشفاق سے باتیں کرے لیکن اس کا طرزِ عمل دیکھ کر دل بجھ گیا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ انجمن کی بیماری، علاج اور کیفیت کے بارے میں تفصیلات معلوم کرے مگر لب کھل نہ سکے۔ سوچا اب تو وہاں جا ہی رہا ہوں خود انجمن ہی سے پوچھ لوں گا سب کچھ!

وقتِ مقررہ پر گاڑی بشارت گنج پہنچ گئی۔ ڈھائی بجے کے قریب یہ لوگ گھر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے کلثوم سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اسلم نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ کہا: آداب بجا لاتا ہوں ممانی جان!

انھوں نے تند نظروں سے دیکھا "جیو!" کہہ کر جدھر سے آئی تھیں اسی طرف چلی گئیں۔ اسلم نے سوچا: اگر سلمیٰ بھی آگئی ہوتی تو اس اخلاق اور شرافت کو دیکھ

کر کیا گزر رہا تھی اس کے دل پر۔ اپھر اس نے اشفاق سے پوچھا: انجمن کہاں ہے
مجھے وہاں لے چلو!

اشفاق نے چلتے چلتے کہا: وہیں چل رہے ہیں۔

یہ اچھا خاصا بڑا گھر تھا، کئی دالان در دالان، وسیع اور کشادہ صحن دو صحنچیاں، کئی بڑے بڑے کمرے، ڈیوڑھی الگ، ڈیرا جدا کمھٹے پر، دو کمرے الگ بنے ہوئے تھے ـــــ یہی انجمن اور اشفاق کا نشیمن تھا۔

کوٹھے پر پہنچنے کے بعد اشفاق نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
آپ چلیے، میں بہت تھک گیا ہوں غسل کر کے ابھی آیا!

اسلم نے یہ باتیں اچھی طرح سنیں بھی نہیں۔ تیر کی طرح بہن کے پاس پہنچا۔ وہ بستر پر پڑی دروازے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ پاس ہی اس گھر کی ایک خانہ زاد بڑھیا کریمن بیٹھی تھی۔

اسلم کو دیکھتے ہی کمزور اور نحیف آواز میں جوشِ مسرّت سے مدہوش انجمن کے منہ سے نکلا بھیا!

اسلم لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر پیار بھرے لہجے میں سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا: ہاں انجمن میں آگیا ـــــ کیسی ہو تم؟

وہ بولی: اچھی ہوں!

کریمن نے کہا: دیکھ تو رہے ہو کیسی ہے؟

اسلم نے غور سے دیکھا تو دیکھ کر ششدر رہ گیا، اس کا جی چاہا کہ چیخ کر اعلان کر دے، اور کریمن کے منہ پر تھپڑ مار کر کہہ دے: جھوٹ ـــــ یہ انجمن نہیں ہے۔

اور پھر نیچے اترے اور کلثوم کا گریبان پکڑ کر پوچھے : میری انجمن کہاں ہے؟

اور پھر اشفاق سے سوال کرے : تم نے کیا کیا میری انجمن کو؟

یہ چارپائی پر پڑی ہوئی ۔۔۔ یہ بستر سے لگی ہوئی نحیف و نزار لڑکی انجمن تھی! آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، گوشت کا کہیں پتا ہی نہیں۔ بس استخوان ہی استخوان! ۔۔۔ انجمن اپنی خوب روئی میں یکتا تھی، جس کی رعنائی کا جواب نہ تھا۔ جو ہر وقت بلبل کی طرح چہکتی رہتی تھی۔ جس کے دلآویز ہونٹوں پر ہر وقت تبسّم رقصاں رہتا تھا۔ جو بجلی کی طرح اِدھر سے اُدھر کوندا کرتی تھی۔ جس کی طبع بذلہ پسند کسی کو چھیڑنے سے باز نہ آتی تھی۔ جو ہمہ نشاط، ہمہ مسرّت، ہمہ شوخی تھی ۔۔۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟

لرزتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا : تمھیں کیا ہو گیا ہے انجمن؟

وہ مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی : اچھی ہو جاؤں گی بھیّا!

اسلم نے بچّوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا : لیکن تم بیمار کیوں پڑیں؟

وہ مسکرانے لگی، اس نے کہا : لوگ بیمار کیوں پڑتے ہیں؟

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا : لیکن تمھیں بیمار نہیں پڑنا چاہیئے تھا۔

وہ پھر ذرا کے ذرا مسکرائی اور کہنے لگی : اچھا معاف کر دیجیے اب نہیں پڑوں گی کبھی بیمار!

ان الفاظ میں اسلم کو بدشگونی نظر آئی۔ اس نے ڈانٹا خبردار ایسی باتیں نہیں کیا کرتے؟

انجمن نے کریمن کی طرف دیکھا اور بولی : بھیّا کے لئے کھانے کا بندوبست تو کر

دیکھیے۔

وہ چڑکر بولی، جاتی ہوں، دیکھتی ہوں کیا ہوتا ہے؟

اسلم نے کہا: کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صبح کا ناشتہ بھی کافی کر لیا تھا۔ ابھی تو ذرا بھی بھوک نہیں ہے!

وہ خاموش ہو گئی، پھر کہنے لگی کتنے خط لکھ ڈالے میں نے آپ کو مگر ایک کا جواب بھی نہیں دیا۔ جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔

اس خفگی میں کتنی بے اندازہ مسرت پنہاں تھی۔ اسے اسلم نے محسوس کر لیا اس نے کہا: لیکن یقین کرو مجھے ایک خط بھی نہیں ملا۔ قسم لے لو میں جھوٹ نہیں بولتا۔

وہ پُر اعتماد لہجے میں بولی: قسم کی کیا ضرورت ہے ٹھیک ہی کہتے ہوں گے آپ! ــــ لیکن خود آپ نے بھی تو کوئی خط نہیں لکھا۔ کیا خود سے نہیں لکھنا چاہیے تھا ــــ؟

جذباتی انداز میں اس نے کہا ہاں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ بے شک میں کوئی خط نہیں لکھ سکا!

لیکن کیوں؟ ــــ یہی تو پوچھ رہی ہوں؟

ویسے ہی جذباتی طور پر اسلم نے کہا: انجمن تم اپنے بھائی کی معذوریاں مجبوریاں اور ناچاریاں کیا جانو۔ وہ کون دن تھا جب تمہیں خط لکھنے کا ارادہ نہیں کیا، لیکن یہی سوچتا رہا کچھ ہوئے کچھ بھیج دوں تو خط لکھنے کے کچھ معنی بھی ہیں ورنہ ممانی جان مجھے بھی گالیاں دیتیں۔

قبل اس کے انجمن کچھ کہہ سکے کرمین بول پڑی : اور ویسے کون سی تعریفیں کرتی ہیں۔

انجمن کو یہ بات بُری لگی اس نے ٹوکا : کرمین تم چُپ رہو۔ ہر معاملے میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔

وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتی، ہوئی خاموش ہوگئی۔ لیکن کرمین کی مداخلت اور انجمن کی روک ٹوک سے اس نے اندازہ کرلیا کہ معاملہ دگرگوں ہے کچھ!

کرمین کسی کام سے نیچے گئی تھی۔ ذرا دیر میں سر کھجاتی واپس آئی اور اسلم سے کہا : چلو بھیا بلایا ہے، کھانا کھالو چل کر۔

انجمن نے کہا : یہیں لے آتیں تو کیا ہوجاتا؟

اسلم نے یقین دلانے کی کوشش کی : سچ مجھے ذرا بھی بھوک نہیں ہے اس وقت ورنہ پھر رات کو فاقہ کرنا پڑے گا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اشفاق آگیا۔ اس نے کہا : چلئے اماں بلا رہی ہیں کھانا کھا لیجئے۔

بھوک تو مجھے ابھی ہے نہیں۔ اسلم نے پھر معذرت کی۔

اس نے کہا : اچھا چائے پی لیجئے۔

وہ اشفاق کے ساتھ نیچے اترا۔ صحن میں ایک چارپائی پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے کلثوم بی بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ پٹی کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر چائے، بسکٹ اور دوسرے لوازمات رکھے تھے۔ اِدھر اُدھر کرسیاں اشفاق اور اسلم کا انتظار کر رہی تھیں، دونوں آئے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کلثوم

نے ایک نظر اسلم پر ڈالی : ماشاء اللہ صحت تو اچھی ہے۔

یہ سُن کر اسلم کو ایک عجیب طرح کی کوفت ہوئی۔

گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کوئی چھوٹا پردیس سے واپس آتا ہے تو گو کتنا ہی موٹا تازہ اور تندرست ہو دیکھتے ہی بے ساختہ پکار اُٹھتی ہیں۔ کتنا دُبلا ہو گیا ہے بے چارہ۔ اور یہاں صورتِ احوال یہ تھی کہ غمِ روزگار اور غمِ زمانہ نے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے تھے۔ دُبلا پن انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور کلثوم بی اس کی تندرستی کو نظر لگانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ جواب میں اس نے کہا : جی ہاں خدا کا شکر ہے!

وہ اسی طرح چھالیہ کترتے کترتے بولیں : ایک یہ ہیں ہمارے اشفاق کسی طرح بوٹی چڑھتی ہی نہیں۔

اس انکشاف نے اُسے اور زیادہ متحیر کر دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ اشفاق کی صحت اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ نگاہ کا یہ فرق کیا معنیٰ رکھتا ہے کہ دُبلا موٹا اور موٹا دُبلا نظر آنے لگے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کلثوم بی بولیں : اب تو ماشاء اللہ گھر بھی بسا لیا تم نے ــــ چاند سی دُلہن لے آئے۔

کچھ جھینپتے ہوئے وہ گویا ہوا۔ جی ہاں کچھ حالات ہی ایسے تھے!

دفعتہً کلثوم بی کا موڈ بدل گیا۔ چھالیا کی ڈلیا ایک طرف رکھ کر اور سروتہ دوسری طرف ٹیک کر بولیں : لیکن بھیّا بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں!

وہ سمجھ گیا یہ خطرے کا الارم ہے لیکن اس نے کہا ضرور فرمائیے۔

ارشاد فرمایا : اپنے عیش و عشرت میں کچھ بہن کا بھی خیال رکھا ہوتا۔ ایسا بھی خون سفید نہیں ہوتا۔ یہ تو معلوم ہے لڑکی کتنم پر بھار دھنی بھاروں نہ ہوتی تو یوں

ننگی لوچی کیوں بیاہ دیتے۔ شمسہ سے اشفاق کی شادی ہوتی ہزاروں کا جہیز آتا یہاں ایک لوٹا اور ایک گلاس بھی نہ ملا۔ خیر ہمیں اس کا گلا نہیں جس کا جیسا نصیب ہوتا ہے ویسا پاتا ہے لیکن میں تو صاف کہتی ہوں کسی پر اتنا بوجھ بھی نہ ڈالنا چاہئے کہ وہ چیخ اٹھے۔

پورے صبر وضبط کے ساتھ اسلم نے یہ کڑوے گھونٹ پی لئے۔ کوئی تلخ بات جواب میں نہیں کہی۔ اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ اشفاق میٹھا یہ باتیں ایک غیر جانب دار تماشائی کی طرح سُن رہا تھا۔ بہرحال جواب میں اس نے عرض کیا ممانی جان!

لیکن ممانی جان میں زیادہ سُننے کی تاب کہاں تھی، جل کر بولیں: بھاڑ میں جائیں تمھاری ممانی جان — بھیا ہم تو تمھاری بہن کا علاج کراتے کراتے تھک گئے۔ وہ نہ آج اچھی ہوتی ہیں نہ کل۔ حکیم کی فیس الگ، ڈاکٹر کی فیس جُدا۔ دواؤں کے دام مزید۔ پھر غذا کا اہتمام سب پر بالا۔ اس طرح تو قاروں کا خزانہ بھی ختم ہو جائے گا اور خیر سے صاحبزادی نہ آج اچھی ہوتی ہیں نہ کل!

اپنے جذبات کو ضبط کرتے ہوئے اس بے رحم عورت سے اس نے کہا: کیا آپ کے خیال میں انجمن مکر کر رہی ہے؟

وہ تنک کر بولیں: یہ تو میں نہیں جانتی لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ اگر اتنا علاج قبر کے کسی مُردے کا کیا گیا ہوتا تو وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

اسلم نے کچھ کہنا چاہا مگر موقع نہیں ملا۔ کلثوم بی نے فرمایا: انسان لاڈ پیار اور چاؤ سے بہو اس لئے گھر میں لاتا ہے کہ اس سے رونق ہو گی۔ وہ ساس کا ہاتھ

بٹائے گی، شوہر کی خدمت کرے گی، گھر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ بچے ہوں گے نئی زندگی ابھرے گی۔ مگر یہاں تو بس خدا کا نام ہے۔ اولاد تو خیر کیا ہوگی۔ ہماری تو کمر ٹوٹ گئی دوا دارو کرتے کرتے۔ ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے بعض وقت تو خیال آتا ہے کہ میں بہو نہیں لائی ہوں بلکہ سفید ہاتھی پال لیا ہے میں نے!

یہ دل خراش باتیں سن کر اسلم کا خون کھول گیا لیکن ضبط کر گیا۔ اس نے کہا وہ آئی تو اس لئے تھی کہ آپ کا ہاتھ بٹائے، اشفاق کی خدمت کرے گھر کا انتظام سنبھالے لیکن بیماری اور صحت تو خدا کی طرف سے ہے۔ آدمی کب بیمار پڑے گا اور یہ بیماری کتنی مدت لے گی، کون بتا سکتا ہے؟

اور پھر لاکھ ضبط کرنے کے بعد بھی اس کے منہ سے نکل گیا، اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اس طویل بیماری کا راز یہ ہے کہ اس کا صحیح علاج ہی نہ ہو سکا۔

جیسے بارود میں کسی نے آگ لگا دی ہو، چک کر بولیں، اچھا یہ بات ہے۔ بھائی کو دیکھتے ہی بہن صاحبہ نے پرپرزے نکالنا شروع کر دیے۔ بیٹھ گئیں شکایتوں کا پلندا لے کر، واہ بھئی یہ بھی خوب رہی ۔۔ الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا اچھا بھئی ہم نے کچھ نہیں کیا۔ یخنی نہیں پلائی، پھل نہیں کھلائے، پھلوں کا رس نہیں پلایا ڈاکٹروں کی لکھی ہوئی کالے بازار میں بکنے والی پیٹنٹ دوائیں نہیں منگائیں تم ہی کر لو یہ سب کچھ، آخر بھائی ہو کچھ تمہارا فرض بھی تو ہے۔

اب تک وہ چائے کا صرف ایک ہی گھونٹ پی سکا تھا۔ پیالی ایک طرف کو کھسکاتے ہوئے اس نے کہا: مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لے جاؤں گا اپنے ساتھ بشرطیکہ آپ اجازت دے دیں۔

گویا پناہ مانگتی ہوئی بولیں۔ ہاں ہاں لے جاؤ بھئی شوق سے لے جاؤ۔ یہاں کس نے روک رکھا ہے انھیں۔ تم بھائی وہ بہن۔ جب تک جی چاہے لے جاکر رکھو کبھی ہمیں بھی بلا لینا، تمھاری دلہن کو بھی دیکھ لیں گے۔

اسلم اٹھ کھڑا ہوا: بہت اچھا کل میں روانہ ہو جاؤں گا انجمن کو لے کر۔

کلثوم بی نے پھر چھالیہ کی ٹوکری اپنی طرف بڑھالی۔ سروتا اٹھایا اور کام شروع کر دیا۔ اشفاق بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا: اماں جی میں ذرا سیر کو جا رہا ہوں۔

اشفاق سیر کو چلا گیا۔ اسلم اوپر پہنچا۔ انجمن سو رہی تھی۔ کریمن نے بتایا ابھی آنکھ لگی ہے۔ نیند تو جیسے اڑ گئی تھی۔ یہ تمھارے قدموں کی برکت ہے۔ دیکھو کیسی میٹھی نیند سو رہی ہے!

اسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک آرام کرسی اٹھائی اور سامنے برآمدے میں جاکر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس وقت نہ جانے کیسے کیسے خیالات آرہے تھے ذرا دیر میں کریمن آکر کھڑی ہو گئی ——— اور بغیر کسی تمہید کے اس نے تقریر شروع کر دی:

اے بھیا! ایک ہی تو بہن ہے، کیوں اسے بھیڑیوں کے بیچ میں ڈال رکھا ہے سچ کہتی ہوں ایک دن مر جائے گی۔ اور پھر زندگی بھر روؤ گے۔

اسلم کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے کہا یہ کیا کہہ رہی ہو کریمن؟

وہ بولی: جھوٹ نہیں کہتی، یہ لڑکی ہیرا ہے ہیرا۔ لیکن اس گھر میں کنکر بھی نہیں ہے۔ کون سا ظلم ہے جو اس پر نہ ٹوٹتا ہو!

اسلم نے بے قابو ہو کر کہا ظلم!؟

وہ کہنے لگی: ہاں بیٹے! ظلم۔ شوہر اور ساس کی خدمت میں اس نے اپنے آپ کو ستی کر دیا، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ بیمار پڑگئی۔ بیمار پڑی تو کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ اوّل تو جب تک ہو سکا خود اس نے اپنی بیماری چھپائی۔ اور کام کرتی رہی۔ لیکن جب بے بس ہو گئی تو پڑ گئی۔ پڑی تو طعنوں کے تیر چلنے لگے۔ نہ دوا کا انتظام نہ پرہیز کا بندوبست نہ آرام کی فکر، کبھی مرحوم ماں کو جلی کٹی سنائی جا رہی ہیں۔ کبھی مرحوم باپ کو اور کبھی زندہ بھائی کو، کبھی خود اُسے۔ ماں کی تحقیر، باپ کی تحقیر بھائی کی تحقیر، یہ کچھ کہ وہ برداشت نہیں کر سکی۔ کمرے میں آ کر مُنہ ڈھانپ کر گھنٹوں اور پہردں چپکے چپکے رویا کرتی۔ مگر نہ اس کے کوئی آنسو پونچھنے والا تھا نہ خبر لینے والا۔ ہائے بیٹے کیا کہوں کیسے کیسے ظلم سہے ہیں اس غریب نے۔ لیکن واہ ری لڑکی! کبھی جو پلٹ کر بھی جواب دیا ہو۔ کبھی جو شکایت کی ہو۔

اسلم نے مداخلت کی لیکن اشفاق نے یہ سب باتیں کیسے برداشت کر لیں:

وہ تو محبت کرتا ہے اس سے!

کریمن نے زہرخند کرتے ہوئے کہا۔ محبت! ——

وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا!

اسلم نے متحیر نظروں سے اُسے دیکھا۔ اور سوال کیا: کیا کہنا چاہتی ہو تم مقصد کیا ہے تمھارا؟

وہ بولی: مقصد کیا ہوتا، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، جیسی ماں ویسا بیٹا۔ ہاں فرزانہ ــــ خدا اسے جیتا رکھے الگ ہے سب سے!

اسلم نے پوچھا: تمھارا مطلب یہ ہے کہ اشفاق اس سے محبت نہیں کرتا؟

وہ بولی: کرتا تھا، مگر اب نہیں کرتا، وہ چار دن کی چاندنی ختم ہو گئی۔ اب تو اندھیری رات ہے، چاروں کھونٹ اندھیرا، اب تو اس پر شمسہ کا بھوت سوار ہے اور دیکھ لینا بہت جلد اس گھر میں وہ بہو بن کر آجائے گی۔ بی بی (کلثوم) نے اشفاق کو بھتیں لینے بھیجا اسی لئے تھا کہ آؤ اور انجمن کو لے جاؤ اور پھر یہاں نئی نویلی دلہن آجائے باجے گاجے کے ساتھ، ڈولے میں بیٹھ کر ۔ لیکن بھیا مجھے بھی لیتے چلنا ساتھ۔ میں انجمن ہی کے ساتھ رہوں گی۔

کریمن کی باتیں ماننے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن جو کچھ اس مختصر سی مدت میں اپنی آنکھوں سے اس گھر کے اخلاق دیکھ اور سن چکا تھا۔ اس کی بنا پر یقین کئے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا:

شاید اشفاق کے طرز عمل نے انجمن کو بیمار ڈالا ہے!

وہ بولی: کہہ تو چکی سب ہی ایک سے ہیں۔ ماں ہیں اُن کے یہ لچھن کہ جو للّاحیاں سنانا شروع کیں تو صبح سے شام تک مشین کی طرح زبان چلتی رہتی ہے اشفاق کا شروع میں تو یہ حال تھا کہ انجمن کو دیکھ کر جیتا تھا۔ اور اب اس کی صورت سے بیزار ہے۔

لیکن کس جرم میں، کس خطا پر؟

بیٹے جرم کو پوچھتے ہو تو وہ ایک ہی ہے ــــ غربت ــــ انجمن اگر امیر گھرانے کی ہوتی تو سجدے کئے جاتے اسے غریب ہے اس لئے ہر طرف سے حقارت کی نظریں پڑ رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اندھیر کیا ہوگا کہ شوہر تک دغا

دینے اور موت لانے پر تُلا ہوا ہے۔ محبت کرنے والا شوہر ــــ میں پوچھتی ہوں کیا کمی ہے انجمن میں ــــ صورت شکل دیکھو تو ہزاروں میں ایک ــــ سلیقہ دیکھو تو سب سے الگ ــــ شرافت اور انسانیت دیکھو تو آدمی نہیں فرشتہ محنت اور خدمت دیکھو تو کیا گھر کا کوئی نوکر اتنا کام کرے گا جتنا بیمار پڑنے سے پہلے تک وہ کرتی رہتی تھی۔ صبر و ضبط دیکھو تو واہ وا۔ ساس کے طعنے، شوہر کی جھڑکیاں، نوکروں کی بدتمیزیاں سب گوارا۔ کیا مجال جو کسی کو الٹ کر جواب دیا ہو۔ بھیا! میں تو اس گھر کی پروردہ ہوں۔ فرزانہ میری گود میں کھیلی ہے، اشفاق کو میں نے پالا ہے۔ یہاں کی وفادار حبشن میں تھی کوئی نہ تھا۔ لیکن انجمن کا سبھاؤ دیکھ کر، اسے دیکھ کر اب میں دنیا میں کسی کی نہیں ہوں سوا اس کے۔ بھیا اگر اسے زندہ رکھنا چاہتے ہو تو لے چلو یہاں سے!

لے چلوں گا کریمن! کل ہی ہم جا رہے ہیں!

(خوش ہو کر) سچ؟ ــــ تو کیا مجھے بھی لے چلو گے؟

ہاں ضرور! لیکن کیا تمہیں اجازت مل جائے گی؟

مل جائے گی، نہ ملے گی تو نوکری چھوڑ دوں گی۔ اس زمانے میں کوئی کسی کو زبردستی نہیں رکھ سکتا۔

(کچھ سوچتے ہوئے افسردگی کے عالم میں) لیکن انجمن نہیں جائے گی یہاں سے۔

(گھور کر) کیوں نہیں جائے گی؟

وہ نہیں جائے گی۔

لیکن خدا کی بندی کیوں؟

میں نے ہزاروں مرتبہ اسے سکھایا پڑھایا، لیکن وہ تو ایک ہی بات پر اڑی ہے۔ میں تو اس گھر سے مرکر نکلوں گی، جس کے پلّے بندھ چکی بندھ چکی۔ اپنے پریشان حال اور آشفتہ روزگار بھائی پر بوجھ نہیں ہوں گی۔ وہ نہ معلوم کس طرح زندگی بسر کر رہا ہے میں بھی اس پر جا کر پڑ جاؤں یہ نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ شمسہ کو بیاہ لائیں گے بیاہ لائیں، وہ میرا کیا کرے گی۔ اب کیا رہ گیا ہے میرے پاس جو چھن جائے گا؟

خیر اسے ساتھ لے چلنے کی تو ایک بڑی عمدہ تدبیر ہے میرے پاس —
لیکن سوال یہ ہے کہ اشفاق کس طرح بدل گیا؟

بیٹے! یہ نہ پوچھو!

کیوں نہ پوچھوں بوا کریمن یہ تو بڑا اہم سوال ہے۔

شروع میں تو اشفاق نے خوب خوب چاہت دکھائی لیکن ماں (کلثوم) بڑی ہوشیار ہیں۔ انھوں نے کچھ اس طرح جال ڈالا کہ آخر وہ پھنس ہی گیا۔

میں نہیں سمجھا کریمن۔

پتھر پر بھی اگر پانی پڑتا رہے تو اسے گھس دیتا ہے، حالانکہ پتھر اور پانی کا کیا مقابلہ! جب ہر وقت صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اس کے سامنے انجمن کے بہتر سے بہتر کاموں میں کیڑے ڈالے جانے لگے اور شمسہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جانے لگے تو وہ بھی ماں کی نظر سے دیکھنے اور ماں کے دماغ سے سوچنے لگا۔ ایک طرف یہ سب کچھ مکاریاں اور دوسری طرف شمسہ

بھائی سے یارانہ کرادیا، وہاں ہر وقت دعوتیں اڑنے لگیں، ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آخر اس نے بھی سوچا، ثمسہ اگر بیوی بن کر آجائے تو گھر کی قسمت چمک جائے گی۔ انجمن سے کیا ملا؟ نہ زیور نہ سامان، پھر ایمان کی بات یہ ہے کہ ثمسہ صورت شکل میں بھی بُری نہیں ہے۔ ہماری انجمن ٹھیریں گھر کی گڑیا۔ نہ کہیں آنے کی نہ جانے کی ___ نہ کسی سے ملنے کی نہ جُلنے کی۔ وہ ایک تیز طرّار محفلوں میں آنا جانا۔ ایک سے ایک جوڑا جو بیچاری انجمن نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ان کپڑوں اور زیوروں میں سچ پوچھو تو گدھی بھی شہزادی معلوم ہونے لگے گی۔ وہ تو ہماری انجمن ہے جو معمولی سوتی کپڑوں میں بھی چاند کی طرح چمکتی ہے۔

کریمن کے خیالاتِ پریشاں کا سلسلہ ابھی کچھ اور جاری رہتا لیکن اسلم کے لئے صبر و سکون کے ساتھ ان باتوں کا سُننا دشوار ہوگیا۔ اس نے کہا بس کرو کریمن میرے دماغ کی رگیں پھٹی جارہی ہیں۔ میں اب اس سے زیادہ نہیں سُن سکتا۔ کچھ اور سُناؤگی تو ایک آدھ کی لاش اٹھے گی اس گھر سے!

کریمن سہم کر ایک دم خاموش ہوگئی۔ کچھ سوچتے ہوئے اسلم نے کہا:

اشفاق اں سے اجازت لے کر سیر کو کہیں گیا ہے میرے خیال میں ثمسہ ہی کے یہاں گیا ہوگا۔

لاشوں کا ذکر سُن کر کریمن نے چُپ رہنے کا عہد کرلیا تھا، لیکن اس سوال کے بعد قائم نہ رہ سکی۔ کہنے لگی ہاں اور کہاں جائیں گے؟

اسلم نے پوچھا: ثمسہ کے بھائی کا کیا نام ہے۔ ماں کا کیا نام ہے، باپ کا کیا نام ہے کیا کام کرتے ہیں اور یہ لوگ رہتے کس محلّے میں ہیں؟

وہ بولی، رہتے ہیں ایک محلہ ہے قاضی پورہ وہاں۔ باپ کا نام ہے زاہد علی انجینئر ہیں۔ بھائی کا نام ہے عابد علی، وکالت پاس کی ہے اس نے۔ ماشاء اللہ رشوت کے روپے سے گھر پٹا پڑا ہے۔ سنا ہے عابد کی وکالت بھی خاصی اچھی چل چل رہی ہے۔

تو ان لوگوں کو اشفاق کے علاوہ کوئی اور داماد نہیں جڑتا ...؟

داماد تو ایک سے ایک مل سکتے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ اس کی حیثیت ایک خانہ داماد کی سی ہو۔ سوچتے ہیں کلثوم بی کے انتقال کے بعد لڑکا ہمارے گھر اٹھ آئے گا۔ اور اس شرط پر اڑے ہیں کہ لڑکی رخصت نہیں کی جائے گی۔

کیا یہ شرط ممانی نے مان لی؟

یہ شرط؟ — وہ ہر شرط ماننے کو تیار ہیں، جب کبھی اس جہیز کا ذکر کرتی ہیں جو شمسہ اپنے ساتھ لائے گی تو باچھیں کھل جاتی ہیں۔ پہلے تو ایک شرط یہ بھی تھی کہ انجمن کو طلاق دے دی جائے۔ لیکن فرزانہ اڑ گئی کہ ہمارے ہاں کبھی کسی کو طلاق نہیں دی گئی۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا۔ فرزانہ بٹیری ایک منہ پھٹ اس سے سب کی کور دبتی ہے۔ آخر یہ سوچا گیا کہ تمھیں بلا کر انجمن تمھارے حوالے کر دی جائے اشفاق یہی خوش خبری سنانے گیا ہوگا کہ انجمن کے رخصت کرنے کا بندوبست ہو گیا — یعنی تم آ گئے۔

پھر آخر انجمن سے شادی رچانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ہی شمسہ سے کیوں نہ کر لی تھی؟

وہ تو ہو گئی ہوتی لیکن اشفاق مچل گیا، اکلوتا لڑکا، آخر ماں کو ہتھیار

ڈالنا پڑے لیکن یہ انھوں نے اسی دن طے کر لیا تھا کہ شمسہ آئے گی اور آ کر رہے گی۔ اس گھر میں اشفاق کی چاہت بچوں کا کھیل تو تھی ہی، اس عمر میں محبت نہیں ہوتی میاں محبت کا سوانگ رچایا جاتا ہے، سو وہ سوانگ اچھی طرح رچا لیا گیا۔

اتنے میں انجمن کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کمزور اور نحیف آواز میں کرمین کو آواز دی۔ اسلم اور کرمین دونوں فوراً۔ . . . . برآمدے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ انجمن نے پوچھا: آپ وہاں کیوں بیٹھے تھے؟

کرمین نے جواب دیا: تم سو جو گئی تھیں!

وہ شکوہ کناں بھائی سے کہنے لگی: تو مجھے جگا کیوں نہ لیا؟

اسلم پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا: کیوں جگا لیتا؟ سوتے سے جب کبھی جگایا ہے ہمیشہ بگڑ گئی ہو! کیا آج بھی خفا کر لیتا تم کو؟

وہ مسکرانے لگی۔ اسلم نے کہا: کیوں انجمن تمھارا اپنی بھابی سے ملنے کو جی نہیں چاہتا؟

انجمن نے حیرت سے اسلم کی طرف دیکھا اور پوچھا: بھابی ——؟ بھیا کیا آپ نے شادی کر لی —— کب؟ مجھے کیوں نہیں بلایا؟

اور پھر جواب سُنے بغیر رونے لگی۔

اسلم نے پیار سے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: میری اور اپنی بھابی کی کتھا تو سُن لو۔

اور پھر اس نے ساری رام کہانی سُنا دی۔

انجمن سُنتی رہی ـــ اس کی شکایت رفع ہو گئی۔

اسلم نے کہا: اسی لئے آیا ہوں کہ چند روز کے لئے تمھیں لے چلوں۔ آب و ہوا بھی بدل جائے گی اور سلمیٰ کو بھی دیکھ لو گی۔ گویا ایک پنتھ دو کاج! تو پھر چلو گی نا؟

اس نے مسکراتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا دی اور کریمن متحیّر رہ گئی کہ یہ ضدّی لڑکی کتنی آسانی سے بھائی کی باتوں میں آکر رام ہو گئی۔

بارہا اس نے مشورہ دیا تھا، صلاح دی تھی کہ یہاں سے بھاگ چلو۔ یہ خونی لوگ تمھیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی اور اب اسلم کے ایک جُملے میں ساری ضد ختم!

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ انجمن نے کریمن سے پوچھا: کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی؟

وہ بولی: لے چلو گی تو ضرور چلوں گی، خود ہی چھوڑ جاؤ تو بات دوسری ہے۔

اسلم نے کہا: لے چلیں گے بھائی۔ تم نے انجمن کی جس محبت اور اپنایت سے خدمت کی ہے اور کر رہی ہو اس کا اندازہ اس ذرا سی دیر میں ہو گیا۔

انجمن بولی: کریمن کی تعریف میں کچھ کہنا اُس کی توہین کرنا ہے۔ سچ بھیّا ایسی محبّت والی عورت آج تک میں نے نہیں دیکھی! اُسے مجھ سے اتنی ہی محبّت ہے جتنی ایک ماں کو بیٹی سے ہو سکتی ہے۔

کریمن کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں ۔ وہ کہنے لگی : اب تو اس دنیا میں میرے لئے تم ہی ہو جو کچھ بھی ہو ۔

اتنے میں کلثوم کی آواز آئی :

اری کریمن کی بچی کتنی دیر سے پکار رہی ہوں ۔ جواب کیوں نہیں دیتی ۔ کیسے کیسے نمک حراموں سے پالا پڑا ہے ۔

کریمن بڑبڑاتی ہوئی نیچے چلی گئی ۔ انجمن نے آنکھیں نیچی کر لیں ۔ اسلم سگریٹ سلگانے لگا !

---

(۵)

پھر وُہی کنجِ قفس!

زندگی میں کبھی بھی اسلم کو اتنا بڑا صدمہ نہیں پہنچا تھا جتنا اشفاق کی تبدیلی سے پہونچا! وہ انجمن کی طرف سے مطمئن تھا کہ اسے قسمت سے محبت کرنے والا شوہر مل گیا ہے۔ عیش کرے گی، زندگی سکھ اور چین سے بسر کرلے جائے گی۔ اپنی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ ہر طرح بسر کرسکتا تھا فٹ پاتھ پر بھی، آرام دہ فلیٹ میں بھی۔ بھوکا رہ کر بھی اور شکم سیر ہوکر بھی اور اسی طرح کر بھی رہا تھا۔ پھر یک بیک حالات نے ایسی کروٹ لی کہ اسے ایک کنبے کا کفیل ہوجانا پڑا۔ ایک چھوٹے سے خاندان کا سرپرست۔ ایک محرومِ تمنّا اور مایوس آرزو لڑکی کا شوہر۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی، لیکن اس سے انکار کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ چاروناچار اُسے یہ ذمہ داری قبول کرنا پڑی!

اور آج ایک اور ذمّہ داری کا اضافہ ہوگیا تھا ــــ انجمن!

اس ذمہ داری کو بھی وہ قبول کرنے پر مجبور تھا!

اگر سلمٰی کی ہمدردی میں وہ اپنا داؤں لگا سکتا تھا تو انجمن کے لئے سلمٰی کو بھی قربان کر سکتا تھا!

یہ مایوس و مغموم، افسردہ اور مضمحل، اداس اور پژمردہ لڑکی — انجمن، جو اس کے ساتھ جارہی تھی اپنا سب کچھ لٹا کر کوچ پر آمادہ ہوئی تھی، جب یہاں آئی تھی تو اس کے پاس سب کچھ تھا، محبت کے بعد کسی چیز کی ضرورت بھی کب باقی رہ جاتی ہے — اور اب یہاں سے دامن جھاڑ کر چلی ہے تو اس طرح کہ اپنی سب سے قیمتی پونجی کھو کر، اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا، سوا غمِ آرزو کے سوا حسرتِ ناکام کے!

کاش اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی!

کاش اشفاق اس کی زندگی میں داخل نہ ہوا ہوتا!

اسے کیا بُرا لگتا مرتا اگر ایک بار ہوتا!

کوئی چیز نہ ملے تو اتنا غم نہیں ہوتا، لیکن ملے اور چھن جائے، پھر غم کی انتہا نہیں رہتی!

جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ شمسہ سے اشفاق کی شادی ہوگئی تو کیا گزر جائے گی اس پر؟ پھر اس کے سیلِ اشک کو، اس کے ہجومِ غم کو روک سکنا کس کے بس میں ہوگا!؟

بے شک وہ زبان سے کچھ نہیں کہے گی، حرفِ شکایت سے اس کے لب آشنا نہیں ہوں گے، کسی کے سامنے اپنے غم کا اظہار بھی نہیں کرے گی لیکن اس کا

دل روتا رہے گا! اس کی روح چیختی رہے گی، اس کے سینے سے آہوں کا دھواں اٹھتا رہے گا — میں یہ منظر دیکھوں گا اور کچھ نہ کر سکوں گا! — اور کر بھی کیا سکتا ہوں!

ریل فراٹے بھرتی، چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی اور اسلم کھڑکی سے لگا بھاگتے ہوئے نظاروں کی دید میں مصروف تھا۔ لیکن اس کا دل کہیں اور تھا! دماغ کہیں اور تھا، وہ خود نہ جانے کہاں تھا! — انجمن کی سونی اور اجڑی ہوئی محفل میں، جہاں کبھی قہقہے تھے اور اب سناٹا تھا!

آخر منزلِ مقصود آ گئی اور اسلم کرمین اور انجمن کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ سلمیٰ نے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے، ایسی پذیرائی، ایسی خاطر، ایسی خدمت کی کہ سگی بہن ہوتی تو اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ دونوں نے ایسا محسوس کیا جیسے آج تک وہ بہن سے محروم تھیں اب ایک بہن مل گئی!

اس منظر سے اسلم کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو گیا۔ اسے یقین تھا سلمیٰ کے اس برتاؤ میں نہ مصلحت کارفرما تھی نہ تصنع نہ وقتی جوش۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صادق جذبے ہیں اور اگر انجمن کی زندگی بھر یہاں رہی تو زندگی بھر قائم رہے گا!

سب سے پہلے اسلم نے سلمیٰ سے منشی سجاد حسین اور ارجمند خاں کا ماجرا پوچھا۔ سلمیٰ نے پوری تفصیل سنا دی! اس نے کہا خان زبان کا کڑا ہے لیکن دل کا بہت اچھا آدمی ہے۔ منشی صاحب کے اس اضطراب اور ہیجان پر سلمیٰ کے ساتھ اسے بھی ہنسی آ گئی۔ پھر مختصر طور پر انجمن کی روداد اسے سنائی۔ جسے وہ دلی اندوہ کے ساتھ سنتی رہی۔ اس نے کہا: یہاں نہ صرف انجمن کا دل ہی نہ دکھنے پائے گا بلکہ

میں اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کروں گی، گو ہم دونوں تقریباً ہم عمر ہیں، لیکن میں آج سے اسے اپنی لڑکی سمجھوں گی۔ اپنی ممتا اس کے لئے وقف کر دوں گی، اب اسے بشارت گنج جانے کی ضرورت نہیں ہے، اب وہ یہیں رہے گی۔ پہلے وہ کھائے گی پھر ہم لقمہ توڑیں گے۔ پہلے وہ پہنے گی پھر جو بچے گا تو ہماری باری آئے گی۔ اس گھر میں اس کی حیثیت ایک خورد کی سی ہے، ہم دونوں سے رشتے میں چھوٹی ہے لیکن آج سے وہی بڑی ہے، اسی کا حکم چلے گا اور اسی کے فرمان پر سب سر جھکائیں گے!

یہ باتیں سن کر اسلم کے دل میں ایک طرح کا احساسِ فخر پیدا ہوا جس بدقسمت کو ایسی رفیقۂ حیات مل جائے اس کے خوش قسمت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے! اس نے تشکر اور ممنونیت کی نظروں سے سلمیٰ کو دیکھا اور کہا: تمھارا جواب نہیں ہے سلمیٰ!

وہ ہنستی ہوئی بولی: ہر بات میں میرا ذکر لے کر نہ بیٹھ جایا کیجئے!

دن اسی طرح بیت گیا، یہاں آتے ہی سلمیٰ کی حالت میں کافی تغیر ہو گیا! سلمیٰ کی چاہت نے جو اس کے لئے بالکل نئی اور خلافِ توقع چیز تھی اس کے دل کو مسرت سے معمور کر دیا، وہ ڈرتی ہوئی آئی تھی کہ دیکھئے نئی بھابی سے کیسی بنتی ہے کیونکہ اس نے سن رکھا تھا اور جانتی بھی تھی کہ بھابیاں اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے عام طور پر ساس سے کم نہیں ہوتیں، وہ ڈر رہی تھی کہیں سلمیٰ بھی کلثوم ثابت نہ ہو، لیکن اس کا اندیشہ غلط نکلا اور اپنا اندیشہ غلط نکلنے پر اسے بہت خوشی ہوئی!

رات کے کھانے کے بعد اسلم انجمن کے کمرے میں آیا۔ وہ بستر پر لیٹی تھی۔ کرمین پاس بیٹھی تھی، اس نے پوچھا: انجمن کوئی تکلیف تو نہیں ہے تمھیں؟

وہ مسکراتی ہوئی بولی: بہت زیادہ ہے بھیّا!

اسلم نے بھی مسکراتے ہوئے سوال کیا تو بتا بھی دو کیا ہے وہ تکلیف!؟

وہ زیرِ لب تبسّم کے ساتھ گویا ہوئی: بھابی ضرورت سے زیادہ میرے آرام کا خیال رکھتی ہیں، جب سے آئی ہوں اس مختصر سی مدّت میں کم سے کم دس پھیرے تو کر گئی ہوں گی۔ کبھی آئیں بستر ٹھیک کر گئیں، کبھی آئیں کھانا سامنے رکھ گئیں۔ کبھی آئیں میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں بیٹھ کر، اس طرح تو میں نہ جانے کیا سمجھنے لگوں گی اپنے آپ کو؟

سلمیٰ بھی پاس کھڑی تھی، وہ ہنسنے لگی، اس نے کہا انجمن تم اچھی ہو جاؤ اور خدا نے چاہا تو بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی پھر سمجھوں گی تم سے، کہہ لو جو چاہو!

اسلم نے کہا: اچھا بھئی ہم چلے!

انجمن نے پوچھا: اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ، بھیّا!

وہ بولا: لوگ جب سوتے ہیں تب ہمارے کام کا وقت ہوتا ہے، اخبار کے دفتر میں جا رہا ہوں، دو بجے تک کام کروں گا۔ تین بجے تک یہاں پہنچوں گا! چار بجے تک کہیں نیند آئے گی!

وہ مُنہ بنا کر کہنے لگی: چھوڑ دیجیے ایسی نوکری؟

اسلم نے ایک قہقہہ لگایا: چھوڑ دوں ــــ سوچا تو میں نے بھی کئی مرتبہ ایسا ہی تھا، تمھاری بھابی کی بھی یہی رائے تھی، لیکن اب اس خیال کو پاس بھی پھٹکنے

کی اجازت نہیں دے سکتا!

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا، لیکن دفعتہً خیال آیا کہ انجمن جیسی حساس لڑکی کے سامنے اس طرح کی باتیں نہ کرنی چاہئیں! سلمیٰ نے بھی آہستہ سے چٹکی لے کر اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا، پھر اس نے کچھ نہیں کہا سوا اس کے کہ اب صبح ملاقات ہوگی۔ شب بخیر، اور چلا گیا!

دفتر پہنچا تو منشی سجاد حسین بہ نفس نفیس کرسیٔ ادارت پر رونق افروز اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے یعنی خبریں بنا رہے تھے۔ کیونکہ خبروں کا ترجمہ کرنا یا اُن پر تبصرہ کرنا اُن کے لئے بڑا کٹھن کام تھا، خبر سازی آسان کام تھا اور نفع بخش بھی تھا، جس کی پگڑی اچھلتی تھی وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کر دیتا تھا۔

اسلم کو دیکھتے ہی منشی صاحب کا دل حزیں باغ باغ ہو گیا، لیکن خوشی کے بجائے برہمی کا اظہار فرمایا: شکر ہے فرصت مل گئی آپ کو!

اسلم نے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک ہفتہ کی رخصت طلب کی تھی لیکن دو دن میں آ گیا۔ آج ہی پہنچا ہوں، آرام بھی نہیں کیا۔ کھانا کھایا اور سیدھا حاضر ہو گیا، اب بھی خفا ہیں آپ؟

وہ ناک سے چشمہ اتارتے ہوئے بولے: خفا تو خیر کیا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ سالنامہ میں دو دن کی یہ تاخیر اسے دو ہفتے لیٹ کر دے گی!

اسلم نے اطمینان دلایا: ایسا نہیں ہوگا! سالنامہ ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہو سکتا!

منشی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، کرسیٔ ادارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: آیئے بیٹھئے۔

اور خود اٹھ کر زنان خانہ میں تشریف لے گئے!

ذرا دیر کے بعد اوپر سے طلبی ہوئی وہ فوراً بالاخانے پر پہنچا۔ منشی صاحب کے سامنے ایک بڑی سی بالٹی میں بہت سے تخمی آم برف میں ڈوبے ہوئے رکھے تھے اور وہ اُن سے شوق کر رہے تھے، پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ منشی صاحب اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ ذرا بھی متوجہ نہ ہوئے اس کی طرف، ایک ایک آم کے چوسنے اور پھر اس کی گٹھلی کو دانتوں سے کھرچنے میں کائی ریاضن کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کیا میں اس لئے طلب کیا گیا ہوں کہ منشی صاحب آم چوسیں اور میں گنوں!

کوئی پون گھنٹے بعد یہ مشغلہ ختم ہوا، فوراً ہی دودھ سے بھرا ہوا ایک لمبا چوڑا گلاس پیش کیا گیا۔ اسے اس سرعت سے پیا جیسے کئی دن کے پیاسے ہیں!

اس کے بعد بستر پر لیٹ کر اور توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا: اسلم صاحب! یہ اقتدار حسین نہیں مانتا کسی طرح، اس کی خبر لینا ہے!

مولوی اقتدار حسین شہر کے ایک نیک اور صالح عالم دین تھے، ھقد بیوگان کی حمایت میں انھوں نے تقریروں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع کر رکھا تھا منشی صاحب کی چھوٹی بہن جو بیوہ بھی تھیں اور لاولد بھی، مولانا سے غیر معمولی عقیدت رکھنے لگی تھیں اور ان کے وعظ اکثر سارے کام چھوڑ کر سننے جایا کرتی تھیں، اسی خبر نے منشی صاحب کو مولانا کا لاگو بنا دیا تھا، اسلم نے کہا: لیکن مولانا کا جرم؟

منشی صاحب نے فرمایا: شریف خاندانوں کی رسوائی کا درپے ہے جو عقد بیوگان کی کھلم کھلا حمایت کر رہا ہے کیا یہ چیز برداشت کی جا سکتی ہے؟

اسلم کو لطف آنے لگا، اس نے پوچھا: تو آپ کے نزدیک عقد بیوگان ناجائز ہے

منشی صاحب تلملا گئے: ناجائز کیوں ہوتا، شرع نے جائز کیا ہے تو ہم ناجائز کرنے والے کون؟ لیکن اس مسئلے کی آڑ لے کر شریف بہو بیٹیوں کو ورغلانے کا اس شیطان نے جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی!

اسلم نے کہا: لیکن مولانا کوثر نقوی صاحب بھی اپنا مقتدا مانتے ہیں!

منشی صاحب لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے، پھر لیٹ گئے اور ذرا دیر میں نغیر خواب بلند کرنے لگے۔ اسلم مسکراتا ہوا پھر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا!

---

(۶)

پنہاں تھا دامِ سخت

چند ہی روز میں انجمن کی صحت کسی حد تک بحال ہو گئی۔ سلمیٰ نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دی بلکہ ہر طرح خوش و خرم رکھنے کی بھی پوری کوشش کی۔

سلمیٰ نے چند ہی روز کے بعد محسوس کر لیا تھا کہ انجمن ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس لئے اور زیادہ اس کی دیکھ بھال رکھتی تھی کہ اسے جہاں تک ہو سکے خوش رکھے۔ آنے والے بچے کے خیر مقدم کی تیاریاں اس نے زور شور سے شروع کر دی تھیں۔ کھانا پکانے اور امورِ خانگی سے جو وقت بچتا تھا وہ بچے کے کپڑے سینے میں صرف ہوتا تھا۔ بہت سے کپڑے نئے نئے رنگ اور جدید اجدید ڈیزائن کے۔ جب وہ کوئی لباس تیار کرتی تو دوڑی دوڑی انجمن کے پاس پہنچتی اور پوچھتی: کیوں انجمن یہ ٹھیک رہے گا؟

اس سوال کے بعد کچھ ایسی شوخ نظروں سے اُسے دیکھتی اور مسکراتی کہ وہ چڑ جاتی۔ دل میں خوش ہو کر اور بظاہر خفا ہو کر کہتی: میں نہیں جانتی!

وہ پھر چھیڑتی۔ کیسے نہیں جانتیں، یوں تو کلیجے سے لگائے لگائے پھرو گی اور ویسے یہ نخرے۔ بس بی یہ باتیں بری لگتی ہیں مجھے!

وہ اور زیادہ تلملا کر جواب دیتی: لگا کریں!

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ اسلم بدستور "قوم" کے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ سالنامہ اس نے ٹھیک وقت پر نکال دیا۔ ایسا شاندار کہ جو دیکھتا کہتا ہاں یہ ایک چیز ہے۔ لیکن ایک مرتبہ بھی ایسا حسنِ اتفاق پیش نہیں آیا کہ مقررہ تاریخ پر کوئی تنخواہ مل گئی ہو۔ کبھی دس کبھی بیس، کبھی پچاس، اسی طرح ٹکڑے ہو ہو کر ملتی۔ اس طرح ہر مہینے میں کچھ رقم منشی صاحب پر چڑھ جاتی، جس کے متعلق منشی صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ ضرور وقت پر ملے گی اور ایک ایک پائی ملے گی۔ بس ذرا حالات سازگار ہو لیں، ذرا فلاں بل مل جائے، ذرا فلاں بل مل جائے، فلاں جگہ رکی ہوئی رقم وصول ہو جائے۔ حالات تو خیر سازگار تھے ہی مگر جب فلاں بل مل جاتا اور فلاں جگہ رکی ہوئی رقم وصول ہو جاتی تو کسی "بے حد ضروری" کام میں خرچ ہو جاتی اور وہ پھر وعدۂ فردا پر ٹال دیا جاتا۔ نہ ہونے سے کچھ ہونا اچھا ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر ان وعدہ خلافیوں اور زیادتیوں کے باوجود بھی وہ کام کئے جا رہا تھا۔ اب تک خبریں بنانے کا کوئی کام منشی صاحب نے اس سے نہیں لیا تھا یہ کام وہ خود ہی کرتے تھے، اس بات سے بھی وہ مطمئن تھا کہ اتنے دن ہو گئے لیکن ضمیر اور اصول کے خلاف کم از کم اپنے قلم سے اس نے کچھ

نہیں لکھا اور نہ لکھنے پر اسے مجبور ہونا پڑا۔

اشفاق کی شادی شمسہ سے ہو چکی تھی اور اس حادثۂ جاں گداز کی اطلاع بھی انجمن کو مل گئی تھی۔ سلمیٰ نے تو چاہا تھا اسے بے خبر رکھا جائے اور اسلم بھی تیار ہو گیا تھا لیکن فرزانہ نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس نے ہمدردی اور محبت سے بھرا ہوا خط لکھا تھا جس میں اسے صبر کی تلقین اور حوصلے کے ساتھ قسمت کے اس وار کو برداشت کر لینے کی تلقین کی تھی! اس نے لکھا تھا:

"میں نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی، نسیم بھی نہیں گئے، ہم دونوں کو اشفاق کی تلوّن مزاجی اور اماں جی کی زرپرستی سے جتنا صدمہ ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن بہن مقدر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اتنی خوبیوں اور اچھائیوں کے باوجود، تمہارے نصیب میں سوت کا غم اور شوہر کی بے وفائی لکھی تھی۔ بھلا قدرت کا قلم کون پکڑ سکتا ہے؟ وہ جو چاہتا ہے لکھتا ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے واقعہ بن جاتا ہے!"

فرزانہ کے اس خط نے انجمن کا بارِ غم ہلکا کر دیا، ظاہر ہے یہ واقعہ اس کے لئے حد درجہ غم انگیز تھا، لیکن کبھی کبھی الفاظ بھی کسی حد تک مرہم کا کام کر جاتے ہیں اس وقت بھی ایسا ہی ہوا لیکن اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اشفاق کو اپنی صورت کبھی نہیں دکھائے گی۔ اب وہ کلثوم کے گھر میں کبھی قدم نہیں رکھے گی۔ وہ شمسہ کا سامنا کرنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتی تھی!

لیکن یہ فکر بھی دامنگیر تھی کہ اپنا بوجھ پریشان حال بھائی پر کس طرح ڈالوں

اس نے سوچا ایک چھوٹا سا مکتب گھر میں کھول دوں اور محلّے کی لڑکیوں کو پڑھا دیا کروں، اس طرح کم از کم میں اپنا بوجھ تو اٹھاؤں گی۔ اس ارادے کا اظہار اسلم یا سلمیٰ سے نہیں کیا، لیکن فیصلہ کر لیا کہ یہ کام ضرور کرنا ہے ـــ ابھی نہیں، وہ ہستی جو عالمِ وجود میں آنے کے لئے مچل رہی ہے نمودار ہو لے۔ اس کے بعد!

اور اس ہستی کے عالمِ وجود میں آنے کے دن قریب آتے جا رہے تھے!

ایک روز دو بجے رات کو جب اسلم "قوم" کے دفتر سے واپس آیا تو خلافِ معمول سلمیٰ کو جاگتے ہوئے پایا، پوچھا: تم اب تک جاگ رہی ہو ـــ خیریت؟

وہ کہنے لگی: کیا کروں، دن میں اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا، میں نے سوچا آج اسی وقت سہی!

وہ کچھ پریشان سا ہو گیا، سوال کیا: کوئی خاص بات ہے؟

وہ بولی: ہاں خاص ہی تو ہے۔ انجمن بہت جلد ایک بچّے کی ماں بننے والی ہے شاید ایک ہفتے میں، شاید دس روز میں۔ لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گی!

اسلم نے کپڑے بدل کر بستر پر لیٹتے ہوئے کہا: یہ تو ایک خوشخبری ہے، بچّے سے اس کا دل اور بہل جائے گا۔ بہت ممکن ہے وہ غم جو اشفاق کی بےاعتنائی سے پہنچا ہے ختم ہو جائے!

وہ گویا ہوئی: یہ تو ٹھیک کہتے ہیں آپ، لیکن زیادہ سے زیادہ کفایت سے کام لیا جائے تو بھی کم سے کم دو ڈھائی سو روپے اس سلسلے میں خرچ ہوں گے۔ اور آپ کے منشی صاحب کا یہ حال ہے کہ کبھی پانچ پر ٹرخا دیا کبھی دس پر، اس طرح

لشٹم پشٹم گھر کا روزمرّہ کا خرچ تو چل جاتا ہے لیکن زچگی کے مصارف تو نہیں چل سکیں گے۔

اسلم نے فکرمند چہرہ بنا کر کہا: یہ تو ٹھیک کہتی ہو! ـــ پھر؟

وہ بولی: پھر یہ کہ جس طرح بھی ہو روپیہ وصول کیجیے!

اسلم نے سر کھجاتے ہوئے کہا: اب تک تو مجھے ارجمند خاں کی فکر تھی بیچارے نے ایک مرتبہ بھی اب تک تقاضا نہیں کیا۔ اور میرے نزدیک اس سے بڑا تقاضا نہیں ہو سکتا۔ سوچ رہا تھا جس طرح بنے اس کی باقی رقم بھی ادا کر دوں مگر تم نے ایک نیا مسئلہ سامنے لا کھڑا کیا؟!

وہ کہنے لگی: جو کچھ بھی ہو اور جس طرح بھی ہو یہ کام تو کرنا ہی ہے کسی نہ کسی طرح!

اسلم بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی تیاری کرتا ہوا بولا: ہاں بھئی کریں گے:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر!

سلمیٰ نے ٹوکا: صرف شعر و شاعری سے کام نہیں چلے گا۔ تین چار دن میں رقم جمع ہو جانی چاہئے میرے پاس۔ یہ نہ ہو کہ ادھر درد شروع ہوں اُدھر اقبال آپ کو اطلاع دینے جائے اور اس وقت آپ دوڑ دھوپ شروع کریں! ہونا یہ چاہیے کہ جس وقت بھی ضرورت محسوس ہو ہم تیار رہیں!

وہ جھلا گیا: ـــ اگر یہ بات تھی تو مہینہ بھر پہلے کیوں نہ بتایا۔ وقت کے وقت بتانے سے کیا حاصل؟

وہ بولی: مجھے خود کوئی واقفیت تو ہے نہیں، اب تک تو لیڈی ڈاکٹر یہی کہتی رہی ابھی دیر ہے۔ آج اچانک یہ کہہ دیا کہ اسی ہفتے عشرے ہی میں کچھ نہ کچھ ظہور میں آجائے گا! ـــ آخر منشی صاحب ہماری چڑھی ہوئی رقم کیوں نہیں دیتے؟

آپ ان سے مرد بن کر کیوں بات نہیں کرتے؟

اسلم نے زہر خند کرتے ہوئے کہا: مرد بن کر بات کس طرح کی جاتی ہے؟ کیا تمھارا مطلب یہ ہے کہ منشی صاحب کی ٹھکائی کروں؟ دو چار طمانچے لگا کر تجوری کی کنجی چھین لوں۔ سلمیٰ! تم نہیں جانتیں جس طرح محنت کرنا ایک فن ہے اسی طرح محنت کا معاوضہ وصول کرنا بھی ایک فن ہے! اور اپنی بدقسمتی یہ ہے کہ پہلا فن تو جانتا ہوں لیکن دوسرے سے ناواقف ہوں! ورنہ کوئی بات تھی کہ رقم وصول نہ ہوتی اور میں کچھ نہ کر سکتا۔ مجھ سے وہ معذرت کر دیتے ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ جھوٹ بول رہے ہیں مجھے ان کا جھوٹ مان لینا پڑتا ہے، اتنا کمزور طبع شخص اس قابل ہے کہ ٹھوکریں ہی کھائے بھیک مانگے اور اپنے قرض خواہوں سے پٹے!

(۷)

انسان

منشی سجاد حسین کی خاص ادا یہ تھی کہ کام کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتے تھے اور کام نکل جانے پر یوں آنکھیں پھیر لیتے تھے کہ جیسے کبھی کی شناسائی تھی نہ ملاقات!

جب تک سالنامہ نہیں نکلا تھا اور اسلم اس کی تیاریوں میں شب و روز مصروف تھا منشی صاحب کی زبان اس کی مدح سرائی کے لئے وقف تھی۔ وہ ان کا عصائے پیری تھا، قوتِ بازو تھا، دست راست تھا، آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا قابلیت میں یکتا، ذہانت میں فرد اور انشاپردازی میں اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن سالنامہ جب توقع سے زیادہ شاندار طور پر شائع ہو گیا تو وہ اسلم کو اس طرح بھول گئے جیسے وہ ایک فالتو مد تھا۔ پہلے اس کے بغیر کام چلنا مشکل تھا اور اب کون کام تھا جو بغیر اس کے نہ چل سکتا تھا!؟

منشی صاحب کی اس خود غرضی اور مفاد پرستی سے اسلم اچھی طرح واقف تھا!

لہٰذا جب اس کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے تب بھی اس نے کوئی خاص خوشی محسوس نہیں کی، اور جب وہ فراموش کر دیا گیا تب بھی اسے کوئی صدمہ نہیں ہوا، دل میں پہلے بھی ہنستا تھا اور اب بھی ہنستا رہا!

انجمن کی زچگی کا زمانہ بالکل قریب آ گیا تھا۔ ہر وقت اندیشہ تھا کہ اب درد شروع ہوئے اور اب شروع ہوئے۔ لیکن روپے کا بندوبست اب تک نہ ہو سکا تھا۔ سلمیٰ نے اپنی یا گھر کی کسی ضرورت کے لئے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا تھا لیکن اب صبح و شام اس کی زبان پر یہی مطالبہ تھا کہ خدا کے لئے روپے کا بندوبست ہوا؟ آخر آپ نے کیا سوچ رکھا ہے؟ اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیتا، کوشش کر رہا ہوں سلمیٰ۔ لیکن نہ اتنی طاقت ہے کہ دوسروں سے روپے چھین سکوں، نہ اتنی ہمت ہے کہ کہیں ڈاکہ ڈال سکوں، کوشش میں کر رہا ہوں دعا تم کرو، بے بسی کے یہ الفاظ سن کر وہ خاموش ہو جاتی۔ اسے اسلم پر ترس آتا اور ان لوگوں کا خون پینے کو جی چاہتا جن پر روپے چاہیئے تھے مگر دینے کا نام نہ لیتے تھے۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتی تھی، وہ تو اسلم سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور تھی!

آج پھر سلمیٰ نے تاکید کی تھی۔ اس نے بتایا کریمن کہہ رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے آج کا دن ٹلے گا نہیں۔ ویسے تو میں بھی ایک بے کلی سی انجمن میں محسوس کر رہی تھی مگر میں نے کریمن سے پوچھا: یہ تم نے کیسے جانا؟

وہ کہنے لگی: بیٹی بال دھوپ میں تو سفید نہیں کئے ہیں!

واقعی وہ بوڑھی اور تجربہ کار عورت ہے۔ بتائیے زچگی کا وقت سر پر آ گیا اور آپ کی جیب اب تک خالی ہے!

اس نے جواب تو کچھ نہیں دیا سیدھا دفتر پہنچا اور منشی سجاد حسین کے دربار میں حاضر ہو گیا وہ فوراً بھانپ گئے ۔ اسلم کو دیکھتے ہی ماتھا ٹھنکا، ضرور یہ تقاضے کے لئے آیا ہے ۔ ماتھے پر کچھ شکنیں ابھریں لیکن فوراً ہی ہونٹوں پر رقص کرنے والے تبسم میں تبدیل ہو گئیں ۔ اور یک بیک سنجیدگی اختیار کر کے فرمایا:

آؤ میاں اسلم دو چار جوتے تم بھی لگاؤ میرے سر پر!

یہ الفاظ سن کر دوست پٹ گیا۔ اور حیرت سے انھیں تکنے لگا "لوگ سمجھتے ہیں میرے پاس خزانۂ قارون ہے ۔ خوب مزے لوٹتا ہوں زندگی کے ۔ مگر اپنے کارکنوں کو، ملازموں کو تنگ کرتا رہتا ہوں، ان کے واجبات نہیں ادا کرتا وقت پر، حالانکہ کون بے غیرت ہوگا جو تقاضے کی ذلت برداشت کرے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ذلت میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے اسے کون مٹا سکتا ہے ۔ ابھی منیجر صاحب وارننگ دے کر گئے ہیں کہ اگر آج عملہ کی باقی تنخواہ ادا نہ کی گئی تو ہڑتال ہو جائے گی ۔ گیارہ سو روپے یہ دینے ہیں، ان سے پہلے کاغذ والے کا فون آ چکا ہے کہ خیریت چاہتے ہو تو دو ہزار سات سو روپے آج ادا کر دو ورنہ کاغذ بند ۔ شفیق پریس کے پروپرائٹر نے نئی مشین خریدی ہے ڈیڑھ ہزار کم ہیں؟ حکم دے گئے ہیں صاحب اگر ہم سے کام لینا ہے تو یہ بند و بست کرنا ہی پڑے گا آپ کو مطلب یہ کہ اخبار یا تو کسی اور پریس میں لے جاؤ ۔ ورنہ ڈیڑھ ہزار سیدھے ہاتھ سے گن دو ۔ بیگم صاحبہ کا جگر خراب ہے مسلسل علاج ہو رہا ہے ۔ ڈاکٹر نے ایک سو بہتر روپے چودہ آنہ کا بل بھیجا ہے اور مرے کو مارے شاہ مدار انکم ٹیکس والوں نے آخری نوٹس دیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر پندرہ ہزار سرکاری خزانہ

میں داخل کردو ورنہ جیل کی ہوا کھاؤ ۔۔۔ ان مصیبتوں سے چھٹکارا نہیں ہوا کہ آپ تشریف لے آئے، غالباً کچھ مطالبہ آپ کا بھی ہوگا۔ میرے کچھ پرانے وعدے یاد دلائے ہوں گے ۔ صاحب میں کچھ نہیں بھولا ہوں، ایک ایک پائی دوں گا گلے گلے پائی دوں گا۔ لیکن ان مصیبتوں سے نجات پاؤں تب ۔۔

یہ لمبی چوڑی تقریر سن کر اسلم کے حواس غائب ہو گئے۔ اسے یقین ہو گیا خواہ کچھ بھی ہو جائے منشی صاحب قابو میں آنے والے نہیں پھر بھی ہمت کر کے گویا ہوا۔

لیکن منشی صاحب میری مصیبت بھی تو آپ کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا!

منشی صاحب نے اس طرح جیسے کوئی ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتا ہے کہا: خدا کے لئے رحم کرو ورنہ زہر کھالوں گا! زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ کہ اس وقت ستر روپے میرے پاس ہیں وہ لے جاؤ علی الحساب، باقی پھر دیکھا جائے گا۔

یہ روپے جیب سے نکال کر انھوں نے سامنے رکھ دیے۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر اسلم نے بے تامل یہ رقم قبول کر لی۔

لیکن یہ رقم ضروریات کے لحاظ سے بالکل ناکافی تھی۔ کم از کم دو سو روپے اور ہونا چاہئیں، پھر اب!؟

خوب یاد آیا شفقت صاحب اس وقت یقیناً کام آئیں گے۔ کیوں نہ ان کے آستانے پر حاضری دی جائے!

یہ سوچ کر وہ سیدھا شفقت صاحب کے در دولت پر حاضر ہوا اس وقت

وہ نیازمندوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ کئی کاتب اپنے اپنے بل لئے نظرِ لطف کے امیدوار موجود تھے۔ پریس والے بھی جنھوں نے کتابیں چھاپی تھیں، جنھوں نے ٹائیٹل چھاپے تھے اس آس میں بیٹھے تھے کہ آج وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ بے چارہ بوڑھا جلد ساز ہاتھ میں بل لئے صورتِ سوال سامنے کھڑا تھا۔ انور پاس کی کرسی پر بیٹھا تھا! اسلم بھی جاکر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اس ہجومِ عاشقاں سے شفقت صاحب پر نہ ہراس تھا نہ اضطراب، کاتبوں کے بل لے کر رکھ لئے، فرمایا:

چیکنگ میں کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا۔ اس وقت جائیے!

بیچارے چپ چاپ گردن جھکا کر چلے گئے۔

پھر پریس والوں کی طرف مڑے اور ذرا تلخی کے ساتھ فرمایا: ہماری کمپنی ہزاروں روپے کا کام آپ کو دیتی ہے مگر بلوں کے لئے ایسی جلدی جیسے ہم کہیں بھاگے جاتے ہیں ـــ آپ کو آنے کی ضرورت بھی کیا ہے، چیک پہنچ جائے گا وقت پر اطمینان رکھیے!

یہ جواب اگرچہ تسلی بخش نہ تھا لیکن قبول کرنا پڑا۔ یہ لوگ بھی چلے گئے۔

اب اس پیرِ مرد کی باری آئی جس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سینکڑوں جلدیں محنتِ شاقہ کرکے اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے بنائی تھیں۔ اور اس امید میں کھڑا تھا کہ پیسے ملیں گے تو چولھا سلگے گا۔ شفقت صاحب نے "زلزلہ بر عضوِ ضعیف می ریزد" کے مصداق خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور تیکھی چتون کے ساتھ فرمایا، اب آپ یہ کام چھوڑ دیجئے!

غریب بوڑھے کے وہ ہاتھ لرزنے لگے جن میں اپنی محنتِ شاقہ کا بِل اس نے زور سے پکڑ رکھا تھا۔ اور امید و بیم کی نظروں سے اپنے آقائے ولی نعمت کی طرف دیکھنے لگا۔ ارشاد ہوا: اب آپ کی جلدوں میں وہ بات نہیں رہی جو پہلے تھی۔

یہ ایک وجدانی اعتراض تھا جس کا جواب دلیل سے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس نے کھسیں نکال دیں مگر کچھ بولا نہیں شفقت صاحب نے فرمایا: بِل چھوڑ جائیے دو تین دن بعد آ جیئے گا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے بِل سامنے رکھ دیا جو فوراً میز کے خانے میں پہنچ گیا۔ جہاں جانے والی چیزوں کو باہر نکلنے کا موقع بہت دیر میں ملا کرتا تھا، جب وہ جانے لگا تو اس کے کانوں میں آواز آئی۔ اب آپ کو پہلا والا ریٹ بھی نہیں ملے گا ـــ جیسا کام ویسے دام!

شیر سے بکری نہیں لڑ سکتی، قلب در درح کی دنیا میں اُمڈے ہوئے طوفان کو سمیٹے چپ چاپ دُعائیں دیتا چلا گیا!

ان سب سے فارغ ہونے کے بعد اسلم پر نظر توجہ مبذول ہوئی ـــ فرمائیے ـــ کوئی حکم؟

یہ منظر دیکھ کر اس کے حوصلے پست ہو چکے تھے لیکن سلمیٰ کی آواز برابر کانوں میں گونج رہی تھی۔ آخر ہمت کر کے گویا ہوا: اب حساب ہو جانا چاہیئے ناول کی رائلٹی کا!؟ ـــ مجھے ضرورت بھی بہت شدید ہے!

زہرخند کرتے ہوئے فرمایا: صاحب! ضرورت کا جہاں تک تعلق ہے کسے نہیں ہے، لیکن ہم تو اصول کے مطابق کام کرتے ہیں، اگلے مہینے آپ کا حساب ہوگا اگلے مہینے آپ کا حساب ہو جائے گا!

یہ الفاظ اتنے فیصلہ کن لہجے میں کہے گئے کہ اسلم لاکھ کوشش کے باوجود بھی کچھ نہ کہہ سکا، وہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیٹھے یا چلے کہ انور نے کہا: دیر ہو رہی ہے۔ اب رخصت کیجئے مجھے!

یہ بڑا عجیب جانور تھا۔ شہر میں اس سے بڑا، اس سے اچھا، اس سے چابکدست اور کوئی فن کار نہیں تھا۔ فرم کے سارے ڈیزائن نقشے، خاکے، لوح یہی تیار کرتا تھا ہر مہینے تین چار سو روپے کھرے کھرے وصول کر لیتا تھا۔ یہی ایک شخص ایسا تھا جس سے شفقت صاحب کی کور دبتی تھی۔ اس کے سامنے ایک نہ چلتی تھی۔ فرمایا: اچھا اس وقت سو روپئے۔

انور کڑک کر بولا: پانچسو سے ایک پیسہ کم نہ لوں گا، ابھی لوں گا اور نقد لوں گا!

یہ تیور دیکھ کر شفقت صاحب سٹ پٹا گئے۔ نرم لہجے میں بولے: بھئی اتنی رقم کا تو بل بھی نہیں ہے آپ کا؟

وہ بے پروائی سے بولا: تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ بل چار سو کا ہے رقم چاہیئے پانچسو! ورنہ ـــــــ

شفقت صاحب کا ماتھا شکن آلود ہو گیا۔ پوچھا: ورنہ کیا ہو گا؟

اس نے جواب دیا: جتنے خاکے، ڈیزائن اور ٹائیٹل بنے ہوئے اور ادھ بنے میرے پاس ہیں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گا جا کر ـــ آپ سارے بل روک لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دو دو مہینے ادائیگی نہ کریں کوئی حرج نہیں۔ پھر ریٹ میں بھی کمی ـــ یہ بھی گوارا اور اگر کبھی ہمیں کوئی ناگہانی ضرورت پیش آجائے تو آپ

آنے پائی کا حساب کرنے لگیں ؟ !

شفقت صاحب ان تلخ باتوں پرمسکرانے لگے فرمایا : معلوم ہوتا ہے واقعی بڑی سخت ضرورت ہے ۔ (شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے) اور ناگہانی بھی !

پھر غلام رسول کو بلاکر حکم دیا : بھئی انور صاحب بہت خفا ہیں ۔ لڑنے کے موڈ میں ہیں انھیں پانچسو روپے لاکر ابھی دے دو !

غلام رسول نے فوراً پانچ نوٹ لاکر تھما دیے ۔ اسلم اور انور دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے ۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا : دیکھا یوں وصول کرتے ہیں !

اسلم نے کہا : ہاں بھئی تمھارے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا ، تمھیں تو ہزار بھی دے دیتے !

انور نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا : اب مزے اڑیں گے ، نوبہار ساقی بنے گی ۔ نئی دریافت ، شاہکار ہے میرا ۔ بخدا عجیب چیز ہے ۔ چلتے ہو ؟ ۔ ارے یہ آنسو ! تم رو رہے ہو ! اسلم خدا کے لئے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے ؟

اسلم نے فوراً آنسو پی لئے ، اس نے جواب دیا : نہیں بھئی تمھیں غلط فہمی ہوئی میں بھلا کیوں رونے لگا ! زندگی ہنسنے ، قہقہے لگانے اور خوش رہنے کے لئے بنی ہے رو رو کر بسر کرنے کے لئے نہیں ، زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ خوب جی بھر کر شراب پی جائے ، مزے اڑائے جائیں ، کسی نوبہار کو ساقیٔ مہوش بنایا جائے ۔ ایسی ایسی نئی دریافتیں ہر روز ہوتی رہیں ۔ جب تک اجل کا فرشتہ سامنے آکر نہ کھڑا ہو جائے یہی کرنا چاہیئے ! ۔۔۔ جاؤ میرے دوست اپنا رستہ کھوٹا نہ کرو ۔ مے خانہ انتظار کر رہا ہوگا ، نوبہار منتظر ہوگی !

یہ کہہ کر وہ انور سے جدا ہوا۔ اور اپنے رستے چل پڑا۔ انور خاموش کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ یکایک وہ لپکا اور چند سکنڈ میں اس نے اسلم کو جا لیا۔ مضبوطی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے بولا:

اسلم تم نہیں جا سکتے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تم نے ابھی شفقت صاحب سے کہا تھا 'مجھے ضرورت بھی بہت شدید ہے!' یہ کہتے کہتے تمھارے چہرے پر بے کلی کی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ بتاؤ وہ کونسی شدید ضرورت ہے جو تمھیں شفقت صاحب کے پاس کشاں کشاں لائی تھی؟

اسلم نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا: کیوں پوچھتے ہو تم؟ جس ضرورت کو شفقت صاحب پورا نہ کر سکے، تم کر دو گے؟ — کر سکو گے، اتنی ہمّت رکھتے ہو؟

بے تامل انور نے جواب دیا: ہاں!

اسلم نے کہا: تو لاؤ یہ پانچسو روپے مجھے دے دو۔ تم ان روپوں سے شراب پیو گے، نوبہار کا غمزہ و عشوہ خریدو گے، شام تک ایک ایک پائی خرچ کر کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر واپس آ جاؤ گے — اور میں — اور میں —!

اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں، پھر اس نے گویا زور لگا کر کہا: اور میں —

مگر اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آنکھیں پھر ایک مرتبہ آب گوں ہو گئیں جوشِ کلام میں اس نے انور کا بازو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا! اسے چھوڑ دیا اور کہا: جاؤ!

لیکن انور نے جنبش بھی نہ کی، وہ اسی طرح کھڑا رہا، اس نے جیب سے وہ پانچسو روپے

ہو ابھی ملے تھے نکالے اور اسلم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ لو۔ یہ میرے نہیں تمھارے ہیں!

اسلم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر دفعۃً جیسے ہوش میں آگیا اس نے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے!

انور نے ایک جذبے کے عالم میں کہا: یہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ تم رقم اسی طرح قبول کرنے پر مجبور ہو جس طرح شفقت صاحب دینے پر مجبور تھے۔ انھیں میں نے ڈیزائن اور ٹائمٹیل پھاڑنے کی دھمکی دی تھی اسی طرح تمھارے سامنے ان نوٹوں کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی نظر آئیں گی۔ یہ تمھارے ہو چکے اب ان پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تم نہیں بتانا چاہتے ہو تو میں پوچھنا بھی نہیں چاہتا، لیکن اتنا اندازہ ہو گیا کہ واقعی وہ کوئی بڑی ہی اشد ضرورت ہے جو تمھیں یہاں تک کھینچ کر لائی ہے!

اب اسلم آپے میں آچکا تھا، اس نے کہا: لیکن تم کیا کرو گے؟ وہ بیچارہ میفروش کیا کرے گا؟ وہ بتِ سیمیں بدن جس کا نام نوبہار لے رہے تھے اپنا بجٹ کس طرح پورا کرے گی؟ یہ روپے دے کر صرف اپنے آپ پر نہیں نوبہار اور میفروش پر بھی ظلم عظیم کر رہے ہو!

انور ہنسنے لگا۔ اس نے کہا: خیر سے آپ ان لوگوں کے وکیل بھی بن گئے۔ جائیے تشریف لے جائیے۔ مہینے میں چند روز میرے عیش سے کٹتے ہیں، باقی کبھی روزی کبھی روزہ! آج کا دن بھی ایسا ہی سہی۔ مجھے خوشی ہے ایک دوست کے کام تو آگیا کسی حد تک!

اسلم نے معاملے پر آتے ہوئے کہا: اچھا یوں کرو تین سو روپے میں بطور قرض لے لیتا ہوں دو سو تم اپنے پاس رکھ لو۔ میرا کام تین سو میں چل جائے گا!

انور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ یہ رقم صرف تمہاری ہے میں اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں لوں گا — ہاں خوب یاد آیا۔ ہاں یہ تو بتاؤ غلام رسول نے وہ اس دن والے روپے ادا کر دیے یا نہیں؟

اسلم نے زہر خند کرتے ہوئے کہا: چھوڑو ان باتوں کو!

انور نے کہا: اس نے قطعاً واپس نہیں کیے ہوں گے۔ اچھی بات میں اس کا سر توڑوں گا۔

اسلم نے استدعا کی خدا کے لئے ایسا نہ کرنا، وہ میرا اور اس کا نجی معاملہ ہے کیوں تم دخل دے کر مجھے اس کی نظروں میں ذلیل کروگے!

انور ہنسنے لگا: واہ بھئی یہ بھی خوب رہی، وہ قرض کی رقم واپس کرکے تمہاری نظر میں ذلیل نہیں ہے۔ اور اس سے اگر تمہاری دی ہوئی رقم کا تقاضا کیا جائے تو تم اس کی نظر میں ذلیل ہو جاؤگے معلوم ہوتا ہے منطق بہت زیادہ پڑھ گئے ہو!

بہرحال انور نے رقم کسی طرح واپس نہیں لی۔ اسلم پانچسو ستر روپے لے کر گھر خوش خوش پہنچا کہ سلمیٰ کو مطمئن کرے۔ لیکن یہاں تو سناٹا چھایا ہوا تھا سارا گھر خالی، نہ کرمین نہ انجن، نہ سلمیٰ اور دروازہ مقفل!

وہ سخت حیرت و اضطراب کے عالم میں کھڑا تھا کہ کوئی سیڑھیوں پر تیزی سے چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو اقبال!

اسلم کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے دیوانہ ہوتا ہوا بولا: بھائی صاحب آپ کہاں تھے

ہر جگہ تلاش کر آیا آپ کو مگر کہیں بھی نہیں ملے۔ چلیے آپا نے بلایا ہے ہسپتال میں۔ ہم سب وہیں تو ہیں دو تین گھنٹے سے!

اسلم نے پریشان ہو کر سوال کیا، لیکن خیریت تو ہے سب؟

وہ بولا: جی ہاں سب خیریت ہے۔ باجی (انجمن) کو خون دیا گیا ہے، اب حالت ٹھیک ہے!

اسلم نے کچھ اور پوچھنا چاہا، اور ــــ

وہ مسکراتا ہوا بولا: اور ایک چاند سی بچی ہوئی ہے، اتنی خوبصورت ہے کہ بس کیا کہوں!

اسلم کا لرزتا ہوا دل ٹھہر گیا، اسے اطمینان ہو گیا۔ مصارف کی طرف سے بھی اب کوئی فکر نہ تھی، پانچسو ستر روپے جیب میں تھے۔ اس نے کہا تو پھر کھڑے کیوں ہو، چلو!

وہ ہنسنے لگا: بھائی صاحب میں کہاں کھڑا ہوں آپ کھڑے ہیں، چلیے! بڑا شدید انتظار ہو رہا ہے آپ کا!

دونوں تیزی کے ساتھ زینے سے اترے، دو تین منٹ تانگے کا انتظار کیا، لیکن اتفاق کی بات کوئی خالی تانگہ ادھر سے نہیں گزرا۔ اسلم کو غصہ آ گیا لاحول ولا قوۃ آج تانگے والوں کو بھی ضد ہو گئی ہے مجھ سے! چلو پیدل چلیں۔

وہ اسلم کے اضطراب سے لطف اندوز ہوتا مسکراتا پیچھے پیچھے چلنے لگا لیکن چند قدم چل کر خالی تانگہ مل گیا! اسلم اور اقبال بغیر کرایہ طے کئے اس میں بیٹھ کر ہسپتال کو چل دیے!

(۸)

نجمہ

ہسپتال پہنچنے پر سب سے پہلے سلمیٰ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وفورِ مسرت سے اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ اسلم کو دیکھتے ہی مسکراتی ہوئی بولی: بھابھی مبارک۔

اسلم بھی مسکرانے لگا۔ وہ گویا ہوئی: ہوبہو ماں کی تصویر ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ناک نقشہ ماموں سے زیادہ ملتا ہے، چھب ماں سے!

اسلم ہنسنے لگا: ارے بھئی یہ سب ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ انجمن کیسی ہے؟ اقبال تو کہہ رہا تھا ——

سلمیٰ قطع کلام کرتی ہوئی بولی: خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بیچاری کمزور تو پہلے ہی سے ہے۔ ابھی ابھی اتنی بڑی بیماری جھیل کر اٹھی ہے، واقعی جان کے لالے پڑ گئے تھے، لیکن لیڈی ڈاکٹر بڑی شریف اور ہمدرد عورت ہے۔ خون پہنچانے

کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ لیکن اس کا ملنا کچھ آسان تو ہے نہیں۔ میں نے کہا میرا ابھی ٹسٹ کر لیجئے۔ اتفاق کی بات انجمن کے خون سے مل گیا۔ وہی دیا گیا اسے ــــ اب اللہ کے فضل سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اسلم نے فخر، ناز اور ممنونیت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: تو گویا آپ نے نجمہ سے خونی رشتہ بھی قائم کر دیا ــــ لیکن بچی کہاں ہے اسے تو ذرا کی ذرا دکھا دو!

ابھی لائی ــــ یہ کہہ کر وہ دوڑی دوڑی گئی اور ایک ننھی سی، خوبصورت سی مخلوق کو اٹھا لائی۔ کہنے لگی: یہ ہیں آپ کی بھانجی صاحبہ! سچ کہئے کتنی پیاری ہے؟

اسلم نے کہا: ہاں، مجھے تو ہو بہو تمہارا ایکچر نظر آتی ہے۔ اس عرصے میں تم انجمن کے دل و دماغ پر چھائی رہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بچی نے تمہاری صورت قبول کر لی۔

وہ ہنستے ہوئے بولی: اے چلئے بھی!

اسلم نے کہا: جس سے چاہو پوچھ لو: کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!

سلمیٰ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: کوئی اچھا سا نام تجویز کیجئے اس کا!

پھر سوچتی ہوئی بولی: نجمہ ٹھیک رہے گا!

اس نے کہا: گویا پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے۔ مجھ سے یوں ہی رسماً پوچھا گیا

تھا ۔۔۔ نام اچھا ہے!

سلمٰی بچہ کو لے کر واپس جانے لگی۔ جاتے جاتے کہنے لگی۔ اور روپے۔ کہہ دیجئے نہیں ملے۔ اللہ جانتا ہے کہ آپ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، دکھ ہوتا ہے، ابھی خیر دو تین دن تو چل جائیں گے، لیکن یہاں سے جاتے وقت بہت کچھ خرچ کرنا پڑے گا ۔۔۔ ارے ہاں خوب یاد آیا لیڈی ڈاکٹر نے یہ نسخہ بھی تو لکھا ہے، یہ چیزیں تو آج ہی لانا ہیں!

اسلم مسکرا مسکرا کر یہ باتیں سن رہا تھا لیکن خاموش تھا، اسے خاموش دیکھ کر وہ چڑ گئی، کہنے لگی آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟ کیا میں دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں ۔۔۔؟

اسلم نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچسو روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔ یہ رقم دیکھ کر وہ نہال ہو گئی۔ کہنے لگی، یہ تو بہت ہیں، کہاں سے لوٹ لائے؟

جھوٹ موٹ بگڑتا ہوا بولا: کیا میں چور ہوں، لٹیرا ہوں، ڈاکو ہوں؟

وہ کہنے لگی: آپ بڑے اچھے آدمی ہیں ۔۔۔ کہیں راستے میں پڑے مل گئے ہوں گے ۔۔۔ منشی جی نے تو یہ بھر مٹی روپے ہرگز نہیں دیے ہوں گے۔ میں حلف اٹھا سکتی ہوں!

اسلم نے کہا: ٹھیک کہتی ہو، وہ بھلا کیا دیتے؟ ایک فرشتے نے از خود یہ احسان کیا ہے!

بچہ زور زور سے رونے لگی۔ سلمٰی اسے لے کر پھر انجن کے وارڈ میں چلی گئی جاتے وقت وہ نسخہ اسلم کے ہاتھ میں تھما تی گئی۔

اسلم چاہ ہی رہا تھا کہ کریمن آتی ہوئی نظر آئی ۔ کہنے لگی : اے میں قربان چاندسی بھانجی مبارک !

اسلم نے کہا : مجھے بھانجی اور تمھیں نواسی مبارک !

کریمن کی آنکھوں میں آنسو آگئے ، کہنے لگی : یہ جوڑی بہن بھائی کی اللہ قائم وسلامت رکھے !

کریمن سے رخصت ہوکر سب سے پہلے اسلم ٹیلیگراف آفس پہنچا ۔ وہ اگرچہ کلثوم سے متنفر اور اشفاق سے خفا تھا، لیکن یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ اتنی بڑی اور اہم خبر کی بروقت اطلاع نہ دے ۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک ارجنٹ تار اشفاق کو بچّہ کی ولادت کا دیا ۔ اس سے فارغ ہوکر دواخانے نسخہ لینے چلا گیا ۔

اشفاق کی شادی شمسہ سے ہو ہی چکی تھی ۔ اب وہ گھر پر راج کررہی تھی ۔ شوہر بندۂ بے دام اور ساس نیاز مند ، نہ شوہر میں وہ آن تھی نہ ساس میں وہ زبان جس نے انجمن کا ناک میں دم کردیا تھا اس کے دل کو چھلنی بنا دیا تھا ۔ مالدار باپ کی مالدار لڑکی تھی ، شوہر بھی پاؤں دھو دھو کر پیتا تھا اور ساس بھی صدقے قربان ہوتی تھیں ۔ فرزانہ اور نسیم نے نہ شادی میں شرکت کی تھی نہ شمسہ کو ۔۔ اور اس کے گھر والوں کو لفٹ دیا تھا ۔ دونوں حسب معمول آتے بیٹھتے اور چلے جاتے ۔ نہ خاص طور پر شمسہ سے ملاقات کرتے ، نہ اس کی چاپلوسی کرتے !

کلثوم ، اشفاق اور شمسہ تک کی دلی آرزو یہ تھی کہ ان دونوں کو ہموار کرلیں ، لہٰذا جب آتے تو خوب خوب خاطریں ہوتیں ۔ آج بھی یہ دونوں میاں

ہوی آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر خود بخود ایک نہایت پُرتکلف پارٹی کا انتظام ہو گیا تھا۔ سب لوگ بیٹھے چار پی رہے تھے کہ ملازم نے تار لاکر اشفاق کے ہاتھ میں دیا۔ کلثوم نے پوچھا کس کا تار ہے؟

اس نے بتایا اسلم کا ہے!

وہ بولیں: اسے ہے تار بھیجنے کی ایسی کون سی ضرورت پیش آئی تھی؟ ہمیں تو نہ خط کی ضرورت ہے نہ تار کی، وہ اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش!

فرزانہ نے اسلم کے ہاتھ سے تار جھپٹ لیا۔ اور پڑھ کر خوش ہوتی ہوئی بولی: اماں جی یہ تار تو اپنے ساتھ بہت بڑی خوش خبری لایا ہے!

خوش خبری کے لفظ سن کر کلثوم کے کان کھڑے ہوئے، وہ سمجھی انجمن مر گئی ہے اور فرزانہ طنز کر رہی ہے۔ پوچھا۔ کیوں؟ کیسی ہے انجمن؟

فرزانہ نے جوشِ مسرّت سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا: وہ تو خیر اچھی ہو گی، لیکن امّی وہ ایک خوبصورت سی بچّی بجمہ کی ماں بن گئی ہے — اور امّی تم دادی بن گئیں!

یہ اگر خوش خبری تھی تو بھی کلثوم کے لئے نہ تھی! اس نے نفرت کی سلوٹیں ماتھے پر ڈالتے ہوئے کہا: بیٹی! اچھی خوش خبری سنا رہی ہو — ہم نے تو لڑکی پیدا ہونے پر اتنا خوش ہوتے کسی کو نہیں دیکھا!

فرزانہ جل گئی۔ اس نے کہا: امّی! جب تم پیدا ہوئی تھیں تو کیا گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی؟ جب میں پیدا ہوئی تھی تو کیا ہمارے گھر میں مرثیے پڑھے

گئے تھے؟ کیوں بی شمسہ جب تم نے عالم وجود میں قدم رکھا تھا تو کیا آہ و فغاں اور نالہ و شیون کی مجلس برپا ہوگئی تھی !؟ ___ کیا لڑکی خدا کا اسی طرح عطیہ نہیں جیسے لڑکا ! یہ غیر انسانی اور غیر اسلامی باتیں نہ جانے کہاں سے سیکھی ہیں آپ نے ؟ جس رسولؐ پر اور جس کی آل پر آپ ہر نماز میں درود بھیجتی ہیں، کیا اس کی آل میں پہلا نمبر لڑکی ہی کا نہیں ہے ؟ ___ ذرا کچھ خدا سے بھی ڈریئے امی !

یہ بے دھڑک باتیں سن کر سب پر سناٹا طاری ہوگیا۔

اسی سناٹے کے عالم میں ایک مرتبہ پھر فرزانہ کی آواز گونجی وہ اشفاق سے کہہ رہی تھی :

کب تک شرماتے رہو گے لڑکی کا باپ بننے پر ؟ ___ میری بات کا جواب دو ___ !

وہ جھینپا ہوا بولا : واہ آپا میں نے کیا کیا ہے ؟ امی سے لڑتے لڑتے مجھ پر توجہ مبذول کردی !

وہ بولی جب سے انجمن گئی ہے تم نے اسے خرچ بھیجا ؟

اشفاق سٹ پٹا گیا، لیکن کلثوم نے سہارا دیا : خرچ کیسے بھیجتا ___ اتنے دن ہم نے بوجھ اٹھایا، کھلایا، پلایا، پہنایا، دوا کی، علاج کرایا۔ کچھ بھائی کا بھی تو فرض ہے اب !

فرزانہ جل کر بولی : کیا آپ نے خیرات میں کھلایا پلایا، کیا وہ اشفاق کی بیوی نہیں ہے ؟ اشفاق نے ایک غیر شریفانہ حرکت تو یہ کی کہ بلاوجہ دوسری

شادی کر کے اس کے دل کو صدمہ پہنچایا۔ دوسری اس سے زیادہ غیر شریفانہ اور غیر انسانی حرکت یہ ہے کہ جو کچھ اس کا شرعی اور قانونی حق ہے وہ بھی نہیں دیتے۔

کلثوم نے شعلہ جوالہ بن کر کہا: تو پھر مقدمہ دائر کرادو اس سے، چلو یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔

فرزانہ نے ماں کو جواب نہیں دیا، اشفاق سے کہا۔ بہرحال اس موقع پر انھیں ایک معقول رقم بھیج دینی چاہیئے۔ اسلم بے چارہ ویسے ہی بے روزگار اور پریشان ہے۔ بتاؤ بھیجو گے؟ — نہ بھیجو تو میں بھیج دوں گا!

اشفاق ماں کی طرف دیکھنے لگا کہ کیا جواب دے، وہ بولیں: کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے، مرضی ہو تو طلاق لے لیں۔ ہمیں یہ کھٹراگ پالنے کی ضرورت نہیں ہے!

فرزانہ نے کہا: اور اگر نسیم نے میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہوتا جب بھی آپ کے منہ سے یہی جملے نکلتے؟

نسیم نے ایک قہقہہ لگایا: بھائی خدا کے لئے مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو، تم جانو اور تمھارے بھائی اشفاق میاں!

کلثوم نے خونخوار نظروں سے بیٹی کو دیکھا اور بولی: نہ جانے میرے پیٹ سے یہ سانپ کیوں پیدا ہو گیا؟

نسیم ہنسنے لگا: امّی جان! سانپ نہیں ناگن!

فرزانہ نے چڑتے ہوئے کہا: بس آپ چپ ہی رہیئے!

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نسیم سے بولی، چلیے!

نسیم نے کہا: اور چائے!!

وہ گویا ہوئی: اچھا تو آپ پیتے رہئے، اطمینان سے بیٹھ کر میں جاتی ہوں موٹر واپس کر دوں گی!

یہ کہہ کر وہ چل پڑی۔ کلثوم، اشفاق، شمسہ، سب نے اسے روکنا چاہا مگر اس کے تیور دیکھ کر کسی کی ہمت نہ پڑی۔ سب کی نظریں بے بسی سے اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور وہ بوئے گل کی طرح نکلی چلی گئی۔ نسیم بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا!

---

(۹)

وہ خط کیا ہے؟

ایک سال گزر گیا!

زندگی اب ایک ڈھرّے پر آگئی تھی! رو پیٹ کر کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا تھا، ایک قرض ادا کیا دوسرا چڑھ گیا۔ وہ ادا کیا تیسرا موجود! شفقت نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ منشی سجاد حسین سے کچھ مل گیا، انھوں نے معذرت کی شفقت نے کچھ دے دیا۔ متفرق کام بھی ملنے لگے تھے۔ پارٹ ٹائم ایک رسالہ کی ایڈیٹری بھی شروع کر دی تھی۔ چالیس روپے ماہوار اس سے مل جاتے تھے۔ مگر یہ رقم بڑی پابندی سے مل جاتی تھی۔ اشاعت گھر والوں کو بھی کبھی کبھی ترس آجاتا تھا۔ جو کام کوئی نہیں کر پاتا تھا، ——————— یا جس کی بہت جلدی ہوتی تھی وہ اب بُلا کر اسے دے دیا جاتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے دو ناول اور لکھ لئے تھے۔ وہ گو اَدنے پونے بکے لیکن شہرت میں اضافہ ہوا اور تھوڑی تھوڑی کر کے

سہی رقم مل گئی ۔ ارجمند خاں کا وجود ایک مستقل خزانہ بن گیا تھا ۔ جو رقم بھی کہیں سے ملی یہیں جمع کر دی جاتی ۔ جب ضرورت ہوتی نکال لی جاتی، کبھی ایسا ہوتا کہ خان صاحب کی رقم چڑھ جاتی، کبھی یوں ہوتا کہ اسلم کی فاضل رقم ۔۔۔ گو تھوڑی ہی سہی ۔۔۔ بہ مد فاضل ان کے پاس جمع ہو جاتی!

بخمہ اب ہوشیار ہو چلی تھی، بڑے مزے مزے کی حرکتیں کرتی تھی، سارے گھر کے لئے ایک کھلونا بنی ہوئی تھی ۔ ہر وقت اس کی گود سے چمٹی رہتی، اقبال سے بھی بہت مانوس تھی ۔ کیونکہ وہ اسے باہر کی سیر کرایا کرتا تھا ۔ اور کبھی کبھی اپنے جیب خرچ سے چاکلیٹ بھی دلا دیتا ۔ اسلم تو جان چھڑکتا تھا جیسے یہ لڑکی اسی کی ہو ۔ گھر آنے کے بعد اور گھر سے جانے سے پہلے کافی وقت وہ بخمہ کے ساتھ کھیلنے اور اس کی دلچسپ حرکتوں کے دیکھنے میں صرف کرتا تھا ۔ انجمن تو بھلا ماں ہی تھی، گو محبت کا زیادہ اظہار نہیں کرتی تھی ۔ اور سلمی کی بے پناہ محبت کے باعث اظہار کا موقع نہیں ملتا تھا لیکن ماتا کا سارا جوش اس ننھی سی جان کے لئے وقف تھا ۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں ایسی چمک آ جاتی تھی جس میں فخر، ناز، محبت ہر چیز مچلتی نظر آتی ۔ دن بھر یہ ننھی سی گڑیا سب کی توجہ اپنی طرف منعطف کئے رہتی ۔

اس عرصے میں سسرال کی طرف سے کوئی پرسش نہیں ہوئی تھی، نہ اشفاق نے کوئی خط لکھا تھا ۔ نہ کلثوم کی طرف سے کوئی پیام آیا تھا ۔ شاید یہ دونوں اسے بھول چکے تھے ۔

لیکن کیا وہ بھی اشفاق کو بھول گئی تھی؟

کلثوم کی دل شکن اور ذلت آمیز باتیں اس کے دل پر نقش تھیں شمہ کا اس

گھر میں وجود ایک کانٹے کی طرح اس کی روح میں کھٹک رہا تھا۔ اشفاق کی سرد مہری، بے وفائی اور زر پرستی نے اس کے قلبِ نازک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا! پھر بھی وہ اشفاق کو اب تک نہیں بھول سکی تھی۔ بھول سکتی بھی نہیں تھی اور بھولنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

بے شک اپنے دل سے اس کی یاد کو بھلانے کی اس نے بہتیری کوششیں کیں لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی،

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں!

جب تک بس چلتا اس یاد کو دل سے دُور رکھنے کی کوشش کرتی۔ اور جب ایسا معلوم ہوتا کہ یہ دُوری مستقل بن گئی ہے تو پھر اس کی یاد ستانے لگتی۔ پھر شب کی تنہائیوں میں اور روز روشن کی ہنگامہ آرائیوں میں وہ بھولا ہوا، وہ زود فراموش، وہ بے وفا شخص یاد آنے لگتا۔ اشفاق نے محبّت کا کھیل کھیلا تھا لیکن انجمن نے دل کی گہرائی سے اسے چاہا تھا۔ کھیل عارضی اور وقتی ہوتا ہے لیکن دل کے مندر میں ایک مرتبہ براجمان ہو جانے والا بُت ہمیشہ اپنی پوجا کرا تا رہتا ہے۔

نجمہ کی پیدائش کے بعد سے اشفاق کی یاد اسے اور زیادہ ستانے لگی تھی!

وہ اکثر اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی سوچا کرتی۔ اس بچّی کا مستقبل کیا ہو گا۔ کیا یہ بچّی ہمیشہ باپ کی محبّت اور شفقت سے اسی طرح محروم رہے گی! کیا یہ ہمیشہ ماموں اور ممانی کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتی رہے گی؟ مانا کہ بھائی جان اسے اولاد سے زیادہ چاہتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک کہ بھابی دلہن) اسے

دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑجاتی ہیں! دونوں میری بات ہنسی مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔ لیکن اس خوش دلی اور محبت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ میرا وجود ان کے لئے موجودہ حالات میں ایک بوجھ ہے اور نجمہ کا وجود ناقابلِ برداشت بوجھ۔ چاہتی ہوں کہ میں بھی ہاتھ پاؤں ہلاؤں۔ اور کچھ نہیں تو گھر میں بیٹھ کر محلے کی لڑکیوں کو پڑھا لکھا دیا کروں اس طرح کچھ آمدنی ہوجائے گی۔ کم سے کم نجمہ کا خرچہ تو نکل ہی آئے گا۔ مگر اس کی نہ بھائی جان اجازت دیتے ہیں نہ بھابی۔ دونوں کو یہ بات گوارا نہیں کہ میں کچھ کروں، دونوں کا ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ مسہری سے لگی بیٹھی رہوں اور مفت کی روٹیاں توڑتی رہوں لیکن کب تک؟ کہتے ہیں جب تک ہم زندہ ہیں۔ واہ بھئی اچھا جواب ہے، جو ان کی ذمہ داری نہیں اسے زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ اور جو اس لڑکی کا باپ ہے اسے کوئی پرواہی نہیں۔ جو اس لڑکی کی دادی ہے اسے ذرا احساس نہیں۔ یہ اتنا نہیں سوچتے کہ ذلت میری نہیں ان کی ہورہی ہے۔ میں تو اپنے بھائی کے ٹکڑوں پر پڑی ہوں۔ لیکن اشفاق کی بیٹی اور کلثوم کی پوتی کے لئے یہ روا ہے کہ وہ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلے؟ نہ جانے وہ قطب مینار کی سی لمبی چوڑی ناک کیا ہوئی؟ جس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا!

قابلِ نفرت میں ہوسکتی ہوں، لیکن اس بچی نے کیا خطا کی ہے؟ یہ تو معلوم ہو۔ اسے تو باپ کی محبت ملنی چاہئے۔ اسے تو دادی کی شفقت سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ بہت سے لوگ دوسری شادی کرلیتے ہیں، بہت سے لوگ پہلی بیویوں کو معلق بنا کر چھوڑ دیتے ہیں لیکن اپنی اولاد کے ساتھ تو اتنے ظالم نہیں ہوتے

ہی رقم مل گئی ۔ ارجمند
ے ملی ہیں، جمہ ور نور نظر سمجھتی ہیں ، لیکن کل ، جب بھائی جان ایک بچے کے باپ بن
جائیں گے اور خدا وہ مبارک دن جلد لائے اور بھابی کی گود میں ان کے جگر کا
ٹکڑا ہوگا تو بھی یہ محبت نجمہ کے ساتھ قائم رہے گی ؟

مان لیا قائم رہے گی ــــ لیکن مولی اپنے پتوں بھاری ہوتی ہے بھائی
جان کی جو حالت ہے وہ میری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ بیچارے دن رات
محنت کرتے ہیں ، اخبار میں کام کرتے ہیں ، رسالہ ایڈیٹ کرتے ہیں ، اشاعت گھر
کا کام کرتے ہیں ۔ ناولیں لکھنے کا وقت نکالتے ہیں ۔ اور اتنی جان لیوا محنت کا
حاصل کیا نکلتا ہے ؟ دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی ! کوئی بیمار پڑ جائے ، کسی کے
کپڑے بنوانا ہوں ، کوئی اور ناگہانی خرچ سامنے آجائے تو بیچارے قرض لینے
پر مجبور ! کتنا دل کڑھتا ہے میرا بھابی کو دیکھ کر ، بیچاری کے پاس ڈھنگ کے کپڑے
تک نہیں ہیں ، کیا ان کا اچھے اچھے ملبوسات پہننے کو جی نہیں چاہتا ؟ گہنے اور زیور
کا شوق نہیں رکھتیں ؟ ریڈیو کے لئے دل نہیں مچلتا ؟ سیر و تفریح کے شوق سے
محروم ہیں سینما دیکھنے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی ! سب کچھ ہوتا ہے ، لیکن
لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے پر مجبور ہیں ۔ مستزاد یہ کہ ان حالات میں میرا بوجھ پڑ گیا
پھر نجمہ عالمِ وجود میں آ گئی ۔ اس کا خرچ دو آدمیوں سے کم کا نہیں ہے اس کے
لئے دودھ ، گرمیں کا جملہ خرچ اور تنخواہ الگ ۔ جب دیکھو جب نئے نئے کپڑے بن
رہے ہیں ۔ لاکھ لاکھ منع کرتی ہوں ، سمجھاتی ہوں ، روکتی ہوں ، لیکن بھابی جواب
دیتی ہیں ، رہنے دو جی ہمارے اور نجمہ کے معاملے میں تم ٹانگ اڑانے والی کون ؟
اور بھائی صاحب کہتے ہیں کتنی کنجوس ہو گئی ہے انجمن ، نجمہ تک کا زرق برق لباس

پہلی بیوی پر جو ظلم چاہیں توڑ لیں لیکن اولاد کو تو کلیجہ سے لگا کر رکھتے ہیں۔ مگر اشفاق میں اتنا حوصلہ بھی نہیں، کلثوم میں اتنی انسانیت بھی نہیں:

اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے!

اکثر وہ یہی سوچا کرتی، کبھی روتی کبھی آہ بھرتی، کبھی ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو جاتی، ایسا بھی ہوتا سوتے سوتے آنکھ کھل جاتی اور پھر ساری رات نیند نہ آتی، خیالات کی یورش ایک پل کے لئے بھی آنکھ نہ جھپکنے دیتی۔ ایسا بھی ہوتا کہ سونے کے لئے لیٹتی اور ان باتوں کی طرف دھیان جاتا تو نیند اچاٹ ہو جاتی۔ آدھی آدھی رات تک کروٹیں بدلتی رہتی اور پھر اسی اثنا میں وہ مختصر سا عہدِ محبت یاد آنے لگتا جو اشفاق کے ساتھ بسر ہوا تھا اور پھر یہ سوچ کر وہ آنسو بہانے لگتی آخر کس جرم کی یہ سزا مل رہی ہے!

الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے!

---

(۱۰)

دُکھ بھری پُکار!

ایک روز نجمہ کو وہ کلیجے سے لگائے سو رہی تھی کہ اس کے رونے سے آنکھ کھل گئی، وہ تو ذرا دیر رو کر اور دودھ پی کر سو گئی مگر انجمن کی نیند اڑ گئی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ اٹھی، بتی جلائی اور خط لکھنے بیٹھ گئی۔:

"بہت دنوں کے بعد بلکہ یہاں آنے کے بعد پہلی مرتبہ — اور شاید آخری مرتبہ بھی — تمھیں خط لکھ رہی ہوں!

خط کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میرے حالِ زار پر توجہ کرو۔ ان وجوہ سے جو صرف تمھی کو معلوم ہیں تمھارے دل سے اتر چکی ہوں اور میں اس پر قانع ہوں مجھے تم سے اگر محبت تھی تو وہ ہے اور رہے گی۔ تمھیں اگر تھی اور اب نہیں ہے تو میں اس کی بھیک نہیں مانگتی۔ محبت دریوزہ گری سے نہیں ملتی۔ اور شاید دریوزہ گری پر میں تیار بھی ہو جاتی لیکن جانتی ہوں اب تمھاری زندگی میں شمسہ

داخل ہو چکی ہے۔ اس نئی زندگی سے تم خوش ہو، مطمئن ہو، ہمنسہ نے جو کچھ تمھیں دیا میں نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہے پھر میں اس پر حسد کیوں کروں؟ اور تم مجھ پر ترس کیوں کھاؤ؟

لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہتی ہوں، ایک لڑکی ہے نجمہ، میں اس کی ماں ہوں تم اس کے باپ ہو، مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہی ہوں، اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ بھائی کے ٹکڑوں پر پڑی اسے پال رہی ہوں۔ اور وہ بیچارہ اپنی انتہائی مالی پریشانیوں کے باوجود اسے اپنی بیٹی کی طرح پال رہا ہے لیکن باپ کی حیثیت سے تم کیا کر رہے ہو؟

کیا ایک باپ کی غیرت اسے گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی لڑکی دوسروں کے رحم و کرم پر جئے!

کیا ایک باپ کی محبت اسے برداشت کر سکتی ہے کہ وہ لڑکی اس کی محبت اور شفقت سے محروم رہے اور یہ بھی نہ جان سکے کہ میرا باپ کون ہے، کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟

کیا تمھارے دل میں کبھی اس پھول سی بچی کو دیکھنے کی لہر نہیں پیدا ہوتی؟ اشفاق! اگر تم ایک دفعہ نجمہ کو دیکھ لوگے تو اس کے پرستار بن جاؤ گے وہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ بڑے مزے مزے کی حرکتیں کرتی ہے، ماموں اس پر جان دیتے ہیں، ممانی اسے ہر وقت کلیجے سے لگائے رکھتی ہیں۔ اقبال سلمی بھابی کا چھوٹا بھائی ــــ جب دیکھو جب باہر کی سیر کرانے لے جاتا ہے۔ اور اگر جیب میں کچھ ہوتا ہے تو اسے چاکلیٹ کھلا دیتا ہے۔ کریمن اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہے لیکن

ان چاہنے والوں میں اگر کوئی نہیں دکھائی دیتا تو اس کا باپ!

ذرا سوچو تو سہی بڑی ہو کر سن شعور کو پہونچ کر وہ اپنے باپ کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں کتنی بدقسمت نظر آئے گی؟ بھلا اُس لڑکی سے بڑھ کر بھی کوئی بدقسمت ہو سکتا ہے جس کا باپ زندہ ہو، خوشحال ہو لیکن نہ اس کی صورت دیکھنا گوارا کرے نہ اس کے مصارف برداشت کرے، جب یہ باتیں سوچتی ہوں تو جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور میں سما جاؤں۔ لیکن تمھیں کچھ خیال نہیں آتا!

تم تو بڑے اچھے آدمی تھے! یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم اتنے کٹھور ہو گئے ہو کہ اپنی لختِ جگر نورِ نظر تک کے لئے سنگ دل بن چکے ہو؟

کیا تمھیں واقعی نجمہ سے محبت نہیں ہے؟

اچھا نہیں ہے تو بھی دُنیا کو دکھانے کے لئے اس کے کفیل بنے رہو!

میری خودداری کا تقاضا یہ تھا کہ اب میں اس گھر میں کبھی قدم نہ رکھتی جہاں سے ذلیل کر کے نکالی گئی ہوں، جہاں میری جگہ پر ایک دوسری ہستی متمکن ہے۔ لیکن نجمہ کے لئے، اپنی بچّی کے لئے میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ مجھے بلا لو، میں اس گھر میں اجنبی کی طرح رہوں گی، لیکن نجمہ کو باپ کی محبت تو مل سکے گی۔

لیکن یہ میں کیا کہہ گئی؟

مجھے معلوم ہوا ہے اور صاف کیوں نہ لکھ دوں کہ کریمن بڑے معتبر ذریعہ سے یہ خبر لائی ہے کہ میرے جرائم میں ایک بہت بڑا جرم یہ بھی ہے کہ میں لڑکے کی ماں کیوں نہ بنی؟!

اگر یہ سچ ہے تو اس سے بڑھ کر بھی بھلا کوئی ظلم ہو سکتا ہے؟!

لڑکا اور لڑکی یہ تو قدرت کے تحفے ہیں، جسے جو مل جائے، جس کی قسمت میں جو ہو۔ کیا اس بات کی کوئی گارنٹی دے سکتا ہے کہ شمسہ کسی لڑکی کی ماں نہیں بنے گی! کیا خود امّاں (کلثوم) ایک لڑکی (فرزانہ) کی ماں نہیں ہیں!

لیکن رچے ہوئے خیالات میں میری یہ چند باتیں تبدیلی نہیں کر سکتیں، اگر تم لڑکی ہونے سے خوش نہیں ہو تو مجھے تم سے ہمدردی ہے، میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ شمسہ کو خدا اس ابتلا سے بچائے۔ اسے لڑکا دے تاکہ اسے میری طرح ذلیل نہ ہونا پڑے! اور تمھاری مراد پوری ہو جائے یعنی تم ایک لڑکے کے باپ بن جاؤ!

لیکن اس کے باوجود وہ ذمہ داری جو تم پر قدرت نے باپ کی حیثیت سے ڈال دی ہے اسے تو پورا ہی کرنا چاہیے۔ میرا نہیں تو اپنی لڑکی کا خرچ اٹھاؤ، زیادہ نہیں پندرہ ہی روپے پابندی کے ساتھ بھیج دیا کرو تاکہ کہنے کو تو ہو جائے کہ ہاں لڑکی کا باپ بھی کچھ بھیجتا ہے اپنی بچی کو۔ ایسے ماحول میں تو نہ پلنے دو کہ سنِ شعور پر پہنچنے کے بعد اس کا احساس صرف محرومی اور یاس تک محدود ہو، سہیلیاں اس کے سامنے باپ کا نام لیں اور وہ شرما کر سر جھکا لے اور پھر میرے پاس آکر رونے لگے۔ اور روتے روتے پوچھے میرا باپ کون ہے؟ مجھے کیوں نہیں بلاتا؟ میرے پاس کیوں نہیں آتا؟ میری خبر کیوں نہیں لیتا؟ —— بتاؤ اشفاق میں کیا جواب دوں گی —— اور جواب دے بھی کیا سکتی ہوں؟

اس خط میں نجمہ کی ننھی سی تصویر رکھ رہی ہوں۔ سچ کہنا کیسی ہے، اتنی پیاری اور خوبصورت بیٹی قسمت ہی سے ملتی ہے! لیکن تم اسے ٹھکرا رہے ہو۔ کیا تمھیں

یہی کرنا چاہیئے ؟

میں اپنی بچّہ کی توہین و تذلیل برداشت نہیں کرسکتی۔ یہ صرف تمہارے لئے بھیجی جارہی ہے کسی اور کو دکھانے کی ضرورت نہیں۔

کیوں اشفاق کیا میں تمہارے جواب کا انتظار کروں ؟

کیا میں یہ توقع کرسکتی ہوں کہ چند دن کے لئے اپنی بچّی کو دیکھنے، پیار کرنے اور کلیجے سے لگانے آجاؤ گے ؟

مجھ سے بات نہ کرنا، میری صورت نہ دیکھنا، میری خبر نہ لینا، لیکن اپنے کھلونے کو تو دیکھ لینا۔ اگر ایک مرتبہ اس کو دیکھ لیا تو پھر زندگی بھر اس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکو گے، ایک مرتبہ اگر اس نے تمھیں پالیا تو پھر وہ بھی کبھی تمہارا دامن نہ چھوڑے گی !

میری طبیعت اکثر خراب رہتی ہے، کبھی ہلکی ہلکی کھانسی کبھی ہلکا ہلکا بخار کبھی دردِ سر، کبھی بخیش، لیکن اپنی بیماری کو بھائی جان اور بھابی سے چھپاتی ہوں کہاں تک بوجھ ڈالوں ان پر !

اُن کے پاس ہو تو وہ میرے اوپر خزانۂ قارون بھی قربان کردیں۔ لیکن وہ تو مزدور ہیں، جس دن مزدوری مل گئی دال روٹی چل گئی جس دن کسی وجہ سے مزدوری نہ ملی تو روزہ !

خط دیکھتے ہی اگر فوراً جواب لکھنے بیٹھ جاؤ تو آج کے تیسرے دن مجھے مل جائے گا ! پرسوں سے ڈاکئے کے انتظار میں چشم براہ رہوں گی !

دیکھو مایوس نہ کرنا۔ جواب جلد اور ضرور دینا !

میرے بیتے ہوئے دن، میری گزری ہوئی راتیں جن کی رونق تمھارے دم سے بھی جانتی ہوں انھیں واپس لے آنا میرے بس سے باہر ہے۔ شاید تمھارے بس سے بھی! لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں وہ زمانہ یاد آتا رہتا ہے۔ قدرت نے مجھ سے میری ہر چیز چھین لی روپ، جوانی، صحت، خوشی ـــــ یادداشت کیوں نہیں چھین لیتی! یہ پچھلا زمانہ اگر کسی طرح بھول جاؤں تو شاید میرے سارے دُکھ ختم ہو جائیں!

---

(۱۱)

کوہِ غم!

ٹھیک تیسرے دن عین اس وقت جب کہ وہ باہری دروازہ کے پاس پیکرِ اضطرار و اضطراب بنی کھڑی تھی پوسٹ مین بھاری سا تھیلا کندھے پر ڈالے پسینے میں شرابور تیز تیز چلتا اس کے گھر کی طرف آتا نظر آیا۔ جیسے ہی وہ آکر دم لینے کو ٹھہرا اس نے پوچھا:

کیا ہمارے ہاں کا بھی کوئی خط ہے؟

پوسٹ مین نے کہا: ہاں ایک رجسٹری ہے انجمن بیگم کے نام!

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وفورِ مسرت سے بے قابو ہو کر وہ بولی:

میرا ہی نام انجمن ہے، لاؤ دے دو مجھے!

پوسٹ مین نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پھر قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: اس پر دستخط کر دیجیے!

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جلدی جلدی دستخط کئے اور لفافہ لے کر اپنے کمرے میں پہنچی۔

وہ بہت خوش تھی آج، اسے بالکل امید نہیں تھی کہ اشفاق خط کا جواب دے دے گا۔ یہ بات تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس قدر جلد جواب دے گا کہ ٹھیک تیسرے ہی دن مل جائے گا!

اتنے میں کریمن نجمہ کو لے کر آ گئی۔ انجمن نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے اس سے کہا: سنتی ہو بوا کریمن ان کا خط آیا ہے!

یہ کہتے کہتے خود بخود اس کے گال سُرخ ہو گئے۔ کریمن نے پوچھا: اے میں قربان کس کا خط آیا ہے؟ ـــ کیا اشفاق کا؟

وہ مسکراتی ہوئی بولی: اُسی کا۔ اور کس کا خط آنے سے مجھے خوشی ہو سکتی ہے؟ کیوں بوا کریمن کیا میں خوش نظر نہیں آتی؟

کریمن نے رحم اور ترس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جواب دیا: ہاں بیٹی کتنے دنوں کے بعد آج تمھیں اتنا خوش دیکھا ہے! خدا ہمیشہ خوش رکھے، سدا سکھی رکھے!

لفافہ اب تک انجمن کے ہاتھ میں تھا۔ نجمہ نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی: کیوں ری! اپنے باپ کا خط چھینے لے رہی ہے مجھ سے! نجمہ بھلا ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھتی مسکرانے لگی۔ انجمن نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اُسے پیار کرتی ہوئی بولی: اس میں تمھارے باپ کا خط ہے، تمھیں انھوں نے بہت بہت پیار لکھا ہے، تمھیں دیکھنے کے لئے اپنی تڑپ کا

اظہار کیا ہے۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے تمھاری تصویر دیکھ کر سب کچھ بھول گئے۔ وہ نفرت بھی جو خواہ مخواہ میرے خلاف ان کے دل میں پیدا ہو گئی تھی!

پھر اس نے کریمن سے مخاطب ہو کر کہا: بوا کریمن، یہ لڑکی یہ بچہ سفیر صلح بن کر آئی ہے اس نے دو بچھڑے ہوؤں میں ملاپ کرا دیا ـــــ سچ پوچھو تو وہ بھی مجبور تھے، محبت انھیں مجھی سے تھی۔ ہمیشہ میرے سامنے شمسہ کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہ انھیں ذرا بھی پسند نہیں تھی محض ماں کے ڈر سے ـــــ بوا کریمن ان کی ماں بھی کتنی جلاد عورت ہے، انھوں نے شمسہ سے شادی کر لی۔ اتنی بڑی غلطی کر گزرنے کے بعد اپنی شادی پر پشیمان ہیں، مجھے ان کی ندامت پر ترس آتا ہے۔ ان کی پشیمانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ میں جانتی ہوں وہ مجبور تھے، میں نے انھیں معاف کر دیا۔ میرے دل میں ان کے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میں نے شمسہ کو بھی معاف کر دیا۔ اس کے خلاف بھی میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ اچھی چیز کو بھلا کون اپنانا نہیں چاہتا۔ اگر وہ اشفاق پر لڑھک گئی تو مجبور ہو گی، بیچاری ـــــ کیوں کریمن بوا ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!

کریمن بوا منہ کھولے کھڑی ہوئی یہ تقریر سن رہی تھیں۔ یہ بات وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کتنی آسانی سے اور یوں چشم زدن میں اشفاق کا ایک خط تمام تلخیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کو حرف غلط بنا کر رکھ دے گا! کریمن کو صحیح معنی میں آج احساس ہوا کہ انجمن اشفاق کی بے وفائی، سرد مہری اور بدسلوکی کے باوجود کس طرح دل کی گہرائی سے اب تک اسے چاہے جا رہی ہے!

لیکن اتنی لمبی چوڑی تقریر سننے کے باوجود یہ ماننے کے لئے وہ قطعاً تیار

نہیں تھی۔ کہ اشفاق نے جو کچھ کیا ماں کے دباؤ سے کیا، وہ اپنے مشاہدات کو کس طرح جھٹلا دیتی۔ کیا اس نے اپنی آنکھوں سے اشفاق کا طرزِ عمل نہیں دیکھا تھا؟ ماں بیٹے کی باتیں جو اکثر اس کے خلاف ہوا کرتی تھیں اپنے کانوں سے نہیں سنی تھیں! لڑکی کے پیدا ہونے پر ماں اور بیٹے کا جو ردِّ عمل سب سے پہلے اس گھر میں اس کو معلوم ہوا تھا اور اس نے یہ خبر آ کر مشتہر کی تھی ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے یہ مان لینا کہ اشفاق تو معصوم ہے، خطاوار صرف کلثوم ہے۔

ایک انہونی سی بات ہے — ناقابلِ یقین، ناقابلِ فہم!

آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا اس نے کہا: کیا کیا لکھا ہے بیٹی اشفاق نے خط میں؟

انجمن کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں، خط تو میں نے اب تک کھولا ہی نہیں۔

کریمن نے منہ بنا کر چڑے ہوئے انداز میں پوچھا: تو کیا یہ ساری باتیں یوں ہی دل سے کہہ رہی تھیں بیٹی؟

وہ ہنستی ہوئی بولی: ہاں! — لیکن کیا تم نے سنا نہیں ہے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے!

وہ اور زیادہ چڑ کر بولی: ہاں سنا ہے، لیکن اب خط بھی تو سنا دو معلوم تو ہو کیا لکھا ہے؟

شکوہ سے بھری نظر ڈالتی ہوئی وہ بولی: اللہ ری بدگمانی، اچھا سنائے دیتی ہوں، — پہلے خود پڑھ لوں!

اور پھر وہ خط پڑھنے لگی۔

خط پڑھتی جاتی تھی اور اس کا رنگ رخ بدلتا جاتا تھا!

کرمین بڑے غور سے اس کی یہ بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہی تھی۔

یکایک اس کے منہ سے نکلا: مجھے سنبھالو میں گری!

اور قبل اس کے کہ بوڑھی کرمین اسے سنبھال سکتی، وہ بیہوش ہو کر پختہ فرش پر دھڑام سے گر چکی تھی، ماتھا اور سر زخمی ہو گیا تھا۔ اور خون بہہ رہا تھا!

کرمین چیخنے لگی۔: ہائے یہ کیا ہو گیا، ارے لوگو!

دھماکے کی آواز سن کر پہلے ہی سلمیٰ چونکنا ہو گئی تھی، کرمین کی چیخ سن کر اس کے حواس جاتے رہے۔ توے پر روٹی چھوڑ کر وہ دوڑی دوڑی انجمن کے کمرہ میں آئی اور یہاں کا ہولناک منظر دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ انجمن بیہوش پڑی تھی۔ خون اب تک رس رہا تھا، لفافہ بدستور اس کی مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کرمین سے پوچھا: ارے یہ کیا ہوا؟

کرمین نے کہا: ابھی خط پڑھ رہی تھیں اشفاق کا!

سلمیٰ نے وہ خط اس کی مٹھی سے نکال لیا، پھر دونوں نے مل کر اسے چارپائی پر لٹا دیا۔ اقبال گیا، ڈاکٹر کو بلا لایا، اس نے مرہم پٹی کر دی، انجکشن لگا دیا، اور اور اطمینان دلاتے ہوئے کہا: تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے یکایک کوئی صدمہ پہنچا ہے جس سے اعصاب پر بہت برا اثر پڑا۔ اور بیہوشی طاری ہو گئی تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا، زخم معمولی ہیں کل تک ٹھیک ہو جائیں گے لیکن مریضہ کے کمرے میں شور و غل نہ ہو۔ نہ ہوش آنے سے پہلے نہ ہوش آنے کے بعد!

سلمیٰ نے اقبال سے کہا: تم یہیں بیٹھو تھوڑی دیر!

پھر وہ کریمن کو لے کر باہر آئی، توے کی روٹی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔ اسے اتارا اور خود پیڑھی پر بیٹھ کر خط پڑھنے لگی۔ خط پڑھتی جاتی تھی اور اس کا بھی رنگ سرخ بدلتا جاتا تھا، کریمن کے دل میں ہول پیدا ہوئی (کہیں) اس کا بھی وہی حشر نہ ہو جو ابھی انجمن کا ہو چکا تھا! اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا خدا کے لئے بتا دو ایسا کیا لکھا ہے اس خط میں؟!

سلمیٰ نے خط پھر لفافے میں ڈالا اور ایک طرف رکھتی ہوئی بولی: اشفاق نے انجمن کو طلاق دے دی ہے!

یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئی۔ کریمن رونے لگی، اس نے کہا: خدا غارت کرے اس عورت کو اور اس شخص کو، ہائے میری بچی اس قابل تھی۔ کیوں بیٹی خدا تو بڑا منصف ہے، کیا انجمن کے ساتھ انصاف کرے گا؟ کیا انسانیت کے ان دشمنوں کو سزا دے گا یا وہ کچھ بھی نہیں کرے گا؟

غمزدہ لب و لہجے میں سلمیٰ نے کہا: خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں کریمن بوا اس کی لاٹھی بے آواز ہے، وہ اپنے گناہ ممکن ہے معاف کر دے لیکن میلے بندوں پر جو ظلم کرتے ہیں وہ نہیں معاف کرے گا۔ ہرگز نہیں کسی قیمت پہ بھی نہیں!

کریمن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: تم نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا بیٹی۔ ورنہ توبہ توبہ میں تو خدا سے بدگمان ہو چلی تھی ـــــ بیٹی سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے ـــــ یہ عمر، یہ روپ، یہ گن اور یہ قسمت! کیوں بیٹی اب کیا ہوگا؟

وہ بولی: یہ داغ زندگی بھر کا ہے۔ اس خط نے جو گھاؤ دل میں ڈالا ہے
وہ مندمل نہیں ہو سکتا لیکن ہم مجبور بندے کر بھی کیا سکتے ہیں:
جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا!

پھر سلمیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: لیکن سوال یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا! آخر طلاق دینے کی ایسی ضرورت کیا پیش آگئی تھی؟ ہماری طرف سے تو کوئی مطالبہ بھی نہیں تھا! ہم نے تو یہ بھی نہیں کہا کہ لڑکی کا خرچ دے دیا کرو!

کریمن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی: کیا بتاؤں بیٹی یہ سب کیا دھرا بی بی (کلثوم) کا ہے، انھیں تو میری بچی سے اللہ واسطے کا بیر ہے، حالانکہ اس غریب نے کبھی انھیں الٹ کر جواب نہیں دیا، ہمیشہ خدمت ہی کرتی رہی!

سلمیٰ گویا ہوئی: وہ تو ٹھیک ہے اور سچ پوچھو تو ہمیں کلثوم سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے، حیرت اگر ہے تو اشفاق پر، اس کا دل پتھر کا کیوں بن گیا؟

کریمن نے کہا: کب نہیں تھا؟

وہ بولی: پھر اس معصوم اور بھولی بھالی لڑکی سے عشق رچانے کی ضرورت کیا تھی؟

کریمن نے جواب دیا: یہ بھی دولت مندوں اور امیروں کا ایک کھیل ہے۔
یہ کیا جانیں محبت کسے کہتے ہیں۔ اور وفادار بیوی کیا چیز ہوتی ہے؟
اور اگر کل کو شمسہ بھی کسی وجہ سے غریب ہوگئی؟
تو اسے بھی چھوڑ دیں گے، اس سے بھی نفرت کرنے لگیں گے اسے بھی طلاق دے دیں گے اور کوئی نئی عورت بیاہ لائیں گے!

اتنے میں اقبال دوڑا دوڑا آیا، اس نے کہا: وہ جاگ گئیں!
کریمن اور سلمیٰ دونوں لپک کر اس کے کمرے کی طرف بڑھیں!

سرودِ غم

... آج سننے والوں کا دل تڑپ تڑپ جائے!

راحت و مسرت کیا رنج بھی نہ راس آئے
زندگی کے دشمن تھے زندگی کے ہمسائے

اس گریزِ بے جا پر اور کیا کہا جائے
ہم تمھاری باتوں میں دور تک چلے آئے

تیرے میکدہ کا بھی کیا نظام ہے ساقیؔ!
کوئی تشنہ لب ترسے کوئی جام چھلکائے

دل میں جذبۂ محکم لیکے چل پڑا ہوں میں
اب جہان کچھ فتارؔ سامنے سے ہٹ جائے

عرضِ غم پہ یوں کوئی مسکرا دیا جیسے
اک چراغ جل جائے اک چراغ بجھ جائے

(۱)

کچھ سے کچھ

اور ایک روز دفعتہً سارے ملک میں کہرام مچ گیا —— پاکستان عالمِ وجود میں آ گیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں تلخی ایک عرصے سے تھی اور اس تلخی ہی نے تقسیم ہند کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ تلخی ہر جگہ نہیں تھی۔ خاص خاص شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں تھی، جہاں نہیں تھی وہاں سیاسی اختلافات کے باوجود ہندو مسلمان سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

لیکن اب ہر جگہ کی فضا بدلی نظر آ رہی تھی، ہر شخص کی آنکھیں بدلی ہوئی تھیں جن سے نسلوں اور پشتوں کے تعلقات تھے وہ کچے دھاگے سے زیادہ کمزور اور بودے ثابت ہوئے تھے۔ ہر روز ریڈیو پر ہولناک خبریں سننے میں آ رہی تھیں۔ اخبارات شہ سرخیوں کے ساتھ فسادات، قتل و غارت اور کشت و

خون کی رپورٹیں شائع کر رہے تھے۔ اغوا، آبروریزی، بچّوں تک کا قتل، ہر زمرے کے واقعات تھے!

ان واقعات سے ہر مسلمان پریشان تھا۔ منشی سجاد حسین ہوں یا ارجمند خاں شفقت صاحب ہوں یا اشاعت گھر کے مالک نور احمد صاحب، سمندر خاں جیسا بے ضرر شہری ہو یا انور جیسا آرٹسٹ سب ہی سہمے ہوئے تھے۔ اور ان لوگوں سے زیادہ ان کے بیوی بچے سہمے ہوئے تھے، اخبار کی ہر خبر پڑھ کر، ریڈیو کی ہر خبر سن کر یہ سب متفقہ طور پر ایک ہی فیصلہ کرتے تھے: پاکستان چلیے!

لیکن ہر شخص تو پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ جن کا کوئی نہ تھا، یا جن کے پاس کچھ نہ تھا۔ یا جو سرکاری ملازمت کے رشتے میں منسلک تھے وہ چلے جائیں تو چلے جائیں، لیکن جو لوگ جمے ہوئے تھے جن کی زمین تھی، جائداد تھی، باغات تھے، دکانیں تھیں، کاروبار تھا، امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس تھا وہ کیوں جاتے؟ انھیں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان میں سے بھی وہ لوگ جا سکتے تھے جنھیں جان کا خطرہ ہو۔ لیکن جو اس خطرہ سے آزاد تھے وہ ایک نوزائیدہ مملکت کی معیشت پر خواہ مخواہ کا بوجھ کیوں بنیں؟

اسلم کی موجودگی میں، منشی سجاد حسین نے اپنے ایک دوست سے جو پاکستان جانے کے لئے پا بہ رکاب تھے یہی بات کہی تھی۔ اور اس بات میں اسلم کو وزن نظر آیا تھا۔

منشی صاحب نے فرمایا:

مجھے دیکھیے ٹھاٹھ سے اخبار نکال رہا ہوں، اب ذاتی پریس بھی ہو گیا ہے فرموں اور کمپنیوں کے اشتہارات اچھے نرخ پر مل رہے ہیں اور کافی مل رہے ہیں

ایک مستقل حلقہ ہے خریداروں کا، یہ سب چھوڑ کر کیوں جاؤں؟ کیا وہاں بھی مجھے یہ سہولتیں حاصل ہوں گی؟ ناممکن!

اور پھر اپنے دوست کو روکتے ہوئے انھوں نے فرمایا: آپ بھی نہ جائیے خدا نے آپ کو کیا نہیں دے رکھا ہے، زمین ہے، جائداد ہے، باغات ہیں، مکانات ہیں، دکانیں ہیں اور ان سب سے لگی بندھی رقم خطیر ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مل جاتی ہے۔ وہاں از سر نو زندگی بنانی پڑے گی، آخر یہ رسک مول لینے سے کیا حاصل؟

اس گفت گو کے دوران میں ایک اور صاحب بھی دیرینہ تعلقات کی بنا پر مشورہ لینے آئے تھے کہ پاکستان جائیں یا نہ جائیں۔ منشی صاحب نے ان سے بھی یہی فرمایا: میاں کچھ دماغ خراب ہوا ہے، بیٹھے رہو اپنی جگہ — الحمدللہ! ہمارے شہر میں ہر طرح امن ہے، نقوی صاحب جیسا کلکٹر، رضوی صاحب جیسا جنٹ میجسٹریٹ، دلاور حسین جیسا کوتوال شہر، بابو کملا پتی جیسا ڈپٹی کمشنر اور گپتا جیسا سپرنٹنڈنٹ پولیس جہاں موجود ہو وہاں کیا ہو سکتا ہے، کسی کی کیا مجال جو سر اٹھائے

ان باتوں سے سب لوگوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ فضا کا وہ کھنچاؤ اور تناؤ جو ہر شخص محسوس کر رہا تھا ایک وہم نظر آنے لگا!

لیکن چند ہی روز کے بعد یہ وہم حقیقت بن گیا!

نقوی صاحب پاکستان چلے گئے، رضوی صاحب نے بھی وہیں کی ملازمت کو ترجیح دی، خان صاحب دلاور حسین معطل کر دیے گئے، بابو کملا پتی اور گپتا کا تبادلہ ہو گیا۔ نقوی صاحب کی جگہ سردار فتح سنگھ تشریف لائے۔ رضوی صاحب کی کرسی سردار

سورن سنگھ کے حصے میں آئی ۔ دلاور حسین کی جگہ موہن پرشاد کوہلی کملاپتی اور گپتا کی جگہ بھی دو نئے آدمی آ گئے !

اس تبدیلی نے سارے شہر پر ایک طرح کا عالم دہشت طاری کر دیا، ایک قوم کے لوگ جو کبھی بڑے محترم و معزز نظر آتے تھے اور جنھیں اپنی سینہ زوری پر ناز تھا، دبے ہوئے اور سمٹے ہوئے نظر آنے لگے ۔ سردار فتح سنگھ نے آتے ہی بہت سے لوگوں کو "غنڈہ" قرار دے کر گرفتار کر لیا، حالانکہ انھوں نے کبھی غنڈہ گردی کا ارتکاب نہیں کیا تھا، سردار سورن سنگھ نے ہر گھر کی تلاشی اس احتیاط سے لی کہ ترکاری کاٹنے کی چھری کو بھی آلۂ دھار دار میں شمار کر کے ضبط کر لیا ۔ اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا ۔ موہن پرشاد نے اعلان کیا کہ : دورِ مجنوں گزشت نوبت ماست ! اب کسی کی شرارت برداشت نہیں کی جائے گی، کسی نے سر اٹھایا تو کچل دیا جائے گا ۔ بدامنی، فساد انگیزی اور منافرت میں حصہ لیا تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی !

چند روز کے اندر فضا کی یہ تبدیلی دہشت انگیز بھی تھی اور خطرناک مستقبل کی نقیب بھی !

منشی صاحب تک کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی، بڑی حسرت سے اپنے نئے خریدے ہوئے پریس کو دیکھتے اور پھر اُسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگتے ۔ بڑی حسرت سے اپنے دو نئے بنوائے ہوئے مکانوں کو دیکھتے اور شومیٔ تقدیر پر آنسو بہانے لگتے ۔ بڑی حسرت سے اشتہاری فرموں اور کمپنیوں کے بل بنتے دیکھتے اور سوچتے کیا یہ آخری تو نہیں ہیں ؟ بار بار دل مشورہ دیتا چلو پاکستان ! اور پھر سوچتے یہ پریس کسے دے جاؤں ؟ یہ مکانات کسے بخش دوں ؟ یہ اخبار یہ سونے کی چڑیا کس کے حوالے کر جاؤں ؟

کاش میں نے پریس نہ خریدا ہوتا، مکانات نہ بنوائے ہوتے ـــــ اگر جانا پڑا تو کیا ہوگا؟

حق ہمسائگی کی بنا پر ارجمند خاں بھی ایک دن مسکین سی صورت بنائے تشریف لائے۔ منشی صاحب خود اپنے غم میں پریشان تھے انھیں دیکھ کر جل ہی تو گئے۔ سرد مہری کے ساتھ پوچھا: کہئے خان صاحب کیسے آنا ہوا؟

خان صاحب نے فرمایا: ہم سے کہتا ہے ہوٹل خالی کر دو، کہتا ہے گوشت مت پکاؤ، کہتا ہے بھاگ جاؤ!

منشی صاحب نے حسرت بھرے لہجے میں کہا: ہاں بھئی نہ جانے کیسا زمانہ آلگا ہے ہم سے بھی سب یہی کہہ رہے تھے!

ارجمند خاں کی مسکینیت غائب ہونا شروع ہوگئی تھی اور رجاریت نمایاں ہونے لگی تھی۔ انھوں نے کاسنی رنگ کی مخملی صدری کی اندرونی جیب سے ایک جڑاؤ چاقو نکالا اور اسے کھول کر فرمایا: تو کیا ہم بزدل ہے؟

منشی صاحب کی پیٹھ کرسی کی پشت سے ٹک گئی اور مرے لہجے میں سر پیٹتے ہوئے ارشاد فرمایا: ارے خان صاحب مارڈالا آپ نے!

خان صاحب کو اس انکشاف پر حیرت ہوئی۔ انھوں نے اسی طرح چاقو ہاتھ میں لئے لئے کہا: تمھیں کیوں مارے گا دشمن کے سینے میں اتارے گا!

منشی صاحب نے تقریباً روتے ہوئے فرمایا: خدا کے لئے اسے بند کیجئے، رکھ لیجئے جیب میں اسے، اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا، دھر لئے جائیں گے آپ۔ اور آپ کے ساتھ یہ نیاز مند بھی! اس زمانے میں چاقو، اس زمانے میں ایسی

باتیں، خان صاحب وہ زمانہ گیا جب ہم بہادر تھے، اب تو ہم بزدل ہیں۔ صرف بزدل بن کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں وہ بھی خدا جانے!

خان صاحب نے نہایت احتیاط سے چاقو بند کیا، پھر اسے جیب میں رکھ لیا اور فرمایا: تم کیسا مسلمان ہے۔ بزدلی کی بات کرتا ہے! تم سے بہادر تو ہمارا احمد خاں ہے کم سے کم چار کو مارے گا تب مرے گا!

بے ساختہ منشی صاحب کے منہ سے نکلا: انا للہ وانا الیہ راجعون! خدا کے لئے چپ رہیے!

ارجمند خاں کو گئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اطلاع آئی کہ شہر کے جنوبی حصے میں فساد پھوٹ پڑا ہے جہاں صورت حال کو قابو میں رکھنے کے لئے مسلح پولیس کے دستے پہنچ گئے ہیں۔ اور چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ شہر میں بھی تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ کرفیو کا نفاذ کر دیا گیا ہے یعنی شام کے ۵ بجے سے صبح آٹھ بجے تک!

یہ خبریں سن کر منشی صاحب بدحواس ہو گئے، دفتر کا ہر شخص اپنے گھر جانے کے لئے بے چین تھا، اخبار کا کام بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا تھا اسے نشم پشتم ختم کر کے لوگ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ اسلم اب تک گردن جھکائے لکھنے میں مصروف تھا۔ منشی صاحب نے کہا: اب جائیے زندگی رہی تو کل ملاقات ہو گی!

(۲)

پھر ایک دن دفعتہً...

کھنچاؤ اور تناؤ میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا اور پھر ایک دن سارے شہر میں فتنہ و فساد، کشت و خون اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ نہ کرفیو کام آیا، نہ مسلح پولیس اور فوج کے دستے، عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سے آسمان لرزنے لگا۔ بے گناہوں کے خون سے زمینِ وطن پر گل کاریاں شروع ہو گئیں، ہر شخص دہشت زدہ تھا۔ امیر و غریب کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ شاندار حویلیاں بھی اتنی ہی غیر محفوظ تھیں جتنے خس پوش جھونپڑے، دولت مند اور سرمایہ دار بھی خوفِ مرگ سے اسی طرح لرزہ براندام تھے جتنے غریب اور فاقہ مست۔ ہر طرف افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا، کسی کو کسی کی پروا نہ تھی، سب اپنی اپنی فکر میں تھے!

حالات بگڑے تو بگڑتے ہی چلے گئے۔ ارجمند خاں موت سے لڑتا ہوا مارا گیا جیالا آدمی تھا۔ بزدلوں کی موت اسے گوارا نہ ہوئی۔ ممند رخاں بیچارہ سے سر پر

پاؤں رکھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن موت اس سے زیادہ تیز رفتار تھی شفقت صاحب کی دکان لٹ گئی۔ یہی حال اشاعت گھر کا ہوا، منشی سجاد حسین کا پریس نذرِ آتش ہو گیا، اخبار کے دفتر میں آگ لگا دی گئی، کاغذ کے سبب سے ریم راکھ بنا دیے گئے۔

امن اور سلامتی کی منزل ــــ پاکستان ــــ کی طرف ہر شخص بیتابانہ لپک رہا تھا۔ کراچی بہتوں کی منزلِ مقصود تھی۔ یہاں قائد اعظم تھے، لیاقت علی خاں تھے، عبد الرب نشتر تھے، چندریگر تھے!

منشی سجاد حسین اور شفقت صاحب اپنی پہلی فرصت میں اپنی جمع جتھا اور اہل و عیال سمیت کراچی پہنچ گئے۔ اسلم کی بھی خواہش تھی کہ پاکستان پہنچ جائے لیکن وہاں جانا کچھ آسان تو نہ تھا، کم از کم پانچسو روپے ہوتے تو اپنے چھوٹے سے کنبے کو لے کر رختِ سفر باندھ سکتا تھا۔ پانچ سو روپے؟ جیل کے گھونسلے میں ماس کہاں! اتنی رقم کہاں سے آتی۔ منشی صاحب نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا شفقت صاحب نے دکھاوے کے لئے بھی خبر نہ لی۔ ان دونوں کے ذمے اس کی اتنی رقم باقی تھی کہ اپنے کنبے سمیت اس سے کئی مرتبہ پاکستان آ جا سکتا تھا مگر کسی سے ایک پائی بھی وصول نہ ہوئی۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ یہ لوگ کنگال ہوتے، اتنا کچھ نقصان اٹھانے کے باوجود بہت کافی نقد رقم دونوں اپنے ساتھ لے گئے۔

اس فساد نے جہاں اس کی رقم ڈبو دی وہاں قرض خواہوں سے بھی اسے نجات مل گئی۔ ارجمند خاں تو ویسے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ دودھ والا اس طرح غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، راشن والے کی دکان بند ہوئی تو پھر نہ کھلی، گھی والے کے بارے میں مختلف روایتیں تھیں، کوئی کہتا تھا وہ شہید

ہوگیا۔ کسی کا خیال تھا جیل بھیج دیا گیا۔ کیونکہ گو آدمی شریف تھا لیکن صورت سے غنڈہ نظر آتا تھا۔ بعض کی رائے تھی ساری جمع جتھا لے کر پاکستان روانہ ہوگیا۔

جو جا سکتے تھے وہ چلے گئے۔ جو نہیں جا سکتے تھے وہ موت اور زندگی کی کش مکش میں گرفتار تھے۔ انھیں لوگوں میں اسلم بھی تھا، ایک طرف فساد کی گرم بازاری، قتل و غارت، کشت و خون، بد امنی، دوسری طرف بے روزگاری، مفلسی اور اندیشہ ہائے دور و دراز! اسی سوچ میں پریشان اور مضمحل بیٹھا تھا کہ سلمیٰ نے پوچھا:

یہ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

وہ گویا ہوا: یہ سوچ رہا ہوں کہ اب کس طرح زندگی بسر ہوگی؟

وہ بولی: یہاں تو کسی طرح بھی کام نہیں چل سکتا۔ نہ سجاد صاحب ہیں نہ شفقت صاحب، ان لوگوں سے کچھ نہ کچھ کام تو مل ہی جاتا تھا، سربلند خاں بھی نہیں، گو کھوٹا سکّہ تھا لیکن کام آجاتا تھا، جن لوگوں سے حساب چلتا تھا وہ بھی ایک ایک کر کے کچھ اللہ کو پیارے ہوگئے کچھ پاکستان بھاگ گئے۔ اور یہاں کی حالت یہ ہے کہ گویا تلوار سر پر لٹک رہی ہے نہ جانے کب کیا ہو جائے! آپ ذرا دیر کو بھی باہر جاتے ہیں تو تو میرا دل ہولنے لگتا ہے۔

اسلم کے خشک ہونٹوں پر تبسم ابھرا اس نے سوال کیا، دل کیوں ہولنے لگتا ہے کیا اس لیے کہ کوئی مجھے مار نہ ڈالے؟ (ٹھنڈی سانس لے کر) لیکن سلمیٰ اس دیس میں، میں تو کہتا ہوں اس دنیا میں انسان کی قدر و قیمت ہی کیا رہ گئی ہے، بس جس کے پاس روپیہ ہو خواہ وہ انسان کی صورت میں جانور ہی کیوں نہ ہو؟ فرض کرلو اگر میں مارا گیا تو کون سی قیامت آجائے گی۔ ایک بے روزگار کے بوجھ سے دنیا نجات پا جائے گی۔ ایک ایسے

شخص کے وجود سے جو کسی کے کام نہیں آسکتا۔ جو اپنی بیوی کو آرام نہیں پہنچا سکتا بہن کو سُکھ نہیں دے سکتا ــــ ارے! تم رونے لگیں ــ اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، خدا کے لیے آنسو پونچھ ڈالو ورنہ واقعی مجھے نہ جانے کیا ہو جائے گا!

سلمیٰ نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے اور کہا:

اس طرح کی باتیں کرتے ہیں شاید آپ کو مزا آتا ہے۔ آپ کو یہ بھی اچھی رہی کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری ــــ آخر پاکستان کیوں نہیں چلے چلتے آپ بھی؟

اسلم نے زہر خند کرتے ہوئے کہا: مجھے پاکستان جانے سے کب انکار ہے، ابھی چلنے کو تیار ہوں لیکن پاکستان کسی محلّے کا نام تو نہیں ہے کہ یہاں سے اٹھے اور وہاں پہنچ گئے۔ وہ ایک ملک ہے، ایک دور دراز ملک۔ کئی سو میل کا فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہ کئی سو میل کا فاصلہ ظاہر ہے پا پیادہ نہیں طے کر سکتے۔ ریل، جہاز یا طیارہ کے ذریعے جا سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے روپیہ چاہیے۔

اور روپیہ ہے نہیں!

اب کی تم نے پتے کی بات۔

لیکن پھر کیا ہو گا؟

یہی یہ سوال ہے ــ اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

یہ باتیں رات کے کھانے کے بعد شروع ہوئی تھیں اور باتوں باتوں میں کافی وقت گزر چکا تھا۔ صبح اٹھ کر اسلم کو پھر ادھر اُدھر کی ٹوہ لینا تھی کہ شاید پاکستان جانے کا بندوبست ہو سکے۔ اس نے کہا:

اب سونا چاہیے۔

اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ سلمیٰ کے کان کھڑے ہوئے اس نے سہمے اور لرزتے ہوئے لہجے میں کہا: کوئی ہے۔

اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا: ہاں کوئی ہے ضرور، لیکن کون ہو سکتا ہے اس وقت؟

یہ کہہ کر اسلم دروازے کی طرف بڑھا لیکن سلمیٰ نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

نہ جائیے!

اس نے دامن چھڑاتے ہوئے کہا: نہ کیسے جاؤں، نہ جانے کون ہے؟ کیوں آیا ہے؟ معلوم تو کروں کیا بات ہے؟

سلمیٰ اسی طرح اس کا دامن پکڑے بولی: نہ جانے کون ہو۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ آج ہی ہمارے گھر کے سامنے ایک راہ چلتے مسلمان کا قتل ہو چکا ہے

اتنے میں دستک کی آواز پہلے سے زیادہ زور سے آئی۔ سلمیٰ کا رنگ رخ سفید پڑ گیا، اس نے اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو بے خبری کی نیند سو رہا تھا کہا: یہ معلوم کر آئے گا۔

اسلم سنجیدہ لب ولہجہ میں بولا: میرے ہوتے یہ کیسے چلا جائے گا!

سلمیٰ نے دامن چھوڑ دیا اور کہنے لگی: اچھا میں جاتی ہوں۔

اتنے میں آواز آئی اسلم صاحب کیا سو گئے؟

اسلم نے کہا: انور کی آواز ہے لیکن یہ کیوں اتنے ناوقت آیا ہے ضرور کوئی خاص بات ہے، انور کا نام سن کر سلمیٰ مطمئن ہو گئی۔ اسلم باہر پہنچا اور انور کو دیکھتے ہی سوال کیا:

خیریت ہے اس وقت کیسے آگئے تم؟

انور ہنسنے لگا ۔ ملنے کا جی چاہا چلا آیا!

زہے نصیب ۔ آئیے تشریف لائیے!

نہیں بیٹھنے نہیں آیا ہوں ۔

پھر کیا سلام کرنے آئے تھے؟

ہاں ۔ الوداعی سلام ۔

کیا مطلب؟

مطلب بالکل واضح ہے ۔ ہم نے بھی سامانِ سفر تیار کر لیا ۔

کیا تم بھی پاکستان جارہے ہو؟

ہاں بھئی ہاں ۔ اسی لیے تو الوداعی سلام کرنے حاضر ہوا ہوں ۔

یہ سن کر اسلم کو ایک دھچکا سا لگا ۔ ہر شخص پابہ رکاب ہے، ہر شخص پر تول رہا ہے جانے کے لیے جسے دیکھیے وہ سامانِ سفر تیار کر رہا ہے ۔ بس ایک میں ہوں جو اس قتل گاہ میں رہنے پر مجبور ہوں سلمیٰ کہہ رہی تھی آج ہمارے گھر کے سامنے ایک مسلمان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ۔ کسی دن میرے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے میرے گھر پر آکر لوگ مجھے، سلمیٰ کو، انجمن کو، اقبال کو قتل کر ڈالیں، گھر میں آگ لگا دیں اور سب کچھ لوٹ لیں، میں کیا کر سکوں گا!

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ انور نے کہا: یار تم بھی کیوں نہیں چلتے ۔ آخر یہاں رہ کر کیا کروگے، وہاں تم ترقی کر سکتے ہو، وہاں تم اپنے قلم کی پوری قیمت وصول کر سکتے ہو وہاں عزت، آرام اور آسائش کی زندگی بسر کر سکتے ہو وہاں تمھارے لیے بہت سے مواقع ہوں گے

اسلم یہ تقریر خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہتے تو ٹھیک ہو۔ اکیلا ہوتا تو شاید بے ٹکٹ بھی چلا جاتا مگر اتنے آدمیوں کو ساتھ لے کر یہ بھی نہیں کر سکتا۔

انور ہنسنے لگا: جب تک ہم زندہ ہیں بے ٹکٹ سفر کریں تمھارے دشمن، چلنا ہے تو سامان باندھ لو، میں یہی کہنے آیا ہوں، آج سے ٹھیک دو دن بعد ایک اسپیشل جا رہی ہے۔ میرے بڑے بھائی ریلوے گارڈ ہیں وہی یہ ٹرین لے کر جائیں گے۔ ہم سب جا رہے ہیں، تم بھی میرے بھائی ہو تمھارے متعلقین میرے عزیز ہیں، میں نے سب کچھ طے کر لیا ہے، چاہو تو شوق سے چل سکتے ہو۔ ورنہ میں زبردستی کرنا بھی جانتا ہوں۔

اسلم کے دل کی مراد مل گئی۔ اس نے پوچھا: کیا واقعی؟

انور نے کہا: میں بہت برا آدمی ہوں، جھوٹ بھی حسب ضرورت بول لیتا ہوں اور بھی نہ جانے کیا کیا نقائص ہیں میرے اندر۔ لیکن میں اسلم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میرے دل میں اس کی عزت ہے۔ میں اسے بہت اچھا، بہت اونچا اور بہت بڑا انسان سمجھتا ہوں۔

اسلم نے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: نہیں انور جھوٹ نہ بولو، سچی بات یہ ہے کہ تم ہو بہت اچھے، بہت اونچے اور بہت بڑے انسان اس زمانے میں ــ اس تاریک زمانے میں کہ جب سایہ بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے جب کوئی کسی کی بات نہیں پوچھتا، جب ہر شخص صرف اپنی فکر میں ہے، تم اتنی رات گئے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میرے پاس آئے ہو صرف اس لیے کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میرے پاس، جس کا کوئی ساتھی نہیں، کوئی ہمدرد نہیں سجاد

صاحب میرے۔ مقروض تھے لیکن سب کچھ بٹور کے اپنے ساتھ لے گئے مجھے ایک پیسہ تک نہ دیا۔ شفقت صاحب سے بھی مجھے بہت کچھ لینا تھا وہ بھی لاکھوں روپیہ لے گئے مگر میری خبر نہ لی۔ کتابیں، گھر والے بھی اخلاقاً میری خبر لینے پر مجبور تھے۔ لیکن انھوں نے بات بھی نہ پوچھی۔ اور تم اس اندھیرے، اس تاریکی میں، اس ہُو کے عالم میں میری خبر لینے میری مدد کرتے، مجھے خطرے سے نکال کر امن کی دنیا میں پہنچانے کے لیے آگئے۔ کیا تم سے بڑھ کر بھی عزت اور احترام کا کوئی مستحق ہو سکتا ہے؟ کیا تم سے بڑھ کر بھی کوئی اچھا، اونچا اور بڑا انسان ہو سکتا ہے؟

انور ہنسنے لگا اور گویا ہوا: "تم" پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کے بعد جیب سے سو سو روپے کے تین نوٹ نکالے اور اسلم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

یہ اپنے پاس رکھ لو۔

اسلم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اتنا کافی ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ لیے چل رہے ہو۔ روپے لے کر میں کیا کروں گا۔

اسلم نے زبردستی وہ نوٹ اسلم کی جیب میں رکھ دیے اور بولا: کام آئیں گے آخر سامانِ سفر بھی تو ٹھیک کرنا ہے۔ راستے میں بھی تو کچھ ضرورتیں پیش آئیں گی۔ میں جانتا ہوں اس وقت تم بالکل خالی ہاتھ ہو۔ پھر دے دینا جب چاہنا۔

اسلم نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی۔۔ ہاں خالی ہاتھ تو ہوں، لیکن تمھارے پاس کون سا دھن برس رہا ہے؟

اسلم نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اس نے جیب سے سو سو کے کئی اور نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا:

یہاں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ ہوائی اڈے پر انکم ٹیکس والوں کو اطلاع دینے کی دھمکی دے کر اپنی جو رقم میں نے شفقت صاحب سے وصول کی تھی اس کا کافی حصہ موجود ہے۔ اچھا اب جاؤ سوؤ۔

اسلم نے کہا: سونے کے لیے ساری رات پڑی ہے چلو تمھیں تمھارے گھر تک پہنچا آؤں چل کر۔

انور نے ہنستے ہوئے کہا: پھر تو یہ سلسلہ رات بھر جاری رہے گا۔ مجھے میرے گھر تک تم پہنچانے جاؤ گے پھر میں تمھیں پہنچانے آؤں گا۔

اسلم نے سمجھاتے ہوئے کہا: رات اتنی آچکی ہے، راستہ پُرخطر ہے۔ تنہا جانا مناسب نہیں۔

انور نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا: بھائی میں تنہا نہیں آیا ہوں۔ دو آدمی میرے ساتھ اور بھی ہیں، موٹر پر آیا ہوں، تیسرا ڈرائیور ہے اور ہم سب کے پاس بھرے ہوئے پستول ہیں۔ انور چلا گیا۔

اسلم اندر داخل ہوا تو سلمیٰ دروازے کے پاس کھڑی تھی اس نے پوچھا تم یہاں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟

وہ بولی: کچھ نہیں، آپ کو دیکھ رہی تھی۔

نہیں تم اس لیے آئی تھیں کہ اگر کوئی دشمن ہو اور مجھ پر حملہ کرے تو اس سے لڑو۔

ایک عورت غنڈوں اور بدمعاشوں سے کس طرح لڑ سکتی ہے! ہاں جان دے سکتی ہے سو بے شک اپنی جان دے دیتی!

اسلم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور محبّت بھرے لہجے میں کہا:

تم نے انور کی سب باتیں سُن لیں؟

وہ بولی: ہاں سُن لیں — واقعی حیرت ہوتی ہے — اس زمانے میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں۔

اسلم نے کہا: بڑی خوبیوں کا آدمی ہے یہ انور۔ گہرا دوست مخلص، جاں نثار — فدائی!

سلمیٰ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: تو پھر دو دن کے بعد چل رہے ہیں پاکستان؟

اسلم ہنسنے لگا: کیا اب بھی تمھیں شبہ ہے کچھ؟ انجمن کو بھی مطلع کر دو اور آج ہی سے سامانِ سفر باندھنا شروع کر دو۔

تھوڑی دیر تک دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سلمیٰ سو گئی۔

اسلم بھی بہ ظاہر سو رہا تھا اور جاگتے میں خواب دیکھ رہا تھا — نئے وطن کے بارے میں — نئی زندگی کے بارے میں — اور روشن، تابناک اور درخشاں مستقبل کے بارے میں!

(۳)

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں!

شہر کے فساد اور قتلِ عام کی دہشت نے جس گھر کو قبرستان بنا دیا تھا اب وہاں پھر زندگی کے ولولے مچلنے لگے۔

اسلم، اقبال، سلمیٰ سب اس طرح سامانِ سفر تیار کر رہے تھے جیسے بہت دن پردیس میں رہ کر وطن واپس جا رہے ہیں۔ جس سرزمین پہ آنکھیں کھولی تھیں، جہاں پشتوں سے رہتے چلے آتے تھے، جہاں کے کھیتوں اور باغوں میں زندگی کاٹی تھی، جہاں کی خاک سے خمیر اٹھا تھا اب وہ وطن نہیں تھا۔ اب وطن وہ تھا جس کا صرف نام سنا تھا۔ جہاں جانے کا، جسے دیکھنے کا، جہاں رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پرانا وطن اب پردیس تھا، جو پردیس تھا اس میں وطن کی کشش پیدا ہو گئی تھی، بلکہ وطن سے بھی کچھ زیادہ عزیز اور محبوب نظر آ رہا تھا، رہ رہ کر اسلم کے دل میں خیال آتا تھا کیا وطن کی نسبت بھی اضافی ہوتی ہے؟ کم از کم اس وقت تو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اقبال کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ اتنا خوش تھا، ایسا خوش تھا جیسے یہاں سے پناہ گزیں بن کر نہیں تاجِ شہریاری زیبِ تن کر کے جا رہا ہے۔ انجمن کا جہاں تک تعلق تھا وہ بھی بہت خوش تھی، خوش ہونا بھی چاہیے تھا۔ پھانسی کے تختے سے اگر کوئی اُتار لیا جائے تو کیسے خوش نہیں ہوگا۔ یہ شہر، یہ محلّہ، یہ گھر اب اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا، یہاں موت چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ خنجر زنی، کشت و خون، مار دھاڑ، غارت گری، بد امنی، فساد روزمرّہ کے واقعات بن گئے تھے۔ اسلم جب باہر جاتا تھا سارا وقت دعا مانگتے اور انگاروں پر لوٹتے گزرتا تھا۔

اقبال کو کسی کام سے باہر بھیجتی تو جب تلک آنہ جاتا دل دھڑکتا رہتا۔ خود اپنی اور انجمن کی جان و آبرو کے بارے میں بھی اطمینان نہ تھا۔ نہ جانے غنڈے کب چڑھ آئیں فوج اور پولیس تو انہی کا ساتھ دیتی ہے بھلا ان کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ کریمن کے دل میں بھی لہریں اٹھ رہی تھیں مسرت کی، بیچاری کو سیر و سیاحت کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ نو برس کی عمر سے جب ہوش سنبھالا تھا اب تک کا سارا زمانہ قیدِ تنہائی میں بسر ہوا۔ گھر میں رہیں تو باپ اور بھائی کی جھڑکیاں کھاتی رہیں، بیاہی گئیں تو ایسے شخص سے جو اپنے وقت کا طرّم خاں تھا، بات پیچھے گالی پہلے اور کبھی کبھی مرکّا اور گھونسا اور طمانچہ بھی، اللہ اللہ کر کے وہ مرا، آزادی ملی تو کلثوم بی کے پنجۂ اقتدار میں اس طرح جکڑ دی گئیں کہ لاکھ پھڑپھڑائیں مگر نکل نہ سکیں۔ اب ایک عرصے سے انجمن کے ساتھ یہاں تھیں لیکن اس شہر میں ہلّڑ بازی کے سوا کیا تھا اور اب پاکستان جائیں گی، لاہور دیکھیں گی، کراچی کا نظارہ کریں گی سنا ہے یہ دونوں شہر بڑے اچھے ہیں، یہاں کے لوگ بھی اچھے ہیں، نیا دیس، نیا دانہ نیا پانی ذرا منہ کا مزا تو بدلے گا۔ سامانِ سفر کی تیاری میں وہ بھی بڑے جوش و خروش سے حصّہ لے رہی تھیں لیکن انجمن! اس کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ وہ کچھ عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کی نگاہِ تصوّر میں بار بار سعادت گنج ابھرتا تھا۔

اشفاق کی تصویر سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ فرزانہ یاد آنے لگتی تھی۔ اور ان سب کے ساتھ کتنی نہ بھولنے والی یادیں پر اباندھ کر سامنے آ کھڑی ہوتی تھیں اب سعادت گنج سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن تھا۔ ریڈیو پر پابندی سے خبریں سننے کی عادی تھی۔ فساد کی خبروں کے ضمن میں کئی مرتبہ سعادت گنج کا نام بھی سننے میں آیا اور جب بھی ایسا ہوا تو نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے سینے میں ہلچل سی مچ گئی۔ اور اب وہ پاکستان جا رہی تھی سعادت گنج کو یہیں چھوڑ کر، اشفاق کو یہیں چھوڑ کر کیا اُسے ایسا کرنا چاہیے؟ کیا اسے پاکستان چلا جانا چاہیے؟ وہ سوچنے لگی۔ یہ ننھی سی جان جو میرے سینے سے چپٹی ہوئی ہے میری نہیں اشفاق کی ہے، یہ اس کی امانت ہے، اگر میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلی جاؤں تو یہ خیانت تو نہ ہوگی۔ ہاں وہ اس کی بات نہیں پوچھتا۔ ممکن ہے میرے چلے جانے کے بعد اسے نجمہ کی یاد ستائے، پھر کیا ہوگا؟ ممکن ہے بڑی ہو کر نجمہ مجھ سے سوال کرے: تم میں اور میرے باپ میں نہیں بنی لیکن تم نے میرے باپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے کیوں جُدا کر دیا؟ پھر میں کیا جواب دوں گی! کیا میری بیٹی مجھے حقیر اور ذلیل نہیں سمجھنے لگے گی؟ جی چاہتا ہے جاؤں اور جس کی امانت ہے اسے سونپ دوں لیکن کوئی اس امانت کا لینے والا بھی ہے؟ کلثوم بی کا بس چلے تو اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اشفاق اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور اشفاق کی نئی اور دولت مند بیوی تو اس کے نام سے چڑتی ہے ـــــ نہیں، ان میں کوئی بھی اسے قبول نہیں کرے گا۔ سب اسے دھتکار دیں گے ـــــ پھر بھی میرا فرض ہے۔ اور یہ سوچتے سوچتے اس نے زور سے نجمہ کو کلیجہ سے لگا لیا۔ جیسے کوئی اسے چھینے لیے جاتا ہے، پھر وہ رونے لگی۔ اب دل کا چور باہر آیا۔ یہ ساری کیفیت اس لیے نہیں تھی کہ وہ نجمہ کو اشفاق کے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ ایسا تو کبھی اور

کسی قیمت پر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بجمہ اس کے جگر کا ٹکڑا ہے، اس کی جان ہے، اس سے جدائی کا تصور بھی ممکن نہیں، لیکن اس دلیس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہتے وقت کم سے کم خیریت تو معلوم ہو جاتی سب کی۔ سب کی — یعنی اشفاق کی — یعنی :

ہمیں یاد سب ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

لیکن خیریت کس طرح معلوم ہو، حالات پُر امن تھے جب بھی خط و کتابت نہیں تھی۔ اور اب تو وہاں خط کیا جائے گا۔ اور اگر جواب دیا جائے تو اس کا یہاں تک پہنچنا ناممکن تھا پھر — وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سلمیٰ آ گئی۔ سامنے کچھ سامان پڑا تھا اور انجمن بجمہ کو گود میں لیے خاموش بیٹھی تھی، وہ انجمن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ محبت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا : کیا سوچ رہی ہو انجمن؟ پھر نظر اٹھا کر دیکھا تو موتی کی لڑیاں اس کے دیدۂ تر سے برسنے لگیں۔ اس نے اور زیادہ حیران و پریشان ہو کر سوال کیا : خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟

سلمیٰ نے اپنی چاہت اور اپنے برتاؤ سے انجمن کو خرید لیا تھا، وہ اس سے اپنی کوئی بات چھپا نہیں سکتی تھی۔ کوئی راز، راز نہیں رکھ سکتی تھی۔ سب کچھ اگل دینا پڑا اس کے سامنے، بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ اس نے کہا :

چور چوری سے گیا لیکن ہیرا پھیری سے نہیں گیا۔ تم اب تک اشفاق جیسے بے مروت اور دغاباز کو بھول نہیں سکیں۔

انجمن نے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ جواب دینا چاہا تھا کہ اسلم کے پکارنے کی آواز آئی۔ انجمن کو چھوڑ کر وہ اسلم کے کمرے میں پہنچی۔ اسلم نے کہا : بھئی آج سارا سامان تیار ہو جانا چاہئے۔ کل چار بجے سہ پہر کو یہاں سے اسپیشل روانہ ہو گی۔ ہمیں تین بجے اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے

یہ موقع اگر ہاتھ سے نکل گیا تو کفن بھی نہیں ملے گا یہاں۔

سلمیٰ بگڑ گئی۔ آخر بدشگونی کی باتیں بے دھڑک کیوں نکال دیا کرتے ہیں آپ منہ سے!

اسلم ہنسنے لگا۔ سلمیٰ نے کہا: کچھ انجمن کا حال بھی سنا آپ نے!

وہ پریشان ہو گیا۔ انجمن کا حال؟ کیا ہو گیا اُسے؟

اس نے سارا ماجرا سنا دیا۔ اسلم چُپ چاپ سنتا رہا، پھر گویا ہوا: جی تو میرا بھی چاہتا تھا چند گھنٹوں کے لیے سعادت گنج ہو آؤں۔ تعلقات لاکھ ختم سہی پھر بھی یہ لوگ عزیز ہیں خونی رشتہ ہے۔ خیریت معلوم ہی کر لینی چاہیے۔ فساد کے شعلے بہر حال وہاں بھی کسی نہ کسی حد تک پہنچ چکے ہیں ـــ

سلمیٰ نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔ پھر کیا ارادہ ہے؟

اس نے جواب دیا: ارادہ کیا، ہو تا جاؤں گا تم اب مطمئن کر دو انجمن کو!

سلمیٰ نے حواس باختہ ہو کر سوال کیا آپ سعادت گنج جائیں گے اس آگ میں؟

اس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا: خواہ مخواہ مت پریشان ہو اکرو۔ سعادت گنج کا راستہ محفوظ ہے۔ صبح کی گاڑی سے جاؤں گا۔ ۶ بجے صبح پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے ۸ بجے چلوں گا یہاں دس بجے پہنچ جاؤں گا، کھانا دانا کھا کر دو بجے اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔

بات کچھ سلمیٰ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن وہ اسلم کے تیور پہچانتی تھی۔ اس فیصلے کو بدلنا آسان نہ تھا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ کہ انجمن کی بات کیوں پہنچائی اس تک! مگر اب کیا ہوتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

صبح کا ناشتہ سب لوگ ساتھ بیٹھ کر کرتے تھے۔ ناشتے پر انجمن نے سلمیٰ سے پوچھا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟ ـــ وہ افسردگی اور کسی حد تک بے رخی کے ساتھ بولی، سعادت گنج گئے ہیں

چائے کی پیالی انجمن کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی، اس نے گلوگیر آواز میں پوچھا:
وہاں کیوں گئے۔ کیا ضرورت تھی جانے کی؟
سلمیٰ کا دل اس کے آنسو دیکھ کر لرزنے لگا۔ وہ ذرا سی بے رُخی کی کیفیت جو اس
کے لب و لہجے میں تھی دور ہو گئی۔ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا: تمھاری خاطر ـــ خیریت
معلوم کرنے ـــ انجمن اُلجھ پڑی تو کیوں جانے دیا تم نے!
وہ بولی: تو کیا روک لیتی۔
انجمن نے ویسے ہی بگڑتے ہوئے کہا ہاں ـــ مجھے کیوں نہیں بتایا، میں نہ جانے
دیتی ـــ میں روک لیتی اُنھیں۔ آج ہی ریڈیو نے پھر بتایا ہے کہ فساد کی آگ سعادت گنج
کے آس پاس پھر بھڑک اٹھی ہے۔
یہ سُن کر سلمیٰ پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ گھبراہٹ میں ریڈیو کے پاس جا کر کھڑی
ہو گئی۔ اسٹیشن ملایا۔ مگر یہاں تو گانا ہو رہا تھا۔
روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔
اقبال نے لقمہ دیا: خبروں کا وقت تو گزر گیا۔
ہارے ہوئے جواری کی طرح سلمیٰ پھر واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ ناشتہ ویسے ہی
رکھا رہا کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔
نو بجے سلمیٰ نے اقبال کو اسٹیشن بھیجا کہ اسلم آ گیا ہو تو اسے لے آ۔ اس کی جان کا
محافظ بن کر فوراً واپس آئیے۔
۹ بجے۔ دس بج گئے۔ ساڑھے دس پر جب سوئی پہنچی تو اقبال واپس آیا ـــ لیکن تنہا!
اُسے تنہا دیکھ کر سلمیٰ اور انجمن کا خون خشک ہو گیا۔ سلمیٰ نے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟

پھر انجمن نے سوال کیا: بھائی جان نہیں آئے؟

اقبال نے مختصر سا جواب دیا: نہیں۔

سلمیٰ نے کہا: ممکن ہے پیچھے کے ڈبے میں بیٹھے ہوں۔ ساری گاڑی دیکھ لی تھی۔؟

وہ جھلّا کر بولا: تو اور کیا کرتا رہا تھا؟ ایک ایک ڈبہ دیکھ لیا۔ جب گاڑی چلی گئی تب آیا ہوں۔ سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انجمن کی بھی یہی حالت ہوئی، لیکن دونوں خاموش رہیں کسی کو کچھ کہنے کا یارا نہ تھا۔

اقبال نے تسلّی دیتے ہوئے کہا: دوسری گاڑی بارہ بجے آتی ہے شاید اس سے آجائیں۔

سلمیٰ نے ڈانٹتے ہوئے کہا: تو پھر واپس کیوں آگیا تو؟ وہ گاڑی بھی دیکھ لیتا۔ جاؤ ابھی جاؤ ان کے ساتھ ہی واپس آنا۔

اقبال کو ہنسی آگئی۔ ابھی سے جا کر کیا کروں، چلا جاؤں گا!

لیکن سلمیٰ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی۔ آخر سوا گیارہ بجے وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سلمیٰ نے کریمن سے کہا: ایک تانگہ لے آؤ۔ میں خود اسٹیشن جاؤں گی۔ یہ لڑکا نہ جانے گیا بھی تھا یا نہیں۔ جائے گا بھی یا نہیں؟

کچھ تامل کے بعد کریمن نے فیصلہ کیا کہ تعمیلِ حکم کر دینی چاہیے۔ وہ تانگہ لے آئی۔ انجمن ساتھ ساتھ چلی۔ سلمیٰ نے پوچھا: تم کہاں جا رہی ہو۔

وہ بولی: آپ کے ساتھ!

ہر طرح سے ضبط کرنے کے باوجود اتنی ہی دیر میں جوشِ اشک سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ سلمیٰ نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو ترس آگیا، حالانکہ دل میں خفا تھی اس سے

کہ اس کی وجہ سے یہ مصیبت پڑی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ انجمن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

یہ لوگ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ اسلم آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی نظر کرمین پر جا کر جم گئی پھر اس نے آواز دے کر تانگہ روکا، سب کو ساتھ لے کر گھر آیا۔ تو ساری کیفیت معلوم ہوئی وہ ہنسنے لگا۔ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہو تم تو۔ ایک گاڑی چھوٹ گئی دوسری سے آگیا۔ ہاں بھئی سعادت گنج میں اب کوئی نہیں ہے سب لوگ خیریت کے ساتھ پاکستان پہنچ گئے۔

اتنے میں اقبال صاحب تشریف لائے۔ اسلم نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا: پھر اکیلے آگئے۔ مجھے کیوں نہیں اپنے ساتھ لائے؟

پھر جلدی جلدی سب نے کھانا کھایا، چونکہ ناشتہ نہیں کیا۔ لہٰذا خوب کھایا، اس کے بعد سامان ٹھیک کر کے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ یہاں اسپیشل تیار کھڑی تھی، انور انتظام میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے جگہ کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ عورتوں کو زنانہ ڈبہ میں بٹھا دیا، خود اقبال اور اسلم کے ساتھ مردانہ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی نے سیٹی دی اور محافظ دستے کی حفاظت میں چھک چھک کرتی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے اسٹیشن کو دیکھ کر بے ساختہ انور نے گنگنانا شروع کر دیا۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

(۴)

مفت کا مال

اسلم بہ خیریت لاہور پہنچ گیا۔ اپنے فن کی داد پانے اور پوری پوری قیمت وصول کرنے کی انور کو اس شہر سے توقع تھی، یہاں بڑے بڑے پریس تھے۔ پرانے دارالاشاعت تھے اور نئے نئے کھل رہے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بھائی کا تقرر بھی یہیں ہوا تھا۔ اس نے یہیں کے قیام پر اصرار کیا، اسلم بھی راضی ہو گیا اس نے سوچا:

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو!

یہیں سہی، ممکن ہے تقدیر یہیں چمک جائے۔ سب سے ٹیڑھا اور کٹھن مسئلہ قیام کا تھا، چند روز تک تو خیر انور کے ساتھ ٹھہرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن چند روز بعد ـــــ ؟

انور نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا: یار بڑے کم ہمت ہو، تمہیں مکان چاہیئے وہ ہم دیں گے ۔ ایک نہیں دس ۔ مجھے بھی بھائی صاحب کے پاس نہیں رہنا چاہیئے اپنے لئے بھی بندوبست کرلوں گا، بس صرف دودن کی مہلت دو مجھے ۔

یہ سن کر اسلم کو حیرت تو ہوئی لیکن خاموش ہوگیا، اس نے معمول یہ بنالیا تھا کہ صبح کرکے ناشتہ کرکے نکلتا اور شہر کا چکّر کاٹا کرتا، لاہور کا شہرہ تو اس نے بہت سُنا تھا، لیکن یہاں آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ادب، لٹریچر، صحافت اور علم و تحقیق کی دُنیا میں اس شہر نے جو کارنامے انجام دیے تھے وہ لازوال رہے۔ یہ اقبال کا شہر تھا جس نے ملّتِ اسلامیہ کو رمزِ اسلام سے آشنا کیا تھا، یہ ظفر علی خاں کا شہر تھا جس کا وجود سیاسیاتِ ہند کے بحرِ ناپیدا کنار میں ایک ناقابلِ مزاحمت طوفان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ سر شیخ عبدالقادر کا شہر تھا جن کے "مخزن" علم و ادب سے عرصۂ دراز تک اُردو مالا مال ہوتی رہی تھی ۔

سب سے پہلے وہ اقبال کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا۔ وہاں جاکر عجیب کیفیت طاری ہوگئی ۔ یہ اقبال تھا جو گوشۂ لحد میں ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا۔ بے ساختہ ذہن میں سوال اُبھرا :

غلغلے سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

ملّتِ اسلامیہ کو آج اقبال کی جتنی ضرورت تھی کبھی نہ تھی اور آج ہی وہ نہیں ہے ۔ افسردگی، یاس اور اضمحلال کے عالم میں وہاں سے اٹھا اور شہر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا ۔ ہر طرف سے لُٹے پِٹے قافلے آرہے تھے، ہر طرف ہلاکت اور بربادی

کی داستانیں بکھری ہوئی تھیں، پھر وہ والٹن کیمپ پہنچا یہاں لاکھوں کی تعداد میں مشرقی پنجاب اور دوسرے مقامات کے مہاجرین موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ لیکن اس مصیبت میں بھی استقلال و استقامت کی جھلک چہروں سے نمایاں تھی

یہاں سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ قیام گاہ پر لوٹ آیا، شام ہو چکی تھی مگر انور صبح کا گیا اب تک نہیں آیا۔ اس کے انتظار میں ایک کرسی کھینچ کر برآمدہ میں بیٹھ گیا اور سگریٹ کا دھواں اُڑانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا اتنے بے شمار آدمیوں کو کھانا کہاں سے دیا جائے گا؟ سر چھپانے کی جگہ کہاں ملے گی؟ روزگار کا کیا انتظام ہوگا، کپڑوں کا بندوبست کس طرح کیا جائے گا؟

یہی سوچتے سوچتے دس بج گئے کہ انور آ گیا۔ وہ اس وقت بے حد خوش تھا، بات بات پہ ہنستا تھا ہنستا پہلے تھا، آتے ہی اسلم کا ہاتھ پکڑ کر زور سے اٹھایا اور تحکم آمیز لہجے میں کہا: چلو!

اسلم اٹھ کھڑا ہوا اور حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا: اس وقت کہاں چلو گے؟

انور نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا: اپنے گھر چلو!

اسلم قدم اٹھاتے اٹھاتے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے گھر؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟

وہ بولا: بھئی چلنا ہے تو چلو، ورنہ ہمارا گھر بھی نکل جائے گا قبضے سے، دونوں پاس پاس ہیں اور بڑے اچھے ہیں!

اسلم نے پھر کوئی بحث نہیں کی، انور تانگہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پر بیٹھ کر یہ دونوں روانہ ہو گئے، تھوڑی دیر میں ایک کوٹھی کے سامنے جا کر تانگہ رک گیا۔ انور

تیزی سے اترا اور "آؤ" کہتا ہوا کمپاونڈ میں داخل ہوگیا۔ یہاں دو تین آدمی پہرہ دے رہے تھے۔ انور نے ان کے ہاتھ پر پچاس روپے رکھے اور رخصت کر دیا۔ صدر دروازہ سے اندر داخل ہوا اور کہنے لگا:

سپردم بتو مایۂ خویش را ،

تو دانی حساب کم و بیش را !

پھر ہنسنے لگا اور گویا ہوا، اب میں اپنے گھر جاتا ہوں، وہ سامنے دوسری زرد رنگ کی جو کوٹھی نظر آرہی ہے میری ہے۔ شب بخیر، صبح پھر ملاقات ہوگی!

اسلم اتنا متحیر تھا کہ چپ چاپ باتیں سنتا رہا، ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ چھپر پھاڑ کر خزانہ مل جاتا ہے یہ تو اس نے سنا تھا لیکن چھپر پھاڑ کر محل مل جاتا ہے، یہ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا!

اس کوٹھی میں دس کمرے تھے، ملازموں کے رہنے کے کوارٹر الگ تھے۔ ایک موٹر گیراج تھا، ڈرائنگ روم اعلیٰ درجے کے بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ سلمیٰ اقبال، کرمین، انجمن سب ہی خدا کی اس دین پر متحیر، مسرور اور نازاں تھے۔ یہاں سے یہ قافلہ ڈرائنگ روم میں پہنچا، یہاں کی کراکری دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اب کمروں کی باری آئی۔ ہر کمرے میں گراں قیمت قالین، پرمائیک کی مسہریاں، موٹے موٹے گدّے، ریشمی چادریں، کمبل، لحاف موجود۔ فوراً ہی کمرے تقسیم ہوگئے۔ ایک انجمن کا، ایک کرمین کا، ایک سلمیٰ کا، ایک اقبال کا، ایک اسلم کا اسٹیڈی روم، کئی کمرے پھر بھی بچ رہے۔ یہ متوقع مہمانوں کے لئے ریزرو کر دیے گئے۔ اس کام سے فارغ ہوکر یہ لوگ گودام میں پہنچے یہاں ضرورت کی ہر چیز بہ افراط موجود تھی، گھی کے ٹین،

آٹے اور چاول کی بوریاں، مسالے، دال، اچار، مُربّے، جام جیلی، کپڑوں کے تھان کے تھان! ریشمی بھی اونی بھی سوتی بھی، مردانے بھی، زنانے بھی، اونی چادریں، شال اور دوشالے بھی، کمبل بھی — یہ لوگ پھر اس کمرے میں پہنچے جو اسلم کے لئے مخصوص تھا، یہاں آکر بیٹھے ہی تھے کہ انجمن نے سلمیٰ سے کہا: بھابی ذرا سامنے کی طرف تو دیکھنا سلمیٰ نے نظر اٹھائی تو ریڈیو پر پڑی۔ اقبال لپک کر اٹھا اور اس کی گوشمالی شروع کر دی، اختری بائی فیض آبادی ایک غزل مدھر سُر دل میں گا رہی تھیں۔

آرام سے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے انجمن نے سلمیٰ سے کہا اور آخر اللہ نے ہماری سُن لی۔ کتنا اچھا مکان ہے یہ!

وہ بولی: ہاں خدا کا شکر ہے، دلدّر دور ہوئے، اب آرام سے ٹانگ پھیلا کر سوئیں گے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ انور آگیا۔ اُسے دیکھ کر سلمیٰ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اب پردہ اٹھ گیا تھا، انجمن اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے پوچھا: کہو بھئی ٹھیک ٹھاک ہے سب کچھ!

اسلم کے بجائے سلمیٰ بولی: کتنا اچھا مکان دلا دیا ہے آپ نے؟ لیکن یہ تو بتائیے کرایہ کیا ہوگا اس کا؟

وہ ہنسنے لگا: کرایہ! کرایہ کون لے سکتا ہے ہم سے، وہاں مسلمانوں کے گھروں پر جو قبضہ کیا گیا ہے اُن کا کرایہ کون دے رہا ہے!

دلیل اتنی زبردست تھی کہ سلمیٰ کو قائل ہو جانا پڑا۔ پھر وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی: خدا کرے اب روزگار بھی لگ جائے جلدی سے!

انور نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: بھابی آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں، کم از کم سال بھر تک تو روزگار کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے! اور اس عرصے میں کہیں نہ

کہیں لگ ہی جانے گا!

وہ بولی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، سال بھر تک کیا ہوگا؟

وہ کہنے لگا: اس گھر میں جو ساز و سامان ہے اس کی قیمت ستّر اسّی ہزار سے کم نہیں!

قطع کلام کرتی ہوئی وہ بولی: یہ ہمارا اسامان تو نہیں ہے جسے فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کریں!

انور نے تمسخر کرتے ہوئے سوال کیا: پھر کس کا ہے؟

وہ بولی: خدا جانے ـــ مگر ہمارا نہیں ہے!

وہ ہنستا ہوا گویا ہوا: "آپ واقعی بڑی سادہ لوح ہیں! ہندوستان سے بھی تو مسلمان اسی طرح بھرے پُرے گھر چھوڑ کر آئے ہیں اُن پر بھی قبضہ ہو رہا ہے۔ وہ بھی مقبوضہ چیزیں بیچ کر دام کھرے کر رہے ہیں۔ یہ کلجگ نہیں کرجگ ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے جیسا وہاں ہو رہا ہے ویسا ہی یہاں ہوگا!

یہ دلیل بھی سلمیٰ کو بڑی وزنی نظر آئی۔ اس نے کہا: بات تو ٹھیک ہے!

اسلم اب تک خاموش بیٹھا تھا گم صم سا، اتنے میں انور نے کہا: بھئی چند روز کے لئے دو تین کمرے ایک شریف آدمی کو دے سکتے ہو؟ چاہو تو کرایہ دے کر رہیں گے ورنہ دس پانچ روز میں اپنا انتظام کر لیں گے! ـــ میں اپنے ساتھ رکھ لیتا لیکن ان کے ساتھ ان کی بیوی، لڑکیاں، بہنیں، بچے سب ہیں۔ اور ایک مجرّد آدمی کے ہاں عورتوں کا رہنا ٹھیک نہیں۔ ویسے اس کی گارنٹی لیتا ہوں کہ نہایت شریف آدمی ہیں، شاید تم نے بھی ان کا نام سنا ہو، حاجی مطیع اللہ صاحب! دلّی کے مالدار لوگوں

میں تھے، کناٹ پلیس میں ایک شاندار دکان کے مالک، بنگلہ، موٹر، ملازم سب کچھ خدانے دیا تھا۔ ایک لڑکا تھا، اسے آرٹ سے دلچسپی تھی، میرے اس سے اچھے خاصے مراسم ہو گئے تھے وہ فسادمیں مارا گیا۔ یہ لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں آگئے۔ ابھی کوٹھی سے باہر ٹہلنے نکلا تھا کہ ایک فٹ پاتھ پر اپنے بال بچوں سمیت بیٹھے ملے۔ ترس آگیا، لے آیا۔ کہو کیا کہتے ہو؟

اسلم نے کہا: ضرور لے آؤ،

انور گیا، اور ایک بڑے میاں کو اندر لے کر آگیا، انور نے تو مختصر طور پر ان کی داستان سنائی تھی، یہ بغیر فرمائش کے اپنی کہانی پوری تفصیل سے سنانے بیٹھ گئے صورت دیکھ کر اسلم کو یاد آگیا کہ دہلی میں دوچار مرتبہ اُن کی دکان پر جاتے اور ان کے ٹھاٹھ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس حال میں دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا، بہت تپاک اور گرم جوشی سے ملا۔ انور تو ذرا دیر کے بعد چلا گیا۔ اسلم نے ان کے لئے تین کمرے خالی کرادیے۔ وہ دعا دینے لگے، رات کافی آچکی تھی۔ ذرا دیر کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔

حاجی صاحب سے رخصت ہوکر اسلم اپنے کمرے میں پہنچا تو سلمیٰ جاگ رہی تھی بجمہ اسی کے پاس سوتی تھی وہ بے خبر سو رہی تھی۔ سلمیٰ نے کہا: آپ تو اب بھی چُپ چُپ سے ہیں!

اسلم نے طنز کرتے ہوئے کہا: آپ کا مطلب؟

وہ جھجکتی ہوئی بولی: اللہ نے سب سے بڑی مشکل تو آسان کردی، اتنا بڑا مکان مل گیا۔ اتنا بہت سارا ساز و سامان مل گیا۔ روزگار بھی مل جائے گا!

اسلم نے کہا، سلمیٰ! میرے دل میں تمہاری کتنی عزت تھی اسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا! لیکن آج میری نظریں تمہیں حقیر محسوس کر رہی ہیں!

وہ چونک پڑی۔ اس نے کہا: یہ کیا کہا آپ نے؟

وہ بولا: کچھ غلط نہیں کہا ______ ذرا سوچو تو ___ اس کوٹھی پر، اس سازوسامان پر، ہمارا کیا حق ہے؟ حاجی صاحب تو کسی حد تک حق کا دعویٰ کر بھی سکتے ہیں، لیکن کیا ہم بھی کر سکتے ہیں؟ کیا ہم نے وہاں ایسی ہی کوٹھی چھوڑی ہے؟ کیا ہمارے پاس وہاں اتنا ہی سازوسامان تھا؟

وہ بول پڑی ___ نہیں تو ___ لیکن ___

اسلم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: لیکن ___ کیا؟ تم کہنا چاہتی ہو ہم سزاوار ہیں اس لوٹ کے؟ نہیں سلمیٰ، میں نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی ___ کبھی ڈاکا نہیں ڈالا، کبھی نقب زنی نہیں کی، میں اب بھی ایسا نہیں کر سکتا، ہرگز نہیں کر سکتا، میں نے کچھ نہیں کھویا ہے؟

کیا سعادت گنج میں آپ کا مکان نہیں تھا؟

ہاں تھا، مگر اس کا بدلا یہ کوٹھی نہیں ہو سکتی۔ سعادت گنج کا گھر زیادہ سے زیادہ بیس ہزار کا ہوگا یہ تین لاکھ کی کوٹھی اس کے بدلے میں کیسے لے لوں؟ میرے گھر میں جھاڑو کا ایک تنکا بھی نہیں، تھا یہاں کیا نہیں ہے؟ یہ امتحان کا وقت ہے یہ میرے ایمان، میرے ضمیر میرے ظرف کے امتحان کا وقت ہے! اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ میں کامیاب ہوتا ہوں یا ناکام! اگر ساتھ دو گی تو فخر سے میرا سر اونچا ہو جائے گا! ساتھ نہ دیا تو خود اپنی نظر میں ذلیل ہو جاؤں گا!

بے تامل اس نے جواب میں کہا : ایسی بات پوچھ کر آپ کیوں مجھے خود میری نظر میں ذلیل کر رہے ہیں ؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر آپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دوں ؟

اسلم خوش ہو گیا ، اس نے کہا : تو کل ہم یہ کوٹھی چھوڑ دیں گے !

وہ بولی : جیسی آپ کی مرضی ــــ لیکن انور صاحب بھی تو قابض ہیں ایک کوٹھی پر ــــ وہ کیوں نہیں سوچتے ایسی باتیں ؟ آدمی بھی بڑے اچھے ہیں ، کیسے کیسے موقعوں پر ہماری مدد کر چکے ہیں ، اس وقت بھی دیکھیے حاجی صاحب کو لے آئے رحم کھا کر !

وہ کہنے لگا : میں کب انور کو برا کہتا ہوں ، لیکن اچھے آدمی بھی غلطی کر سکتے ہیں ! اس وقت اس نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ غلط ہے !

سلمیٰ نے پوچھا : یہ گھر چھوڑ کر ہم جائیں گے کہاں ؟

اس نے جواب دیا : صبح آٹھ بجے کراچی جانے والی گاڑی پر ہم بیٹھ جائیں گے ، اس جواب سے وہ کچھ مطمئن نہیں ہوئی ۔ پھر سوال کیا : وہاں کہاں رہیں گے ؟

اس نے کہا : کہیں نہ کہیں سر چھپانے کی جگہ مل ہی جائے گی !

پھر وہ کچھ نہیں بولی : نجمہ رونے لگی تھی ، اس کے پاس بیٹھ کر لوریاں دینے لگی ۔

اسلم بہت تھکا ہوا تھا ۔ بستر پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا ۔

وہ صبح تڑکے بیدار ہو گیا ۔ جلدی جلدی سامان باندھا ۔ حاجی صاحب بھی نماز کے پابند تھے ، وہ بھی ٹھیک وقت پر اٹھے ۔ پھر تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے اسلم کے کمرے کی طرف آئے ، اسے بستر باندھتے دیکھ کر پوچھا : بیٹے یہ کیا ؟

اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا: آپ آندیم برخاست! اس مکان کے اور اس ساز وسامان کے آپ مستحق ہیں میں نہیں۔ آپ شاید اس سے زیادہ چھوڑ کر آئے ہیں آپ کو حق ہے یہاں رہنے کا۔ میرے پاس ایک معمولی مکان تھا اس کے بدلے میں یہ کوٹھی لینے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔

حاجی صاحب دم بخود کھڑے اسے دیکھا کئے، وہ جلدی سے تانگہ لایا اور سب کو ساتھ لے کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ سلمیٰ نے کہا: انور صاحب سے تو مل لئے ہوتے! اس فرمائش میں یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ شاید وہ روک لے، تو بگڑی بات بن جائے مگر اس نے جواب دیا وہ بے خبر سو رہا ہوگا، دس بجے سے پہلے کیا اٹھے گا۔

اچھا ہے جو فتنہ سوتا ہے!

---

(۶)

سفر!

حاجی صاحب کو اسلم کی اس اصول پرستی اور عالی ظرفی پر حیرت ہوئی۔ بے ساختہ جذبۂ تحسین و ستائش لہریں مارنے لگا۔ لیکن خوشی بھی ہوئی۔ ابھی تک وہ مہمان کی طرح تھے اب وہ مالک بن گئے۔ اب تک یہ دھڑکا تھا نہ جانے کب چلتے کر دیے جائیں، اب اطمینان ہوگیا کہ قسمت مہربان ہے!

کوئی گیارہ بجے کے قریب انور آیا، اس کی آواز سن کر حاجی صاحب باہر نکلے۔ انور نے پوچھا: کیا اسلم اب تک سو رہا ہے؟

وہ گویا ہوئے: وہ تو صبح کی گاڑی سے کراچی گئے!

یہ سن کر انور کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ کراچی گئے؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب قبلہ؟!

حاجی صاحب قبلہ نے از اوّل تا آخر ساری رام کہانی سنا ڈالی۔ اس نے کفِ افسوس

ملتے ہوئے کہا: عجب شخص ہے!

حاجی صاحب نے تسبیح کو سینچے پر لپیٹتے ہوئے کہا: بخدا اس سرشت کا آدمی نظر سے نہیں گزرا۔ وہ آدمی کب ہے فرشتہ ہے! لاکھوں روپے کے مکان، ہزاروں روپے کے سامان پر اس بے نیازی سے لات مار کر رخصت ہو جانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ بڑا دل گردہ چاہیئے اس کے لئے!

وہ حاجی صاحب سے کہیں زیادہ اچھی رائے اسلم کے لئے رکھتا تھا، ان الفاظ پر کچھ زیادہ متوجہ نہ ہوا، کہنے لگا: بس تو آپ رہیئے!

حاجی صاحب کو مزید سند مل گئی۔ دعا دیتے ہوئے بولے، بیٹے تمہیں خدا اجر دے گا!

اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کے ہونٹ شدتِ تاثر سے کانپنے لگے۔ انور کو ان سے ہمدردی تو تھی ہی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ دلجوئی کے لئے تقریر کرتے بیٹھ جاتا۔ بغیر سنے واپس چلا آیا۔ اور اپنی کوٹھی میں آکر آرام سے صوفے پر دراز ہو گیا۔ ریڈیو کھول دیا اور گانا سننے لگا۔

یہ کوٹھی پہلی والی کوٹھی سے بھی عمدہ تھی۔ اس کا ساز و سامان زیادہ بھی تھا اور قیمتی بھی! وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا، اسلم کو یہ کیا سوجھی؟ کوئی حد ہے اس حماقت کی، یہ تو کفرانِ نعمت ہے اللہ دے اور بندہ نہ لے!

قلی کو پندرہ روپے رشوت دینے کے بعد اسلم کو گاڑی میں جگہ ملی تھی، کیونکہ مسافروں کا وہ ہجوم اور اژدحام تھا کہ معلوم ہوتا تھا سارا الٰہ آباد ہو سمٹ کر اسٹیشن پر آ گیا ہے۔ پاکستان کے پاس نہ کوئلہ تھا نہ انجن، کراچی کے لئے فی الحال، صرف ایک گاڑی

روزجاتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ لوگ پائدان پر کھڑے کھڑے، چھت پر بیٹھ کر، دروازوں سے لٹک کر ۲۴ گھنٹے کا یہ سفر پورا کرتے تھے۔

انجمن، سلمیٰ، کرمین اس طرح بھینچی ہوئی بیٹھی تھیں۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا بجمہ بار بار اس نامانوس فضا سے گھبرا گھبرا کر روتی تھی۔ نہ سلمیٰ کے چپ کرنے سے چپ ہوتی تھی نہ انجمن کے نہ کرمین کے۔ اقبال نے کئی مرتبہ ارادہ کیا اسے گود میں لے لے، لیکن وہ اس طرح اپنی جگہ پر بھنچا کھڑا تھا کہ گو چند قدم کا فاصلہ تھا لیکن اس کا طے کرنا ہفت خواں کی منزل طے کرنے سے کم نہ تھا! اسلم کے کھڑے کھڑے پاؤں سن ہو گئے تھے، جی چاہتا تھا جہاں کھڑا ہے وہیں بیٹھ جائے لیکن اتنی جگہ کہاں تھی کہ بیٹھ سکتا یہ چوبیس گھنٹے کا سفر بے کھائے پیئے کٹا، جگہ چھوڑنے کے معنی یہ تھے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ لہٰذا عقل و دانش کا تقاضا یہ تھا کہ بھوک پیاس اور حوائج ضروری کی تکلیف برداشت کرلی جائے مگر جگہ نہ چھوڑی جائے!

آخر اللہ اللہ کرکے دوسرے دن دوپہر کو بارہ بجے گاڑی کراچی پہنچی۔ تین چار گھنٹے لیٹ یوں ہوئی کہ راستے میں ایک حادثہ پیش آگیا تھا

کراچی اسٹیشن پر اترنے کے بعد اسلم کی جیب میں ایک سو دس روپے تھے، باہر نکلنے کے بعد کچھ دیر تو وکٹوریہ والوں کے ہجوم میں کھویا رہا۔ بڑی مشکل سے ایک وکٹوریہ والا اس پر رضامند ہوا کہ حاجی مولیدینا کے مسافر خانہ تک پہنچا دے گا اور پانچ روپے لے گا۔ وقت گزرتا جارہا تھا، اس نے زیادہ بحث نہیں کی، بیٹھ گیا، ذرا دیر میں مسافر خانہ آگیا، بڑا غصہ آیا کہ اتنی ذرا سی دوڑ کے پانچ روپے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا! سب کو وہیں وکٹوریہ میں چھوڑ کر وہ منیجر کے پاس پہنچا۔ منیجر نے صورت دیکھتے ہی کہا:

جہاں جگہ ملے پڑ رہیے۔ یہ عجیب و غریب جواب سن کر اب جو اس نے غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں تو تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ کمرے سب فل، برآمدوں میں بھی لوگ بال بچوں سمیت ڈٹے ہوئے ہیں۔ صحن میں پڑ دے ڈال ڈال کر نہ جانے کتنے زندگی بسر کر رہے تھے۔ پاخانہ پیشاب اور گندگی کی بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا اگر منیجر صاحب مہربان ہو کر ٹھہرا لیتے تو بھی یہاں ایک رات بسر کر لینا کسی طرح ممکن نہ تھا!

پھر ــــ پھر اب کیا کیا جائے؟

آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا وکٹوریہ کی طرف بڑھا، وکٹوریہ والا خفا ہونے لگا۔ بڑی دیر کر دی صاحب! اس طرح کیسے کام چلے گا، اتاروں سامان؟

اس نے کہا: نہیں بھئی یہاں تو جگہ ہی نہیں ہے، کہیں اور لے چلو!

وہ جھلّا کر بولا: اور کہاں لے چلوں، سب جگہ یہی حال ہے، پیسے خرچ کرو، کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا: کوئی سستا ہوٹل مل جائے گا؟

اس نے جواب دیا بہت۔ جتنا کہو ــــ پانچ روپیہ روز پڑے گا!

وہ راضی ہو گیا، وکٹوریہ والے نے ایک ہوٹل کے سامنے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔ نہایت معمولی ہوٹل تھا، قدم رکھتے ہی طبیعت وحشت کھانے لگی۔ مگر بہرحال رہنا تھا۔ منیجر نے بے نیازی کے ساتھ کہا: صرف ایک کمرہ خالی ہے، دس روپے یومیہ کرایہ ہو گا!

دس روپے یومیہ سن کر اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ اس نے کہا: ذرا دکھاؤ

دیکھئے !

منیجر صاحب نے کمرہ دکھایا تو وہ کوٹھڑی سے چھوٹا نکلا ۔ نہ بجلی نہ نل ، نہ بستر نہ چارپائی ۔ اس نے کہا : اس کے دس روپے یومیہ !

منیجر صاحب نے غصّے کے ساتھ زور سے دروازہ بند کیا اور فرمایا تو پیلیس ہوٹل چلے جائیے ۔ وہاں تیس روپے میں مل جائے گا !

اسلم نے کہا : خفا کیوں ہوتے ہیں مجھے منظور ہے آپ کا کرایہ ؟

منیجر صاحب نے پھر کمرہ کھول دیا ، اسلم نے جاکر وکٹوریہ والے کو دس روپے دیے اور کمرے پر قبضہ کر لیا ۔ سب بھوک سے بے حال ہو رہے تھے ، ان لوگوں کو بٹھا کر باہر گیا اور ایک حلوائی کے ہاں سے کچھ پوریاں ، تھوڑا سا رودے کا حلوا لے آیا ۔ پاس والے ہوٹل سے چائے کو کہہ آیا ۔ جب ذرا کھایا پیا جان میں جان آئی اور پھر سوچنے لگا : اب کیا ہوگا ؟

شام کو باہر نکلا تو دروازے پر ایک صاحب کھڑے نظر آئے منہ میں بیڑی دبی ہوئی ، اسلم کو دیکھتے ہی پوچھا "ماچس ہے ؟"

اس نے ماچس پیش کر دی ۔ بیڑی سلگانے کے بعد پوچھا : آپ بھی مہاجر ہیں

جی ہاں یہی سمجھ لیجیے !

کیا کرایہ دے رہے ہیں ، ہوٹل کا ؟

دس روپے یومیہ پر طے ہوا ہے !

بڑا بے ایمان ہے یہ ہوٹل والا ۔ پہلے آٹھ آنے روز پر بھی کوٹھڑیاں نہیں اٹھتی تھیں اب دس روپے روز لے کر بھی خوش نہیں ہے ، میں بھی چند روز سے

یہیں پڑا ہوں، کیا کریں صاحب! کہیں جگہ ملتی نہیں، مکان ناپید، لوگ بہت پندرہ دن ہوگئے یہاں رہتے، چند روز میں فاقوں کی نوبت آجائے گی ۔۔۔ لیکن میں نے تو ایک بندوبست کرلیا ہے آپ چاہیں تو آپ کے لئے بھی ہوسکتا ہے ۔ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ، پڑوس اچھا رہے گا!

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ۔ اس نے کہا: کیا بندوبست کیا ہے آپ نے؟

وہ بیڑی پھینکتے ہوئے بولے، آئیے تشریف لائیے!

آگے آگے وہ، پیچھے پیچھے اسلم، تھوڑی دُور جاکر ایک فٹ پاتھ پر کھڑے ہوگئے ۔ اور فرمایا: بس! یہ ٹکڑا بچا ہے جسے میں نے تیس روپے میں خریدا ہے ۔ پندرہ آپ دے دیجیے تو نصف آپ کا!

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا یہ صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں ۔ اس نے کہا: ذرا وضاحت کیجیے!

وہ صاحب گویا ہوئے: جناب یہاں ایک جھگی ڈال لیجیے ۔ تیس روپے میں اتنی بڑی جھگی بن جائے گی کہ آپ اپنے کنبے سمیت رہ سکیں ۔ پندرہ روپے مجھے دیجیے ۴۵ میں کام بن جائے گا! ورنہ دس روپے روز ہوٹل میں دیتے رہیے میری جھگی کا کام کل صبح سے شروع ہوجائے گا ۔ بارہ بجے ہم اس میں آجائیں گے آپ چاہیں تو آپ کے لئے بھی بنوا دوں ۔۔ ؟

ہر ہر لفظ دل پر تیر و نشتر کی طرح لگ رہا تھا!

لیکن زندگی کے سنگین حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں، ان سے کوئی مفر نہیں! فٹ پاتھ پر رہنا، جھگی میں رہنا، خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرنا، یہ باتیں کلیجے کو بھی

سوچی تھیں۔ اب کرنا پڑ رہی تھیں۔ ایک دن کی تاخیر بھی تباہ کن ثابت ہوتی، اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا: مجھے آپ کی پیش کش منظور ہے!

دوسری بیڑی سلگانے کے لیے پھر انھوں نے ماچس طلب کی اور اسے واپس کرتے ہوئے کہا: بس چلیے صبح مجھے پیسے دے دیجئے گا!

دونوں ساتھ ساتھ آئے، ان صاحب کی کوٹھڑی بھی اسلم کی کوٹھڑی کے قریب ہی تھی۔ رات جوں توں بسر ہوئی۔ صبح اسلم نے ۴۵ روپے ان کے ہاتھ پر رکھے، دو بجے کے قریب خبر ملی کہ جھگی تیار ہے، چلیے تشریف لے چلیے! ہوٹل کا حساب صاف کرنے کے بعد اسلم اپنے متعلقین کے ساتھ جھگی میں پہنچ گیا۔ راحت صاحب جو خضر طریقت ثابت ہوئے تھے زیر تعمیر جھگی میں جو بالکل ساتھ ہی تھی تشریف لے آئے!

راحت صاحب کا کنبہ اسلم کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھا، دو تو صرف بیویاں تھیں۔ ہر ہر بیوی سے کئی کئی لڑکے اور لڑکیاں، دو ناکتخدا بہنیں ایک چھوٹا بھائی۔

جھگی میں سامان ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد سلمیٰ نے پوچھا: اب ہم لوگ یہاں رہیں گے؟

ان الفاظ میں طنز تھا، ویسے وہ جھگی کیا درخت تلے بھی بسر کرنے کو تیار ہو جاتی، لیکن اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ اچھی بھلی کوٹھی اور اس کا ساز و سامان چھوڑ کر یہاں آ کر اس طرح کی تکلیف اٹھانے اور اتنی حقیر زندگی بسر کرنے کی کیا ضرورت تھی!

اسلم نے نگاہ اٹھا کر سلمیٰ کو دیکھا اور جواب دیا: رہنا ہی پڑے گا! جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا!

وہ جل کر بولی! تو نہیں آپ دکھا رہے ہیں!

اسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان الفاظ نے اُسے حد درجہ برہم کر دیا تھا لیکن ضبط کر گیا!

اتنے میں پاس کی جھگی میں دو عورتوں نے جلی کٹی اور طنز و تعریض، پھر مغلظ اور محش گالیوں سے بھرپور باتوں کا تبادلہ شروع کیا، آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ راحت حسین چُپ چاپ مہابھارت کا یہ منظر دیکھتے رہے پھر اٹھے اور دونوں بیویوں کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کی پیٹھ پر گھونسا اس کے منہ پر تھپڑ، بچے اسی طرح ہنستے کھیلتے اور شوخیاں کرتے رہے جیسے یہ روزمرہ کا معمول ہے اس میں کوئی ندرت نہیں!

ذرا دیر نہیں گزری تھی کہ راحت حسین صاحب کا بڑا بیٹا شفاعت دفعتہً اندر آگھسا، یہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا، آتے ہی اقبال سے کہا: ہمارا گیند ادھر آیا ہے جلدی سے لاؤ!

اقبال نے بے رُخی سے کہا: یہاں کوئی گیند وینڈ نہیں ہے۔

یہ سنتے ہی شفاعت نے کہا: سالے دبائے بیٹھا ہے اور نہیں دیتا، جیسے تیری ماں نے خرید کر دیا تھا مجھے!

یہ الفاظ سُن کر اسلم کو چکر آ گیا، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، انجمن اور سلمیٰ کا چہرہ فق! اقبال بھلا ایسی کڑوی کسیلی بات کیسے سُن لیتا! اس نے تڑاق سے ایک چانٹا جڑ

دیا: گالی بکتا ہے!

طمانچہ کھانے کے بعد شفاعت نے اقبال کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا!
اسلم بیچ میں آگیا، میاں صاحبزادے، کیوں لڑتے ہو، بُری بات!

اسلم کو حائل دیکھ کر وہ واپس چلا گیا، لیکن روتا ہوا۔ ذرا دیر کے بعد راحت حسین صاحب کی آواز آئی: لیفٹننٹ گورنر ہوں گے تو اپنے گھر کے!

اور پھر جھگی کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا: جناب اسلم صاحب! ذرا اپنے لڑکے کو تو بھیجئے باہر! ہم بھی زیارت کر لیں اس گاما پہلوان کی!

اسلم باہر آیا تو دیکھا راحت صاحب کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے! اس نے بڑی نرمی اور ملائمت سے سارا واقعہ سُنایا اور کہا: پھر بھی مجھے افسوس ہے کہ اقبال نے طمانچہ مار دیا۔ اُسے گالی کھا لینی چاہئے تھی، آپ نے ناحق تکلیف کی، شفاعت سے کہئے، خوب جی بھر کر گالیاں دے لے، اقبال صرف سُنتا رہے گا!

راحت صاحب اس اُمید میں آئے تھے کہ دو دو ہاتھ ہو جائیں گے، یہاں مقابلے میں جو کھڑا تھا وہ موم تھا۔ جنگ و پیکار کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ اگر اسلم نے ذرا بھی سخت الفاظ استعمال کئے ہوتے تو اسے کشتی بھی لڑنا پڑتی اور گالیاں ہی سُننا پڑتیں۔ لیکن اس کے نرم الفاظ نے راحت صاحب کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا مزید کچھ کہے سُنے بغیر وہ پھر اپنی جھگی میں واپس چلے گئے!

(۱)

جب فضلِ خدا ہوتا ہے

رات کو پھر راحت کدہ میں لڑائی شروع ہو گئی۔ کچھ دیر تک دونوں بیویوں میں ایک دوسرے کے حسب و نسب پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ راحت حسین غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے یہ جنگ دیکھتے اور لطف لیتے رہے۔ کبھی اس کو شہ دیتے کبھی اس کو ہشکاتے، کبھی ہنسنے لگتے کبھی قہقہے لگانے لگتے۔ رفتہ رفتہ یہ جنگ گالیوں کی جنگ بن گئی۔ فحش اور مغلظات گالیاں سن کر انجمن نے شرم سے گردن جھکالی۔ سلمیٰ نے منہ پھیر لیا۔ دونوں کو حیرت تھی کہ عورت کے منہ پر بھی ایسے گندے الفاظ آ سکتے ہیں۔ اسلم سخت حیران تھا کہ کہاں جائے کیا کرے، کس طرح اس پڑوس سے پیچھا چھڑائے۔ آخر اقبال کو لے کر باہر آ گیا کہ کم از کم گالیاں اس بچے کے کان میں تو نہ پڑیں۔ وہ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گشت کرتا رہا۔ یونہی بے مقصد، کوئی ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو راحت کدہ کے سامنے ایک جمِ غفیر تھا، کچھ پولیس کے سپاہی ڈنڈے

سنبھالے گھوم رہے تھے۔ اسلم کا دل دھڑکنے لگا : یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟ بہر حال لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا تو معلوم ہوا چاقو چل گیا ہے، راحت صاحب کے فرزند دلبند نے پڑوس کی ایک ادھ جھگی کے کسی لڑکے کو گالیاں دیں، اس نے اپنے باپ سے شکایت کر دی، باپ نے راحت صاحب کو للکارا، راحت صاحب نے بھی بے دھڑک گالیوں کا پشتارہ کھول دیا۔ اور لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور وار کر دیا بہار وار سینے پر کیا جو اوچھا پڑا۔ دوسرا شانے پر جس نے تین انچ کا زخم ڈال دیا، حملہ آور گرفتار، راحت صاحب داخل ہسپتال، دونوں بیویوں کی سینہ کوبی اور فریاد و فغاں سے محشر کا سماں!

ذرا دیر یہ منظر دیکھ کر اسلم اندر داخل ہو گیا سلمیٰ کے چہرے پر ناگواری، برہمی اور خشونت کے آثار تھے، انجمن نے کہا : یہاں تو بھائی صاحب کسی طرح گزر نہیں ہو سکتا۔ کہیں اور چلیے!

اسلم نے بے بسی کے ساتھ جواب دیا : واقعی یہاں گزر نہیں ہو سکتا تمھاری بھابی نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن خفا وہ بھی ہیں اور سچ پوچھو تو یہ خفگی بجا بھی ہے سلمیٰ بول پڑی : اب اتنا زیادہ حقیر تو نہ سمجھیے ہمیں کیوں خفا ہونے لگی، یہ سچ ہے یہاں رہتے شرم آتی ہے، لیکن کیا صرف مجھی کو؟ آپ کو بھی آتی ہے مگر حالات پر بس کس کا ہے، انجمن کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ کوشش کیجیے شاید اللہ کوئی صورت نکال دے!

سلمیٰ یہ باتیں آنکھیں چار کیے بغیر کر رہی تھی، پھر بولی : کھانا کھا لیجیے ٹھنڈا ہو رہا ہے!

وہ کہنے لگا: جی تو نہیں چاہتا جھوک بھی کچھ ایسی نہیں ہے مگر تم کہتی ہو تو، دو چار لقمے زہر مار کر لوں ۔

کھانا کھا کر سونے کے لئے لیٹ گیا، لیکن نیند کیسے آتی تھی۔ خیالات پریشاں نے یورش کی اور نیند کو کالے کوسوں بھگا دیا!

راحت حسین صاحب کا قرب ایک بلائے جان بن گیا تھا، اور حالات تھے کہ مکان ملنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی! یہاں رہ کر ذہنی اور دماغی کام کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس ماحول میں نہ قلم چل سکتا تھا نہ دماغ! اور کام بہرحال کرنا تھا ورنہ: چہ کند اہل و فرزندم!

صبح سے شام تک اسلم کا یہی کام تھا مکان کی تلاش اور روزگار کی جستجو! بہت سے مکان خالی تھے، بہت سے مکانات پر لوگوں کا قبضہ تھا بہت سے لوگ تھے جو کئی کئی مکانات پر قابض تھے۔ اور منہ مانگی پگڑیاں لے کر دستبردار ہو رہے تھے۔ بہت سے لوگ تھے جو اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ بڑے مکانات پر متصرف تھے، بہت سے لوگ تھے جو دو سو سے لے کر ہزار تک کی فیس لے کر گھر بیٹھے کسی خالی مکان کا الاٹ منٹ لا کر دے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں کا ذریعۂ معاش ہی یہ تھا کہ ضرورت مندوں کو مکان اور الاٹ منٹ دلائیں اور جیب نوٹوں سے بھر لیں۔ اسلم کی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں لیکن وہ بے بس تھا، وہ ناجائز قابضین کو کان پکڑ کر نکال نہیں سکتا تھا، کئی مکانات پر قبضہ رکھنے والوں کی سُراغ رسانی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ پگڑی دینے کی استطاعت تھی نہ رشوت دے کر الاٹ منٹ لینے کو۔ صبح سے شام تک چکر لگانا اور مایوس ہو کر چلا آنا۔ یہی

حال روزگار کا تھا۔ "آرزو کیوں لئے آئے ہو یہاں کچھ بھی نہیں!"

منشی سجاد حسین حسین تھے اور واقعی قسمت کے دھنی تھے۔ جمشید روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کا بنگلہ الاٹ ہو گیا۔ بندر روڈ پر ایک وسیع دفتر عطا ہو گیا۔ کچہری روڈ پر ایک بہت بڑا پریس الاٹ کرا لیا، پولیس انوینٹری (فہرست) بنانے آئی تو اس کی جیب گرم کر دی۔ اس نے فہرست میں ایک مشین، ایک ٹریڈل اور پچاس پونڈ ٹائپ درج کر کے معاملہ ختم کر دیا اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد منشی صاحب نے جائزہ لیا تو آنکھیں کھل گئیں، کئی سو ریم ولایتی کاغذ کے تھے، کئی سو ریم نیوز پرنٹ کے تھے، سو ریم سے زیادہ آرٹ پیپر تھا، ایک آفسٹ مشین، دو جرمنی کی ساختہ لیتھو مشینیں تھیں سے آٹھ سو کے قریب پلیٹیں تھیں، گرانڈنگ مشینیں تھیں، کٹنگ اسٹیچنگ اور پرفوٹنگ مشینیں جدا، اعلیٰ درجے کی سیاہ، سبز، سرخ اور دوسرے رنگوں کی روشنائیوں کا گراں بہا ذخیرہ۔ اردو، انگریزی، گجراتی، سندھی ٹائپ بے انداز اور یہ سب مال مفت تھا! کیونکہ درج فہرست نہ تھا۔ میر دوست محمدؐ بھی منشی سجاد حسین سے کم ہوشیار نہ تھے، انھوں نے بھی وہی تکنیک اختیار کی جو منشی صاحب نے کی تھی، اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ فائدے میں کون زیادہ رہا۔ منشی صاحب یہ الزام میر صاحب پر لگاتے تھے کہ یار لوٹ لیا تم نے بیچارے بھورام کو اور منشی صاحب یہ تہمت میر صاحب پر لگاتے تھے۔ اماں ہٹو بھی لکھ پتی بن گئے۔ پریس پر قبضہ کر کے پاکستان کا وجود ختم کر کے ہندوستان کو پھر سے متحد کر دینے کے اعلان کا انعام پا کر دونوں نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ منشی صاحب نے "قوم" میر صاحب نے "مسلم" جاری کر دیا۔ "قوم" ایک مرتبہ پھر "ملت اسلامیہ کا

بیباک نقیب"۔ اور "مسلم" ایک مرتبہ اور "ملّت اسلامیہ کے مفاد و حقوق کا نڈر پاسباں" بن گیا!

دونوں بہت جلد اقلیم صحافت کے تاجدار اور شہریار بن گئے۔ دونوں کو اشتہارات کا نرخ کبھی دو آنے سے زیادہ نہ ملا تھا، یہاں تین روپے سے آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ اخبارات کبھی ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں چھپتے تھے اب آٹھ دس ہزار تک کی اشاعت ہو گئی!

اسلم کا کئی مرتبہ جی چاہا کہ منشی صاحب کے سنگِ در پر دستک دے لیکن نہ جانے کیوں ہمت نہیں پڑی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ جب وہ جوتیاں چٹخاتا بندر روڈ پر گھوم رہا تھا، منشی صاحب موتی مسجد کے پاس کھڑے ایک سگریٹ فروش سے کریون اے" کاٹن بلیک مارکیٹ کے نرخ سے خرید رہے تھے، آنکھیں چار ہوئیں لیکن انھوں نے التفات نہ فرمایا۔ منشی صاحب کے پاس اسٹاف کی کمی نہ تھی، ایک سے ایک قابل اور فاقہ مست سستے داموں مہیّا ہو رہا تھا! وہ ایسے شخص کو کیوں مُنہ لگاتے جو سب سے پہلے گڑے مُردے اکھاڑنے لگتا۔ یعنی پچھلے حساب کا کھاتہ لے کر بیٹھ جاتا!

اسلم نے بھی سوچا جو شخص اتنا گرا ہوا ہو اس سے بات کرنا انسانیت کی توہین ہے۔ اس کی خوشامد کرنے سے فاقے کر کے مرجانا بہتر ہے۔

منّتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے

دونوں اپنے اپنے راستے چلے گئے۔ ایک منزلِ مقصود کی طرف کامگار

اور کامراں، دوسرا ایک غیر متعین سمت کی طرف ناکام اور نامراد!
لیکن بگڑی بن جاتی ہے جب فضلِ خدا ہوتا ہے۔ چند ہی قدم گیا تھا کہ قسمت نے پلٹا لیا!

عبدالخالق صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ یہ ادھیڑ عمر کے ایک شریف اور نیک شخص تھے۔ پیشہ کتابت تھا، قوم کے دفتر میں سالہا سال کام کر چکے تھے۔ اسلم کو، اس کی طبیعت کو، اس کی صلاحیت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ آخاہ، اسلم صاحب! آپ کب آئے؟

اسلم نے مختصر طور پر اپنی داستان درد سنادی، پھر پوچھا: آپ کیا کر رہے ہیں؟
خالق صاحب نے جواب دیا، اللہ کا شکر ہے بہت مزے میں ہوں، گھر پر بلاکوں کی کتابت کرتا ہوں، کام اتنا زیادہ ہے کہ دار نہیں ملتا۔ ۳۰، ۴۰ روپے روز کما لیتا ہوں!

تیس چالیس روپے روز، یہ سن کر اسلم کو سناٹا آگیا۔ جس شخص کو ۳۰، ۴۰ روپے ماہوار مشکل سے ملتے تھے وہ آج اتنے روپے روزانہ کما رہا ہے۔ واقعی اس سے بڑھ کر خدا کا شکر کرنے کا حق کسے ہے؟ لیکن فوراً ہی اس کفر پر دل ہی دل میں توبہ کی، "سو سے بُرا تو لاکھ سے بہتر بنا دیا" کیا مجھے خدا کا شکر ادا نہیں کرنا چاہئے لاحول ولاقوۃ کیسے ناپاک خیالات آجاتے ہیں بعض وقت!

پھر خالق صاحب کا اصرار کشاں کشاں اسلم کو اُن کے غریب خانے تک لے گیا، یہ سات کمروں کا ایک شان دار فلیٹ تھا، ہر طرح سے آراستہ پیراستہ، اسلم نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا، خوب مکان مل گیا، کرایہ کیا ہے؟

خالق صاحب زور سے ہنس پڑے ۔ جی بہت زیادہ سترہ روپے ماہوار!

اسلم کو یقین نہیں آیا : سچ بتائیے!

فرمایا : بخدا ، الاٹ منٹ پر سات سو روپے ضرور خرچ ہو گئے!

اسلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گیا ۔ لیکن خالق صاحب کا بحر لطف وکرم اس وقت طوفانی حالت میں تھا کہنے لگے : کیوں نہ آپ یہاں اُٹھ آئیں!

اسلم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ۔ حیرت اور بے یقینی کے ساتھ اس نے پوچھا : میں چلا آؤں ؟

خالق صاحب ہنسنے لگے ، جی آپ اور کون ؟ سات کمرے ہیں ہمارے لئے چار بہت کافی ہیں ، تین بالکل خالی پڑے رہتے ہیں آپ آجائیں گے تو ایک سے دو ہو جائیں گے!

کتنی پیاری تجویز تھی اور یہ آدمی بھی کتنا پیارا تھا جو ایک خانہ بدوش کو پناہ دے رہا تھا!

اسلم نے بے دلی کے ساتھ جواب دیا " بہت بہتر! " لیکن تامل و تذبذب چہرہ سے نمایاں تھا ۔ سوال یہ تھا کہ جھگی میں فاقے سے بھی پڑ رہے تو کسی کو کیا خبر یہاں تو چولھا جلنا چاہیئے اور جیب تقریباً خالی ہے ، بہرحال وہ جھگی پہنچا ۔

یہ خوش خبری جو سنائی تو ہر شخص پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی ۔

خان صاحب کے فلیٹ میں اپنی جھگی ایک پریشان حال کو دے کر ـــ اسے متعلقین سمیت پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی ۔ لاکھ بے سروسامانی سہی ، لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں کچھ دیر لگ ہی جاتی ہے ، یہاں تینوں کمرے خان صاحب

نے پہلے سے صاف کر رکھے تھے۔ سامان سجاتے سجاتے آٹھ بج گئے۔ اب کھانے کی فکر ہوئی سلمیٰ نے نجمہ کو انجمن کی گود میں دیتے ہوئے کہا: کچھ لے آئیے تو پکا لوں!

اتنے میں خالق صاحب کی آواز آئی جو دروازے پر کھڑے اسلم صاحب کو آوازیں دے رہے تھے، وہ فوراً باہر نکلا تو دیکھتا کیا ہے کھانے کا خوان دونوں ہاتھوں پر سنبھالے کھڑے ہیں۔ کہنے لگا: اتنی زیادتی نہ کیجیے خالق صاحب!

وہ گویا ہوئے: آج رات سے صبح کے ناشتے تک آپ ہمارے مہمان ہیں!

خوان اتنا وزنی تھا کہ خان صاحب دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ اسلم نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا یہ بوجھ لے کر اندر آگیا۔

ایک روز حسبِ معمول گھوم پھر کر واپس آیا تو خالق صاحب کو منتظر پایا۔ انھوں نے فرمایا: پاکستان کی مشہور پبلشنگ فرم میسرز غلام حیدر اینڈ سنز کا صدر دفتر تو لاہور میں ہے مگر برانچ کراچی میں بھی ہے۔ آجکل فرم کے پروپرائٹر شیخ اعجاز احمد صاحب آئے ہوئے ہیں وہاں اپنا ایک بل لینے گیا تھا تو آپ ہی کی باتیں ہو رہی تھیں کہ نہ جانے کہاں ہیں؟ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ انھوں نے یہ خط آپ کو دیا ہے۔ شاید کچھ کام دینا چاہتے ہیں! اسلم نے لفافہ کھولا تو خط کے ساتھ چھ سو روپے کا ایک چیک خط میں لکھا تھا۔ یہ چیک قبول کیجیے، اگر ہماری فرم کے لئے آپ کچھ لکھیں گے تو یہ رقم منہا ہو جائے گی۔ ورنہ حسابِ دوستاں دردل! میں آج لاہور واپس جا رہا ہوں، غالباً اگلے ماہ پھر آؤں گا تو نیاز حاصل ہوگا!

اسلم نے خط خالق صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ پڑھنے کے بعد انھوں نے فرمایا: بڑے ایماندار آدمی ہیں، مزدوروں کی اُجرت صحیح معنی میں پسینہ خشک ہونے سے

دیتے ہیں۔ دس روپے کا بل ہو یا دس ہزار کا، کبھی یہ نہیں کہیں گے کل آنا! اسی وقت نقد یا چیک دے دیں گے!

اسلم نے حیرت سے یہ باتیں سنیں اور بے یقینی کے لہجے میں کہا: آپ کہتے ہیں تو مانے لیتا ہوں!

خالق صاحب ہنسنے لگے: ہاں بھئی دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے!

اسلم کے لئے یہ رقم نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے قلم سنبھالا اور کام کرنے بیٹھ گیا! بیس پچیس دن تک جم کر کام کیا۔ اور کافی لکھ لیا۔ اتفاق کی بات ایک روز شام کو ٹہلنے نکلا تو کریم اللہ خاں سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ جب "قوم" کا ایڈیٹر تھا یہ نیشنل پیپر پارٹ کے منیجر تھے، باتوں باتوں میں معلوم ہوا خان صاحب کریم پیپر پارٹ کے مالک ہیں اور وارے نیارے کر رہے ہیں صرف بلیک مارکیٹ سے ہی ہزارہا کما لیتے ہیں۔ کہنے لگے: اپنا اخبار کیوں نہیں نکالتے۔ آپ کے زورِ قلم کے سامنے یہاں کا کون اخبار ٹھہر سکتا ہے؟

اس نے اپنی مجبوریاں بیان کیں تو فرمایا: تین مہینے تک کاغذ میں قرض دوں گا منظور پریس کے مالک میرے دوست ہیں انھیں بھی راضی کر لوں گا کہ تین مہینے تک ادھار چھاپیں، کتابت کا مسئلہ بیٹک ٹیڑھا ہے۔ یہ بل روزانہ کی سیل سے ادا کیجئے۔ چلئے اخبار نکل گیا نہایت ٹھاٹھ کا!

اسلم نے کہا: اور اسٹاف کی تنخواہیں؟ نیوز سروسز کا معاوضہ؟ یہ کہاں سے ادا ہوگا؟

کریم اللہ خاں نے ذرا دیر سر کھجانے کے بعد کہا نیوز سروسز کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تاجدار صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں وہ بھی تین مہینے تک مطالبہ نہیں کریں گے۔ رہا اسٹاف کا معاملہ تو وہ کم سے کم رکھئے اور خود زیادہ سے زیادہ کام کیجئے۔

اگر قوم "آپ اکیلے ایڈیٹ کر سکتے تھے تو اپنا اخبار کیوں نہیں کر سکیں گے؟

اخبار کا نام سن کر اسلم کے دل میں لہریں اٹھنے لگیں۔ ہندوستانی صحافت کے ہنگامہ خیز دور سے وہ متعلق رہ چکا تھا، یہاں سے کافی اخبار نکل رہے تھے لیکن ایسے کم تھے جن کے مقالات ادارت میں جان ہو۔۔ جو غیر ملکی اخبارات کے مضامین کے تراجم شائع کرتے ہوں، جو عالمِ اسلام کے واقعات و حوادث کی تفصیل دیتے ہوں اور ان پر تنقید کرتے ہوں، ان کی پونجی عامیانہ فکاہی کالم اور ٹارزن کی کہانیوں پر مشتمل تھی، لہٰذا ایک معیاری اخبار کی ضرورت تھی، اور یہ ضرورت وہ بہ وجہ احسن پوری کر سکتا تھا بڑی خوشی سے تیار ہو گیا۔ کہنے لگا: مجھے یہ تجویز دل و جان سے منظور ہے!

اسلم خوش خوش گھر آیا۔ فوراً خالق صاحب سے مشورہ کیا۔ اخبار کی چاٹ انھیں بھی تھی۔ راضی ہو گئے۔ کہنے لگے: کاتبوں کا بندوبست میں کروں گا! مگر دفتر!

اسلم نے بے تامل جواب دیا: ہم سب ایک کمرے میں رہیں گے، دو کمرے دفتر کے لئے کافی ہیں ـــ ہیں نا؟

خالق صاحب نے ماتھا سکیڑ کر کہا: ہاں ہیں تو، لیکن ایک روزانہ اخبار کا دفتر رہائشی مکان میں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سیکلوڈ روڈ پر اولڈ منٹ ہاؤس کا آدھا حصہ خالی پڑا ہے ابھی تک کسی کے نام الاٹ نہیں ہوا۔ اگر ہمیں الاٹ ہو جائے تو قوم وغیرہ مُنہ دیکھتے رہ جائیں گے اتنا شاندار دفتر ہو گا!

اسلم نے کہا: خیر دفتر کی کوشش بھی کر لی جائے گی، آپ کاتبوں کا بندوبست کیجئے۔ دوسرے روز وہ گھر سے نکل کر سیدھا وزیر مہاجرین سید میراں محمد شاہ کے گھر پر پہنچا۔ ہونے والی بات، فوراً ملاقات ہوگئی۔ اس نے کہا: مجھے اپنی رہائش کے لئے مکان نہیں چاہئے۔ پہلے جھگی میں تھا اب سب ٹیننٹ ہوں لیکن قوم کی خدمت کا ولولہ مجھے کشاں کشاں آپ کے در دولت تک لایا ہے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود بعض دوستوں کے تعاون سے اخبار نکال رہا ہوں، اس کے لئے دفتر چاہئے نہ پگڑی دینے کی طاقت ہے نہ رشوت کی استطاعت، اولڈ منٹ ہاؤس کا آدھا حصہ خالی ہے۔ آپ اگر کرم کریں تو یہ مشکل حل ہو سکتی ہے!

ان صاف اور کھری باتوں سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اسی وقت موٹر میں جا کر موقع کا معائنہ کیا۔ اور واپس آکر الاٹمنٹ دے دینے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ اتنی غیر متوقع کامیابی تھی جس نے یقین دلا دیا اب اخبار ضرور چلے گا۔ وہاں سے سیدھا مجسٹریٹ کے دفتر پہنچا اور روزنامہ "ملت" کا ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ پھر خوش خوش کریم اللہ خاں کے پاس گیا۔ وہاں منظور پریس کے مالک حافظ محمد منظور صاحب بھی تشریف فرما تھے، فون کرتے ہی تاجدار صاحب بھی آموجود ہوئے اور جو باتیں کل سر راہ طے ہوئی تھیں وہ باقاعدہ طے ہوگئیں۔ طے یہ پایا کہ تین مہینے کے بعد پریس نیوز اور کاغذ کے بل اسلم پابندی سے ادا کرے گا۔ اور پچھلی رقم بھی ساتھ ساتھ قسط وار ادا کرتا رہے گا!

نیا ناول نصف سے زیادہ لکھا جا چکا تھا۔ ایک ہفتے میں باقی حصہ مکمل کر لیا۔ اور اسے حسن اتفاق کہنا چاہئے کہ دوسرے ہی روز شیخ اعجاز احمد صاحب بھی تشریف

لے آئے اور بجائے اس کے کہ اسلم کو بلاتے خود ہی ایک دن صبح آموجود ہوئے۔ اسلم نے اخبار کی اسکیم بتائی سن کر بہت خوش ہوئے، ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا، مجید صاحب ساتھ تھے۔ انھوں نے تائید کی کہ اسلم صاحب کے اخبار میں ہماری فرم کا اشتہار وقتاً فوقتاً دے دیا کیجئے اور پھر رخصت کی اجازت چاہی۔ اس طویل نشست میں جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی سب طرح کی باتیں ہوئیں۔ لیکن شیخ صاحب نے ایک مرتبہ بھی یہ سوال نہیں کیا کہ ناول لکھا گیا یا نہیں؟ لکھا جائے گا یا نہیں؟ جو رقم دی جا چکی ہے وہ کس طرح ادا ہوگی؟ اس سرشت کا آدمی پہلی مرتبہ اس کی نظر سے گزرا تھا۔ اور اس "ہماوتے" پہ وہ متحیر بھی تھا اور مسرور بھی آخر اس نے خود ہی کہا: ناول میں نے مکمل کر لیا ہے۔

شیخ صاحب اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئے۔ اچھا دیدار تو کرائیے!

اسلم نے مسودہ سامنے لاکر رکھ دیا۔ شیخ صاحب نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور مجید صاحب کے حوالے کر دیا۔ چلتے چلتے کہا: کسی وقت تشریف لے آئیے گا دفتر تک تو حساب ہو جائے گا!

اور شام کو جب وہ دفتر پہنچا تین ہزار کا چیک تیار ملا۔ حساب کی تفصیل بتلاتے ہوئے اعجاز صاحب نے کہا: پندرہ سو اس ناول کے ہیں باقی پندرہ سو میں ایک دوسرا اتنا ہی بڑا ناول لکھ دیجئے۔ وہ چھ سو — تیسرے — چوتھے اور پانچویں ناول میں دو دو سو روپے کے حساب سے منہا ہو جائیں گے

ان الفاظ میں نہ رعونت تھی نہ پندار نہ خودستائی نہ انانیت، یہ معلوم ہو رہا تھا ایک شریف انسان ایک شریف انسان سے گفتگو کر رہا ہے، وہ اس کا

منتظر نہیں ہے کہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسان کی داستانِ درد سُنے اور اسی اثنا میں پوری فن کاری سے اس کے کمزور پہلوؤں کو یعنی مجبوریوں کو تاڑ لے۔ اور پھر روپے کا کام چار آنے میں لینے کی کوشش کرے اور یہ کام لے کر چار سو مرتبہ پھیرے لگوائے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رقم عطا کرے، اس نے ایک لفظ سنے بغیر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسان کی مجبوری اور پریشانی کا پورا پورا اندازہ کر لیا تھا اس نے مزدور کی اجرت میں ایک پیسہ بھی کم نہیں کیا۔ پوری اُجرت ادا کر دی بلکہ جتنی اجرت بنی اس سے کہیں زیادہ رقم پیشگی کی مد میں دے دی اور یہ سب کچھ اس طرح کیا جیسے نہ کوئی احسان کیا ہے نہ رعایت کی ہے۔

وہ خوش خوش چیک لے کر گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے روزنامہ "ملت" کا ڈیکلریشن بھی منظور ہو کر آگیا ہے، گویا اب کام فوراً شروع ہو سکتا تھا۔ جو چیک اعجاز صاحب سے لے کر آیا تھا دوسرے ہی دن اُس کی رقم سے "ملت" کے نام کا بینک میں اکاؤنٹ کھول لیا اور کام شروع کر دیا۔

بہت جلد "ملت" نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ اس کے سنجیدہ اور متوازن مقالات اداریت، اس کی صحیح اور مستند خبریں، اس کی بے لاگ اور بے باک نکتہ چینی ان سب چیزوں نے اسے معیاری اور وقیع اخبار بنا دیا۔ وزیر داخلہ نے پریس کے لئے جو مشاورتی کمیٹی قائم کی تھی، مدیر "ڈان" و "آبزرور" کے ساتھ اسلم بھی اس کا ممبر نامزد کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کے ایوان اور وزیر اعظم کے دولت کدہ پر جو سیشن منعقد ہوا کرتے تھے اُن میں بھی وہ مدعو کیا جانے لگا۔ اچھے نرخ پر اشتہارات بھی ملنے لگے، اشاعت میں یومیاً یوماً اضافہ ہونے لگا۔ قرض سے اس کی طبیعت

ہمیشہ منتشر رہتی تھی۔ کریم اللہ خاں، تاجدار صاحب اور منظور صاحب نے کاغذ، نیوز سروس اور پریس کے لئے جو سہولتیں دی تھیں ان سے صرف ایک مہینہ اس نے فائدہ اٹھایا۔ دوسرے مہینے سے نقد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کاتبوں کا بل بھی وقت پر ادا کر دیا جاتا۔ اسٹاف میں جو چند آدمی تھے ان کی تنخواہیں ایک گھنٹے کے لئے نہیں رکیں۔ یہ سب کچھ دے دلا کر خود اس کے لئے بہت کم بچتا۔ جو تین ہزار اعجاز صاحب سے ملے تھے اخبار ہی میں لگ گئے۔ لیکن ایک در بند سو در کھلے۔ اکرام صاحب آئی سی ایس محکمہ اطلاعات و نشریات کے جوائنٹ سکریٹری تھے، اس محکمہ کے وزیر قریشی صاحب تھے یہ دونوں اسلم کی قدر کرتے تھے۔ ریڈیو اور محکمۂ اطلاعات سے مجموعی طور پر ہر مہینے سات آٹھ سو روپے کا کام ملنے لگا۔ اس رقم کا بہت کم حصّہ وہ اپنی ذات پر خرچ کرتا باقی سب رقم اخبار پر خرچ ہو جاتی۔ اخبار بہت کامیاب تھا لیکن ابھی تک آمد و خرچ میں توازن قائم نہیں ہو سکا تھا جو کمی ہوتی اسے اپنی بالائی آمدنی سے پورا کرنا۔ اسی اثنا میں قریشی صاحب کے ایما سے اکرام صاحب نے اسے ایک کتاب لکھنے کو دی۔ "پاکستان سے پہلے اور پاکستان کے بعد!" اس کا معاوضہ ساڑھے چار ہزار روپیہ طے پایا۔ اس کتاب میں لکھنے کا اتنا کام نہیں تھا جتنا ایڈیٹنگ کا تھا۔ جلدی سے مکمل ہو گئی یہ رقم بھی اخبار کے کھاتہ میں جمع ہو گئی۔

چونکہ اخبار کا خسارہ پورا کرنے کے لئے اُسے باہر کا کام کرنا پڑتا تھا لہذا شدّت سے ایک رفیقِ کار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، یکایک ایک روز مسٹر یعقوب سے ملاقات ہو گئی۔ یہ اسلم کے کالج فیلو تھے اور خود بھی صحافت کا پیشہ تقسیم ہند سے پہلے اختیار کئے ہوئے تھے۔ دونوں دوست بے تکلفی سے ملے اور بہت جلد پیمانِ

رفاقت بندھ گیا، اب وہ زیادہ یکسو ہوکر بالائی کام کرنے لگا، اعجاز صاحب کے لئے ناول، ریڈیو کے لئے ہر ہفتے خبروں پر تبصرہ، کتابوں پر تنقید، اسلامی موضوعات پر پاک محکمہ اطلاعات کے لئے مختلف عنوانات پر مقالات، ان سب کاموں کا بہت کافی معاوضہ مل جاتا تھا۔ یعقوب صاحب کی حیثیت پارٹنر کی تھی، کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان سے ان کا روپیہ آنے والا ہے جیسے ہی آیا اسلم کی اب تک کی خرچ کی ہوئی رقم کا نصف وہ دیں گے۔ بدگمانی یا بے اعتمادی کا کوئی سوال نہ تھا! معاملہ طے پاگیا اور کام چلنے لگا!

ایک روز خالق صاحب بہت خفا ہوگئے۔ مہینہ کی تیس تاریخ تھی اور کل تنخواہیں ادا کرنا تھیں، اسلم اسی سوچ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک مظلوم جماعت کے نمائندے تھے۔ انھوں نے کہا آپ ہم مظلوموں کی جس جوش و خروش سے تائید کر رہے ہیں اس کے ہم دل سے سپاس گزار ہیں۔ آپ کی خدمات کا معاوضہ تو نہیں دیا جاسکتا لیکن اظہار تعاون کے طور پر ہزار روپے کی یہ حقیر رقم قبول کر لیجئے

اسلم نے روپے میں ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے کہا: اگر میں نے یہ روپیہ لے لیا تو جس جوش و خروش کی تعریف میں آپ اتنے رطب اللسان ہیں وہ زر خرید بن جائے گا۔

ان صاحب نے کہا: آپ کا خیال ہے کہ یہ رقم کم ہے، واقعی کم ہے لیکن ہماری مشکلات پر بھی غور کیجئے، نہ جانے کس طرح ہم کام چلا رہے ہیں کسی اخبار کی خدمت میں ہم نے اس سے زیادہ رقم پیش نہیں کی ہے، دیکھئے یہ رہیں رسیدیں!

سب سے پہلے جن رسیدوں پر نظر پڑی وہ "قوم" اور "مسلم" کی تھیں۔ لیکن اسلم

سٹ سے مس نہ ہوُا۔ اس نے کہا : رقم کی کمی زیادتی کا کوئی سوال نہیں یہ تو اپنا اپنا اصول ہے۔ روپے واپس لے جائیے، انشاءاللہ ملت پہلے سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ آپ کی تائید کرے گا، کیونکہ واقعی آپ مظلوم ہیں!

روپیہ واپس لے کر وہ چلے گئے، ان کے جاتے ہی خالق صاحب برس پڑے بس تو چل چکا اخبار اسلم صاحب! سب یہی کرتے ہیں!

وہ مسکراتا ہوُا بولا: لیکن ان سب میں اسلم نہیں ہے!

خالق صاحب نے پوچھا: کل تنخواہیں ادا کرتے وقت کیا کیجیے گا؟

وہ بولا: آپ حضرات کی خوشامد کر لوں گا! ورنہ اخبار بند کر دوں گا!

خالق صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ اتنے میں محمد طاہر آگیا۔ یہ ملت کا سول ایجنٹ تھا، نہایت ایماندار، معاملے کا کھرا۔ اور پائی پائی حساب چکانے والا، اس نے اسلم کو مضمحل دیکھ کر کہا: آج کچھ پریشان نظر آتے ہیں آپ؟

وہ بولا: بھئی پندرہ سو روپے نہیں چاہئیں، دے دو، حساب میں کاٹ لینا۔ یا قرض سمجھ کر ہی، چند روز بعد ادا کر دیں گے!

کچھ دیر طاہر سوچتا رہا، پھر اس نے ہمیانی سے روپے نکالے اور گن دیے، اس کے جانے کے بعد اسلم نے خالق صاحب سے کہا: کہیے دیکھا آپ نے اللہ میاں کو؟!

وہ مسکرانے لگے: جواب کیا دیتے؟

(۱۰)

مرگِ دل!

کونین کے لطف کس سے اٹھیں مجھ کو غمِ دو جہاں بہت ہے!

"ملت" دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ اشاعت بھی بڑھ رہی تھی۔ اشتہارات بھی اچھے نرخ پر اور کافی ملتے تھے۔ غیر ملکی اشتہاری کمپنیوں سے بھی معاہدے ہو گئے تھے۔ سرکاری اشتہارات کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور سب کچھ بغیر کنوسینگ کے ہوا تھا۔ صرف اخبار کی ہر دلعزیزی کی بنیاد پر! لیکن یکایک حالات نے پلٹا کھایا اور وہ عمارت جو شب و روز کی انتھک جانفشانیوں کے بعد تیار ہوئی تھی گیک بیک زمین پر آ رہی!

"قوم" اور "مسلم" کے لئے "ملت" کی سربلندی اور کامیابی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ یہ اخبارات کسی اعتبار سے بھی "ملت" کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ روپیہ ضرور ان کے پاس ضرورت سے زیادہ تھا لیکن صحافت کی ابجد سے بھی نا واقف تھے۔ یہ

"ملّت" کی سطح تک نہ آسکے۔ "ملّت" کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کرتے لگے "مسلم" بھی منظور پریس میں چھپتا تھا۔ حافظ منظور احمد صاحب کو مسلم والوں نے گانٹھ لیا۔ چنانچہ گو آخری کاپی ٹھیک وقت پر دفتر سے بھیج دی جاتی تھی لیکن نہایت پابندی کے ساتھ اخبار لیٹ چھپنے لگا۔ اسلم نے منظور صاحب سے بار بار شکایت کی انھوں نے ہر بار معذرت کی اور اس کے سامنے پریس کے ملازموں کو بلا کر ڈانٹا ڈپٹا لیکن اخبار کے لیٹ ہونے کی وضعداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاکر ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے، چند روز تک تو سہم دفا نباہتے رہے یعنی اخبار کتنا ہی لیٹ چھپتا وہ اس کو اٹھاتے لیکن جب روز کا یہی معمول بن گیا تو "قوم" اور "مسلم" اٹھانے لگے آخر ملّت پرستی کرکے فاقے تو نہیں کر سکتے تھے۔ ادھر قوم اور مسلم نے ہاکروں کے کمیشن میں بھی اضافہ کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اشاعت خاصی گھٹ گئی۔

طاہر نے کہا: صاحب اس طرح تو اخبار بے موت مر جائے گا۔ پریس بدلئے منظور صاحب مسلم اور قوم سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی وقت پر نہیں چھاپیں گے۔ بہت سے ہاکر ہمارے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ چند روز میں سب بھاگ کھڑے ہوں گے۔ مشکل یہ تھی کہ ایسے پریس جو روزانہ اخبار چھاپ سکیں بہت کم تھے۔ پھر بھی دوڑ دھوپ کرکے اسلم نے یہ مشکل حل کر لی۔ اور ایک دوسرے پریس میں بندوبست کر لیا یہاں سے اخبار وقت پر شائع ہونے لگا لیکن بھاگے ہوئے ہاکروں کو پھر سے جمع کرنا خاصا دشوار کام تھا، جس طرح ہوا یہ کام بھی کیا گیا پھر ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ یہ پہلی سے زیادہ مہلک تھی، حد درجہ بھرے ہوئے سینہ میں شرابور، غصہ سے چُور ہاکروں کے غول اخبار کے بنڈل لے لے کر واپس آنے لگے۔

اسلم حیران، خالق پریشان۔ ارے بھئی طاہر صاحب یہ کیا معاملہ ہے آپ کے ہاکروں کو کیا ہو گیا ہے؟ طاہر نے جواب دیا۔ بات یہ ہے کہ "مسلم" اور "قوم" کے آدمی "ملت" کے سو ڈیڑھ سو پرچے مختلف ہاکروں سے خرید لیتے ہیں اور پھر بولٹن مارکیٹ پہ دو آنے میں، فریئر روڈ پہ ڈیڑھ آنے میں اور صدر میں ایک آنے میں بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس آدمی نے پرچہ بولٹن مارکیٹ پر دو آنے میں خریدا ہے وہ صدر آ کر ایک آنے میں بکتا ہوا دیکھ کر کیا پھر دوسرے دن لے سکتا ہے؟۔ خالق صاحب نے کہا ان لوگوں کے ہاتھ پرچہ کیوں بیچا جائے؟ طاہر نے بتایا یہ تو عام خریدار کی حیثیت سے دو آنے میں خریدتے ہیں اور پھر نقصان اٹھا کر سستا بیچ ڈالتے ہیں تاکہ "ملت" کی ساکھ پر اثر پڑے۔ چند روپے روز کے نقصان میں یہ سودا برا نہیں ہے!

یہ ایسی مشکل آن پڑی تھی جس نے سب کو حواس باختہ کر دیا۔

ابھی اس مشکل سے نجات نہیں ملی تھی کہ ایک نئی افتاد سے دوچار ہونا پڑا۔ اسلم میعادی بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اور تقریباً مہینہ بھر تک دفتر نہ جا سکا! اس اثنا میں سندھ کے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش نے اپنے ہندو سکریٹری کو سفارشی خط دے کر یوپی کے وزیر اعظم پنت صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اس خط کا عکس کئی اخبارات نے چھاپ کر قیامت برپا کر دی۔ تنہا ملت وہ اخبار تھا جس نے پیر صاحب کی پشت پناہی زور شور اور جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دی۔ "قوم" اور "مسلم" کو اسلم اور "ملت" کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے کا موقع مل گیا لیکن اسے سر پاؤں کا ہوش نہ تھا وہ بخار میں بھن رہا تھا۔ اخبار کی اشاعت گرتی جا رہی تھی، وقعت بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔

وی پی واپس آرہے تھے۔ مستقل مقامی اخبار لینے سے انکار کر رہے تھے۔ ہاکر اخبار لے جاتے تھے اور جوں کا توں واپس آتے تھے!

مہینہ بھر بعد وہ اس قابل ہوا کہ باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کر سکے، وکٹوریہ میں بیٹھ کر دفتر پہنچا، وہاں جاکر معلوم ہوا جس اخبار کی روزانہ مقامی سیل پارہ پندرہ سو روپے روز تھی، اب اس کی سیل دو روپے روز کی بھی نہیں رہ گئی تھی۔

خالق صاحب سے بیٹھا وہ مشورہ کر رہا تھا کہ یعقوب صاحب آگئے، انھوں نے کہا اب تک میں "ملت" کی خدمت کرتا رہا اب مجھے اپنے مستقبل کی فکر ہے یہاں سے جو آنریریم ملتا تھا وہ میرے لئے ناکافی تھا اور اب اس کی بھی کوئی امید نہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اخبار فروخت کر دیجیے۔ یہ ہاتھی آپ کے پالے نہیں پل سکتا!

خالق صاحب بھی اتنے بددل ہو چکے تھے کہ گویا رضامند ہو کر فوراً سوال کیا۔

کون خریدے گا بھلا اسے؟

یعقوب صاحب نے فرمایا: شفیق صاحب بیرسٹر پرانے قومی کارکن ہیں انھیں ایک اخبار کی ضرورت ہے، نئے اخبار میں زیادہ سرمایہ لگانا پڑے گا پھر اشتہارات کے لئے سال بھر انتظار کرنا پڑے گا۔ ملت خرید کر اس جھنجھٹ سے بچ جائیں گے بارسوخ آدمی ہیں چلا لیں گے، عملے کو جو تنخواہ اب ملتی ہے اس سے کچھ زیادہ ہی دیں گے!

خالق صاحب بالکل راضی ہو گئے۔ بتائیے اسلم صاحب!؟

اسلم نے جواب دیا: چلیئے یہی سہی!

اسی دن سہ پہر کو یعقوب صاحب شفیق صاحب کو لے کر آگئے، گورا چٹا رنگ
چھریرا بدن، کرنجی آنکھیں، شفیق صاحب کے ساتھ ان کی انگریز بیوی بھی تھیں،
تعارف کی رسم ادا ہوئی، پھر یعقوب صاحب نے کہا: شفیق صاحب پندرہ ہزار
روپے دینے کو تیار ہیں اور اس سے زیادہ آپ کو رقم ملے گی بھی نہیں میرے خیال
میں مان لیجئے!

خالق صاحب بول پڑے۔ یہ نہ کہئے یعقوب صاحب ــــ!

اسلم نے بات ختم کر دی: مجھے منظور ہے

شفیق صاحب نے چالیس روپے کا ایک ٹائپ شدہ اسٹامپ اسلم کی طرف
بڑھا دیا: "پڑھ لیجیے اور دستخط کر دیجیے!"

اسلم نے پڑھ لیا اور دستخط کر دیے۔ اس تحریر کی رُو سے اُس نے پندرہ ہزار روپے
لے کر ملت اور کاروبار، دفتر، فرنیچر، ہر چیز کا حق ملکیت بیگم شفیق کے نام منتقل کر دیا
تھا، شفیق صاحب اپنے پیشے کی وجہ سے خود میدان میں نہیں آسکتے تھے۔ اسلم میں
اور شفیق صاحب میں گفتگو شروع ہو گئی، بیگم شفیق نے وہ دستاویز اٹھا کر پرس میں
رکھ لی، شفیق صاحب نے کہا: آپ دیکھ لیں گے یہ اخبار چند دن میں کہاں سے کہاں
پہنچتا ہے۔ آپ ٹھہرے شریف اور نیک آدمی آپ کو وہ ٹیکنیک نہیں معلوم جو روپے
کو اس طرح کھینچتی ہے جیسے مقناطیس آہن کو!

ان الفاظ میں اسلم کو منشی سجاد حسین کی روح تاباں اور درخشاں نظر آئی۔
وہ کانپ گیا۔ یکایک شفیق صاحب نے کہا: اور بس آپ تو صرف ادارت کریں باقی
معاملات میں بھگت لوں گا!

بے ساختہ اسلم کے منہ سے نکلا: ادارت! نہیں شفیق صاحب اب میں صرف کتابیں لکھوں گا!

شفیق صاحب ہنسنے لگے: کتابیں لکھنے سے کون منع کرتا ہے آپ کو۔ آپ صرف لیڈنگ آرٹیکل لکھ کر بھیج دیا کیجیے۔ فی الحال آپ کا گریڈ ۷۵۰ – ۵۰ – ۱۰۰۰ ہوگا۔ حالات کے سازگار ہوتے ہی یہ گریڈ ڈبل کر دیا جائے گا۔ جو تنخواہ "ڈان" کے ایڈیٹر کو ملتی ہے وہ "ملت" کے ایڈیٹر کو بھی مل سکتی ہے!

یہ پیشکش ایسی نہ تھی جسے موجودہ بحرانی دور میں وہ بے جھجک مسترد کر سکتا۔ اس نے پوچھا: لیکن پالیسی کیا ہوگی اخبار کی؟

شفیق صاحب نے فرمایا: کیوں بنا رہے ہیں آپ مجھے ـــ پالیسی وہی ہوگی جو جو آپ چاہیں گے۔ مجھے تو صرف انتظامی امور سے سروکار ہوگا، باقی آپ جانیں آپ کا کام!

خالق صاحب نے اسلم کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا: بہت بہتر، اسلم صاحب ادارت کریں گے

انتہائی گرمجوشی اور تپاک کے ساتھ شفیق صاحب نے فرمایا: شکریہ! پھر بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوئے: چیک بک، دو، اسلم صاحب کا حساب صاف کر دیا جائے۔

وہ برق پاش تبسم کے ساتھ گویا ہوئیں: چیک بک تو میں اپنے ساتھ نہیں لائی!

شفیق صاحب نے انھیں گھور کر دیکھا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالے تو دس دس کے پندرہ بیس نوٹ نکلے۔ زیر لب تبسم کے ساتھ گویا ہوئے۔ اتنی بڑی نقد رقم کہاں نکل سکتی تھی جیب میں! تو اسلم صاحب ایسا کیجیے کل تو اتوار ہے پرسوں پیر کو دفتر تشریف لے آئیے اور چیک لے لیجیے!

بیگم شفیق صاحب نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال کر ناگواری کے لہجے میں کہا، پارٹی ختم ہی ہوگئی ہوگی۔ یہ معاملہ آپ نے پیر ہی کو کیوں نہیں کرلیا؟

شفیق صاحب نے اسلم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: اچھا اجازت دیجئے۔ پیر کو دس گیارہ بجے تشریف لے آئیے!

شفیق صاحب تشریف لے گئے۔ لے کے دل دلستاں روانہ ہوا۔ یعنی اپنے ساتھ جو ملکیت کی دستاویز بھی لیتے گئے۔ خالق صاحب نے کہا: دستاویز تو روپے لے کر دینی چاہئے تھی

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا: فی الحال میرا مرنے کا ارادہ ہے نہ شفیق صاحب بھاگے جاتے ہیں

پیر کے دن اسلم شفیق صاحب کے چیمبر میں پہنچا، پہلے سے زیادہ گرمجوشی اور تپاک سے ملے فرمایا: آپ آگئے ــــ لیکن اسلم صاحب ایک ہفتہ کی مہلت دیجئے۔ میرا ایک بڑی رقم کا چیک رک گیا ہے، اگلے پیر کو حساب ضرور بیباق کر دوں گا!

اس کے کانوں میں خالق صاحب کے الفاظ گونجنے لگے "دستاویز تو روپے لے کر دینی چاہئے تھی"۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا واپس چلا آیا!

جس اخبار، دفتر اور کاروبار کا وہ کل تک مالک تھا آج وہاں ایک ملازم کی حیثیت سے جاتے ہوئے شرم آرہی تھی، اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا، گھر سے لیڈنگ آرٹیکل لکھ کر بھیج دیا کرتا، اسی طرح دو مہینے گزر گئے لیکن شفیق صاحب کا گراں بہا چیک "کلیر" نہیں ہوا۔ آج وہ پھر ان کی جناب میں حاضر تھا، اس نے کہا: نہ آپ نے میرا حساب بیباق کیا نہ دو مہینے کی تنخواہ دی، یہ بھی تو سوچئے اگر میں اتنا ہی دولت مند ہوتا تو اخبار بیچنے اور آپ کی ملازمت کرنے پر کیوں تیار ہوتا؟

شفیق صاحب کو جیسے برس پڑنے کا موقع مل گیا: جناب آپ نے تو نہ جانے کب کی

دشمنی نکالی ہے میرے ساتھ، دیوالیہ اخبار میرے ہاتھ فروخت کر دیا، رقم کہاں سے بیباق کروں، یہاں کاتبوں کی تنخواہ دینا مشکل ہو رہا ہے آپ اپنی تنخواہ طلب کر رہے ہیں، عجیب ستم ظریفی ہے یہ بھی!

اسلم کا خون کھولنے لگا: جی چاہا بنیک آف انڈیا کی پانچویں منزل سے شفیق صاحب کو نیچے پھینک دے اور پھر خود بھی کود پڑے۔ لیکن جیسے سلمیٰ، انجن، نجمہ، اقبال اور کرمین سب نے مل کر اس کے پاؤں پکڑ لئے، نہ وہ شفیق صاحب کو پھینک سکا نہ خود کود سکا مایوس ہو کر اور آئندہ پھر کبھی نہ آنے کا عہد کر کے واپس آ گیا۔

گھر پہنچا تو سلمیٰ کا چہرہ اترا ہوا، انجن بے حال، کرمین پریشان، حیران ہو کر پوچھا: کیا بات ہے سلمیٰ ــــ؟

وہ بولی: صبح سے نجمہ کی پسلی چل رہی تھی۔ ابھی ڈاکٹر صادق کو بلا کر دکھایا اُن کی تشخیص نمونیہ کی ہے ـــ انجکشن لگا گئے ہیں۔ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کہا "وہ" آئیں تو فیس کے اور انجکشن کے روپے پہنچ جائیں گے۔ پندرہ روپے انھیں دے آئیے!"

صبح سے اب تک ٹھوکریں کھاتے کھاتے تین بج چکے تھے۔ خیال تھا کھانا کھا کر ذرا آرام کرے گا لیکن اب کھانے اور آرام کرنے کا کیا سوال تھا۔ فوراً ہی روپے کا بندوبست کرنے چل پڑا۔ یہ پندرہ روپے جو ابھی دینا تھے، تو انجام کا آغاز تھے۔ بچی کی صحت تک ایسے ایسے پندرہ روپے نہ جانے کتنے خرچ کرنا پڑیں گے، وہ سیدھا میسرز غلام حیدر اینڈ سنز کے دفتر میں پہنچا کہ اعجاز صاحب ہوں تو ان کی شرافت سے پھر فائدہ اٹھائے معلوم ہوا ہیں تو لیکن اس وقت ضروری کام سے کریم پیپر مارٹ گئے ہوئے ہیں۔ واپسی

دیر میں ہوگی، کیونکہ وہاں سے کسی پارٹی میں جانا ہے!

ذرا بھی انتظار کئے بغیر وہ کریم پیپر پارٹ میں پہنچا، یہاں اعجاز صاحب تو نہیں تھے لیکن کریم اللہ خاں تشریف فرما تھے، لیکن ایک نئی درج سے، ہندوستان میں کریم اللہ خاں صاحب پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ داڑھی بھی رکھتے تھے، کرتہ اور شلوار لباس تھا، پاکستان میں بھی یہ ادا کچھ دن تک قائم رہی، لیکن آج ایک نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس تھے، داڑھی مونچھ ندارد، بالکل اپٹوڈیٹ جنٹلمین نظر آرہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑتا، لیکن آدمی ہنستے ہنستے رو سکتا ہے روتے روتے ہنس نہیں سکتا۔

اس نے خان صاحب سے پوچھا، یہاں اعجاز صاحب آئے تھے؟

خاں صاحب نے فرمایا: ہاں آئے تھے، ابھی ان کے ایک دوست لے کر گئے ہیں۔ وہیں سے پارٹی میں جائیں گے جہاں مجھے بھی جانا ہے!

پارٹی سے اسلم کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی، وہ سنی کی ان سنی کر کے رخصت ہونے لگا، تو خان صاحب نے کہا: کہاں چلے بھائی ذرا دیر تو بیٹھ جاؤ!۔۔۔ ہمیں تم سے سخت شکایت ہے؟!

کریم اللہ خاں کو آج تک اسلم نے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا، اُن کی ایک پائی بھی ان کے ذمے نہیں نکلتی تھی۔ یہ سن کر وہ چونک پڑا، اس نے کہا: تعجب ہے، آپ کو مجھ سے شکایت ہے؟!

انھوں نے اپنایت کے لہجے میں کہا: کیا ہم پندرہ ہزار نہ دے دیتے، کیا ہم بیس ہزار نہ دے دیتے؟ ۔۔۔ پندرہ ہزار کا ہمیں نفع بھر بھی نہ رہتا!

یہ ساری باتیں اسلم کے لئے ناقابل فہم تھیں، وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے

لگا، کہنے لگے: مجھے کیا گھور رہے ہو! شفیق صاحب سے پندرہ ہزار لے کر اتنا بڑا دفتر دے دیا میں نے ۳۵ ہزار پگڑی دے کر ان سے حاصل کیا ہے۔

اسلم نے کہا: لیکن میں نے تو شفیق صاحب سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا!

کریم اللہ خاں نے آنکھیں نکال کر کہا: اب جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا میں نے اپنی آنکھوں سے دستاویز دیکھی ہے!

اسلم کے بدن میں سنسنی سی ہونے لگی۔ ایسا لگنے لگا جیسے دل بیٹھا جا رہا ہے خشک حلق میں آواز اٹکنے لگی۔۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا: خان صاحب وہ اخبار کا سودا ہوا تھا، پگڑی لینے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا!

خان صاحب ہنس پڑے۔ خیر چھوڑیے یہ باتیں، ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں جیسا جیسا موقع ملتا ہے گزرتا ہے، اناڑی پن کی وجہ سے نقصان اٹھا گئے بیس ہزار کا! خاں صاحب کسی طرح یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھے کہ اسلم نے پگڑی نہیں لی ہے اور شفیق صاحب نے اسے روپے نہیں دیے ہیں۔

اسلم نے سوچا: بحث کرنے سے کیا حاصل؟ خاموش ہو گیا، خان صاحب نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا: اچھا بھئی اب ہم تو پارٹی میں چلے، اشفاق صاحب اور ان کی اہلیہ شمسہ بیگم کے ہاں پارٹی ہے، لڑکا پیدا ہوا ہے، عقیقے کی تقریب ہے آج، بڑے یار باش آدمی ہیں، ولسن کمپنی کے جو غیر ملکی کاغذ اور روشنائی سپلائی کرتی ہے جنرل منیجر ہیں، دو ہزار تنخواہ پاتے ہیں، اس سے زیادہ اوپر سے کما لیتے ہیں ــ مسکراتے ہوئے) ہم سب ایک دوسرے کے حق اور حصے کا بڑی ایمانداری کے ساتھ خیال رکھتے ہیں ــ

یکایک ایک نہایت فیشن ایبل نوجوان اور ایک خوش اندام خاتون زرق برق لباس میں ملبوس آگے پیچھے وارد ہوئے۔

یہ نوجوان سلیم تھا!

یہ خوش اندام خاتون مسرت تھی۔

اسلم کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ مسرت کچھ جھینپ سی گئی۔ سلیم بھی کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ کریم اللہ خاں نے پرجوش مصافحہ کرتے ہوئے سلیم سے کہا:

یہ ہمارے دوست اسلم صاحب ہیں۔ انہی کا وہ آفس ہے جس کا آپ کے لئے میں نے شفیق صاحب سے سودا کیا ہے!

پھر اسلم سے کہا: یہ میرے عزیز دوست نواب زادہ سلیم اللہ خاں ہیں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کر رکھا ہے۔ قسمت یاور ہے۔ ایک کے دس بنا رہے ہیں۔

سلیم نے پوچھا: اسلم صاحب آپ نے شفیق صاحب سے کیا پگڑی لی تھی؟

کریم اللہ خاں بول پڑے: صرف پندرہ ہزار اور وہ ظالم ہم سے ۳۵ ہزار لے مرا۔ ویسے دوست بھی بنتا ہے، لیکن اتنا شاندار دفتر پچاس ہزار میں بھی گراں نہیں سستا ہے۔

اسلم نے خاں صاحب سے کڑے تیور سے کہا: آپ بے ایمان ہیں، جھوٹے ہیں حرام خور ہیں۔ آپ بھی اور آپ کے شفیق صاحب بھی۔ میں نے دفتر نہیں بیچا، اس لئے کہ وہ میرا نہیں، میں نے اخبار بیچا، اور اس کا بھی دستاویز پر دستخط ہونے کے باوجود ایک پیسہ وصول نہیں ہوا۔

کریم اللہ خاں مسکرانے لگے۔ اس تبسم میں طنز تھا۔ لیکن سلیم نے ہمدردانہ لہجے

میں پوچھا: پھر آپ نے دستاویز کیوں لکھ دی؟

اس لئے کہ دستاویز لکھے بغیر سودا نہیں ہو سکتا تھا۔

روپے کیوں نہیں لئے؟

اس نے دوسرے دن کا وعدہ کیا تھا!

دستاویز واپس کیوں نہیں لے لی — ؟ کہہ دیتے جب روپیہ دو گے تب دستاویز ملے گی۔

اس لئے کہ میں اسے دغاباز نہیں سمجھتا تھا۔

کچھ کچھ کریم اللہ خاں کو بھی یقین آنے لگا۔ یار یہ تو بہت بُرا ہوا، پھر اب؟

مسرت نے کہا: بہت دیر ہو رہی ہے، چلئے نا!

اسلم ان تینوں سے پہلے باہر نکل آیا۔ اور اپنے غم کدے کی طرف روانہ ہوا۔ اعجاز صاحب مل جاتے تو ساری مشکل حل ہو جاتی۔ اُن سے اب کل سے پہلے ملاقات کی کوئی سبیل نہ تھی۔

لیکن کیا کل تک ڈاکٹر کا بل روکا جا سکتا ہے؟

نجمہ کی طبیعت اگر اور زیادہ خراب ہو گئی — کچھ اور دواؤں کی ضرورت پڑی تو کیا ہوگا؟

پارٹی اگر اشفاق کے علاوہ کہیں اور ہوتی تو وہ پارٹی میں بھی پہنچ جاتا۔ اسے اعجاز صاحب کی شرافت اور عالی ظرفی سے یقین تھا کہ وہ ضرور مشکل کشائی کرتے اشفاق کے عشرت کدے کی طرف اس کے قدم کیسے اٹھ سکتے تھے؟

انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ گھر پہنچا۔ سلمیٰ دروازے پر کھڑی تھی

جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھی !

لیکن اس کی آنکھیں سوجی ہوئی کیوں ہیں ؟ یہ رو کیوں رہی ہے ؟ اقبال پیکرِ غم بنا اس کے دامن سے لگا کیوں کھڑا ہے ؟

اس نے پوچھا : کیا بات ہے سلمیٰ ؟

سلمیٰ نے گلوگیر آواز میں کہا : میری نجمہ اب اس دنیا میں نہیں ہے !

دروازہ نہ پکڑ لیتا تو شاید گر پڑتا ! اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا نجمہ مر گئی ۔ وہ کیوں مر گئی ! انجمن کیوں نہیں مری ؟ میں کیوں نہیں مرا تم کیوں نہیں مریں ؟ جھلملاتے ستارے نہیں مر سکتے یہ چمکتا ہوا چاند موت سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا ، لیکن نجمہ ! میری آنکھ کا تارا — اس گھر کا چاند مر سکتی ہے ؟ کیا خطا تھی اس کی ؟ — تھی — خطا تھی ۔ اس نے جھونپڑی میں رہ کر شہزادیوں کا مزاج پایا تھا ۔ ہم جیسے سخت جانوں کو جہاں چھینک بھی نہیں آتی اسے نمونیہ ہوا ! اور دم بھر میں مر گئی ۔ اب اس کے لئے کفن کا بندوبست ہونا چاہئے ! لیکن میرے پاس کفن خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہیں ۔ — میرے پاس کفن —

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا ، پختہ فرش پر دھڑام سے گر پڑا بیہوش ہو کر !